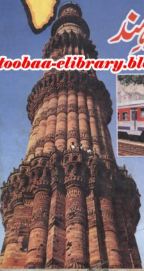




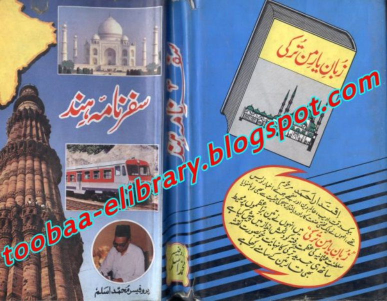
سفرنامہ ہند







پروفیسر محمد اسلم



سفرنامہ ہند
پروفیسر محمد اسلم
زبانِ یارِ من ترکی
اقتدار احمد مرحوم
بیک وقت ادیب، عالم دین اور منجھے ہوئے اخبار نویس
تھے۔ انہوں نے ایک محنتی صنعت کار اور دیانتدار تاجر کی حیثیت سے بھی لوہا منوایا
"زبانِ یارِ من ترکی" میں انہوں نے تین براعظموں پر محیط
سلطنت عثمانیہ کی عظمت رفتہ کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے
ساتھ ہی جدید ترکی کا نہایت خوبصورت نقشہ
بھی قارئین کے سامنے رکھا ہے
toobaa-elibrary.blogspot.com

پروفیسر محمد اسلم ۲۸ نومبر ۱۹۳۲ء کو پھلور ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پہلی جماعت سے لے کر ایم اے تک لاہور میں تعلیم پائی۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ انگلستان چلے گئے جہاں انہوں نے نو سال تک ڈرہم یونیورسٹی، مانچسٹر یونیورسٹی اور کیمبرج یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ اور تاریخ کا مطالعہ کیا۔ انگلستان سے واپسی کے فوراً بعد وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ سے منسلک ہو گئے جہاں سے وہ ۲۷ نومبر ۱۹۹۲ء کو بحیثیت صدر شعبہ سبکدوش ہوئے۔ ان کے شاگرد ہزاروں کی تعداد میں ہیں جن میں سے بیشتر مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھا رہے ہیں۔

پروفیسر محمد اسلم چودہ علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کے پونے دو صد مقالات پاک و ہند کے علمی اور تحقیقی جرائد میں چھپ چکے ہیں۔

موصوف نے انگریزی، اردو فارسی اور پنجابی زبانوں میں کتابیں لکھی ہیں۔ ہیر وارث شاہ کی تاریخی اہمیت پر ان کی ایک تصنیف گورو نانک دیو یونیورسٹی امرتسر نے گورمکھی رسم الخط میں شائع کی ہے۔

میاں نوید احمد حنفی

ہندوستان کے تاریخی، دینی، علمی، ادبی اور روحانی مقامات کی سیر اور اُن پر تحقیقی تبصرہ

سفرنامۂ ہند

پروفیسر محمد اسلم
سابق صدر شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی

ریاض برادرز
۴۰۔ اردو بازار ○ لاہور

نام کتاب:	سفرنامہ ہند
ناشر	میاں نوید احمد
	فون نمبر: 7224989
مطبع	اردو آرٹ پریس
	دربار مارکیٹ، لاہور
سن اشاعت:	جولائی ۱۹۹۵ء
تعداد اشاعت:	۵۰۰
قیمت:	۲۲۵ روپے

فہرست مضامین

انتساب

میں اپنی رحلۃ الشتاء والصیف کی یہ روئداد
فاضل محترم حکیم محمد موسیٰ صاحب چشتی نظامی امرتسری
کے نام معنون کرتا ہوں
اور ان سے یہ استدعا کرتا ہوں کہ میرے حق میں یہ دعا فرمائیں
آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا

نیاز مند قدیم
محمد اسلم



پروفیسر محمد اسلم مسجد قوۃ الاسلام دہلی کے صحن میں کھڑے ہیں۔ عقب میں قطب مینار نظر آرہا ہے۔ یہ ایک نادر تصویر ہے۔

عرضِ مصنف

راقم الحروف نے ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۸۹ء تک بھارت کے تاریخی، علمی، دینی اور رُوحانی مراکز کے بار بار دَورے کئے اور بعض اوقات میں اچانک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں کسی بھارتی مسلمان اسکالر کے بھی قدم بھی نہیں پڑے تھے چہ جائیکہ کوئی پاکستانی اسکالر وہاں پہنچتا۔ ایک بار میں حضرت نظام الدین امیٹھوی کا مزار تلاش کرتے ہوئے رام نگر میں ملک محمد جائسی، صاحب پدماوت کے مزار پر پہنچ گیا۔ جب میں نے علی گڑھ جا کر اپنی اس "دریافت" کا ذکر کیا تو بعض احباب نے اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ تو اب تک یہی سمجھتے رہے ہیں کہ صاحب پدماوت کا مزار جائس میں ہوگا۔ میں نے حضرت امیر خسرو کی مثنوی قران السعدین اور شیخ رکن الدین کی لطائف قدوسی میں سرجو ندی کا ذکر پڑھا تھا لیکن کسی نقشے میں اس ندی کا سراغ نہیں ملا۔ جب میں ایودھیا گیا تو وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ سرجو ندی اس قصبے کو چھو کر گزرتی ہے۔ میں نے بدایوں میں شمسی مسجد اور فیض آباد میں بہو بیگم کا مقبرہ دیکھے۔ اگر میں انہیں نہ دیکھتا تو اسلامی فن تعمیر کے ان شاہکاروں سے لاعلم رہتا۔ میں نے بابری مسجد کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ پاکستان میں گنتی کے چند افراد ایسے ہوں گے جنہوں نے یہ مسجد دیکھی ہے۔

راقم نے ملفوظات کے موضوع پر مخطوطات کی تلاش میں بھارت کی بڑی بڑی لائبریریوں کی خاک چھانی ہے اور اسی طرح تمام اہم درگاہوں میں حاضری کی سعادت حاصل کی ہے۔ بھارت کے دینی اور رُوحانی مراکز کو ایک سے زائد مرتبہ دیکھا ہے۔ اسی طرح مجھے وہاں بہت سے ایسے اساطین علم و ادب سے ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے جو اب اس دنیائے فانی میں نہیں رہے۔

راقم نے بھارت کے بعض اسفار کی روئداد ماہنامہ بینات کراچی، ماہنامہ الحق

اکوزہ خٹک اور سہ ماہی العلم کراچی میں شائع کرائی تھی جو ان مجلوں کی فائلوں میں محفوظ ہے لیکن پورا سفر نامہ پہلے کبھی شائع نہیں ہوا اور کئی ابواب میں نے پہلی بار تحریر کیے ہیں ۔ میں نے اس سفرنامے کی طباعت کے سلسلے میں دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے ریسرچ سیل سے بھی رابطہ قائم کیا تو وہاں کے کارپردازوں نے سالِ رواں کے اواخر میں اسے شائع کرنے کا وعدہ کیا لیکن میں اتنی دیر تک انتظار نہیں کر سکتا تھا ۔ اسی دوران میں میاں نوید احمد صاحب ، پروپرائیٹر ریاض برادرز سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس کی فوری اشاعت کا مژدہ سنایا ۔ میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا ۔ میں اس "عجلت" کے لئے میاں صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں ۔

فاضل محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب نے اس پر ایک بسوط پیش لفظ تحریر فرمایا ۔ اس کرم فرمائی کے لئے میں ان کا صمیمِ قلب سے شکر گزار ہوں ۔ اسی طرح مشہور اسکالر اور ماہرِ غالبیات ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب نے بھی اس پر مقدمہ لکھ کر میری حوصلہ افزائی کی ۔ میں ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ میری بیٹی انجم نے اس کتاب کے پروف پڑھنے میں حسبِ سابق میری معاونت کی ہے ۔ اللہ کریم اسے علم کی دولت سے مالا مال فرمائے ۔ اس سفر نامے کی طباعت کے پیچھے بھی حسبِ سابق جنابِ محترم حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کا تعاون مجھے حاصل رہا اور اگر موصوف میری حوصلہ افزائی نہ کرتے تو شاید یہ کتاب کبھی طبع نہ ہوتی ۔

تاریخ اور اُردو ادب کے اساتذہ اور طلبہ کو میری اس کتاب میں بہت سی نئی معلومات ملیں گی ۔ مجھے امید ہے کہ عام قاری بھی اسے پسند فرمائیں گے ۔

لاہور	ہیچمدان
۲۳ مئی ۱۹۹۵ء	محمد اسلم

عرضِ سدید

پروفیسر محمد اسلم سے میری پہلی ملاقات الحمرا آرٹ کونسل میں بھارتی کتابوں کی ایک نمائش کی تقریب میں ہوئی تھی ، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس پہلی ملاقات سے بہت عرصہ پہلے میں ان کے حبالۂ نیاز مندی میں آچکا تھا ۔ ان کے علمی مرتبے سے شناسا تھا ، ان کے مقالات کا قاری تھا ۔ وہ اعلیٰ پائے کے جرائد میں جس وضع داری سے تاریخ کے گم شدہ اوراق کی تزئین نو کر رہے تھے ، اس سے متاثر تھا ۔ ان کی ایک کتاب "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" کا پیش لفظ استاد العلماء مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ نے لکھا تھا اور انہوں نے اسلم صاحب کی تحقیق و تدقیق میں وسعتِ نظر کی داد دی تھی اور انہیں تحقیق تاریخ میں بلند مقام عطا کیا تھا ۔ ان سے ملاقات ہوئی تو ان کا یہ مقام میری نظر میں تھا ۔

میری مسرت کا ایک باعث یہ بھی تھا کہ کسی سابقہ تعارف کے بغیر انہوں نے مجھے میرا نام لے کر مخاطب کیا اور میری چند معمولی کتابوں کا ذکر اس خلوص و محبت سے کیا جیسے وہ ان کا بالاستیعاب مطالعہ کر چکے تھے ۔ انہوں نے نہ صرف میری محنت کی داد دی بلکہ "اُردو ادب کی تحریکیں" کے تاریخی پس منظر کے بارے میں مجھے چند نئے ماخذ سے روشناس کرایا اور یہ بھی بتا دیا کہ یہ ماخذ مجھے کس لائبریری سے مل سکتے تھے ۔ ان کے کردار کی ایک یہ بات بھی دلنشیں معلوم ہوئی کہ علم کی افراط اور مطالعے کی وسعت نے ان کو نہ تو نخوت پسند بنایا تھا نہ انہیں گردن دراز کیا تھا وہ بات کرتے تو ان کی طلب و جستجو کا جذبہ پوشیدہ نہ رہتا ۔ اسلم صاحب ثمر دار شاخ کی طرح جھکتے چلے جاتے ۔ سامع کا احساسِ کم مائیگی بڑھتا جاتا ۔ کسی نئی کتاب کا نام سن کر جھوم اُٹھتے اور دریافت کرتے کہ یہ کہاں سے دستیاب ہو گی ؟

میرا ایک اور اعزاز یہ ہے کہ مجھے اسلم صاحب کی نئی کتاب "سفر نامہ ہند" جو دہلی اور نواحِ دہلی کا سفرنامہ ہے مسودے کی صورت میں پڑھنے کا موقع ملا ہے ۔ اس کتاب کے مطالعے کے دوران ان کا متذکرہ رُخ کردار میرے ذہن میں روشن تھا ۔ میں

نے یہ کتاب اس زاویہ نظر سے پڑھی کہ مصنف دیارِ غیر، اجنبی اشخاص، نامانوس مظاہر اور انوکھے مناظر کے تعارف کے دوران علم و آگہی کی کس منزل سے گزرتا ہے، کیا سفر میں ان کے کردار کی کوئی نئی جہت سامنے آتی ہے؟

یہ سوال میرے ذہن میں اس لیے ابھرا کہ ہمارے متعدد معروف سفرنامہ نگار جب کسی بیرونی ملک کی سیاحت پر جاتے ہیں تو اپنا حقیقی کردار اپنے ملک میں ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ دوسری دنیا کے ساحل پر "ڈان کہوٹے" کے انداز میں قدم رکھتے ہیں اور اس سرزمین کے حسن اور بالخصوص نسوانی رعنائیوں کو "ڈان جوآن" کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور واپس آتے ہیں تو اپنی "فتوحات" کے قصوں سے یوسف خان کمبل پوش کی طرح لوگوں کو مرعوب کرتے ہیں، سفرنامہ تخیلی افسانہ بن جاتا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ سفرنامہ نگار مناظر مظاہر اور اشیاء سے موانست کی بجائے اپنی ذات کی نرگسیت میں مبتلا ہے اور نئی دنیا کو دریافت کرنے کی بجائے اپنی محرومیوں کا ازالہ کر رہا ہے۔ چنانچہ سفرنامہ نہ صرف صداقت سے بعید ہو جاتا ہے بلکہ حقیقت کشا بھی ثابت نہیں ہوتا۔

پروفیسر محمد اسلم کا سفرنامہ ہند پڑھ کر سب سے پہلے یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے حقیقت اور صداقت کے مدار سے لاشعوری طور پر بھی باہر نکلنے کی سعی نہیں کی۔ یہ ایک ایسا سچا سفرنامہ ہے جس میں شوق نے سیاح کی انگلی پکڑ رکھی ہے اور جستجو انہیں کشاں کشاں منازلِ مقصود کی طرف لئے جا رہی ہے۔ شوق و جستجو کے اس سفر میں ان کی ذات اور وجود تو موجود ہے لیکن یہ منظر پر غالب نہیں آتے، وہ تاریخ کے سفر میں جغرافیے کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ہر نیا قدم انہیں تازہ دم رکھتا ہے چنانچہ بھوک نے انہیں رُکنے نہیں دیا۔ پیاس نے انہیں تھکنے نہیں دیا اس کی ایک مثال احمد آباد کے سفر کے دوران یوں سامنے آتی ہے:

"شام کو میں احمد آباد پہنچا...... احمد آباد میں میری سب سے زیادہ دلچسپی ایک مخطوطے میں تھی جو شہزادی جہاں آرا۔ بنت شاہجہان کی تصنیف تھا اور ـ ـ ـ ـ "رسالہ صاحبیہ" ـ ـ ـ ـ کے نام سے موسوم تھا۔ اس کا دنیا بھر میں اور کوئی نسخہ نہیں تھا۔ شہزادی نے اس میں اپنے شیخِ طریقت ملا شاہ بدخشی

کے سوانحِ حیات قلم بند کئے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں پروفیسر محمد ابراہیم ڈار نے اورینٹل کالج میگزین میں اس کا مختصر سا تعارف کرایا تھا لیکن اصل مخطوطہ شائع نہیں ہوا تھا۔ میری یہ دلی خواہش تھی کہ اس کی طباعت کی سعادت میرے حصے میں آئے۔

میں اس مخطوطے کی زیارت کے لیے آپا راؤ بھولا ناتھ لائبریری جانا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی رکشے والا اس سے واقف نہیں تھا۔ میں نے ایک رکشے والے کو میونسپل لائبریری چلنے کو کہا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میونسپل لائبریری کا عملہ میری راہنمائی کرے گا۔ یہ لائبریری دریائے سابرمتی کے پار تھی ـ ـ ـ یہ دریا شہر کے وسط سے گزرتا ہے۔ اس میں پانی بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے کنارے گاندھی جی نے سابرمتی آشرم قائم کیا تھا جہاں انہوں نے وجے لکشمی پنڈت کو رکھ کر سید حسین کے ساتھ شادی کرنے سے رُوکا تھا۔ ایسی کنیاؤں (دوشیزائیں) کے دماغ اسی آشرم میں درست کیے جاتے تھے۔

میونسپل لائبریری جا کر میں نے آپا راؤ بھولا ناتھ لائبریری کا پتہ پوچھا۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے بھجوانے کی بجائے وہ کسی رکشا والے کو سمجھا دیں۔ ان کے سمجھانے پر میں آپا راؤ بھولا ناتھ لائبریری پہنچ گیا جو دریا کے اسی جانب تھی جہاں سے میں چلا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ لائبریری گیارہ بجے کھلتی ہے۔ اس وقت دس بجے تھے۔ میں نے ایک گھنٹہ ایک ریستوران میں گزارا۔ لائبریری کھلی تو میں بڑی اُمیدیں لے کر وہاں پہنچا۔ لائبریرین نے مجھے بتایا کہ عربی اور فارسی کے تمام مخطوطے ان کے ہاں سے وِدّیا سبھا لائبریری میں منتقل ہو چکے ہیں۔

اب وہاں پہنچنے کا سوال تھا

میری استدعا پر انہوں نے ایک رکشا ڈرائیور کو وِدّیا سبھا لائبریری کا محلِ وقوع بتایا۔ ایک بار پھر میں نے سابرمتی دریا عبور کیا اور مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔ میں نے لائبریری کے کاؤنٹر پر اپنا نام اور علی گڑھ کا پتہ بتایا تو انہوں نے مجھے "رسالہ صاحبیہ" فراہم کر دیا۔ میں نے شام تک آدھا رسالہ نقل کر لیا اور بقیہ

اگلے روز نقل کر کے مخطوطہ لوٹا دیا۔ بلکہ میرے پاس اتنا وقت اور نکل آیا کہ میں نے شیخ علی متقی (م ١٥٦٧ء) کا " رسالہ در علامات مہدی " بھی نقل کر لیا جو انہوں نے مہدی جونپوری کے رد میں لکھا تھا "۔

اس طویل اقتباس سے نہ صرف اسلم صاحب کا ذوقِ جستجو نمایاں ہوتا ہے بلکہ ان کے شوق کے متعدد زاویے بھی سامنے آجاتے ہیں اور " رسالہ صاحبیہ " کا مخطوطہ گل بکاولی سے زیادہ گراں مایہ نظر آتا ہے جس کی زیارت کے لیے اسلم صاحب نے دریائے سابرمتی کو دو مرتبہ عبور کیا۔ اس سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دیکھی ہوئی چیزوں کے برعکس ان دیکھی چیزوں تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ سفرنامہ ہمیں دیار و امصار کی سیر ہی نہیں کراتا بلکہ مخطوطات، تبرکات اور بزرگانِ عالی مقام کے مزارات کی زیارات کا شرف بھی عطا کرتا ہے اور متعدد انوکھے تاریخی کرداروں سے بھی متعارف کراتا ہے یہ الفاظ لکھتے ہوئے مجھے اسلم صاحب کا جھنجھانہ کا سفر یاد آرہا ہے اور میرا سر عقیدت حضرت میاں جیو جھنجھانوی کے سامنے جھکا ہوا ہے۔

"کیرانہ سے چل کر ہم جھنجھانہ پہنچے۔ دونوں قصبوں کے درمیان نو میل کا فاصلہ ہے۔ بس قریباً بیس منٹ میں جھنجھانہ پہنچا دیتی ہے۔ یہ قصبہ راجہ جھن جھن بدری پرشاد کی راج دھانی تھی۔۔۔۔۔ میاں جیو نور محمد کا مولد و مدفن جھنجھانہ ہے لیکن ان کی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ "لوہاری" میں گزرا۔ یہ تاریخی قصبہ اس راستے پر تھا جس سے بنگال و بہار سے خفیہ طور پر مجاہدین بالا کوٹ اور پھر ان کے جانشینوں کو مالی امداد بھیجی جاتی تھی۔ لوہاری میں میاں جیو مقیم تھے جو اگلی منزل تک اس رقم کو پہنچانے کے ذمہ دار تھے۔ انہوں نے اخفائے حال کے لیے لوہاری کی مسجد میں دو روپے ماہانہ پر امامت کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ لوہاری کی مسجد کے جس حجرے میں آں جناب کا قیام تھا اس کے بارے میں ایک بار حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا کہ انہوں نے جو انوار وہاں مشاہدہ کیے ہیں ویسے انوار دائرہ شاہ علم اللہ (م ١٦٨٥ء) رائے بریلی کے علاوہ اور کہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔ حضرت میاں جیو کا مجاہدہ اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ ایک بار انہوں نے فرمایا کہ وہ بطورِ فخر نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر کہتے ہیں کہ گزشتہ تیس

برسوں سے ان کی تکبیرِ اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔

میاں جیو کے خلفاء میں حافظ محمد ضامن شہید (م ١٨٥٧ء) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ١٨٩٩ء) اور شیخ محمد فاروقی تھانوی (م ١٨٧٩ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے حاجی امداد اللہ سے فیضِ عام ہوا۔۔۔۔۔ ایک بار مولانا محمد قاسم نانوتوی سے کسی نے استفسار کیا کہ اتنے بڑے بڑے علما حاجی صاحب سے کیوں کر بیعت ہوئے۔ اس پر مولانا نے فرمایا " بھائی! ہم نے دین کتابوں میں پڑھا ہے، اور حاجی صاحب نے بزرگوں سے سیکھا ہے "۔

ایک بار کسی شخص نے مولانا محمد قاسم نانوتوی سے پوچھا " کیا حاجی صاحب بھی عالم ہیں؟ " مولانا نے فرمایا " عالم ہونا کیا معنی اللہ تعالیٰ نے انہیں عالم گر بنایا ہے "۔

میں نے عصر کی نماز میاں جیو نور محمد کے مزار سے ملحقہ مسجد میں ادا کی اور چلتے وقت ان کی قبرِ پُر انوار سے تھوڑی سی مٹی بھی اٹھا لی۔ میں اس متبرک مٹی کو لاہور لے جا کر اپنے والدِ بزرگوار کی قبر پر ڈالنا چاہتا تھا لیکن اثنائے سفر میرا وہ سوٹ کیس چوری ہو گیا جس میں یہ تبرک " محفوظ " تھا "۔

پروفیسر محمد اسلم صاحب کا یہ سفر دشواریوں سے ناآشنا نہیں لیکن ان کی طلب چونکہ صادق تھی اور جذبہ نوادر پسند تھا اس لیے دشواریوں نے ذوق میں کمی پیدا نہ ہونے دی بلکہ شوق کو مہمیز لگا دی اور وہ اس حسرت کو مٹانے میں مصروف ہو گئے کہ خدا جانے زندگی پھر اس طرف آنے کی مہلت بھی دیتی ہے یا نہیں۔ ان کا جھانسی سے ناگپور کا سفر ایسی ہی ایک کیفیت کا مظہر ہے:

" ٹرین جھانسی سے چل کر رات کو گیارہ بجے بھوپال میں رکی۔ اس کے بعد اس کا اگلا سٹاپ ناگپور میں تھا جہاں اس نے نمازِ فجر کے وقت پہنچنا تھا۔ راستے میں دو تین جگہ سگنل نہ ہونے کی بنا پر ٹرین رکی۔ صبح ساڑھے تین بجے میری آنکھ کھلی۔ دیکھا تو میرا سامان غائب تھا۔ میرے ہوش گم ہو گئے۔ سامان کے ساتھ مختلف لائبریریوں میں لیے گئے نوٹس، دہلی سے خریدی ہوئی کتابیں، کپڑے اور سب سے بڑھ کر میرا پاسپورٹ بھی چلا گیا تھا۔ اتنے میں چند مسافر اور بیدار ہو گئے۔ انہوں نے بھی واویلا مچایا۔ ان کا سامان بھی چوری ہو گیا تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھیلوں کا علاقہ ہے اور وہ چوری چکاری کے لیے بدنام ہیں۔ راستے میں جب کسی سگنل پر ٹرین رکی تو وہ چند مسافروں کا سامان اٹھا کر دو ڈبوں کو ملانے والا کینوس پھاڑ کر اتر گئے۔۔۔۔ میں نے ناگپور ریلوے اسٹیشن کے تھانے میں چوری کی رپورٹ درج کرائی۔ انہوں نے مجھے اس کی ایک نقل فراہم کر دی۔ تھانے میں صدہا ایسے افراد کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جو چلتی ٹرینوں میں اس طرح کی وارداتیں کرتے تھے۔۔۔

میں نے دل میں کہا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب خدا جانے کب ناگپور آنا ہو اس لیے لگے ہاتھوں بابا تاج الدین ناگپوری (م ۱۹۲۵ء) کا مزار دیکھ آؤں۔ علامہ اقبال بھی ان کے بہت معتقد تھے اور انہوں نے اپنے ایک خط میں مہاراجہ سرکشن پرشاد مدار المہام سلطنتِ آصفیہ کو ان سے ملنے اور اپنے لیے دعا کروانے کا مشورہ دیا تھا۔ بابا صاحب کے جانشین بابا عبدالکریم المعروف بہ یوسف شاہ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی چلے آئے اور وہیں ۱۹۴۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔۔۔۔

میں نے ایک رکشا ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے بابا تاج الدین کے مزار پر لے چلے لیکن وہ مجھے بابا جلال شاہ بخاری کے مزار پر لے گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں نے چلتے وقت اس سے دریافت کیا تھا کہ وہ بابا تاج الدین کی درگاہ کے بارے میں جانتا ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا تھا۔ پھر مجھے یہاں کیوں لے آیا؟ اس نے کہا "یہ بھی ایک بابا کی درگاہ ہے"۔ میں نے اسے کرایہ دے کر رخصت کیا۔۔۔۔ اس جگہ سے بابا تاج الدین کا مزار پانچ میل سے کم فاصلے پر نہ ہو گا"۔ بابا صاحب کا مزار ان کی وفات ۱۹۲۵ء کے بعد تعمیر ہوا تھا۔ اب وہاں ایک نیا ماڈل پڑا تھا جس کے مطابق اسے از سرِ نو تعمیر کرنا تھا۔ ہندو مسلم بلا تمیز ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

۔۔۔۔ شہر کی ایک جھلک دیکھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ میں نے دل میں پھر وہی سوچا کہ اب جو ہونا تھا ہو چکا۔ اس لیے راستے میں بھوپال دیکھتا جاؤں۔ میں نے بھوپال کا ٹکٹ خریدا، شام کو مغرب سے تھوڑی دیر پہلے بھوپال

پہنچ گیا"۔

ایک ممتاز مورخ کی حیثیت میں اسلم صاحب کو قدیم مقابر، تاریخی مقامات، مخطوطات اور نوادرات کے احوال و آثار کی بازیافت، مشاہدے اور مطالعے کا شوق ہے۔ اس سفرنامے میں انہوں نے متعدد ایسے آثار کی دریافت کی ہے جو معدوم ہو چکے تھے یا جنہیں مقامی آبادی بھی فراموش کر چکی تھی۔ یہ سفرنامہ اس لحاظ سے نادر ہے کہ اس میں شوق ہر رنگ میں رقیب سرو ساماں نظر آتا ہے لیکن اسلم صاحب ہمیشہ تحقیق سے جوئے شیر نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ کیفِ مسرت سے سرشار ہو جاتے ہیں اور پھر یہ سرشاری ان کے سفر کا حاصل بن جاتی ہے۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد کے ایک نامور امیر نواب مرتضیٰ خان فرید بخاری گزرے ہیں، ان کی قبر شیخ محمد اکرام مرحوم صاحب "رودِ کوثر" نے پاکستان کے قیام سے قبل دہلی میں دیکھی تھی اور ان کے لوحِ مزار کا کتبہ بھی نقل کیا تھا۔ اسلم صاحب سولہ برسوں سے اس قبر کی تلاش میں تھے، لیکن سڑکوں کے نام بدل جانے اور نئی نئی آبادیاں قائم ہو جانے کی وجہ سے قبر کی تلاش میں کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ مطلوبہ قبر تک اسلم صاحب کس طرح پہنچتے ہیں، یہ انہیں کی زبان سے سنیے:

"میں ایک روز مفتی ضیاء الحق صاحب کے پاس مدرسہ رحیمیہ میں بیٹھا تھا کہ فرید آباد کے خطیب ان سے ملنے آئے۔ مفتی صاحب نے میرا ان سے یہ کہتے ہوئے تعارف کرایا کہ مجھے بھی ان کی طرح پرانے مقبرے اور تاریخی مقامات دیکھنے کا شوق ہے۔ خطیب صاحب اس پر بہت خوش ہوئے اور مجھے بتایا کہ ابھی حال ہی میں انہوں نے نواب مرتضیٰ خان کی قبر دیکھی ہے۔ ان کی بات سن کر میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور ان سے کہا:

"میں تو سولہ برس سے اس کی تلاش میں ہوں لیکن مجھے اس کا اتہ پتہ نہیں ملتا"۔ خطیب صاحب نے فرمایا کہ ان کی مسجد کے اندر ایک قبر ہے جسے وہ نواب صاحب کی قبر سمجھتے رہے (یہ قبر دراصل میرے فاضل دوست جناب خورشید انصاری فرید آبادی کے جدِ امجد محمد اعظم پانی پتی کی ہے)۔ گزشتہ دنوں کراچی سے ہاشمی فرید آبادی کے ایک عزیز فرید آباد آئے تو انہوں نے ان سے تصدیق

کرنا چاہی ۔ انہوں نے بتایا کہ یہ قبر نواب مرتضیٰ خان کی نہیں ہے ۔ ان کی قبر تو مالویہ نگر میں ہے ۔ ان کی نشان دہی پر ہی خطیب صاحب نے مالویہ نگر جا کر قبر تلاش کر لی ۔

نواب مرتضیٰ خان کی قبر ایک چھوٹی سی بستی "سراوڑی" میں تھی ۔ قریب ہی چوہدری دلیپ سنگھ کا ٹیوب ویل تھا ۔ قبر پر کتبہ نصب ہے اور لوہے کا جنگلہ موجود ہے ۔ اس قبر کے آثار تلاش کرنے میں اسلم صاحب کو جن مشکلات سے گزرنا اور جان جوکھوں میں ڈالنی پڑی وہ ابن بطوطہ کی مشکلات سے کم نہیں ۔ میں اس کا طویل اقتباس یہاں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ۔ اسلم صاحب لکھتے ہیں ۔

"میں اگلے روز چوہدری دلیپ سنگھ کے ٹیوب ویل پر پہنچ گیا ۔ وہاں دو تین بوڑھیاں بیٹھی تھیں ۔ میں نے ان سے نواب مرتضیٰ خان کی قبر کا پتہ پوچھا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگیں ۔ میں نے قبر کی بجائے مزار اور پھر مقبرے کا نام لیا لیکن وہ خاموش رہیں ۔ میں نے تنگ آکر ان سے پوچھا کہ یہاں کسی مسلمان کی سمادھی ہے ؟ اس پر انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک کھنڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ اس کے پار وہ "سمادھی" موجود ہے ۔ وہاں سے کھنڈر کا فاصلہ سو گز کے قریب تھا اور موسم برسات میں خود رو جھاڑیوں نے وہاں تک پہنچنے کا راستہ مسدود کر رکھا تھا ۔ میں نے ایک نو عمر لڑکے سے کہا کہ میں اسے کچھ رقم دے دوں گا وہ مجھے وہاں تک پہنچا دے اس نے کہا کہ راستے میں سانپ کا خطرہ ہے اس لئے وہ مجھے وہاں تک نہیں لے جا سکتا ۔

میں اللہ کا نام لے کر زمین پر زور زور سے پاؤں مارتا ہوا اور منہ سے شی شی کی آوازیں نکالتا ہوا بمشکل تمام اس کھنڈر تک پہنچا ۔ جب میں ڈھلان کے اوپر چڑھا تو معلوم ہوا کہ میں ایک مسجد کی دوسری منزل پر کھڑا ہوں ۔ میں جب گھوم کر جنوبی سمت گیا تو ایک احاطے میں چند قبریں نظر آئیں ۔ ان میں لوہے کے جنگلے والی قبر سب سے نمایاں تھی اور صرف اسی پر کتبہ نصب تھا ۔

میں ایک زینے کے راستے نیچے اترا اور احاطہ قبور میں داخل ہوا ۔ برسات کا موسم تھا ۔ خود رو جھاڑیوں کی وجہ سے زمین پر پاؤں دھرنا محال تھا ۔ میں با

دل نخواستہ پختہ قبریں پھلانگتا ہوا اور مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوا نواب صاحب کی قبر تک پہنچا ۔ یہاں آکر مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ لڑکا جان بوجھ کر مجھے یہاں تک نہیں لایا ۔ ٹیوب ویل پر کام کرنے والے ملازمین رفع حاجت کے لئے یہاں آتے ہیں ۔ گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے زمین پر بیٹھنا محال ہے ۔ اس لئے وہ پختہ تعویذوں پر بیٹھ کر مزارات کی بے حرمتی کرتے ہیں ۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ خواجہ باقی باللہؒ ، مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدثؒ کے ممدوح اور "جرگہ ممدانِ دولتِ اسلام" کے سرخیل نواب مرتضیٰ خان کی قبر اب کس حال میں ہے ؟ یہ اس بزرگ کی قبر ہے جس کے دم قدم سے عہد مغلیہ کے کئی مدارس اور خوانق کی رونق قائم تھی ۔

نواب موصوف کی قبر کے سرہانے سنگِ مرمر کی قدِ آدم لوح نصب ہے ۔ سنگ تراش نے حروف کھودنے کی بجائے ابھار دیئے ہیں ۔ اس لئے وہ دور سے پڑھے نہیں جاتے تھے ۔ میں نے نواب صاحب کے لئے دعائے مغفرت کی اور ہمت کرکے جنگلے کے اندر کود گیا ۔ میں نے تعویذ پر کھڑے ہو کر بدقت تمام وہ عبارت نقل کی :

نواب صاحب کی قبر پا لینے کے بعد اسلم صاحب پر ملال اور مسرت کی کیفیات بیک وقت طاری ہوئیں ، مسرت اس بات کی تھی کہ انہیں تلاش کا ثمر مل گیا تھا لیکن ملال یہ تھا کہ آثارِ قدیمہ کی مناسب حفاظت نہیں کی جا رہی تھی اور بھارت کی سرزمین سے بڑے بڑے ناموں کے نام مٹتے چلے جا رہے تھے ۔ یہ کیفیات مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ کیجئے ۔

نواب مرتضیٰ خان کا مزار تو کہنے کو "محفوظ" ہے اور محکمۂ آثارِ قدیمہ کی حفاظت میں ہے لیکن اس سے زیادہ غیر محفوظ عمارت میں نے کبھی نہیں دیکھی ۔ ساداتِ کرام کے اس مقدس قبرستان کو رفع حاجت کے لئے مختص کر لیا گیا ہے اور قبروں کے تعویذ غلاظت سے اٹے پڑے ہیں ۔ کاش دہلی کے باغیرت مسلمان اس کی حفاظت اور صفائی کی طرف توجہ دیں (مسلم اوقاف کی مجرمانہ چشم پوشی بھی قابل صد مذمت ہے) اگر سڑک پر ایک تختی لگا کر مزار کی نشاندہی" ی

جائے تو کئی بھولا بھٹکا مسلمان راہی وہاں جا کر فاتحہ پڑھ لے ۔ اسی بہانے مزار کی صفائی کا انتظام ہو جائے گا ۔

نواب مرتضیٰ خان کی قبر ملنے سے مجھے جو خوشی ہوئی اس کا اندازہ میرے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا ۔ میری سولہ سال کی محنت اور تجسس رائیگاں نہیں گئے ۔ میں نے اس قبر کا اتہ پتہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ، حکیم عبدالحمید ، ڈاکٹر مختار الدین احمد (آرزو) اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو دیا اور ان سے یہ درخواست کی کہ وہ محکمۂ آثارِ قدیمہ پر دباؤ ڈال کر اس کی حفاظت اور صفائی کا انتظام کریں ۔"

قدیم ماضی سے جدید حال کی طرف آئیں تو اسلم صاحب ہمیں بعض ایسی معلومات سے بھی سرفراز کرتے ہیں جن کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا اور سرحد کے اس پار اگر چلے بھی جائیں تو عام سفرنامہ نگاروں کو وہ معلومات حاصل کرنے میں دلچسپی ہی نہیں ہوتی جو اسلم صاحب نے دقتِ نظر سے جمع کیں اور پھر تحقیقی صحت سے ہم تک پہنچائیں ، چند انوکھی معلومات جن سے بھارت کی سماجی زندگی کے خدو خال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ، حسب ذیل ہیں :

"لونی کے بعد باغپت آتا ہے ۔ دہلی سے باغپت کا فاصلہ ۴۴ کلو میٹر ہے ۔ بھارت کے ایک سابق وزیر اعظم چوہدری چرن سنگھ (م ۱۹۸۷ء) یہیں کے رہنے والے تھے ۔ اس علاقے میں جاٹوں کے علاوہ مسلمان بھی بڑی تعداد میں رہتے ہیں ۔ جاٹ برادری کے سربراہ ہونے کے باوجود پارلیمنٹ کے انتخاب میں کامیابی کے لئے چوہدری صاحب کو مسلمانوں کے ووٹوں کی ضرورت رہتی تھی چنانچہ الیکشن کے زمانے میں ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگائے جاتے تھے ۔ میں نے باغپت سے گزرتے ہوئے دیواروں پر "جٹوا کٹوا بھائی بھائی" کے اشتہارات لگے ہوئے دیکھے ۔ میرے استفسار پر قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (م ۱۹۹۱ء) کے فرزند زین الساجدین نے بتایا کہ کٹوا کے معنی مختون ہیں ۔ مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے چوہدری چرن سنگھ اور ان کی جاٹ برادری مسلمانوں کی طرف وقتی طور پر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے ۔"

○

"بھوپال شہر سات حصوں میں منقسم ہے ہر حصے کا نام ہفتے کے دن سے منسوب ہے ۔ مثلاً اتوارہ ۔ سوموارہ ۔ بدھ وارہ وغیرہ ۔"

○

"منماڑ سے میٹر گیج لائن اورنگ آباد جاتی ہے ۔ مجھے اورنگ آباد جانا تھا ، اس لئے میں یہیں اتر گیا ۔ ٹرین آنے میں تین گھنٹے باقی تھے ۔ دن بھر کے سفر نے مجھے یوں بھی تھکا دیا تھا ۔ میں رات کا کھانا تناول کرنے ریلوے کے ریستوران میں گیا ۔ اتفاق سے ایک مسافر جو ٹرین میں میرے برابر والی سیٹ پر سفر کر چکا تھا ، وہاں موجود تھا ۔ میں نے ویجیٹیرین کھانے کا آرڈر دیا ۔ اس نے بھی کھانا منگوایا ۔ ہم آمنے سامنے میز پر بیٹھے تھے ۔ اس نے اپنی ایک ہتھیلی پر گلاس سے پانی ڈالا اور اسے اپنے سامنے میز پر اس انداز سے گرایا کہ اس کے اور میرے درمیان پانی کی دیوار حائل ہو گئی ۔ اس طرح وہ ایک مسلمان کے مسموم اثرات سے اپنے کھانے کو محفوظ کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ میں دیر تک اس کی ذہنیت کے بارے میں سوچتا رہا ۔ پھر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر یہ اس طرح مسلمانوں کے خلاف نفرتیں نہ رکھتے اور چھوت چھات کے قائل نہ ہوتے تو مسلمانوں میں ضم ہو جاتے ۔ ایسی ہی گھنونی حرکات نے انہیں مسلمانوں سے بلکہ یوں کہیے کہ اسلام کی روشنی سے دور رکھا ۔"

"تھانہ سے ۴۰ کلو میٹر کے بعد کلیان آتا ہے ۔ یہاں ملنگ بابا کا مزار ہے ۔ جس کا احترام مہاراشٹر کے باشندے بلا تفریق مذہب و ملت کرتے ہیں ۔ مولانا جعفر شاہ پھلواروی (م ۱۹۸۲ء) فرمایا کرتے تھے کہ ان کی درگاہ کے احاطے میں لوگ جھوٹ نہیں بولتے ۔ ایک گوالا ان کی درگاہ کے احاطے میں دودھ میں پانی ملانے کا اعتراف کرے گا لیکن درگاہ سے باہر آتے ہی دودھ کے خالص ہونے کی قسم کھالے گا ۔ میں نے سنا ہے کہ ہمارے ہاں دیہات میں ایسے لوگ بھی ہیں جو قرآن پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی قسم کھا لیتے ہیں لیکن اگر ان سے یہ کہا جائے کہ فلاں بابا کے مزار پر ڈالی ہوئی چادر پکڑ کر قسم کھاؤ تو وہ کسی قیمت پر ایسا نہیں کرتے ۔ ملنگ بابا کی تصویریں بمبئی میں عام فروخت ہوتی ہیں ۔ سرکاری بسوں ،

دکانوں، دفتروں اور بغلوں میں ان کی تصویریں نمایاں طور پر لگی ہوئی نظر آتی ہیں۔

پروفیسر اسلم صاحب نے حقیقت کو شعوری طور پر افسانہ بنانے کی بجائے ہمیں باور کرایا ہے کہ تخیل آرائی سے اگر کام نہ بھی لیا جائے تو حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ سفرنامہ نگار اگر اپنی چشمِ حیرت کھلی رکھے تو انوکھے حقائق ہر مقام پر اس کا دامنِ دل تھام لیتے ہیں۔ یہ سفرنامہ پڑھتے ہوئے میری حیرتیں متنوع زاویوں سے جاگتی چلی گئیں۔ یوں محسوس ہوا کہ اسلم صاحب جب ماضی کو زمانہ حال کے ساتھ مائل بہ موانست کر رہے تھے تو میں ان کا ہم سفر تھا۔ اس سفرنامے میں وہ نہ "ڈان کہوٹے" تھے اور نہ انہوں نے "ڈان جو آن" بننے کی کوشش کی۔ بلاشبہ وہ بلند پایہ تاریخ نگار ہیں لیکن اس سفرنامے میں وہ صرف طالب علم نظر آتے ہیں طلبِ علم ان کی بنیادی آرزو ہے۔ اس آرزو کی تکمیل کے لیے وہ ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے اور تاریخ کے زمانوں میں سفر کرتے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت تلاش کرنے کی آرزو ان کے ہاں ہر مقام پر زندہ نظر آئی ہے۔ اسلم صاحب ہمیں ویسے ہی دکھائی دیتے ہیں، جیسے وہ زندگی میں نظر آتے ہیں، یہ سفرنامہ ان کا ظاہر نہیں، ان کا باطن ہے لیکن خوبی کی بات یہ کہ ان کا باطن ان کے ظاہر سے مختلف نہیں ہے۔

اس سفر کی یاد تازہ کرنے کے لیے میں پھر عازمِ سفر کر رہا ہوں ان کا سفرنامہ دوبارہ پڑھ رہا ہوں۔ ایک دفعہ پھر اپنی حیرتوں کو جگا رہا ہوں۔ میں آپ کو شریکِ سفر ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔

۱۷۲، سیج بلاک، اقبال ٹاؤن

لاہور ــــــــ ۸ اپریل ۱۹۹۵ء

انور سدید

حرفے چند

"عجائبات فرنگ" (۱۸۴۷ء) کو اردو کا پہلا کتابی سفرنامہ مانا گیا ہے۔ اس طرح اردو میں سفرنامے کی باقاعدہ روایت گویا تقریباً ڈیڑھ صدی کو محیط ہے۔ سفرنامے کی پہلی صدی، بیشتر جغرافیے اور تاریخ کے ملے جلے بیانیے سے عبارت رہی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد بطور شعبہ ادب، سفرنامے نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی اور اب یہ محض بیانیہ نہیں رہا، اسے شخصی آنچ، اور تخلیقی، افسانوی رمق اور رنگ میسر آیا ہے، اور اس تازہ کاری نے اسے فکشن کے قاری کے لیے بھی قابلِ قبول بنا دیا ہے۔

زیرِ نظر سفرنامہ ہند، عہدِ موجودہ میں تاریخ کے ایک ممتاز اسکالر، جناب محمد اسلم کی نگارش ہے۔ پروفیسر محمد اسلم کی تاریخی آثار اور جغرافیائی اماکن سے گہری دلچسپی کا اظہار، اس سفرنامے کی ایک ایک سطر سے ہوتا ہے لیکن اس کے لیے جو پیرایۂ اظہار انہوں نے اختیار کیا ہے، وہ بڑا شخصی اور ادبی ہے جس نے اس سفرنامے کو قدیم اور جدید کا ایک خوشگوار سنگم بنا دیا ہے۔

آج، کہ ذرائع آمد و رفت بڑے برق رفتار، اور ذرائع ابلاغ کے بہت حساس اور قوی ہونے کے باعث، دنیا نہ ڈھکی چھپی رہی ہے، نہ کچھ ایسی بیکراں رہ گئی ہے، سفر سے ایک گوناں تحیر اور تجسس پھر بھی وابستہ رہتا ہے۔ خود مسافر کچھ نہ بتانا چاہے تو بھی، متعلقین اور اس کے عزیزوں کے استفسار، اسے یہ بتانے پر آمادہ کر ہی لیتے ہیں کہ اس نے کیا دیکھا، کیسی گزری، کیا کھویا، کیا پایا۔۔۔ پھر معاملہ ایسے شخص کا ہو جو پوچھے جانے کے تکلف انتظار میں پڑے بغیر بھی بڑی فراخدلی سے بہت کچھ بتانے پر کمربستہ اور آمادہ رہتا ہو، جیسا کہ پروفیسر محمد اسلم ہیں، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے سفرنامے کی کیفیت کیا ہو گی۔۔۔ یہ معلومات آفریں بھی ہے اور بڑا دستاویزی بھی۔۔۔ خود سوال اٹھانے اور ان کے شافی جواب فراہم کرنے کی جیسی غیر معمولی استعداد اور عادت سے پروفیسر محمد اسلم متصف، اور اپنے ہم عصروں میں معروف ہیں، اس کا بڑا اچھا اور موثر اظہار، ان کے زیرِ نظر سفرنامہ ہند میں ہوا ہے۔

پھیلاؤ کے اعتبار سے کسی سفرنامے کا دامن انتہائی وسیع ہو سکتا ہے، جتنا بجائے خود یہ

کائنات، لیکن اس ہمہ ہمی اور چمک و تازگی سے بھری پری کائنات کے "کل" میں سے، کس "جزو" کو سیاح یا مسافر اپنا مرکز نظر بناتا ہے؟ اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ مرکز نظر اور زاویہ نظر والی بات ہی کسی سفرنامے کو ایک خاص امتیاز، مزاج، رنگ اور رخ عطا کرتی، اور سفرنامے کو ایک مخصوص مزاج اور نوع کے پڑھنے والوں کے لیے قابل قبول اور باعث کشش بناتی ہے۔ ہر مسافر، اپنی پسند کے حوالے سے مقامات سفر میں رکھتا ہے اور اپنی دل چسپی کے میدان کے مطابق ترجیحات سیاحت قائم کرتا ہے:

"میں تین روز بمبئی میں رہا۔ بمبئی کے فلمی نگار خانوں سے مجھے کوئی دل چسپی نہ تھی، اس لیے میں وہاں نہ گیا۔۔۔۔۔۔"

○

"بمبئی میں ایک روز بعد دوپہر میں مالابار ہل دیکھنے گیا۔ اس پہاڑی پر قائد اعظم محمد علی جناح کا بنگلہ ہے۔ اسے دیکھنے کی خواہش ہی مجھے مالابار ہل پر لے گئی۔"

○

"میں بمبئی میں اسمٰعیل یوسف کالج دیکھنا چاہتا تھا۔"

○

"مجھے برہان پور میں اور تاریخی عمارتوں کے علاوہ حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ خواجہ محمد ہاشم کشمی کا مزار دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔"

○

"احمد آباد میں میری سب سے زیادہ دل چسپی ایک مخطوطے میں تھی۔"

○

"میں لکھنؤ میں اردو کے نامور شعراء کی قبروں کے بارے میں صدر شعبہ اردو سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا، لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔"

○

"مجھے دہلی میں مولوی محرم علی چشتی لاہوری کی قبر کی تلاش تھی۔"

○

"بھڑوچ ایک تاریخی شہر ہے، یہی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی تھی۔"

○

"سورت میں میری دل چسپی کا سامان جامعہ سیفیہ تھی۔"

پروفیسر محمد اسلم کے ان بکھرے ہوئے بیانات سے ان کے اس سفرنامہ ہند کا مزاج اور اس کے حدود متعین کرنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ہر سفرنامہ، کسی نہ کسی درجے میں "مسافرنامہ" بھی ہوتا ہے۔ پروفیسر محمد اسلم کا یہ سفرنامہ، مقامات سفر ہی سے متعارف نہیں کراتا، خود صاحب سفر کی افتاد طبع ان کے معتقدات، ان کے مطمح نظر اور اسلوب حیات ان کی علم افروزی، ماضی کے آثار اور اکابر سے ان کے غیر معمولی شغف اور تاریخی مقامات اور شخصیات سے ان کے گہرے وقوف اور تعلق خاطر پر تفصیلی روشنی ڈالتا ہے۔

یہ سفرنامہ، مقامات یا اشخاص کو اپنے پڑھنے والوں کے لیے دریافت اور متعارف کرانے اور سفر کردہ علاقوں کی سیاسی اور سماجی تاریخ کو روشن اور منور کرنے کی قابل قدر خدمت انجام دیتا ہے۔ تاریخی اکابر اور اصاغر اور صاحبان علم و طریقت کے آثار و قبور کی تعیین اور مزارات کی الواح سے بنیادی معلومات کا احتیاط، پروفیسر محمد اسلم کا اختصاص ہے۔ یہ سفرنامہ اس نوعیت کے اندراجات کے اعتبار سے بڑی دستاویزیت اور افادیت رکھتا ہے۔

یہ سفرنامہ ایک سطح پر مقامات سفر کے بارے میں ضروری جغرافیائی معلومات اور اطلاعات کو جمع اور فراہم کرنے کی کوشش کے اعتبار سے بھی قابل قدر ٹھہرتا ہے۔ ان مقامات اور دور افتادہ بستیوں تک پہنچنے کے لیے پروفیسر محمد اسلم نے کیا ذرائع سفر اختیار کیے، انہوں نے بالالتزام اس کا اندراج کیا ہے۔ اس طرح اس سفرنامے میں، ان مقامات اور مسافات تک پہنچنے کے دوسرے آرزو مندوں اور علم کے جویا، مستقبل کے سیاحوں اور زائروں کو راہ دکھانے اور راستے کی صعوبتوں سے، بچانے یا کم کرنے کے بڑے آثار اور اشارے موجود ہیں اور محفوظ ہو گئے ہیں۔

سفر کے بارے میں میر انیس نے ایک چلتی ہوئی بات کہی ہے کہ:

"ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں"

بقول شخصے رنج کھینچنے ہی سے سفر، تجربہ بنتا ہے اور صحیح معنوں میں سفرنامے کا مرتبہ پاتا ہے۔ پروفیسر محمد اسلم کے یہ سفر آسان، بے سمت، سرسری یا وقت کٹی اور

دل لگی کے سفر نہیں تھے۔ ایک شدید گہری علمی پیاس اور لگن ان کے پیچھے دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔

ان اسفار کے دوران بہت سے مشکل مقامات آئے اور انہیں بڑی کٹھنیں اٹھانا پڑیں اور یہ ان کے لیے بڑی آزمائش اور مصائب کا پیغام بھی لائے لیکن ان کے شوق زیارت میں اس سے کمی نہیں آئی:

"ٹرین جھانسی سے چلی، رات گیارہ بجے بھوپال رکی۔ نماز فجر کے وقت اسے ناگپور پہنچنا تھا۔ صبح تین بجے میری آنکھ کھلی۔ دیکھا تو میرا سامان غائب تھا میرے ہوش گم ہو گئے۔ سامان کے ساتھ مختلف لائبریریوں میں لیے گئے نوٹس دہلی سے خریدی ہوئی کتابیں، کپڑے اور سب سے بڑھ کر میرا پاسپورٹ بھی چلا گیا۔ میری جیب میں اس وقت پندرہ صد روپے تھے۔"

○

"دل میں کہا جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب خدا جانے کب ناگپور آنا ہو، اس لیے لگے ہاتھوں بابا تاج الدین ناگپوری کا مزار دیکھ آؤں۔"

○

"میں نے دل میں پھر وہی سوچا کہ اب جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا، اس لیے راستے میں بھوپال دیکھتا جاؤں۔"

○

"چلتے چلتے میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے اور اب پھٹ کر زخم بن گئے تھے۔ یونیورسٹی کی ڈسپنسری میں پاؤں پر پٹی کروائی اور یونیورسٹی لائبریری دیکھنے گیا۔"

○

"قیصر باغ کے پل پر ایک موٹر سائیکل میرے رکشے سے ٹکرا گئی، رکشا الٹ گیا، اور میرا دوسرا پاؤں بھی زخمی ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا چشمہ بچ گیا اور زیادہ چوٹ نہ آئی۔"

ہند کے مختلف مقامات "ساحل گجرات اور دکن، اجمیر، احمد آباد، اودے پور، چتوڑ،

کاندھلہ اور اس کے مضافات، دہلی، کلکتہ، گیا، سہسرام، دیوبند، سہارنپور، انبیٹھہ، گنگوہ، نانوتہ، امروہہ، مراد آباد، رامپور، عظیم آباد پٹنہ، ناگپور، بھوپال، لکھنؤ، بنارس، رودولی، اعظم گڑھ، سرہند شریف اور جونپور وغیرہ کے ان سفروں میں پروفیسر محمد اسلم کو بڑے رنج کھینچنے پڑے لیکن ان کی ہمت نے کہیں جواب دیا، اور نہ شوق سفر کہیں ماند پڑا۔ بڑے کام اور بڑے مقاصد، جنون کے بغیر انجام نہیں پاتے۔ پروفیسر محمد اسلم کے اس سفرنامے کے پس پشت، ان کی بلندی نگاہ اور جان کی پرسوزی قدم بہ قدم ہمیں ان کی رفیق اور دمساز دکھائی دیتی ہے۔

یہ سفرنامہ، "مقامات سفر" سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ "کیفیات سفر" کو بھی پڑھنے والوں کے دلوں تک پہنچاتا ہے۔ اور یوں، یہ سفرنامہ "مخزن معلومات" سے ابھر اور اٹھ کر مدار ادب میں داخل اور شامل ہو جاتا ہے۔ یہ اگرچہ بڑی علمی سچ دھج رکھتا ہے۔ لیکن اپنے رواں دواں پیرایہ اظہار کے حوالے سے اپنی ایک الگ پہچان کا حامل ہے۔ اور عام پڑھنے والوں کے لیے بھی اپنے اندر کشش اور کشف کا بڑا ساز و سامان رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں اس سفرنامے کی خاطر خواہ پذیرائی ہو گی۔ یہ مقبول ہو گا اور معتبر ٹھہرے گا۔

۴۔ مارچ ۱۹۹۵ء

پروفیسر سید معین الرحمن
صدر شعبہ اردو
گورنمنٹ کالج، لاہور

ساحلِ گجرات اور دکن

دو سال بعد مجھے دوبارہ اجمیر اور احمد آباد جانے کا موقع ملا۔ اس بار میں احمد آباد سے بڑودہ چلا گیا۔ ان دونوں شہروں کے درمیان ۱۰۰ کلو میٹر کا فاصلہ ہے اور تیز رفتار ریل دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں وہاں پہنچا دیتی ہے۔

بڑودہ آزادی سے قبل مہاراجہ گائیکواڑ کی ریاست تھی۔ یہاں کی یونیورسٹی کا علمی معیار بہت اُونچا تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے شہر کی جانب جاتے ہوئے راستے میں یونیورسٹی پڑتی ہے۔ یونیورسٹی کی عمارت کے گنبد بڑے بھلے دکھائی دیتے ہیں۔

مہاراجہ گائیکواڑ کو موسیقی کے ساتھ بڑا شغف تھا۔ خانصاحب فیاض خاں (م ۱۹۵۰ء) اُن کے درباری گویّے تھے۔ مہاراجہ نے از رہِ قدردانی شہر کی ایک سڑک ان کے نام منسوب کی ہے۔ شہر کے درمیان میں ایک بڑا وسیع پانی کا تالاب ہے۔ شاید اسی سے شہر کو پانی فراہم کرتے ہیں۔ تالاب کے قریب ہی مسلمانوں کے ریستوران اور دکانیں ہیں۔

بڑودہ میں مجھے ایک بات بہت پسند آئی اور اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہو گی۔ سڑکیں تعمیر کرتے وقت اگر کہیں کوئی قبر درمیان میں آگئی ہے تو اس کے گرد گول چکر (Round About) بنا کر ٹریفک اِدھر اُدھر سے گھما دی ہے۔ لیکن مرہٹہ حکمران نے قبر کا نشان نہیں مٹایا۔

میں نے بڑودہ میں ایک رات قیام کیا اور اگلے روز بھڑوچ روانہ ہو گیا۔ ان شہروں کے درمیان ۷۰ کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ بھڑوچ بڑا قدیم اور گندہ شہر ہے۔ بازاروں میں تعفن پھیل رہا تھا۔ ہندوؤں نے اپنے گھروں میں بیت الخلاء اس انداز سے تعمیر کرائے ہیں کہ بھنگی کو گھر کے اندر داخل نہ ہونا پڑے اور باہر ہی سے لوہے کا ڈھکنا اٹھا کر صفائی کر دے۔ اسی وجہ سے ہر طرف بُو پھیل رہی تھی۔

بھڑوچ ایک تاریخی شہر ہے۔ یہی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی تھی۔ حضرت عمرؓ کے

عہدِ خلافت میں بحرین سے ایک بحری مہم یہاں آئی تھی۔ ثانیاً یہ کہ بھروچ حضرت صبغتہ اللہ بروچی کا وطنِ مالوف تھا جنھوں نے مکتوباتِ امامِ ربانیؒ کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ عربی کتابوں میں بھروچ کو بروص لکھتے ہیں۔

شہر کے ایک جانب ایک اُونچا ٹیلہ تھا۔ میں نے اس پر چڑھ کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ یہ شہر دریائے نربدا کے کنارے آباد ہے۔ شہر سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر بحیرہ عرب نظر آرہا تھا جس میں یہ دریا گرتا ہے۔ عرب فاتحین دریا کے راستے ہی شہر تک پہنچے ہوں گے۔ ایسا ہی مشاہدہ راقم نے تھانہ میں کیا جہاں مسلمانوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں حملہ کیا تھا۔ تھانہ بھی دریا کے کنارے آباد ہے اور سمندر سے دریا کے راستے ہی وہاں تک جا سکتے ہیں۔

میں نے ایک امام مسجد سے کسی ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا جو بھروچ کے بارے میں معلومات رکھتا ہو۔ اس نے کہا کہ اسی ٹیلے پر ایک قاضی صاحب رہتے ہیں، اُن کے پاس بہت معلومات ہیں۔ میں قاضی صاحب کے ہاں پہنچا لیکن اس وقت وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکنے کا بڑا افسوس رہا۔ میں نے امام صاحب سے حضرت صبغتہ اللہ بروچی کے مزار کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ تو مکّہ مکرمہ میں فوت ہوئے تھے۔ یہ بات اس وقت میرے ذہن میں محفوظ نہ تھی۔

میں تانگے میں سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ ایک ہندو مسافر نے بتایا کہ اُن کے ہاں یہ مثل مشہور ہے کہ جس کسی کو بددُعا دینی ہو، اسے کہتے ہیں کہ پرماتما تجھے اگلے جنم میں بھروچ میں بھینسے کی شکل میں پیدا کرے۔ وہاں بار برداری کا بیشتر کام بھینسوں سے لیا جاتا ہے اور اُن کی خوب پٹائی ہوتی ہے۔

بھروچ سے مجھے سُورت جانے والی ٹرین مل گئی۔ ان دونوں شہروں کے درمیان ۵۹ کلومیٹر کی مسافت ہے۔ میں جلد ہی سورت پہنچ گیا اور ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ سُورت بڑا بارونق شہر ہے۔ بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ مغلوں کے عہد میں یہاں بڑی بندرگاہ تھی۔ دریائے تاپتی اس کے پاس سے گزرتا ہے۔ اس زمانے میں حاجی اسی بندرگاہ سے جہازوں میں سوار ہوا کرتے تھے۔ شاہجہان نے یہ شہر اپنی بھتیجی بیٹی

جہان آرا بیگم کو بطورِ جاگیر عطا کیا تھا۔ شاہجہان کے بیٹے مُراد نے اسی شہر میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے اپنے نام کے سکّے ڈھالے تھے۔ مغلوں کے عہد میں فتنوں نے یہاں تجارتی کوٹھی قائم کی تھی اور اُن کا یہاں بڑا اثر تھا۔

سُورت میں میری دلچسپی کا سامان جامعہ سیفیہ تھی۔ یہ داؤدی بوہروں کا دینی مدرسہ ہے جہاں مُلّا تیار کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں مُلّا کلمہ تحقیر سمجھا جاتا ہے لیکن ان کے ہاں یہ بہت بڑا اعزاز مانا جاتا ہے۔ اس زمانے میں طاہر سیف الدین بقیدِ حیات تھے جو بوہرہ فرقہ کے داعی مطلق تھے۔ آج کل ان کے فرزند برہان الدین اس منصبِ جلیلہ پر فائز ہیں۔ میرے جامعہ سیفیہ میں قیام کے دوران نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ مدرسے کے تمام طلبہ نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کی۔ میں نے یہ منظر بڑے غور کے ساتھ دیکھا۔ وہ جمعرات کی شام تھی، نماز کے بعد طلبہ ٹولیوں کی شکل میں جامعہ سے باہر نکلنے لگے۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے فرقے کے داعیوں کے مزارات پر جا رہے ہیں۔ میں بھی ایک ٹولی میں شامل ہو گیا۔ داعیوں کے مزارات زیادہ دُور نہیں تھے۔ ایک وسیع احاطے میں کئی گنبد تھے اور ہر گنبد میں کئی کئی داعی دفن تھے۔ طلبہ اور دوسرے زائرین ان کی قبروں کو چوم کر آگے بڑھتے جاتے تھے۔

داؤدی بوہرے دراصل اسماعیلیوں ہی کی ایک شاخ ہیں۔ ہوا یوں کہ امام جعفر صادق کا بڑا بیٹا اسمٰعیل ان کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا، اس لئے امام صاحب کی وفات کے بعد ان کا دوسرا بیٹا موسیٰ کاظم منصبِ امامت پر فائز ہوا۔ اس موقع پر امام جعفر صادق کے پیروکاروں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ایک گروہ کا یہ کہنا تھا کہ امام مامور من اللہ ہوتا ہے، لوگ اسے امام نہیں بناتے۔ اس لئے اسمٰعیل کو امام ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہ زندہ نہیں رہے تو پھر ان کا بیٹا امام ہو گا۔ جنھوں نے امام موسیٰ کاظم کی امامت تسلیم کر لی وہ امامت کو بارھویں امام مہدی تک لے آئے۔ یہ لوگ بارہ اماموں کی نسبت سے اثنا عشری کہلائے۔ جنھوں نے اسمٰعیل کو امام مانا وہ اسمٰعیلی کہلانے لگے۔ یہ سلسلہ چھبیسویں امام طیّب تک ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔ امام طیّب کی وفات پر ان کے پیروکاروں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ وہ آخری امام تھے اب کوئی امام نہیں آئے گا لیکن داعی آیا کریں گے جو لوگوں کو نیکی کی دعوت دیتے رہیں گے۔

دوسرے گروہ کا یہ کہنا تھا کہ امام کے بغیر دنیا قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لئے تا قیامِ قیامت امام آتے رہیں گے یہی گروہ اسمٰعیلی ہے جو عرفِ عام میں آغا خانی کہلاتے ہیں۔ ان کا موجودہ امام آغا خان پرنس کریم ہے۔ دوسرا گروہ جو امامت ختم کرکے داعیوں کی آمد کا قائل ہو گیا وہ بوہرے کہلائے۔ کچھ عرصے بعد ان میں بھی سلیمان اور داؤد میں سے کسی ایک کے داعی ہونے پر اختلاف پیدا ہو گیا۔ سلیمان کے معتقدین سلیمانی بوہرے مشہور ہو گئے اور داؤد کے حامی داؤدی بوہرے کہلانے لگے۔ سُورت میں اسی آخر الذکر گروہ کا دینی مرکز ہے۔ بنیادی طور پر وہ شیعہ ہیں لیکن ماتم نہیں کرتے۔ سلیمانی بوہرے ہمارے ہاں بہت کم تعداد میں ہیں اور حقانی چوک کراچی میں ان کی مسجد اور جماعت خانہ بھی ہے لیکن داؤدی بوہرے کراچی میں بڑی تعداد میں آباد ہیں۔

میں نے رات سُورت میں گزاری اور اگلے روز بمبئی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ تیس کلو میٹر کے فاصلے پر نوساری کا ریلوے اسٹیشن پڑا۔ یہ پارسیوں کا مقدس مقام ہے۔ جب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایران فتح ہوا تو اس وقت کچھ پارسی ایران سے بھاگ کر نوساری پہنچ گئے۔ وہ اپنے ساتھ وہ مقدس آگ بھی لے آئے جو صدہا برس سے ان کے سب سے بڑے آتشکدے میں روشن تھی۔ اس کے بعد پاک و ہند میں جہاں جہاں آتشکدے بنے، وہاں نوساری سے ہی مقدس آگ بھیجی گئی۔

نوساری سے بمبئی ۲۳۳ کلو میٹر ہے۔ راستے میں کیلوں کے کھیت اور پانوں کی فصل نظر آ رہی تھی۔ کھیتوں میں لنگور بھی دوڑتے بھاگتے نظر آئے۔ یہ پُورا علاقہ زرخیز ہے۔ میں پہلی بار بمبئی آیا تھا، اس لئے میں وہاں بالکل اجنبی تھا۔ ٹرین بمبئی سنٹرل اسٹیشن پر جا کر رُکی۔ میں اپنا سامان اٹھا کر اسٹیشن سے باہر نکلا تو تھوڑا سا فاصلہ طے کرکے گرانٹ روڈ پر پہنچ گیا۔ وہاں ایک عمارت پر نیشنل ہوٹل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ مجھے وہاں رہائش کے لئے ایک کمرہ مل گیا۔

گرانٹ روڈ اور فاک لینڈ روڈ کے چوک میں مسلمانوں کے بڑے اچھے ریستوران ہیں جہاں سے ہمارے مطلب کا کھانا مل جاتا ہے، یہ ریستوران بجنور کے مسلمانوں کے ہیں اس لئے کھانے کا ذائقہ یوپی کے کھانوں جیسا ہوتا ہے۔

فاک لینڈ روڈ بمبئی کا چکلہ ہے۔ باقی ملک میں یہ کاروبار قانوناً بند کر دیا گیا ہے

لیکن بمبئی کو بندرگاہ ہونے اور عربوں کی آمد و رفت کی وجہ سے اس قانون سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ طوائفوں کے مکان کیا ہیں حوالاتیں اور عقوبت خانے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ سلاخ دار دروازوں کے پیچھے جانگیے پہنے اور رانیں ننگی کرکے کھڑی رہتی ہیں اور آنے جانے والوں کو اشاروں سے اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ جو ذرا زیادہ ہی دیدہ دلیر ہیں وہ باہر نکل کر راہگیروں کو پکڑ لیتی ہیں۔

فاک لینڈ روڈ سے گزریں تو نل بازار اور اس سے ملحقہ مینارے والی مسجد آ جاتے ہیں۔ نل بازار میں سبزی اور فروٹ کی دکانیں ہیں اور اس بازار سے ملحقہ مسجد کا شمار بمبئی کی بڑی مساجد میں ہوتا ہے۔ آزادی سے قبل اس مسجد کے خطیب پاکستان کے حق میں وعظ کہا کرتے تھے۔

نل بازار مارکیٹ سے قریب ہی عزۃُ المساجد ہے۔ یہ بمبئی میں داؤدی بوہروں کی سب سے بڑی عبادت گاہ ہے۔ اُن کے داعیٔ مطلق جب بمبئی میں ہوتے ہیں تو ان کا قیام یہیں ہوتا ہے۔ اس زمانے میں سیّدنا طاہر سیف الدین اس منصبِ جلیلہ پر فائز تھے اور موصوف علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چانسلر تھے۔ اب ان کی جگہ ان کے فرزند ارجمند بُرہان الدین بوہروں کے داعیٔ مطلق ہیں۔ طاہر سیف الدین کو ان کی وفات (۱۹۶۵ء) کے بعد بمبئی کے قریب ماناترن میں دفن کیا گیا ہے۔ میں ان کی وفات کے بعد وہاں نہیں گیا لیکن سنا ہے کہ ان کے مقبرے پر پورا قرآنِ پاک منقوش ہے۔ یہ زیادہ تعجب کی بات نہیں، اگر بوہرے چاہتے تو ان کا مقبرہ سونے کی اینٹوں سے تعمیر کر دیتے۔

میں نے بھونڈی بازار دیکھا جہاں کتابوں کی دکانیں اور خاص کر عربی اور اسلامی علوم کی کتابوں کو، شائع کرنے والے ادارے موجود ہیں۔ مکتبہ قیمّہ بمبئی، جس کے مالکان اپنے نام کے ساتھ "شرف الدین الکتبی و اولادہٗ" لکھتے ہیں، یہیں واقع ہے۔ اسی ادارے سے علامہ شمس العلماء عمر بن محمد داؤد پوتہ (م ۱۹۵۹ء) نے تاریخِ سندھ المعروف بہ تاریخِ معصومی ۱۸۳۸ء میں طبع کروائی تھی۔ یہ عربی کتابوں کی طباعت کا ایک بڑا ادارہ ہے۔

محمد علی روڈ پر فینسی بلڈنگ ہے جو پورے شہر میں مشہور ہے۔ یہیں اصلاحی

دواخانہ ہے جس کے مالک حکیم عمر مختار ایک کامیاب طبیب اور صاحبِ ذوق عالم ہیں۔ موصوف کئی طبی کتابوں کے مصنف ہیں۔ میں اس وقت ان سے واقف نہ تھا لیکن دیوبند کے جشنِ صد سالہ پر ان سے ملاقات ہوئی تو ان کے جوہر کھلے۔

شام کے وقت میں جوہو دیکھنے گیا۔ یہ کلفٹن کی طرح سمندر کے کنارے ایک با رونق جگہ ہے۔ شام کے وقت یہاں میلے کا سماں ہوتا ہے۔ اپالو بھی سمندر کے کنارے ایک اچھی تفریح گاہ ہے۔ جوہو سے آگے چوپاٹی ہے۔ یہاں ساحل سمندر کے کنارے ایک ہی ڈیزائن اور رنگ کے درجنوں مکان ایک ہی لائن میں بنے ہوئے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے چوپاٹی اور اپالو کو دیکھ کر بڑا گہرا اثر لیا تھا۔ ان کا یہ شعر ان کے تاثرات کی صحیح غمازی کرتا ہے:

" بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را

ان کا بمبئی کے بارے میں یہ شعر بھی زبان زدِ خلائق ہے:

نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را
طرازِ مسند جمشید تاجِ خسرو را

اگلے روز میں نے گیٹ وے آف انڈیا (بابُ الہند) دیکھا۔ یہ سمندر کے کنارے ایک خوش وضع ڈیوڑھی کی طرز کی بلڈنگ ہے جس کے فنِ تعمیر میں مسلمانوں کے ذوقِ جمال کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ جب ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم اور ملکہ میری دہلی دربار میں شرکت کے لئے ہندوستان آئے تو ان کا جہاز یہیں لنگر انداز ہوا تھا اور وہ اسی ڈیوڑھی سے گزرے تھے۔

اسی عمارت کے جوار میں اسمٰعیلیوں اور بوہروں کے تجارتی مراکز ہیں۔ میں ایک مرکز دیکھنے گیا جس کی کئی منزلیں تھیں اور ہر منزل میں مختلف اشیاء فروخت کے لئے رکھی گئی تھیں۔ ایک ہی مرکز سے تمام ضروریاتِ زندگی خریدی جا سکتی ہیں۔ اختلافِ مسلک کے باوجود یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ بمبئی میں مسلمانوں کا کاروبار بڑا اچھا ہے۔

گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے اب سیواجی مرہٹہ کا بت نصب کیا گیا ہے۔ وہ ایک گھوڑے پر سوار دکھایا گیا ہے جو سرپٹ دوڑنے کے انداز میں اگلے دونوں پاؤں

اٹھائے ہوئے ہے۔ سیواجی نے ہاتھ میں ایک تلوار پکڑی ہوئی ہے جسے وہ ہوا میں لہرا کر "بزعمِ خویش" اورنگ زیب عالمگیر کو للکار رہا ہے۔ جس چبوترے پر بت نصب ہے اس پر "چھترپتی سیواجی" لکھا ہوا ہے۔

اسی نواح میں ریلوے کا مشہور اسٹیشن ہے، جو وکٹوریا کے نام سے موسوم ہے۔ آزادی سے قبل اسے وکٹوریا ٹرمینس کہتے تھے۔ پلیٹ فارم کے ایک جانب ٹرین آکر رکتی تھی اور دوسری جانب جہاز کھڑا ہوتا تھا جس کے ذریعے انگریز افسران اور ڈاک لندن جایا کرتی تھی۔ لوگ عرفِ عام میں اس اسٹیشن کو بوہری بندر کہتے ہیں۔ یہ گوتھک اسٹائل کی عمارت ہے۔

بمبئی کا یہ علاقہ فورٹ کہلاتا ہے۔ یہیں بڑی بڑی کمپنیوں کے دفاتر ہیں۔ اسی علاقے میں پرنس آف ویلز میوزیم آف ویسٹرن انڈیا ہے۔ اس میں محفوظ نوادرات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ سلطان علاء الدین خلجی مرحوم (م ۱۳۱۶ء) کی تلوار ایک شو کیس میں رکھی ہوئی ہے۔ ایک پوری گیلری میں ہندوستان میں پائے جانے والے جانور حنوط کرکے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک گیلری میں مغلوں کے دَور کی مصوّری کے نادر نمونے اور ہندوؤں کے کانگڑہ سکول آف پینٹنگ کے شاہکار رکھے ہوئے ہیں۔ سب سے اہم وہ گیلری ہے جس میں ہندوستان کے مغربی ساحل سے ملنے والے قبروں کے کتبات ہیں، جس سے اس علاقے میں مسلمانوں کی آمد اور رہائش کی تاریخ متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ کاش ہمارے بھی کسی عجائب گھر میں ایسی گیلری ہوتی۔ ان میں سے کئی کتبے خطِ کوفی میں کندہ تھے جو ان کی قدامت پر شاہد تھے۔

میں نے یہ عجائب گھر جی بھر کر دیکھا۔ وہاں ایک سٹال پر نوادرات کے عکس فروخت ہو رہے تھے، میں نے یادگار کے طور پر مغل عہد کی مصوّری کے چند نمونے خریدے۔ دو تصویریں کرشن چندر جی کی بھی خریدیں جو کانگڑہ کے دبستانِ مصوّری کا شاہکار تھیں۔ ان میں کرشن چندر جی کو رادھا اور گوپیوں کے جھرمٹ میں بنسری بجاتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔

شام کے وقت میں ماہم گیا۔ بمبئی والے اسے احتراماً ماہم شریف کہتے ہیں اور اس کا تلفظ ماہم شریف کرتے ہیں۔ یہاں سمندر کے کنارے حضرت علی مہائمی رحمتہ اللہ

علیہ (م ۱۴۳۱ء) کا مزار ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ موصوف بمبئی پولیس کے سرپرست ولی (PATRON SAINT) ہیں۔ ان کے مزار کے برآمدے اور وہاں موجود بعض عمارتیں بمبئی پولیس کی تعمیر کردہ ہیں۔ اب بھی جمعرات کو شام کے وقت بمبئی پولیس کا ایک دستہ وہاں سلامی دینے کی غرض سے حاضر ہوتا ہے۔

موصوف نے "تبصیرُ الرحمٰن" کے عنوان سے عربی زبان میں قرآنِ حکیم کی تفسیر لکھی ہے جس میں ربطِ آیات کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ نے اپنے ایک مکتوب میں اس تفسیر کا ذکر اچھے انداز میں نہیں کیا کیونکہ ان کے نزدیک حضرت علی مہائمی حکماء اور انبیاء کے علوم میں زیادہ فرق روا نہیں رکھتے تھے اور حکماء کو انبیاء کا عدیل سمجھتے تھے۔ حضرت علی مہائمیؒ پر ابنِ عربی کا بڑا اثر تھا۔ انہوں نے فصوص الحکم کی شرح بھی لکھی ہے۔ حضرت علی مہائمیؒ کے بارے میں عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی نے مخدوم علی مہائمیؒ کے عنوان سے اور فخرالدین مہائمی نے افتاب کو کن کے نام سے کتابیں لکھی ہیں جو راقم کے ذاتی کتابخانے میں موجود ہیں۔ مجھے دو بار بمبئی جانے کا اتفاق ہوا، دونوں بار میں ماہم شریف گیا۔ یہ ویسے بھی بڑا سرسبز علاقہ ہے اور وہاں ناریل کے پیڑوں کے بہت جھنڈ ہیں۔

میں بمبئی میں اسمٰعیل یوسف کالج دیکھنا چاہتا تھا، لیکن نہ دیکھ سکا۔ اس کالج سے علامہ نجیب اشرف ندوی (م ۱۹۶۸ء) اور علامہ عمر بن محمد داؤد پوتہ (م ۱۹۵۹ء) جیسے فضلاء منسلک رہے ہیں۔ بمبئی کے فلمی نگار خانوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے میں وہاں نہ گیا۔

ایک روز بعد دوپہر میں مالا بار ہل دیکھنے گیا۔ یہ ایک پہاڑی ہے جو سمندر میں دور تک چلی گئی ہے۔ اس کے تین اطراف سمندر ہے۔ بمبئی کے اہلِ ثروت اسی جگہ رہتے ہیں۔ پہاڑی کی چوٹی پر ایک باغ ہے جس میں پودوں کو تراش کر ہاتھی، گھوڑے اور مور بنائے گئے ہیں۔ یہ ایک پُرفضا مقام ہے۔

اسی پہاڑی پر قائداعظم محمد علی جناح کا بنگلہ ہے۔ اسے دیکھنے کی خواہش ہی مجھے مالا بار ہل پر لے گئی تھی۔ اس کی خوشنمائی اور لان دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد لالہ سری پرکاش پاکستان میں ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر مقرر ہوئے

تھے۔ وہ دو سال کراچی میں رہے۔ بھارت جا کر انہوں نے "پاکستان میں میرے دو سال" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ اصل کتاب انگریزی میں تھی جامعہ ملیہ دہلی سے اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا جو میرے ذاتی کتابخانے میں موجود تھا۔ ہمارے ایک شہرۂ آفاق مؤرخ یہ کتاب مجھ سے مستعار لے گئے اور چند روز بعد انہوں نے اپنا کتابخانہ قائداعظم یونیورسٹی لائبریری اسلام آباد کے پاس فروخت کر دیا۔ میری کتاب کے بھی انہوں نے دام وصول کر لئے۔ میں نے کئی بار دہلی سے یہ کتاب حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن دوبارہ مجھے نہیں ملی۔ میں جب اسلام آباد جاتا ہوں تو اس کتاب کو لائبریری سے نکلوا کر ضرور دیکھتا ہوں۔ اس کتاب میں لالہ سری پرکاش لکھتے ہیں کہ ایک بار قائداعظم نے اُن سے کہا کہ وہ پنڈت جواہر لعل نہرو سے کہیں کہ ان کی رہائش گاہ کو متروکہ ملک قرار نہ دیا جائے۔ وہ جب پاکستان کی سیاست سے ریٹائر ہوں گے، تو بمبئی میں اپنے مکان میں سکونت اختیار کریں گے۔ نیز جب تک موصوف پاکستان میں ہیں اس بنگلے کا کرایہ، جو کسی طرح بھی چار ہزار روپے ماہانہ سے کم نہیں ہونا چاہیے، انہیں ملنا چاہیے۔ اگر یہ سری پرکاش کی "اختراعِ بندہ" ہے، تو اس کی کسی سرکاری ادارے کی طرف سے تردید ہونا ضروری تھی۔

میں تین روز بمبئی میں رہا۔ وہاں وکٹوریا ٹرمینس اسٹیشن سے دوپہر ایک بجے ایک تیز رفتار گاڑی روانہ ہوتی ہے۔ میں منماڑ کا ٹکٹ خرید کر اس میں سوار ہو گیا۔ یہ ریلوے کا مشہور جنکشن ہے جو بمبئی۔ دہلی ریلوے لائن پر آتا ہے۔

بمبئی سے ۳۳ کلو میٹر کے فاصلے پر "تھانہ" آتا ہے۔ یہ وہی تاریخی مقام ہے جہاں فاروقِ اعظمؓ کے عہدِ خلافت میں بحرین کے حاکم عثمان بن العاص ثقفی کے بھائی الحکم نے بحری جہازوں کے ذریعے حملہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ لڑائی میں ان کے چند ساتھی بھی شہید ہوئے ہوں گے۔ اس لئے یہاں صحابہ اور تابعین کی قبریں لازماً ہوں گی، خواہ اب ان کے نشان مٹ چکے ہوں۔

تھانہ سے ۲۰ کلو میٹر کے بعد کلیان آتا ہے۔ یہاں ملنگ بابا کا مزار ہے جس کا احترام مہاراشٹر کے باشندے بلا تفریق مذہب و ملت کرتے ہیں۔ مولانا جعفر شاہ پھلواروی (م ۱۹۸۲ء) فرمایا کرتے تھے کہ ان کی درگاہ کے احاطے میں لوگ جھوٹ نہیں

بولتے۔ ایک گوالا اُن کی درگاہ کے احاطے میں دُودھ میں پانی ملانے کا اعتراف کرلے گا لیکن درگاہ سے باہر آتے ہی دُودھ کے خالص ہونے کی قسم کھا لے گا۔ میں نے سنا ہے کہ ہمارے ہاں دیہات میں ایسے لوگ بھی ہیں جو قرآن پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی قسم کھا لیتے ہیں لیکن اگر ان سے یہ کہا جائے کہ فلاں بابا کے مزار پر ڈالی ہوئی چادر پکڑ کر قسم کھاؤ تو وہ کسی قیمت پر ایسا نہیں کرتے۔ ملنگ بابا کی تصویریں بمبئی میں عام فروخت ہوتی ہیں۔ سرکاری بسوں، دکانوں، دفتروں اور بلڈنگوں میں ان کی تصویریں نمایاں طور پر لگی ہوئی نظر آتی ہیں۔

بمبئی سے ۱۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر اگت پوری آتا ہے۔ یہ ویسٹرن گھاٹ کا سب سے اُونچا مقام ہے۔ بمبئی سے یہاں تک چڑھائی ہی چڑھائی ہے۔ اُونچا ہونے کی وجہ سے بحیرہ عرب سے جو بادل اٹھتے ہیں، وہ اگت پوری میں برستے ہیں۔ اس لئے وہاں مسلسل بارش ہوتی رہتی ہے۔ میں نے یہ سنا ہوا تھا کہ ایک صاحب وہاں سے پیر کے روز ٹرین میں سوار ہو کر گزرے تو ریلوے پلیٹ فارم پر ایک بورڈ پر چاک کے ساتھ جلی حروف میں بزبان انگریزی لکھا ہوا تھا:

Continous Raining Since Friday Morning

یعنی جمعہ کی صبح سے مسلسل بارش ہو رہی ہے۔ ویسٹرن گھاٹ پر ہونے والی بارش کا پانی تالابوں میں جمع کرکے بجلی پیدا کی جاتی ہے جو بمبئی شہر کو سپلائی کی جاتی ہے اور اسی بجلی سے بمبئی اور پونا کے درمیان ریل چلتی ہے۔ بمبئی کو پانی بھی یہیں سے مہیا کیا جاتا ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں یہ مسلسل بارش والی بات اُستاد محمد شریف قریشی مرحوم (م ۱۹۷۶ء) سے سنی تھی۔ اب اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

اگت پوری سے ۵۱ کلومیٹر کے فاصلے پر ناسک ہے۔ یہ ہندوؤں کا مقدس مقام ہے۔ وہاں ایک تالاب ہے جس میں اشنان کرنا بڑا پن (ثواب) ہے۔ گاندھی جی کی چند ہڈیاں اس تالاب میں بھی ڈالی گئی تھیں۔ مشہور سفاک قاتل بندہ بیراگی بھی کچھ عرصہ یہاں تپسیا کر چکا تھا۔ آزادی سے قبل ڈاک کے ٹکٹ اور کرنسی نوٹ ناسک میں چھپتے

تھے۔ اب بھی چھپتے ہوں گے۔ وہاں حکومت ہند نے ایک بہت بڑا ادارہ قدیم سکوں پر تحقیق کے لئے قائم کیا ہے۔ میرا ان سے بذریعہ خط و کتابت رابطہ قائم ہے۔

ناسک سے ۷۳ کلومیٹر کے فاصلے پر منماڑ ہے، جہاں میں نے ٹرین بدلی تھی۔ بمبئی سے منماڑ کا فاصلہ تو صرف ۲۱۱ کلومیٹر ہے لیکن چڑھائی کی وجہ سے یہ مسافت چھ گھنٹوں میں طے ہوتی ہے۔

منماڑ سے میٹر گیج لائن اورنگ آباد جاتی ہے۔ مجھے اورنگ آباد جانا تھا، اس لئے میں یہیں اتر گیا۔ ٹرین آنے میں تین گھنٹے باقی تھے۔ دن بھر کے سفر نے مجھے یوں بھی تھکا دیا تھا۔ میں رات کا کھانا تناول کرنے ریلوے کے ریستوران میں گیا۔ اتفاق سے ایک مسافر جو ٹرین میں میرے برابر والی سیٹ پر سفر کر چکا تھا، وہاں موجود تھا۔ میں نے ویجیٹیرین کھانے کا آرڈر دیا۔ اس نے بھی کھانا منگوایا۔ ہم آمنے سامنے میز پر بیٹھے تھے۔ اس نے اپنی ایک ہتھیلی پر گلاس سے پانی ڈالا اور اسے اپنے سامنے میز پر اس انداز سے گرایا کہ اس کے اور میرے درمیان پانی کی دیوار حائل ہو گئی۔ اس طرح وہ ایک مسلمان کے مسموم اثرات سے اپنے کھانے کو محفوظ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں دیر تک اس کی ذہنیت کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر یہ اس طرح مسلمانوں کے خلاف نفرتیں نہ رکھتے اور چھوت چھات کے قائل نہ ہوتے تو مسلمانوں میں ضم ہو جاتے۔ ایسی ہی بھونڈی حرکات نے انہیں مسلمانوں سے بلکہ یوں کہیے کہ اسلام کی روشنی سے دور رکھا۔

منماڑ سے اورنگ آباد ۱۳۲ کلومیٹر ہے۔ میٹر گیج پر گاڑیاں یوں بھی بڑی سست رفتار ہوتی ہیں۔ رات کو ساڑھے نو بجے گاڑی آئی۔ میں اس خیال سے نہ سویا کہ کہیں اورنگ آباد سے آگے نہ نکل جاؤں۔ بارے خدا رات کو ساڑھے بارہ بجے میں اورنگ آباد پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن شہر سے کافی فاصلے پر ہے۔ میں نے ایک رکشا والے کو کہا کہ وہ مجھے کسی اچھے سے ہوٹل میں لے جائے۔ وہ مجھے ایک معروف ہوٹل میں لے گیا لیکن وہاں کوئی کمرہ خالی نہ تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک ہوٹل سے واقف ہے وہاں رہائش کے لئے ہمیشہ کمرہ مل جاتا ہے۔ میں کوئی رات کے ڈیڑھ بجے وہاں پہنچا۔ چوکیدار مین گیٹ بند کرکے چارپائی پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ رکشا ڈرائیور نے اسے جگایا۔ میں نے اس سے

کمرہ مانگا تو وہ میرا سامان اٹھا کر دوسری منزل میں لے گیا اور کہنے لگا کہ رجسٹر میں اندراج صبح کر دیجئے گا۔ اب آرام کیجئے۔ میں کمرے میں جا کر بے سدھ ہو کر سو گیا۔ صبح ذرا دیر سے آنکھ کھلی۔ میں نہا دھو کر نیچے اترا۔ مسافر ناشتے کی میزوں پر جمع تھے۔ ہوٹل کے مالک کی بیٹی ایک تھال میں چراغ روشن کر کے لائی۔ اس نے ہر مسافر کے سامنے تھال ایک خاص انداز کے ساتھ گھما کر آرتی لی اور سب کے ماتھوں پر صندل سے تلک لگایا۔ اس کے بعد ناشتہ آیا۔

میں ناشتے سے فارغ ہو کر "بی بی کا مقبرہ" دیکھنے نکلا۔ یہ اورنگ زیب کی ملکہ دلرس بانو المعروف بہ رابعہ دورانی کا مقبرہ ہے۔ جو اس کے فرزند محمد اعظم نے چھ لاکھ روپے کے صرفے سے تاج محل کی طرز پر بنوایا تھا۔ اسے تاج محل کی بھونڈی نقل کہا جا سکتا ہے۔ یہیں سے مغلوں کے فنِ تعمیر کا زوال شروع ہوا تھا۔

کسی زمانے میں اسی مقبرے کی حدود میں انجمن ترقی اُردو ہند کا صدر دفتر تھا۔ جس کے روحِ رواں مولوی عبدالحق بابائے اُردو تھے۔ یہیں انہوں نے نام دیو نامی ایک مالی پر مقالہ لکھا تھا جو اس کے اپنے پیشے سے جنون کی حد تک وابستگی کا مظہر ہے۔

اورنگ آباد ایک بڑا شہر ہے۔ پہلے اس کا نام "کھڑکی" تھا اورنگ زیب کے عہد میں یہ اورنگ آباد کے نام سے موسوم ہوا۔ یہاں ایک قدیم دروازہ ہے۔ جو بھڑکل کے نام سے موسوم ہے۔ بھڑ کے معنی ہیں بڑی اور کل کہتے ہیں، کمان یا محراب کو۔ بی بی کے مقبرے کو جانے کے لئے اسی بھڑکل سے گزرتے ہیں۔

اورنگ آباد کا ایک محلہ جیلی پورہ کہلاتا ہے۔ یہاں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے والدِ بزرگوار رہتے تھے اور مولانا نے اپنی ابتدائی زندگی کے چند سال یہیں گزارے ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو جگہ جگہ پولیس کھڑی تھی۔ میں نے ایک شخص سے پولیس کی موجودگی کی وجہ پوچھی تو اس نے مجھے بتایا کہ چند روز پہلے یہاں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا۔ ہنوز کشیدگی باقی ہے اس لئے پولیس حفاظتی اقدام کے لئے کھڑی ہے۔

اگلے روز میں خلد آباد جانے کے لئے بس اسٹینڈ پر پہنچا تو ایک بس پر CONDUCTED TOUR OF AJENTA کا بورڈ لگا ہوا دیکھا۔ میں نے دل میں کہا کہ خلد آباد تو پھر بھی جا سکتا ہوں اجنتا کا دورہ اس بس کے مسافروں کے ساتھ رہبر کی

راہنمائی میں کر لوں تو مناسب رہے گا۔ چنانچہ میں ٹکٹ لے کر اس بس میں سوار ہو گیا۔ اڑھائی پونے تین گھنٹے کی مسافت طے کر کے ہم اجنتا پہنچے۔ بس ڈرائیور ہمیں ایک ایسے مقام پر لے گیا جہاں سے ہم اجنتا کے غاروں کا دور سے نظارہ کر سکتے تھے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ لاکھوں برس پہلے اس علاقے میں اتنا شدید زلزلہ آیا ہو گا کہ پہاڑ شق ہو گیا ورنہ اتنا تنگ سا درہ نہ بنتا۔

یہ نظارہ کرانے کے بعد بس ڈرائیور کافی چکر لگا کر ہمیں اس پہاڑ کے دامن میں لے گیا۔ دامن میں ایک ندی بہہ رہی تھی اور وہ اتنی پایاب تھی کہ اس میں سے باآسانی گزرا جا سکتا تھا۔ ندی کے کنارے ایک ریسٹورنٹ تھا اور اردگرد کا منظر دیدنی تھا۔

ہمارے دائیں ہاتھ زمین سے تھوڑی سی چڑھائی پر بہت سے غار تھے جو بُدھوں نے نویں صدی سے بارھویں صدی کے درمیان چٹانیں کاٹ کر تیار کئے تھے۔ بُدھوں کے زوال کے بعد یہ مقام بے آباد ہو گیا اور جھاڑیوں نے غاروں کے منہ ڈھانپ لئے۔ گزشتہ صدی کے نصف آخر میں ایک انگریز فوجی افسر ایک زخمی سؤر کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچا۔ وہ جھاڑیوں میں سؤر تلاش کر رہا تھا کہ اسے ایک غار کا مُنہ نظر آیا۔ اس نے یہ سمجھا کہ سؤر اسی میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ اس نے جھاڑیاں ہٹا کر غار کے اندر جھانکا تو اسے مہاتما بُدھ کے مجسّمے نظر آئے۔ اس نے فوراً محکمہ آثارِ قدیمہ کو مطلع کیا تو وہاں ۲۹ غار مل گئے۔

یہ غار پہاڑ کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ ان کے اندر جو مجسمے ہیں وہ بھی چٹانوں کو تراش کر بنائے گئے ہیں کہیں باہر سے یہاں لا کر نہیں رکھے گئے۔ رہبر ہمارے ساتھ تھا، وہ لیکچر دیئے جا رہا تھا۔ اس کے اشارے پر ایک چوکیدار نے سرچ لائٹ مہاتما بُدھ کے چہرے پر ڈالی تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہو۔ جب اس نے چہرے کے دائیں جانب روشنی ڈالی تو مہاتما کو متبسّم پایا۔ بائیں طرف روشنی ڈالنے سے ان کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آنے لگے۔ روشنی گل کرنے کے بعد رہبر نے بتایا کہ اب آپ لوگ اس مجسمے کو دیکھئے، اس میں وہ چیزیں نظر نہیں آئیں گی جو روشنی سے پیدا ہوتی ہیں۔

ایک دیوار پر مہاتما بُدھ کو وعظ کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے سامنے

صدہا مرد اور عورتیں مختلف علاقوں کے لباس میں ملبوس کھڑے اس کے ارشادات سن رہے ہیں۔ ایک شخص کی داڑھی اور مونچھوں کا اسٹائل دوسرے شخص سے نہیں ملتا اور اسی طرح ایک عورت کے بالوں کا اسٹائل دوسری عورت سے نہیں ملتا۔ آج ہمارے ہاں بیوٹی پارلروں پر عورتوں کے بالوں کی جو گت بنائی جاتی ہے، اس کے نمونے اجنتا کے غاروں میں موجود ہیں۔

ایک جگہ مہاتما بدھ کو فضا میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ پھر ان کی ذات سے ہزار کے قریب بدھ نکل کر فضا میں پھیل گئے۔ یہ تعددِ اجسام کے نظریے کی عملی تفسیر تھی۔

ندی کے کنارے سر اکبر حیدری وزیرِ اعظم دکن نے برگد کا ایک پیڑ لگایا تھا۔ پیڑ لگانے کی تقریب میں دکن کے نامور مؤرخ اور شاعر مسعود علی محوی بھی موجود تھے۔ انہوں نے پیڑ لگانے کی منظوم تاریخ کہی تھی، جو پتھر کی ایک سِل پر کندہ کر کے وہاں لگا دی گئی۔

اجنتا بڑی پُر سکون جگہ ہے جو بدھ بھکشوؤں نے اپنی رہائش کے لئے تیار کی تھی۔ وہ یہاں رہ کر ہمہ وقت یادِ خدا میں مصروف رہتے تھے۔ سنا ہے کہ یہ نام اچنتا تھا، یعنی ایسی جگہ جہاں کوئی چنتا (غم و فکر) نہ ہو۔ کثرتِ استعمال سے اچنتا، اجنتا بن گیا۔ ندی کے کنارے چند دکاندار اس نواح میں ملنے والے قیمتی پتھر اصلی شکل میں فروخت کر رہے تھے۔

اجنتا میں تین ساڑھے تین گھنٹے گزار کر ہم شام کو مغرب کے لگ بھگ اورنگ آباد پہنچ گئے۔ رات اسی ہوٹل میں گزاری اور اگلی صبح میں دولت آباد روانہ ہو گیا۔ دونوں جگہوں کے درمیان دس میل کا فاصلہ ہے۔ دولت آباد میں ایک قلعہ ہے اور اس کے درمیان ایک بلند پہاڑی ہے، جس پر قدیم عمارتوں کے نشان باقی ہیں۔ ایک مسجد جو چاند مسجد کے نام سے موسوم ہے، اب تک اپنے خالق کی یاد میں کھڑی ہے۔ اس کا مینارہ دُور دُور سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔

یہی دولت آباد، کسی زمانے میں دیو گیر کہلاتا تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی نے پہلی بار اسے ۱۲۹۵ء میں فتح کیا اور خراج ادا کرنے کی شرط پر سابقہ ہندو حکمران کے پاس

ہی رہنے دیا۔ ایک بار اس نے وعدہ خلافی کی تو ملک کافور نے اس کے خلاف فوج کشی کی اور اسے اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

سلطان محمد بن تغلق نے ۱۳۲۷ء میں اسے اپنا دارالحکومت قرار دیا اور دہلی کے باشندوں کو وہاں جا کر آباد ہونے کا حکم دیا۔ اس نے اپنے شہر کو دکن میں اسلام کا مرکز بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ اس شہر کی ٹکسال سے سلطان نے جو سکّے ڈھالے ان پر "ضرب قبۃ الاسلام" منقوش تھا جو اس کے عزائم کی غمازی کرتا ہے۔ دہلی سے دولت آباد دارالحکومت کی تبدیلی کو بعض کم فہموں نے سلطان محمد بن تغلق کی "حماقت" قرار دیا ہے۔ دراصل سلطان یہ چاہتا تھا کہ شمالی ہند میں تو اسلام کی اشاعت ہو چکی ہے اب دکن کی طرف توجہ دینی چاہیے وہاں مسلم آبادی بہت کم ہے اسی لئے بار بار وہاں بغاوت ہوتی رہتی ہے، اس لئے وہاں مسلم آبادی بڑھائی جائے۔ ثانیاً منگولوں کا دباؤ شمالی ہند پر بڑھ رہا ہے لہٰذا دارالحکومت دہلی کے اداروں کو جنوبی ہند میں منتقل کر دینا چاہیے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب سلطان ایسا سوچ رہا تھا تو اس عہد کے صوفیاء کرام بھی اسی انداز سے سوچ رہے تھے۔ چنانچہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے شیخ منتجب الدین زری زر بخشؒ کو دولت آباد بھیج دیا تھا کہ وہ دکن میں کام کریں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے وصال کے بعد شیخ منتجب الدین زری زر بخشؒ کے بھائی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ حضرت شیخ برہان الدین غریبؒ، سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں سات سو درویشوں کی جماعت کے ساتھ دکن روانہ ہوئے۔ شیخ کا سن اس وقت ستر سال کے لگ بھگ تھا اور وہ اتنے طویل سفر کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے ان کے ساتھیوں نے انہیں پالکی میں بٹھا لیا اور انہیں دکن لے گئے۔ دکن کے مشہور علمی اور روحانی شہر برہانپور کی نسبت انہیں کی طرف ہے۔ دکن کی تاریخ میں پالکی کی آمد سے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا اور ان سات سو درویشوں نے دکن کی فضاء کو اپنے انفاسِ طیبہ سے معطر کر دیا۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ جس ذہن سے اس عہد کا سلطان سوچ رہا تھا اسی ذہن سے اس وقت کا "شیخ" سوچ رہا تھا۔ ان حالات میں سلطان محمد بن تغلق کے منصوبے کو کون احمق اس کی "احمقانہ تجویز" کہہ سکتا ہے۔

دولت آباد میں اب کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں۔ دولت آباد سے خلد آباد جانے

والی بس قریبی پہاڑی پر چڑھتی ہے تو قلعہ کا اندرونی منظر صاف نظر آتا ہے۔ خلد آباد وہاں سے صرف چھ میل ہے۔ خلد آباد اب ایک گاؤں بن کر رہ گیا ہے۔ وہاں دو بڑی درگاہیں ہیں۔ دائیں جانب حضرت زین الدینؒ کا مزار ہے جو حضرت برہان الدین غریبؒ کے مرید تھے اور بائیں ہاتھ حضرت برہان الدین غریبؒ کی درگاہ ہے۔ دونوں کے درمیان سے بس گزرتی ہے۔

میں پہلے حضرت زین الدینؒ کے مزار پر حاضر ہوا۔ ان کی درگاہ کے احاطے میں ایک چبوترے پر کھلے آسمان کے نیچے برِعظیم کا نامور حکمران اورنگ زیب عالمگیر محوِ خواب ابدی ہے۔ عالمگیر کی قبر کچی ہے۔ اس پر ریحان کا ایک پودا اُگا ہوا تھا۔ اسے ہی ان کی قبر کا غلاف سمجھنا چاہیے۔ اورنگ زیب کا انتقال احمد نگر میں ہوا تھا اور انہوں نے یہ وصیت کی تھی کہ انہیں شیخ زین الدینؒ کے قدموں میں دفن کیا جائے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اورنگ زیب کی قبر مرہٹوں کے علاقے میں بالکل محفوظ رہی اور جب اس کے جانشین شاہ عالم اوّل نے سیواجی کے پوتے ساہو کو شاہی قید خانے سے رہا کیا تو اس نے دکن جا کر پہلا کام یہ کیا کہ اورنگ زیب کے مزار پر حاضری دی۔ یہاں بتانے کی بات یہ ہے کہ اورنگ زیب کے پردادا اکبر، جس کی ہندو نوازی مشہور ہے، کی قبر کو جاٹوں نے اکھاڑ کر اس کی ہڈیاں جلا دی تھیں اور مقبرے کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ اورنگ زیب کے مزار سے چند قدم کے فاصلے پر جانبِ مشرق ایک الگ چبوترے پر اس کا بیٹا محمد اعظم مدفون ہے۔ وہ اپنے بھائی محمد معظم (شاہ عالم اوّل) کے خلاف تخت نشینی کی جنگ میں ۲۰ جون ۱۷۰۷ء کو جاجو کے مقام پر کام آیا تھا۔

سڑک کے پار حضرت برہان الدین غریبؒ (م ۱۳۳۷ء) کا مزار ہے۔ اسی احاطے میں سلطنتِ آصفیہ کے بانی میر قمر الدین نظام الملک آصف جاہ اوّل (م ۱۷۴۸ء) کی ابدی آرام گاہ ہے۔ یہیں ان کے فرزند ناصر جنگ شہید (م ۱۷۵۰ء) کا بھی مدفن ہے۔ نظام کے بہت سے رشتے دار یہاں آسودۂ خاک ہیں۔ اسی قصبے میں فوائد الفواد کے مرتب خواجہ امیر حسن علاء سجزی (م ۱۳۳۷ء) اور میر غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۷۸۶ء) جیسے فضلاء کی قبریں ہیں۔ حضرت منتجب الدین زری زر بخشؒ کا مزار ایک ویرانے میں سب سے الگ کھڑا ہے۔ حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کے والد ماجد حضرت سید یوسفؒ کا مزار بھی اسی جگہ ہے۔ ان

کا وصال ۱۳۳۱ء میں ہوا تھا۔ ان کا مزار ان کے گھر کے وسیع آنگن میں تھا۔ اب وہاں لق و دق میدان ہے۔

جس پہاڑی پر ان بزرگوں کے مزارات ہیں، اس کے نیچے ایلورہ کی غاریں ہیں جن میں ہزاروں بُت نصب ہیں۔ ان بتوں کی وہاں موجودگی مسلمانوں کی فراخ دلی پر دلالت کرتی ہے۔ میں نے ان مزارات سے ایک پگڈنڈی پر چلنا شروع کیا تو چند منٹ میں ان غاروں تک پہنچ گیا۔ بُدھوں نے جس طرح اجنتا میں چٹانیں کاٹ کاٹ کر بت بنائے تھے اسی طرح یہاں ہندوؤں نے سینکڑوں کی تعداد میں بت تراشے ہوئے ہیں۔ کہیں کوئی طائفہ گا بجا رہا ہے تو کہیں ناچتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ بُدھوں کے ہاں جو بُت بنائے جاتے تھے ان میں شرافت اور رُوحانیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کے مقابلے میں ہندوؤں کے ہاں بڑی بے حیائی اور حیا سوزی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ یہاں کی سب سے بڑی غار کا نام "کیلاش" تھا۔ میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی اور خلد آباد سے اورنگ آباد جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔

اگلے روز میں بذریعہ بس براستہ اجنتا، جلگاؤں پہنچا۔ وہاں سے بس تبدیل کر کے بھساول آیا۔ ان شہروں کے درمیان ۲۵ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ان جگہوں سے پورے ہندوستان کو کیلا فراہم کیا جاتا ہے۔ دن میں مختلف علاقوں کو بہت سی اسپیشل ٹرینیں کیلے لے کر روانہ ہوتی ہیں۔ بھساول سے میں نے ٹرین پکڑی اور پچاس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے برہانپور پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے ہی نصف رات گزر چکی تھی۔ ایک ہوٹل میں رات گزاری اور صبح ناشتے کے بعد میں اپنی مہم پر نکلا۔ مجھے برہانپور میں اور تاریخی عمارتوں کے علاوہ حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے خلیفہ اور ان کے مکتوبات کے تیسرے دفتر کے مرتب خواجہ محمد ہاشم کشمی رحمتہ اللہ علیہ (م ۱۰۴۵ھ) کا مزار دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ ان کا شمار نقشبندیہ مجددیہ سلسلۂ تصوف کے بڑے بزرگوں میں ہوتا ہے۔

میں ہوٹل سے نکلا تو بازار میں ایک حکیم صاحب مطب پر بیٹھے نظر آئے۔ یہ طبقہ عام طور پر دیندار ہوتا ہے۔ میں نے خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کے مزار کا اتہ پتہ پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ دیکھیے سامنے چائے خانے کے باہر دو آدمی بیٹھے ہیں، ان سے دریافت کیجیے۔ میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ

سامنے کتب خانہ رشیدیہ نظر آرہا ہے ۔ اس کے مالک برہانپور سے خوب واقف ہیں ، اس لئے میں ان سے رجوع کروں ۔ میں کتب خانہ رشیدیہ پہنچا اور خواجہ صاحبؒ کے مزار کے بارے میں دریافت کیا ۔ کتب خانے کے مالک نے کہا کہ یہاں مولوی معین الدین نام کے ایک عالم رہتے ہیں ۔ ان سے زیادہ برہانپور کے بارے میں اور کوئی نہیں جانتا ۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہیں تھے ۔ اتنے میں مولوی صاحب وہاں تشریف لے آئے ۔ ان سے میں نے خواجہ صاحبؒ کے مزار کا پتہ پوچھا تو فرمانے لگے " میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں ۔ چلیے میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں ۔"

مولوی معین الدین برہانپور کے سیوا سدن کالج میں اردو اور فارسی کے استاد تھے۔ اس کالج میں ایم اے کی کلاسیں بھی ہوتی ہیں ۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہاں سندھی زبان و ادب ایم اے کی سطح تک پڑھائے جاتے ہیں اور پڑھنے والے سبھی ہندو ہیں جو سندھ سے وہاں جا کر آباد ہوئے ہیں ۔ 11746

حضرت خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کا مزار اسی کالج کے احاطے میں پانڈہ زول ندی کے کنارے ایک چار دیواری کے اندر ہے ۔ لوحِ مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے کہ پہلے ان کا مزار عید گاہ کے قریب تھا ۔ پانڈہ زول ندی کاٹ کرتی ہوئی ان کے مزار تک پہنچ گئی تو خواجہ صاحب نے خواب میں برہانپور کے ایک بزرگ محمد طاہر کو اشارہ کیا کہ وہ آپ کا جسد وہاں سے نکال کر کسی محفوظ جگہ دفن کر دے ۔ چنانچہ اس بزرگ نے ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء میں ان کا جسد موجودہ جگہ دفن کیا ، حضرت کے ساتھ ہی ان کے فرزند ارجمند میر محمد قاسم اور دختر نیک اختر بی بی صفیہ کی بھی قبریں ہیں ۔ یہیں ان کے خلیفۂ خاص شاہ عبداللطیف کا بھی مزار ہے ۔ ان کے مزار کا کتبہ کسی صاحبِ ذوق عالم کا لکھوایا ہوا ہے۔ اس پر یہ بھی مرقوم ہے کہ خواجہ صاحب نے مکتوباتِ امامِ ربانی کا تیسرا دفتر جمع کیا اور اپنے شیخ کے سوانح حیات زبدۃ المقامات کے عنوان سے تحریر فرمائے ۔ کتبے پر یہ بھی منقوش ہے کہ ان کے فارسی دواوین ملا فیروز پارسی لائبریری اور کاما لائبریری بمبئی میں محفوظ ہیں ۔

راقم نے انڈیا آفس لائبریری لندن سے ان کے دیوان کی مائیکرو فلم حاصل کی تھی۔ ابھی حال ہی میں شعبۂ فارسی ، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کی ایک با ذوق طالبہ

روزینہ انجم نقوی نے میری فلم کی مدد سے " غزلیاتِ ہاشم " مرتب کی ہیں ۔

پانڈہ زول ندی اب کاٹ کرتی ہوئی دوبارہ ان کے مزار کے قریب پہنچ گئی ہے ۔ ندی کے ارد گرد زمین ریتلی اور نرم ہے ۔ اس لئے اب پھر وہ وقت آگیا ہے کہ ان کا جسدِ مبارک کسی محفوظ جگہ پہنچا دیا جائے ۔

میں نے خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کی اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کی ۔ مولوی معین الدین نے فرمایا کہ وہ اب مجھے وہ جگہ دکھانا چاہتے ہیں جہاں حضرت کا قدیم مزار تھا ۔ میں ان کے ہمراہ وہاں پہنچا تو انہوں نے فرمایا کہ جس عید گاہ کا ذکر کتبے میں آیا ہے ، وہ بھی دیکھ لوں ۔ برہانپور کی جدید فصیل نظام الملک آصف جاہ اول نے بنوائی تھی ۔ انہوں نے فصیل میں ایک محراب بنا کر اس کے گرد زمین چھوڑ دی ، جو اب عید گاہ کہلاتی ہے ۔ عید گاہ دیکھ کر ہم پرانے شہر میں داخل ہوئے۔ راستے میں مولوی صاحب نے مجھے شیخ بہاء الدین باجنؒ (م ۱۵۰۶ء) کا مزار دکھایا ۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنی مشہور تصنیف " پنجاب میں اردو " میں ان کا کلام نقل کیا ہے ۔ مجھے اچانک ان کا مدفن مل جانے سے بڑی مسرت ہوئی ۔

وہاں سے ہم جامع مسجد دیکھنے گئے ۔ یہ مسجد سرتاپا سنگِ سیاہ سے تعمیر ہوئی ہے۔ اس مسجد کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں عربی کے علاوہ سنسکرت زبان میں بھی کتبے لکھے ہوئے ہیں ، جو شاہانِ فاروقی کی وسیع القلبی پر دال ہیں ۔ سکھر کے مشہور مؤرخ اور ممتاز خطاط میر محمد معصوم بھکری (م ۱۰۱۰ء) صاحبِ تاریخ سندھ المعروف بہ تاریخ معصومی نے بھی وہاں اپنا ایک یادگاری کتبہ نصب کیا تھا ۔

جامع مسجد دیکھ کر ہم فاروقی بادشاہوں کے مقبرے دیکھنے گئے ۔ اس خانوادے کے پہلے چھ حکمران تھالنیر میں مدفون ہیں اور آخری چھ برہانپور میں ۔ ان کے مقبرے تباہ ہو رہے ہیں ۔ وہاں شکستہ پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے ۔ مقبروں میں لنگور کودتے پھرتے تھے ۔ یہ منظر بڑا عبرت ناک تھا ۔ ہندوستان کی " سیکولر " حکومت کو مسلمانوں کی یادگاروں کے ساتھ بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ۔ وہ تو اجودھیا کی بابری مسجد کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہے اور اس کے بعد متھرا اور بنارس کی مساجد کی باری ہے (بابری مسجد ۶ جون ۱۹۹۲ء کو شہید کر دی گئی) ۔

بُرہانپور میں سندھی پُورہ نامی ایک بستی میں سندھی اولیاء کے مزارات ہیں۔ یہ بزرگ سندھ سے وہاں جا کر آباد ہوئے تھے۔ ان میں سے حضرت عیسیٰ جندُ اللہ (م ۱۰۳۱ھ) اور حضرت عبدالستار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے حالات پر محمد مطیع اللہ راشد نے "بُرہانپور کے سندھی اولیاء" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو ۱۹۵۷ء میں کراچی سے شائع ہو چکی ہے۔ پاکستان کے سابق وزیرِ خارجہ اور ممتاز قانون دان شریف الدین پیرزادہ بُرہانپور کے اسی خاندان کے ایک فرد ہیں۔

بُرہانپور کا قلعہ، جو تاپتی کے کنارے ہے، قابلِ دید ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں نے وہاں اپنے قیام کے زمانے میں اس کی تزئین و آرائش کی طرف خصوصی توجہ دی تھی۔ دریا کے دوسری جانب زین آباد ہے۔ یہ آبادی شیخ زین الدین خلیفۂ شیخ برہان الدین غریبؒ کی جانب منسوب ہے۔ وہیں وہ آہو خانہ ہے جہاں ملکہ ممتاز محل کو عارضی طور پر دفن کیا گیا تھا۔ جب آگرہ میں تاج محل تیار ہوا، تو اس کا جسد وہاں منتقل کر دیا گیا۔

مولانا ابُوالکلام آزاد نے شاہجہانی عہد کی ایک مغنیّہ ہیرا بائی زین آبادی کا ذکر کر کے اس مقام کو شہرتِ دوام بخشی ہے۔ بقولِ آزاد، اورنگ زیب نوجوانی میں اس پر فریفتہ ہو گئے تھے لیکن قدرت نے اس نوجوان شہزادے کی جوانی کو بے داغ رکھنا تھا۔ اس لئے اللہ میاں نے ہیرا بائی کو جلد ہی اپنے پاس بلا لیا۔ مرزا سنگین بیگ سیر المنازل میں لکھتے ہیں کہ دہلی میں ایک ایسی ہی عورت کی قبر تھی اور اس کے کتبے پر یہ شعر کندہ تھا:

زن فاحشہ در تہِ خاک شد
بجا شد کہ خس کم جہاں پاک شد

خانخاناں کے بیٹے مرزا ایرج الملقب بہ شاہ نواز خان کا مزار بھی بُرہانپور میں ہے۔ حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ کے مکتوبات میں اس کے نام متعدد مکتوبات موجود ہیں۔ حضرت مجدّدؒ نے اسے راسخ العقیدہ مسلمان بنا دیا تھا۔ اس کے سوانح نگاروں نے، خصوصاً مآثرالامراء کے مصنف صمصام الدولہ شاہنواز خان نے، اسے متعصب سنّی لکھنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

خانخاناں نے بُرہانپور کو بڑی ترقی دی۔ اس نے وہاں پارچہ بافی کے کارخانے

لگائے اور ٹھٹھہ سے باشندے بلا کر وہاں آباد کئے۔ آج بھی بُرہانپور کا ایک بازار تانا گوری کے نام سے مشہور ہے (یعنی تانا بانا لگانے والوں کا بازار)۔ اس بازار کی مسجد کے مینارے اپنی نظیر آپ ہیں۔

اورنگ زیب طویل عرصے تک بُرہانپور میں بحیثیت صوبیدار رہ چکا تھا۔ یہیں اس کی ملاقات شیخ نظام سے ہوئی جو بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ جب اورنگ زیب نے فتاویٰ عالمگیری مرتب کروایا تو شیخ نظام کو اس کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا۔

اورنگ زیب کے زمانے میں یہاں ٹکسال تھی۔ راقم کے ذخیرۂ مسکوکات میں اورنگ زیب کا ایک روپیہ محفوظ ہے جس پر "ضرب دارالسرُور بُرہانپور" منقوش ہے۔

اورنگ زیب کے بھائی شہزادہ شجاع کی ایک بیوی بلقیس الزمانی کا مقبرہ بھی بُرہانپور کی تاریخی عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ خانخاناں کی بنوائی ہوئی سرائے تا حال موجود ہے۔ بُرہانپور کی سب سے بڑی زیارتگاہ حضرت فضل اللہ کا مزار ہے۔ یہ بزرگ وہاں نائبِ رسول اللہ کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اورنگ زیب نے جب داراشکوہ کے خلاف پیش قدمی کی تھی تو اس نے ایک ماہ یہاں رہ کر سامانِ جنگ فراہم کیا اور سپاہی بھرتی کئے۔ میں نے کہیں یہ بھی پڑھا تھا کہ وہ اس جنگ میں کامیابی کی دُعا کرانے کی غرض سے حضرت فضل اللہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا تھا۔

مولوی معین الدین نے مجھے بتایا کہ ایک بار ان کے دل میں یہ بات آئی کہ جس پہاڑ کو ست پُڑا کہتے ہیں، اسے جا کر دیکھنا چاہیے۔ انہوں نے ۵۳ میل پیدل سفر کر کے یہ معلوم کیا کہ ست پُڑا دراصل سات پہاڑی سلسلے ہیں جو شمالی ہند کو جنوبی ہند سے جدا کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ چند سال ہوئے کھنڈوہ کے ایک مندر کے نام وقف زمین کے بارے میں تنازع پیدا ہو گیا اور مقدمہ عدالت تک پہنچا۔ مندر کے پروہتوں نے ایک شاہی فرمان عدالت میں پیش کیا۔ عدالت نے فارسی زبان کا فرمان پڑھ کر سنانے کے لئے مولوی معین الدین کو بلایا۔ یہ فرمان اورنگ زیب کا عطا کردہ تھا جس میں مندر کے اخراجات کے لئے زمین دی گئی تھی۔ چند سال ہوئے گورو نانک دیو یونیورسٹی امرتسر کے سابق وائس چانسلر جگدیش سنگھ گریوال کو جھکھڑ اور پنڈوری کے مندروں سے اورنگ زیب کے فرامین ملے ہیں جن میں مندروں کو بہت سی

مراعات دی گئی تھیں۔ پروہتوں نے اورنگ زیب سے اس بات کی شکایت کی تھی کہ پہلے انہیں حکومت کی طرف سے ہر ماہ گھی، شکر اور تیل جیسی اشیائے خوردنی ملتی تھیں اب کسی افسر نے بند کر دی ہیں۔ اس پر اورنگ زیب نے فرمان جاری کیا کہ ان کی سابقہ مراعات بحال کی جائیں۔ گریوال صاحب کو چالیس کے قریب ایسے فرامین ملے ہیں، انہوں نے ان کا فارسی متن اور انگریزی ترجمہ شائع کرکے اورنگ زیب کو مذہبی جنونی کہنے والے ہندو، سکھ اور انگریز مؤرخوں کے منہ بند کر دیئے ہیں۔

رابرٹسن کالج جبل پور، جو ان دنوں مہا کوشل مہاودیالے کہلاتا ہے، مدھیہ پردیش کا مشہور علمی ادارہ ہے۔ وہاں کے پروفیسر شیخ فرید بڑے محقق ہیں۔ ان کے تحقیقی مضامین ماہانہ رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ ٹیکسلا کے کتبۂ مارگلہ پر بھی ان کا ایک مضمون ماہنامہ بُرہان دہلی میں کئی قسطوں میں چھپا تھا۔ میں ان سے ملنے کا متمنی تھا۔ ان کا گھر لوہا منڈی بُرہانپور میں ہے۔ میں پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچا۔ ان کے بھائی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جبل پور گئے ہوئے ہیں۔ شیخ فرید سے ملاقات نہ ہو سکنے کا مجھے بڑا قلق ہوا۔

میں نے بُرہان پور میں جو کچھ دیکھنا تھا۔ وہ میں دیکھ چکا تھا۔ مولوی معین الدین صاحب کا میں نے شکریہ ادا کیا اور اپنا سامان اٹھا کر ریلوے اسٹیشن پہنچا اور اگلے روز صبح میں دہلی پہنچ گیا۔

اجمیر، احمد آباد، اُودے پُور اور چتوڑ

نئی دہلی ریلوے اسٹیشن سے ایک ٹرین عصر کے وقت روانہ ہو کر صبح نمازِ فجر کے بعد اجمیر پہنچتی ہے۔ میں اس ٹرین کے ذریعے اجمیر پہنچا اور ریلوے اسٹیشن سے قریب ہی ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ نہا دھو کر میں نے ناشتہ کیا اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۳۶ء) کے مزار کی جانب روانہ ہوا۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ گلیوں اور بازاروں کے نام سندھی رسم الخط میں، جو دراصل خطِ نسخ ہے، لکھے ہوئے تھے۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اجمیر میں سندھی ہندو شرنارتھی بڑی تعداد میں رہتے ہیں اور میونسپل کمیٹی پر ان کا مکمل کنٹرول ہے۔ میں بازاروں سے گزرتا ہوا ترپولیہ پہنچا۔ اس سے قریب ہی حضرت خواجہؒ کی درگاہ ہے جسے برِعظیم پاک، ہند اور بنگلہ دیش کی سب سے بڑی درگاہ سمجھا جاتا ہے۔

درگاہ کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوں تو ایک بڑا شاندار دروازہ نظر آتا ہے جو نظام گیٹ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نظامِ دکن کا خواجہ صاحبؒ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت ہے۔ اس دروازے کے قریب ہی نوبت خانہ ہے جہاں صبح و شام نقارے بجائے جاتے ہیں۔ اکبرِ اعظم نے ۱۵۷۶ء میں رانا پرتاپ کو شکست دے کر چتوڑ فتح کیا تو اس نے رانا کے نقارے حضرت خواجہؒ کی درگاہ پر بطورِ نذر پیش کئے۔ اسی زمانے سے یہاں نوبت بجانے کی رسم شروع ہوئی۔

نوبت خانے کے قریب ہی درگاہ کی انتظامیہ کا دفتر ہے اور اس کے بالمقابل مدرسہ معینیہ کی عمارت کھڑی ہے۔ یہ وہی مدرسہ ہے جہاں کے اُستاد مولانا معین الدین اجمیری نے برِعظیم پاک و ہند کے دینی اور علمی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا ہے، موصوف خواجہ قمر الدین سیالویؒ (م ۱۹۸۱ء) کے اُستاد اور خیر آبادی مکتبِ فکر کے آخری بڑے عالم تھے۔

مدرسہ معینیہ سے آگے بڑھیں تو دائیں جانب دو بڑی دیگیں دکھائی دیتی ہیں۔

ان دیگوں میں عرس کے موقع پر سیکڑوں من کھانا پکتا ہے اور خدام بانس کی سیڑھیوں کے سہارے دیگوں میں اتر کر کھانا باہر نکالتے ہیں ۔ ان کے چولھے لنگے جڑے ہیں کہ ان میں فقرا رہائش پذیر ہیں ۔ لوگ ان دیگوں میں نقدی پھینک رہے تھے ۔

دیگوں کے قریب ہی درگاہ کی مسجد ہے جو سرتاپا سنگِ مرمر سے تعمیر ہوئی ہے ۔ یہ شاہجہان کا نذرانہ عقیدت ہے ۔ خواجہ صاحب کا گنبد بھی اسی کا تعمیر کردہ ہے ۔ مزار شریف کے سامنے ایک برآمدہ ہے جو بیگمی دالان کے نام سے موسوم ہے ۔ اسے شاہجہان کی صوفی منش بیٹی جہاں آرا بیگم (م ۱۶۸۱ء) نے تعمیر کروایا تھا ۔ بیگمی دالان میں مجاور بیٹھے رہتے ہیں جو زائرین سے نذرانے وصول کرتے اور انہیں درگاہ کے اندر لیجا کر ان کے سروں پر مزار کا غلاف ڈال دیتے ہیں ۔ زائرین اپنے سروں پر کپڑا ڈلوا کر دیر تک مراقبے میں بیٹھے رہتے ہیں ۔

مجاورین میں سے ایک صاحب " دیوان " کہلاتے ہیں ، جو اس گروہ کے سرخیل ہوتے ہیں ۔ ان کی رہائش گاہ بھی " حویلی دیوان صاحب " کہلاتی ہے ۔ باقی مجاورین کے ہاں بھی زائرین کی سہولت کے لئے قیام کی جگہ ہوتی ہے ، دور دور سے زائرین آکر ان کے ہاں قیام کرتے ہیں اور رخصت ہوتے وقت حسبِ توفیق ان کی خدمت کر دیتے ہیں ۔

گنبد کے نیچے صرف خواجہ معین الدین اجمیریؒ کا مزار ہے لیکن درگاہ کے وسیع احاطے میں اور بھی کئی قبریں ہیں ۔ میں نے ایک قبر کے سرہانے " شاہ نیم روز بہشتی " لکھا ہوا دیکھا اور اس کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نظام سقے کی قبر ہے جسے ہمایوں بادشاہ نے نصف یوم کے لئے تخت پر بٹھایا تھا ۔ یہ اس خدمت کے صلے میں تھا جس میں اس نے ہمایوں کو دریائے گنگا میں ڈوبنے سے بچایا تھا ۔

درگاہ کے احاطے میں پانی کی کمی ہے ۔ اس لئے وہاں سقے پانی کی مشکیں اٹھائے کسی عقیدت مند کے منتظر رہتے ہیں جو انہیں کچھ رقم دے کر مشک کا پانی تالاب میں ڈلوا دے ۔ اسی تالاب کے پانی سے نمازی وضو کرتے ہیں ۔

میں نے وہاں ایک سندھی ہندو کو دیکھا جو مٹھائی سے بھری ہوئی سینی اپنے سر پر اٹھائے ہوئے درگاہ میں لا رہا تھا ۔ میرے استفسار پر ایک شخص نے بتایا کہ ہندو بکثرت

خواجہ صاحب کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور شہر کے غیر مسلم باشندے بھی صدقِ دل کے ساتھ ان کا احترام کرتے ہیں ۔

میں درگاہ میں کچھ دیر قیام کے بعد صدر دروازے سے باہر نکلا تو سامنے مشہور تاریخی مسجد جو " اڑھائی دن کا جھونپڑا " کے نام سے مشہور ہے ، دکھائی دی ۔ اس مسجد میں نماز نہیں ہوتی اور اب یہ تاریخی یادگار بن کر رہ گئی ہے ۔ مسجد کے ستون دیکھ کر صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کسی مندر کے ستون ہیں جنہیں اوپر تلے رکھ کر اونچا کر دیا گیا ہے ، مسجد کی چھت کا بوجھ ان ستونوں نے سنبھالا ہوا ہے ۔ میں نے ان ستونوں کی تصویریں اتاریں ۔ ان پر بُت بنے ہوئے ہیں اور ان کے سر توڑ دیئے گئے ہیں ۔ ان کی ٹانگیں ، بازو اور دھڑ ہنوز موجود ہیں ۔ اجمیر ایک عظیم رُوحانی مرکز ہے اور یہاں ہزاروں جید علماء نے نمازیں ادا کی ہیں لیکن کسی نے ستونوں پر بتوں کی موجودگی پر اعتراض نہیں کیا ۔ اگر ہمارے علاقے میں ایسی مسجد موجود ہوتی تو علمائے دین اس میں نماز ادا نہ کرنے کا فتویٰ صادر کر دیتے ۔ دہلی میں مسجد قوۃ الاسلام کے ستونوں پر بھی ایسے ہی بُت موجود ہیں ۔ میں نے بغور مسجد اڑھائی دن کا جھونپڑا کا جائزہ لیا ۔ میں یہ مسجد دیکھ کر باہر نکل رہا تھا کہ وہیں میری ملاقات ایک رہبر (GUIDE) سے ہو گئی ۔ وہ زائرین کو تارا گڑھ لے جاتا تھا ۔

تارا گڑھ نام کا پہاڑ خواجہ صاحبؒ کے مزار کے عقب میں واقع ہے ۔ اس کی چوٹی پر حضرت سید حسین خنگ سوار (م ۱۲۲۰ء) کا مزار ہے ۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے تین میل پیدل چلنا پڑتا ہے ۔ رہبر سے معلوم ہوا کہ برسات کی وجہ سے راستہ خراب ہو گیا ہے ورنہ عورتوں اور بوڑھوں کو کہار ڈولیوں میں بٹھا کر اوپر لے جاتے ہیں ۔

میں نے دل میں سوچا کہ تارا گڑھ جانے کا یہ بہترین موقع ہے اس لئے اسے گنوانا نہیں چاہیئے ۔ خدا معلوم دوبارہ کب یہاں آنا ہو اور اس وقت میری صحت اوپر چڑھنے کی اجازت بھی دے گی یا نہیں ۔ میں نے ہمت کر کے رہبر سے پوچھا کہ وہ کتنی فیس لے گا ۔ اس نے کہا کہ جو آپ کی خوشی ہو دے دیجئے گا اور اگر نہ بھی دیں گے تو وہ بُرا نہیں منائے گا ۔

میں اس کے ساتھ چل پڑا ۔ بارش ہو جانے کی وجہ سے مٹی بہہ گئی تھی اور پتھر

ظاہر ہو گئے تھے ۔ اس لئے اُوپر جانے میں دشواری پیدا ہو رہی تھی ۔ کوئی پَون میل اُوپر جا کر میں ذرا دَم لینے کے لئے رُکا ۔ میرے رہبر نے کہا کہ عام لوگ تو یہاں تک پہنچنے تک تین جگہوں پر دَم لیتے ہیں ۔ آپ بڑے باہمت ہیں جو ایک ہی سانس میں یہاں تک پہنچ گئے ہیں ۔

ہمارے راستے میں ایک بڑی چٹان آئی ، جو اوپر سے لڑھک کر وہاں تک پہنچی ہو گی ۔ اس پر ایک چھوٹا سا نشان بنا ہوا تھا ۔ میرے رہبر نے کہا کہ اس جگہ سیّد حسین خِنگ سوار بیٹھے ہوئے تھے کہ اوپر سے کسی ہندو جوگی نے ان پر یہ چٹان لڑھکا دی ۔ حضرت خِنگ سوار نے اسے چابک کے ساتھ روکا ، یہ اس کا نشان ہے ۔ یار لوگوں نے بالکل یہی روائت بابا نانک کے بارے میں مشہور کر دی ہے کہ وہ موضع حسن ابدال میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حسن ابدالؒ نے ان کی طرف پتھر لڑھکا دیا جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے روکا ۔ حالانکہ ان دونوں بزرگوں کے درمیان ایک صدی کا بُعد ہے ۔ میں آگے بڑھا تو دُور سے ایک کھڑکی سی نظر آئی ۔ اندازاً ایک میل چلنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کھڑکی دراصل ایک قلعے کا صدر دروازہ ہے جو پہاڑ پر تعمیر کیا گیا تھا ۔ اس دروازے سے گزر کر ہم قلعے میں داخل ہوئے ۔ ہنوز قلعے کی شکستہ فصیلیں موجود ہیں ۔ حضرت خِنگ سوارؒ اسی قلعے کے انچارج تھے ۔ قلعے کے اندر سب سے اُونچی جگہ پر ایک چار دیواری کے اندر حضرت خِنگ سوار اور ان کے بہت سے رفقاء کی قبریں ہیں ۔ جب قطب الدین ایبک کی وفات کی اطلاع اس علاقے میں بسنے والے ہندوؤں کو ملی تو انہوں نے موقعہ پا کر قلعہ پر یلغار کر دی اور خِنگ سوارؒ اپنے رفقاء کے ساتھ قلعے کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہو گئے ۔

حضرت خِنگ سوار ابتداءمیں اثنا عشری مذہب پر عامل تھے لیکن خواجہ صاحبؒ کی صحبت میں رہتے ہوئے انہوں نے اپنا مسلک تبدیل کر لیا ۔ خواجہ صاحبؒ نے اجمیر میں قیام کے دوران میں ان کی ایک عزیزہ کے ساتھ عقد کر لیا تھا ۔

حضرت خِنگ سوارؒ کے مزار پر ایک کتبہ نصب ہے جو مادھو جی سندھیہ نے از رو عقیدت وہاں نصب کرایا تھا ۔ حضرت کے مزار کے قریب ہی ایک چبوترہ سا بنا ہوا ہے ، جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ان کے گھوڑے کی قبر ہے جو اپنے مالک کے ساتھ ہی شہید ہوا تھا ۔ زائرین وہاں چنوں کی دال بطور نذر چڑھاتے ہیں ، جو مجاورین

اٹھا کر لے جاتے ہیں ۔

چار دیواری کے باہر ایک باؤلی نظر آئی ۔ اس کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ سلطان شمس الدین التمش (م ۱۲۳۶ء) کی تعمیر کردہ ہے ۔ پہاڑ کی چوٹی پر رہنے والوں کو اسی باؤلی سے پانی ملتا ہے ۔ باؤلی کے قریب چند عورتیں بیٹھی تھیں جن کے بارے میں مجھے یہ بتایا گیا کہ یہ بیوہ ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو کچھ پیسے دے دیں ، تو وہ آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیں گی ۔ پہاڑی کے ایک سرے پر ، شہر کے رُخ پر ، ایک عظیم الشان دروازہ بنا ہوا ہے ۔ یہ اکبر اعظم نے حضرت خِنگ سوارؒ کی یاد میں بنوایا تھا ۔ اگلے روز جب میں اجمیر ریلوے اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہو کر احمد آباد کے لئے روانہ ہوا تو میلوں تک وہ دروازہ نظر آتا رہا ۔

واپسی کے لئے رہبر نے دوسرا راستہ اختیار کیا جو زیادہ لمبا نہ تھا ۔ یہ عمودی راستہ تھا اس لئے سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا پڑتا تھا اور زمین کے قریب جا کر تو خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ اس راستے سے میں اسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے رہبر مجھے ساتھ لے کر چلا تھا ۔ میں نے پانچ روپے اس کے ہاتھ میں تھمائے جو اس نے بخوشی اپنی جیب میں ڈال لئے ۔

دوپہر کا وقت ہو چکا تھا ۔ میں کھانا تناول کرنے کے لئے ایک ہوٹل میں چلا گیا ، راستے میں میں نے ایک ہندو قصائی کو دیکھا جو اپنے ماتھے پر تلک لگائے گوشت کاٹ کاٹ کر فروخت کر رہا تھا اور وہاں ہندوؤں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی ، جن کی اکثریت سندھی تھی ۔ میں کھانا کھا کر اپنے ہوٹل میں چلا گیا اور دوپہر کو تھکاوٹ کی وجہ سے مجھے خوب نیند آئی ۔ عصر کے وقت میں بیدار ہوا اور نہا دھو کر دوبارہ درگاہ شریف پہنچا ۔ مغرب کے بعد شاہجہانی مسجد میں بیٹھنے کا بڑا لطف آیا ۔ مسجد اور مزار شریف ملے ہوئے ہیں ۔ گنبد کے اوپر سونے کے پتروں سے بنا ہوا تاج نصب ہے جو شاہجہان نے تیار کروایا تھا ۔ شاہجہان سے پہلے مزار پر ایک معمولی سا گنبد تھا ۔ اکبر اعظم کے عہد کے مصوروں نے اکبر کو درگاہ میں غریبوں میں رقم بانٹتے ہوئے دکھایا ہے ۔ تصویر میں اس وقت کے گنبد کی تصویر ہے ۔ پرانا گنبد خواجہ حسین ناگوریؒ کی درخواست پر مالوہ کے حکمران سلطان محمود خلجی (م ۱۴۷۵ء) نے تعمیر کروایا تھا ۔

اجمیر برِ عظیم پاک و ہند و بنگلہ دیش کا سب سے بڑا رُوحانی مرکز ہے ۔ یہیں سے سلسلۂ عالیہ چشتیہ آکاس بیل کی طرح ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہے ۔ رانا سانگا (م ۱۵۲۸ء) نے راجستھان سے مسلمانوں کے آثار مٹانے کی سعی ناکام کی تو اس نے سب سے پہلے ناگور کو تباہ کیا ۔ اس کے بعد اس نے اجمیر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ۔ اخبار الاخیار ۔ میں لکھتے ہیں کہ اجمیر کے کھنڈر درندوں کا مسکن بن گئے تھے اور ان کے خوف سے کوئی شخص خواجۂ بزرگ کے مزار کی زیارت کے لئے نہ جاتا تھا ۔

اکبر اعظم کے ہاں اولاد نرینہ نہ ہوتی تھی ۔ اس نے منت مانی کہ اگر خالق کائنات اسے خواجہ صاحبؒ کے صدقے میں بیٹا عطا کرے تو وہ پا پیادہ آگرہ سے اجمیر جا کر درگاہ میں نذر پیش کرے گا ۔ سلیم کی ولادت کے بعد اکبر نے یہ منت پوری کی ۔ وہ کئی بار اجمیر گیا ۔ اس کی وجہ سے اجمیر کی بڑی شہرت ہوئی ۔ جہانگیر بھی اپنے عہدِ حکومت میں کئی بار وہاں حاضر ہوا ۔ بلکہ ایک بار اس نے اپنے کان چھدوا کر ان میں حلقے ڈلوائے اور وہ خود کو خواجہ صاحب کا حلقہ بگوش غلام سمجھنے لگا ۔ اس کا ذکر تزکِ جہانگیری میں موجود ہے ۔

میں نے رات ہوٹل میں گزاری ۔ اگلے روز میں پُشکر دیکھنے گیا ۔ یہ اجمیر سے چار میل کے فاصلے پر ہے اور ایک پہاڑ عبور کر کے وہاں جانا ہوتا ہے ۔ پہاڑ پر سے اجمیر شہر کا نظارہ بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے ۔ یہیں سے میں نے آنا ساگر دیکھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ جب اجمیر تشریف لائے تو انہوں نے آنا ساگر کے کنارے ہی پڑاؤ کیا تھا ۔

اجمیر سے پُشکر تک بس چلتی ہے ۔ میرے سوا اس میں سبھی ہندو سوار تھے ۔ پُشکر ہندوؤں کا بڑا تیرتھ ہے ۔ یہاں ایک جھیل کے کنارے راجستھان کے باون ہندو حکمرانوں نے باون گھاٹ تعمیر کروائے ہیں ۔ مندر بھی وہاں بہت ہیں ۔ مجھے وہاں بس سے اترتے ہی ایک نوجوان ہندو رہبر (GUIDE) نے گھیر لیا ۔ اس نے بڑی تیزی کے ساتھ اس شہر کے اوصاف بیان کرنا شروع کر دیئے ۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ یہاں شراب کی دکان نہیں ، رنڈی کا مکان نہیں ، اور تیلی کا گھان نہیں ۔ شراب کی دکان اور رنڈی کا

مکان نہ ہونے کی تک تو میری سمجھ میں آگئی لیکن اس وقت تیلی کے گھان کی عدم موجودگی کا عقدہ حل نہ ہوا ۔ بعد ازاں مجھے یہ معلوم ہوا کہ کولہو میں سرسوں پیلتے ہوئے اس میں چیونٹیاں اور کیڑے مکوڑے بھی پیلے جاتے ہیں اور یہ جیو ہتھیا ہے جو بہت بڑا پاپ ہے ۔ اس لئے ہندو کولہو لگانا معیوب فعل سمجھتے ہیں ۔ اجمیر سے احمد آباد جاتے ہوئے راستے میں مونٹ آبو پڑتا ہے ۔ اس مقام پر جینیوں کے صدہا مندر ہیں ۔ شاید تیلی کے گھان کی عدم موجودگی جینیوں کے ہی زیر اثر ہو ۔

مندروں کے جھرمٹ میں مجھے ایک ستون نظر آیا جو بڑا حیا سوز تھا ۔ میرے رہبر نے بتایا کہ یہ قدرتی شوِلنگ ہے اور پورے ملک میں ایسے بارہ شوِلنگ ہیں جو قدرت کا شاہکار ہیں ۔ میں نے گھاٹ دیکھ کر رہبر کو کچھ دے کر رخصت کیا ۔ ایک مندر سے موسیقی کی تانیں سنائی دے رہی تھیں ۔ میں نے دیکھا کہ ایک دیو داسی موسیقی کی دُھن پر ایک بُت کے سامنے ناچ رہی ہے ۔ یہ بھی ان کے ہاں عبادت کا ایک طریقہ ہے ۔

ہماری تاریخوں میں یہ مرقوم ہے کہ سلطان شمس الدین التتمش (م ۱۲۳۶ء) نے پُشکر پر حملہ کر کے اسے تباہ کر ڈالا تھا ۔ اس کے بعد ہندوؤں نے اسے پھر تعمیر کر لیا ۔ خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ نے اجمیر میں جو قیام فرمایا وہ بلاوجہ نہ تھا ۔ پُشکر جیسے تیرتھ کا قرب ہی انہیں یہاں کھینچ لایا تھا تاکہ وہ اس ماحول میں رہ کر توحید کی تبلیغ کر سکیں ۔ کلیر شریف ، جہاں حضرت علاء الدین علی احمد صابرؒ نے قیام فرمایا ہردوار کے راستے میں پڑتا ہے ۔ ملتان میں سورج دیوتا کا مندر تھا جہاں دُور دُور سے ہندو یاتری آیا کرتے تھے ۔ یہاں حضرت بہاء الدین ذکریاؒ نے ڈیرہ ڈال دیا ۔ دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ جوگ مایا کے مندر کے قریب ہے ۔ ہم نے ابھی تک اس انداز سے صوفیاء کرام کی تبلیغی مساعی کا جائزہ نہیں لیا ۔

پُشکر دیکھ کر میں اجمیر واپس آیا ۔ اجمیر کے بازاروں کی سیر کی اور ایک صراف کی دکان سے مجھے علاء الدین خلجی (م ۱۳۱۶ء) کا چاندی کا ایک سکہ مل گیا ۔ اسی سفر میں دہلی میں دریبہ کلاں میں ایک صرّاف کی دکان سے مجھے علاء الدین خلجی کا ایسا ہی سکہ ملنے سے بڑی مسرت ہوئی ۔ دوپہر کو کچھ دیر میں نے ہوٹل میں جا کر قیام کیا اور شام کو میاں تان سین کی بیٹی تلوک دئی کی تعمیر کردہ مسجد دیکھنے گیا ۔ میاں تان سین اکبر کے

درباری گویے تھے اور بقولِ ابوالفضل (م ۱۶۰۲ء) پچھلے ہزار سالوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی ۔ میاں صاحب اور ان کے فرزند بلاس خان گوالیار میں حضرت محمد غوث شطاری کے احاطہ مزار میں محو خواب ابدی ہیں ۔ ان کی بیٹی کا ہندوانہ نام کچھ اچھا نہیں لگتا ۔ مسجد کی تعمیر سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ مسلمان تھی ۔ مسجد کی پیشانی پر جو کتبہ نصب ہے ، اس پر یہ عبارت کندہ ہے :

اللہ اکبر

این مسجد را بانی تلوکدی کلانوت بچی
بنت میاں تانسین کلانوت راست کردہ است ۱۰۴۳

(صحیح لفظ کلاونت ہے لیکن کتبے پر کلانوت کندہ ہے) ۔

اجمیر میں انگریزوں نے میو کالج کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا جہاں راجستھان کے راجاؤں کے بیٹوں کو تعلیم و تربیت دی جاتی تھی ۔ اب نہ وہ ریاستیں رہیں اور نہ ہی راجے رہے ۔ اس لئے اب یہ ادارہ پبلک کے لئے کھول دیا گیا ہے ۔ میں اسے دیکھ کر خواجہ صاحبؒ کی درگاہ جا پہنچا ۔ مغرب اور عشاء کی نمازیں حسب سابق وہیں ادا کیں ۔ اگلے روز نمازِ فجر کے بعد میں اسی ٹرین میں سوار ہو کر احمد آباد روانہ ہوا ۔

راستے میں آبو روڈ سے گزر ہوا ۔ ماؤنٹ آبو جانے والے یاتری آبو روڈ کے ریلوے اسٹیشن پر اتر جاتے ہیں ۔ ماؤنٹ آبو راجستھان میں جینیوں کا سب سے بڑا مرکز ہے ۔ یہ سرد جگہ ہے اس لئے انگریزی عہد میں انگریز ریذیڈنٹ اجمیر سے ماؤنٹ آبو چلا جایا کرتا تھا ۔ شام کے قریب میرا گزر پالن پور سے ہوا ۔ یہ بڑا جنکشن ہے ۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ کی تمام ریلوے لائنیں یہاں مل جاتی ہیں ۔ ہمارے زمانے میں تبلیغی جماعت کے ایک عالم مولانا محمد عمر پالن پوری کی وجہ سے اس شہر کو بڑی شہرت ملی ہے ۔

اجمیر سے ٹرین میں میرا ساتھ ایک بوڑھے سکھ کے ساتھ ہو گیا ۔ وہ بھلروان ضلع سرگودھا کا رہنے والا تھا ۔ وہ دہلی سے احمد آباد جا رہا تھا جہاں اس کا فرنیچر کا کاروبار تھا ۔ وہ مجھے ہندو ہی سمجھتا رہا ۔ میں نے بھی اپنی کسی حرکت سے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانی مناسب نہ سمجھی ۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بھلروان کا رہنے والا ہے ۔ جب ۱۹۴۷ء میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے تو بھلروان کا ایک مسلمان لوہار برچھیاں بنا

کر رات کے وقت سکھوں کو تھما دے جاتا تھا ۔ پولیس کی تلاشی کے خوف سے سکھ ان برچھیوں کو رسے سے باندھ کر کنوئیں میں لٹکا دیتے تھے تاکہ دیکھنے والا یہی سمجھے کہ کنوئیں میں ڈول پھینکا ہوا ہے ۔ مجھے اس " مسلمان " لوہار پر بڑا غصہ آرہا تھا جو مسلمانوں کو قتل کروانے کے لئے چند سکوں کے عوض سکھوں کو ہتھیار بنا کر دیتا تھا ۔ شاید اسی بنا پر ہمارے فقہاء نے دارالحرب کے کافروں کے ہاتھ لوہے کی فروخت کو حرام قرار دیا ہے تاکہ وہ اس سے ہتھیار بنا کر مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچائیں ۔

شام کو میں احمد آباد پہنچا ۔ احمد آباد کا قلعہ " بھدرہ " کہلاتا ہے ۔ اس کے صدر دروازے کے باہر نشاط ہوٹل ہے ، جو کسی مسلمان کی ملک ہے ۔ اتفاق سے وہاں کوئی کمرہ خالی نہ تھا ۔ اس لئے میں قریب ہی ایک ایسے ہوٹل میں چلا گیا جو PAYING GUEST کی طرز پر چلایا جا رہا تھا ۔ یہ کسی ہندو کا مکان تھا ۔ وہ خود بھی اسی میں رہتا تھا اور تین چار کمرے کرائے پر اٹھا دیتا تھا ۔ میں نے رات اسی ہوٹل میں گزاری اور صبح نہا دھو کر باہر نکلا ۔

احمد آباد میں میری سب سے زیادہ دلچسپی ایک مخطوطے میں تھی جو شہزادی جہاں آرا بنت شاہجہان کی تصنیف تھا اور ـــــ رسالہ صاحبیہ ـــــ کے نام سے موسوم تھا ۔ اس کا دنیا بھر میں اور کوئی نسخہ نہ تھا ۔ شہزادی نے اس میں اپنے شیخ طریقت ملا شاہ بدخشی کے سوانح حیات قلمبند کئے تھے ۔ ۱۹۳۷ء میں پروفیسر محمد ابراہیم ڈار نے اورینٹل کالج میگزین میں اس کا مختصر سا تعارف کرایا تھا لیکن اصل مخطوطہ شائع نہیں ہوا تھا ۔ میری یہ دلی خواہش تھی کہ اس کی طباعت کی سعادت میرے حصے میں آئے ۔

میں اس مخطوطے کی زیارت کے لئے آپا راؤ بھولا ناتھ لائبریری جانا چاہتا تھا لیکن کوئی رکشے والا اس سے واقف نہ تھا ۔ میں نے ایک رکشے والے کو میونسپل لائبریری چلنے کو کہا ۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میونسپل لائبریری کا عملہ میری رہنمائی کرے گا ۔ یہ لائبریری دریائے سابرمتی کے پار تھی ۔ یہ دریا شہر کے وسط سے گزرتا ہے ۔ اس میں پانی بہت کم ہوتا ہے ۔ اسی کے کنارے گاندھی جی نے سابرمتی آشرم قائم کیا تھا جہاں انہوں نے وجے لکشمی پنڈت کو رکھ کر سید حسین (م ۱۹۴۹ء) کے ساتھ شادی کرنے سے روکا تھا ایسی کنیاؤں (دوشیزاؤں) کے دماغ اسی آشرم میں درست کئے جاتے تھے ۔

میونسپل لائبریری جا کر میں نے آپا راؤ بھولا ناتھ لائبریری کا پتہ پوچھا۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے بٹھانے کی بجائے وہ کسی رکشا والے بٹھا دیں۔ ان کے بٹھانے پر میں آپا راؤ بھولا ناتھ لائبریری پہنچ گیا جو دریا کے اسی جانب تھی جہاں سے میں چلا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ لائبریری گیارہ بجے کھلتی ہے۔ اس وقت دس بجے تھے۔ میں نے ایک گھنٹہ ایک ریستوران میں گزارا۔ لائبریری کھلی تو میں بڑی اُمیدیں لے کر وہاں پہنچا۔ لائبریرین نے مجھ بتایا کہ عربی اور فارسی کے تمام مخطوطے ان کے ہاں سے وِدّیا سبھا لائبریری منتقل ہو چکے ہیں۔ اب وہاں پہنچنے کا سوال تھا۔ میری استدعا پر انہوں نے ایک رکشا ڈرائیور کو وِدّیا سبھا لائبریری کا محلِ وقوع بتایا۔ ایک بار پھر میں نے سابرمتی عبور کیا اور مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔ میں نے لائبریری کے کاؤنٹر پر اپنا نام اور علی گڑھ کا پتہ بتایا تو انہوں نے مجھے رسالۂ صاحبیہ فراہم کر دیا۔ میں نے شام تک آدھا رسالہ نقل کر لیا اور بقیہ اگلے روز نقل کر کے مخطوطہ لوٹا دیا بلکہ میرے پاس اتنا وقت اور نکل آیا کہ میں نے شیخ علی متقی (م ۱۵۶۷ء) کا "رسالہ در علامات مہدی" بھی نقل کر لیا جو انہوں نے مہدی جونپوری (م ۱۵۰۴ء) کے رد میں لکھا تھا۔ اس کی نقل ہنوز میں نے شائع نہیں کی لیکن رسالۂ صاحبیہ کا فارسی متن اور اُردو ترجمہ ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کے مجلّے میں شائع کر دیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ سردار علی احمد خان نے اورینٹل کالج میگزین میں شائع کر دیا اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی، اُستاد شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی نے میرے فارسی متن کو اُردو میں ڈھال کر ششماہی نوائے ادب بمبئی میں طبع کروا دیا۔ حال ہی میں سردار علی احمد خان نے ان سب کو یکجا کر کے چھاپ دیا ہے۔ وِدّیا سبھا لائبریری سے میں گجرات کالج دیکھنے گیا۔ وہاں شعبۂ فارسی کے سربراہ ڈاکٹر عبدالحمید فاروقی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے چندر بھان برہمن کا فارسی دیوان مرتب کر کے شائع کیا تھا اور اس پر ۹۶ صفحوں کا مقدمہ لکھا جو حاصلِ مطالعہ ہے۔ انہوں از راہِ شفقت دیوان چندر بھان برہمن کا ایک نسخہ اپنے دستخطوں کے ساتھ مجھے عنایت فرمایا۔ ان کی ایک رفیقِ کار مِس قریشی سے ملاقات ہوئی۔ اسی کالج سے پروفیسر ابراہیم ڈار (م ۱۹۵۳ء) اور ابو ظفر ندوی (م ۱۹۵۸ء) وابستہ رہے تھے۔ یہیں شرما نام کے تاریخ کے ایک اُستاد تھے جنہوں نے گجراتی مسلمانوں پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ایک بار امرتسر میں گورو نانک دیو یونیورسٹی میں

ایک سیمینار میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ پنڈت جی اگر آپ میرے ساتھ لاہور چلیں تو آپ کی وضع قطع اور لباس دیکھ کر کوئی شخص آپ کو پہچان نہیں سکے گا۔

گجرات کالج سے رخصت ہو کر میں حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے پوتے حضرت برہان الدین قطب عالم (م ۱۴۵۳ء) کا مزار دیکھنے بٹوہ گیا۔ یہ احمد آباد ہی کا حصہ ہے۔ مولوی عبدالحق بابائے اُردو نے اپنی مشہور تصنیف "اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں ان کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ایک رات اندھیرے میں ان کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرا گیا تو معاً ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے "لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے"۔ احمد آباد میں ان کا مزار دیکھنے کے لائق ہے۔

حضرت قطبِ عالم سے کہیں زیادہ شہرت ان کے فرزندِ ارجمند حضرت شاہ عالم (م ۱۴۷۵ء) کے حصے میں آئی۔ ان کا شاندار مزار رسولپورہ میں ہے جو کسی نواب کا محل معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے گجرات کے سلطان محمد اوّل (م ۱۴۵۱ء) کی بیوہ بی بی مغلانی سے نکاح کر کے سلطان کے فرزندِ ارجمند محمود کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ یہی محمود بعد ازاں سلطان محمود بیگڑھ (م ۱۵۱۱ء) کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کا دورِ حکومت گجرات کی تاریخ میں سُنہری دور کہلاتا ہے۔ حضرت شاہ عالم کے مقبرے میں ان کے احفاد کی بہت سی قبریں ہیں۔ شاہ عالم کے ملفوظات مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔ راقم نے ان کی اہمیت پر ۳۳ صفحات کا ایک مضمون لکھ کر مجلہ تاریخ و ثقافت، اسلام آباد بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۲ء میں شائع کرایا ہے۔

گجرات کے سلاطین پر حضرت شاہ عالم کا بڑا اثر تھا۔ سلطان محمد اول ان کا ہم زلف تھا اور سلطان محمود بیگڑھ ان کا ربیب تھا۔ ان کی اولاد اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک علم و فضل میں ممتاز رہی۔

حضرت شاہ عالم کا مزار دیکھ کر میں حضرت محمد شاہ (م ۱۴۷۵ء) کا مزار دیکھنے گیا۔ گجرات میں ان کے بڑے عقیدت مند رہتے ہیں۔ گجرات کے سُنّی بوہروں میں آج تک یہ رسم چلی آتی ہے کہ وہ نومولود بچے کو ان کے مزار کے پائنتی لا کر رکھتے ہیں اور جب اسے مکتب میں بٹھاتے ہیں تو یہیں اس کی رسمِ بسم اللہ ادا کرتے ہیں۔

مزار سے ملحق ایک عظیم الشان لائبریری ہے جس کا شمار بھارت کے مشہور کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ مولانا محمد سورتی نام کے ایک نوجوان عالم اس لائبریری کے انچارج تھے انہوں نے مجھے تفسیر ابی سعود عمادی، علّامہ وجیہہ الدین گجراتی کا نقل کردہ مخطوطہ تفسیر بیضاوی، تفسیر غرائب القرآن، کتاب الفقہ حنفی تالیف ابو حفص نجم الدین عمر بن محمد مکتوبہ ۷۷۳ھ، ترغیب الصلوٰۃ محررہ ۶۵۹ھ، فتاویٰ تتار خانیہ، ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی کی تیسیر الاحکام، فوائد فیروز شاہی، مناقب العارفین، سفرنامۂ مخدوم جہانیاں، دیوان فیضی، دیوان نویدی، راگ درپن، جنگ نامہ اعظم شاہ و معظم شاہ، خیالات العشاق مؤلفہ قاضی حمید الدین ناگوری، مرصاد العباد اور عزۃ الازیاج (اس تصنیف کا دوسرا نام عزۃ الزیجات بھی ہے) کے نادر نسخے دکھائے۔ مؤخرالذکر کتاب حال ہی میں ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے شائع کر دی ہے۔

حضرت محمد شاہ کے مزار اور وقف کی آمدنی ایک لاکھ روپے سالانہ سے زائد ہے جو لائبریری اور درگاہ کی دیکھ بھال پر خرچ کی جاتی ہے۔ حضرت محمد شاہ قادری سلسلے کے بزرگ تھے اور ان کی والدۂ ماجدہ کا شجرۂ نسب حضرت بندہ نواز گیسو دراز سے ملتا ہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے جو درگاہ کمیٹی نے شائع کر دی ہیں۔

حضرت محمد شاہ قادری کے مزار سے قریب ہی حضرت وجیہہ الدین علوی گجراتی کا مزار ہے، جو مرجع خلائق ہے۔ حضرت وجیہہ الدین احمد آباد کے نامور عالمِ دین تھے اور دربار میں مفتیٔ اعظم کے عہدے پر فائز تھے۔ جب شیر شاہ سوری نے حضرت محمد غوث گوالیاری (م ۱۵۶۲ء) کو ہمایوں کے ساتھ تعلقات کی بنا پر تنگ کرنا شروع کیا تو موصوف گوالیار سے ترکِ وطن کرکے احمد آباد چلے آئے۔ یہاں انہوں نے معراج نامہ تصنیف کیا۔ اس کتاب کی علّامہ اقبال کو بڑی تلاش رہی، لیکن وہ اس کے حصول میں ناکام رہے۔ مجھے اس کا ایک نسخہ اسی سفر کے دوران مل گیا۔ اس تصنیفِ دلپذیر میں حضرت گوالیاری نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ بعض ناسمجھ لوگ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمانی معراج کا انکار کرتے ہیں اور یہاں انہیں کئی بار معراج ہوئی ہے۔ اس پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ شیخ علی متقی (م ۱۵۶۷ء) نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ داغ دیا۔ سلطان محمد شاہ ثالث (م ۱۵۵۴ء) نے حضرت گوالیاری کو دربار میں طلب فرمایا اور شیخ

وجیہہ الدین علوی سے اس فتویٰ کے بارے میں استفسار کیا۔ شیخ موصوف نے حضرت گوالیاری کا چہرہ مبارک دیکھتے ہی وہ فتویٰ پھاڑ ڈالا اور کہا ایسا شخص جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ شیخ علی متقی اپنے کپڑے پھاڑ کر وجیہہ الدین کے ہاں پہنچے اور ان سے کہنے لگے کہ وہ بدعت کی اشاعت اور دین میں رخنہ اندازی پیدا کرنے میں کس طرح راضی ہو گئے۔ شیخ وجیہہ الدین نے کہا کہ ہم اہلِ قال ہیں اور حضرت گوالیاری اہلِ حال، اس لئے ہم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ شیخ وجیہہ الدین حضرت گوالیاری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے مرید ہو گئے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ پہلے وہ مسِ خام تھے، شیخ کی صحبت میں رہ کر خاص سونا بن گئے ہیں۔

شیخ وجیہہ الدین علوی ۱۵۸۸ء میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ ان کے ملفوظات کا ایک نادر مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے جس کی تاریخی اہمیت پر راقم نے ۳۲ صفحات کا ایک مضمون لکھ کر اورینٹل کالج میگزین لاہور میں فروری ۱۹۸۰ء میں شائع کرایا تھا۔ اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں انہوں نے بڑا کام کیا ہے بلکہ اتنے صاف اور مکمل فقرے مجھے کسی دوسرے بزرگ کے ملفوظات میں نظر نہیں آئے۔

احمد آباد کی ایک نواحی بستی سرکھیج کہلاتی ہے۔ شاید یہ سرخیز کی بگڑی ہوئی صورت ہو۔ احمد آباد ریلوے اسٹیشن سے وہاں تک بس جاتی ہے۔ میں قریباً پون گھنٹے میں سرکھیج پہنچ گیا۔ وہاں حضرت شیخ احمد کھٹو گنج بخش (م ۱۴۴۶ء) کا روضہ ہے جو کسی نواب کا محل معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی (م ۱۹۸۴ء) جیسے ماہرِ فنِ تعمیرات نے اسے مغربی ہندوستان میں سب سے شاندار سنگی عمارت قرار دیا ہے۔ ان کے ملفوظات تحفۃ المجالس کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے ملفوظات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ ہزاروں افراد کو اپنے ساتھ سمرقند لے گیا۔ ان اسیروں میں شیخ موصوف بھی تھے۔ اثنائے سفر امیر تیمور کو ان کی بزرگی کا علم ہوا تو انہیں اپنا مصاحب بنا لیا۔ امیر تیمور کی مجلس میں حضرت شیخ اور مولانا عبدالاول نبیرۂ مولانا برہان الدین مرغینانی صاحبِ ہدایہ کے درمیان کئی موضوعات پر علمی مباحثے ہوئے اور امیر تیمور ان کی علمیت اور روحانیت کا قائل ہو گیا۔ امیر نے انہیں دہلی جانے کی

اجازت دے دی اور ان کی سفارش پر صدہا افراد کو رہا کر دیا ۔ اس حقیقت کا کسی مؤرخ نے ذکر نہیں کیا ۔

شیخ احمد کھٹو کا اختیاری وطن کھاٹو تھا جو راجستھان میں بہترین قسم کے سنگِ مرمر کی کانوں کے لئے مشہور ہے ۔ ان کا تعلق تصوف کے سلسلۂ مغربی کے ساتھ تھا اور ان کی عمر کا آخری حصہ احمد آباد میں گزرا ۔ احمد آباد کی بنیاد احمد نام کے چار شخصوں نے مل کر رکھی تھی ، ان میں آپ کے علاوہ سلطان احمد ، ملک احمد اور قاضی احمد بھی تھے ۔ سلاطینِ گجرات پر ان کا بھی بڑا اثر تھا ۔ گجرات کا سب سے مشہور سلطان محمود بیگڑہ بھی ان کی درگاہ کے احاطے میں دفن ہے ۔ یہاں درویش کا مزار سلطان کے مزار سے کہیں زیادہ شاندار ہے ۔

اس روز جمعہ تھا ۔ میں نے جمعہ کی نماز شہر کی جامع مسجد میں ادا کی ۔ یہ مسجد زرد رنگ کے پتھروں سے تعمیر ہوئی ہے اور ستونوں اور چھتوں پر ہندو اثرات نمایاں ہیں ۔ مسجد بہت وسیع ہے ۔ مسجد کے شمالی دروازے کے باہر سلطان احمد (م ۱۴۴۳ء) کا مزار ہے جو اس مسجد کے بانی تھے ۔ میں نے دیکھا کہ نماز کے بعد لوگ بکثرت اس کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے جا رہے ہیں ۔

میں نے احمد آباد میں ایک عجب منظر دیکھا ۔ ہندوؤں کی کوئی نیچ ذات ہے ۔ اس کا ایک فرد مر گیا تھا ۔ صدہا مرد اور عورتیں اس کی ارتھی کے ساتھ گاتے بجاتے اور ہوا میں گلال اڑاتے ہوئے جا رہے تھے ۔ مُردے کو لٹانے کی بجائے بٹھایا ہوا تھا اور اس کا چہرہ بھی گلال سے رنگا ہوا تھا ۔ میرے استفسار پر ایک شخص نے بتایا کہ اس قوم کے افراد اپنے مُردے اسی انداز سے مرگھٹ تک لے جاتے ہیں ۔

احمد آباد میں اگرچہ ہندوؤں کی اکثریت ہے ، اس کے باوجود شہر کی تہذیب و ثقافت پر مسلمانوں کی چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے ۔ چاروں طرف مساجد اور مقابر نظر آتے ہیں ۔ احمد آباد کی مساجد میں جامع مسجد کے علاوہ رانی سپری کی مسجد اور جالی والی مسجد قابلِ دید ہیں ۔ ہندوؤں کے منادر چھوٹے چھوٹے ہیں جو مکانوں میں گھر جانے کی وجہ سے نظر نہیں آتے ۔

احمد آباد میں تین روز قیام کرنے کے بعد میں گیارہ بجے قبل دوپہر ایک بس میں

سوار ہو کر اُودے پور روانہ ہوا ۔ بس کا مسلمان مالک بھی ہمارے ساتھ بس میں سوار تھا ۔ بس میں آیت الکرسی اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی تصویریں آویزاں تھیں ۔ دو اڑھائی گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد بس ایک بہت بڑے مندر کے پاس رکی ۔ مسافر چائے پینے کے لئے بس سے اتر گئے ۔ اس مندر کے علاوہ دُور دُور تک آبادی کا نشان نہ تھا ۔ مندر بہت وسیع تھا اس کا احاطہ لاہور کی بادشاہی مسجد جتنا ہو گا ۔ وہاں سے چل کر ہم نماز مغرب سے پہلے اُودے پور پہنچ گئے ۔

میں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا ۔ مغرب کے بعد میں کھانا تناول کرنے کے لئے بازار میں نکلا ۔ اتفاق سے مجھے اسی بس کے دو مسافر مل گئے ۔ میں نے ان سے اُودے پور میں کسی اچھے ہوٹل کے بارے میں دریافت کیا جہاں مجھے اچھا کھانا مل جائے ۔ انہوں نے فوراً سوال کیا ہندو ہوٹل یا مسلمان ؟ میں نے کہا کہ اگر مسلمان ہوٹل مل جائے تو میں گوشت کھاؤں گا ۔ انہوں نے کہا کہ میں اسی سڑک پر چلتے ہوئے ہتھیا پول چلا جاؤں ۔ ہتھیا پول پرانے شہر کا ایک دروازہ ہے جہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد آباد ہے ۔ سنا ہے کہ جب اکبر اعظم نے رانا پرتاپ کے خلاف چڑھائی کی تھی اس وقت ہتھیا پول کے مسلمانوں نے رانا کی حمایت میں دادِ شجاعت دی تھی ۔ اس بنا پر راجپوت ان کا بڑا لحاظ کرتے ہیں ۔ ہتھیا پول کے باہر ایک لائبریری بھی نظر آئی جس پر " سیدنا طاہر سیف الدین لائبریری " کا بورڈ آویزاں تھا ۔ یہ بوہروں کی لائبریری تھی اور عشاء کے وقت لوگ مطالعہ میں مصروف تھے ۔ لائبریری کے قریب ہی ایک ہوٹل تھا جہاں میں نے کھانا کھایا اور بازاروں میں گھوم پھر کر اپنی قیام گاہ پر واپس آ گیا ۔

اگلے روز میں نے چتوڑ جانا تھا ۔ میں اپنا سامان اٹھا کر ریلوے اسٹیشن پہنچا ۔ میں چند منٹ تاخیر سے وہاں پہنچا ۔ میں ابھی اسٹیشن سے باہر ہی تھا کہ ریل چل دی ۔ مجبوراً میں بس اسٹینڈ پر آیا اور بذریعہ بس چتوڑ پہنچ گیا ۔ دوپہر کا کھانا ایک معمولی سے ریسٹورنٹ میں کھایا ۔ وہاں باجرے کے آٹے کے پیڑے اُپلوں کی آگ میں دبا دیتے ہیں اور پکنے پر انہیں توڑ کر گاہکوں کے آگے رکھ دیتے ہیں ۔ میں نے دال بھاجی کے ساتھ چاول کھائے ۔ یہ ریسٹورنٹ قلعہ کی فصیل سے قریب تھا ۔ قلعہ ایک پہاڑی پر ہے اور اس کی فصیل محفوظ ہے ۔ قلعے کے اندر ایک ہندو وضع کا " وکٹری ٹاور " بنا ہوا ہے ، جسے

رانا کمبھا نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کے ماڈل بازار میں دستیاب تھے۔ رانا پرتاپ کو چتوڑ پر بڑا ناز تھا۔ میں نے وہاں جا کر اندازہ لگایا کہ چتوڑ تک پہنچنے کے لئے کئی تنگ دروں سے گزرنا پڑتا ہے۔ راجپوت بڑی آسانی کے ساتھ حملہ آوروں کو ان دروں میں روک سکتے تھے۔ دروں میں بھی فصیلیں اور تنگ دروازے نظر آرہے تھے جو اس زمانے کی یادگار تھے۔

اکبر نے رانا پرتاپ کو ۱۵۷۶ء میں ہلدی گھاٹ کی تاریخی جنگ میں فیصلہ کن شکست دی۔ رانا پرتاپ نے بمشکل اپنی جان بچائی۔ اس روز اس نے یہ عہد کیا کہ جب تک وہ چتوڑ واپس نہیں لے لے گا، وہ زمین پر سوئے گا اور اپنے سر میں تیل نہیں ڈالے گا، وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہ حسرت دل میں لے کر دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کے سپاہیوں کی اولاد قیام پاکستان تک خانہ بدوشوں جیسی زندگی بسر کرتی رہی۔ آزادی کے بعد پنڈت جواہر لعل نہرو انہیں لے کر ایک قافلے کی شکل میں فاتحانہ انداز میں چتوڑ میں داخل ہوئے اور یوں رانا پرتاپ کا عہد پورا کیا۔

چتوڑ سے روانہ ہو کر میں شام کو عصر کے قریب بھیل واڑہ پہنچ گیا۔ یہ ایک اچھا خاصہ شہر ہے۔ وہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے رکے اور چائے پی کر آگے روانہ ہوئے۔ میں نے اس کا اچھی طرح مشاہدہ کیا کہ راجستھان اتنا خشک نہیں ہے جتنا ظاہر کیا جاتا ہے۔ میں جس راستے سے گزرا ہوں اس میں ندیاں، نالے اور سرسبز کھیت دکھائی پڑتے تھے۔ اگر پانی اور درخت نہ ہوں تو اس علاقے میں شیر کیونکر زندہ رہ سکتے ہیں؟

بھیل واڑہ سے چل کر میں مغرب کے بعد دوبارہ اجمیر پہنچ گیا۔ رات اسی ہوٹل میں گزاری جہاں پہلے رہا تھا۔ صبح کو خواجہ صاحب کی درگاہ پر حاضری دے کر دہلی روانہ ہو گیا۔

کاندھلہ اور اس کے مضافات

۱۵ اگست ۱۹۸۶ء کو میں علی الصبح دہلی سے کاندھلہ روانہ ہوا۔ دہلی سے کاندھلے کا فاصلہ سڑک کے راستے ۸۰ کلو میٹر ہے۔ راستے میں لونی اور باغپت نام کے دو تاریخی قصبے آتے ہیں۔ لونی کا ذکر اٹھارہویں صدی کے وسط میں مرہٹوں، روہیلوں اور جاٹوں کے درمیان ہونے والی جنگوں میں آتا ہے۔ سعادت یار خان رنگین کے والد اور مشہور مؤرخ طہماس خان (م ۱۸۰۳ء) نے اپنی تصنیف "طہماس نامہ" میں لونی کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ اب تک وہاں ایک ٹیلے پر قلعے کے بچے کچھے آثار نظر آتے ہیں۔

لونی کے بعد باغپت آتا ہے۔ دہلی سے باغپت کا فاصلہ ۴۴ کلو میٹر ہے۔ بھارت کے ایک سابق وزیر اعظم چوہدری چرن سنگھ (م ۱۹۸۷ء) یہیں کے رہنے والے تھے۔ اس علاقے میں جاٹوں کے علاوہ مسلمان بھی بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ جاٹ برادری کے سربراہ ہونے کے باوجود پارلیمنٹ کے انتخاب میں کامیابی کے لئے چوہدری صاحب کو مسلمانوں کے ووٹوں کی ضرورت رہتی تھی چنانچہ الیکشن کے زمانے میں ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگائے جاتے تھے۔ میں نے باغپت سے گزرتے ہوئے دیواروں پر "جٹوا کٹوا بھائی بھائی" کے اشتہارات لگے ہوئے دیکھے۔ میرے استفسار پر قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (م ۱۹۹۱ء) کے فرزند زین الساجدین نے بتایا کہ کٹوا کے معنی مختون ہیں۔ مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے چوہدری چرن سنگھ اور ان کی جاٹ برادری مسلمانوں کی طرف وقتی طور پر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے۔

باغپت سے چل کر بڑوت پہنچتے ہیں۔ ان دونوں قصبوں کے درمیان ۲۹ کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ بڑوت سے ایک سڑک میرٹھ کی طرف مڑ جاتی ہے اور دوسری کاندھلہ، شاملی تھانہ بھون، ننوتہ اور رام پور منہاراں ہوتی ہوئی سہارنپور چلی جاتی ہے۔ سردھنہ جانے والے مسافر بڑوت سے بس تبدیل کرتے ہیں۔ سردھنہ کی شہرت بیگم سمرو (م ۱۸۳۶ء) کی وجہ سے ہوئی جس نے وہاں ایک عالی شان گرجا تعمیر کیا تھا۔ بیگم سمرو کی قبر بھی اسی

گڑھے میں ہے۔ میرے بچپن میں مشہور ناول نگار محمد صادق سردھنوی نے اس قصبے کو چار دانگ عالم میں مشہور کر دیا تھا۔ بڑوت میں بس کچھ دیر تک رکتی ہے۔ مسافر سکنجبین اور سوڈا واٹر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بڑوت سے چل کر میں جلد ہی کاندھلہ پہنچ گیا۔

میں نے ایک رکشا میں اپنا سامان رکھا اور اسے محلہ مولویاں چلنے کو کہا۔ پرانے زمانے کی گلیوں میں سے گھومتے ہوئے رکشا محلہ مولویاں پہنچ گیا۔ میں نے ایک کتب فروش سے نورالحسن راشد کے گھر کا پتہ پوچھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ان کا گھر تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ کتب فروش ان کے چچازاد بھائی تھے۔

نورالحسن راشد، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے تلمیذ رشید مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (م ۱۸۲۹ء) کے احفاد میں سے ہیں۔ انہوں نے مفتی صاحب کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے "مفتی الٰہی بخش اکیڈمی" بھی بنائی ہوئی ہے۔ انہوں نے ایک چارٹ تیار کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے اس وقت برِّعظیم پاک و ہند میں کوئی عالمِ دین ایسا نہیں جس کا سلسلۂ تلمذ چند واسطوں سے مفتی الٰہی بخش سے نہ ملتا ہو۔ اس چارٹ میں علمائے دیوبند، علمائے سہارنپور اور علمائے انبہٹہ کے اسمائے گرامی دیکھ کر مفتی صاحب کی علمی اور دینی خدمات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

نورالحسن راشد ابھی نوجوان ہیں۔ ان کے والد بزرگوار مفتی افتخار الحسن صاحب، شاہ عبدالقادر رائپوری رحمۃ اللہ علیہ کے اکابر خلفاء میں شمار ہوتے ہیں۔ اضلاع سہارنپور، میرٹھ اور مظفر نگر میں ان کا فتویٰ چلتا ہے۔ ان اضلاع کے دینی مدارس ان کی سرپرستی کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ مفتی صاحب کاندھلے کے ایک کھاتے پیتے زمیندار ہیں۔

میں جس مکان میں ٹھہرا تھا وہ مفتی افتخار الحسن صاحب کی ملک تھا۔ یہ وہی مکان ہے جس میں تبلیغی جماعت کے بانی حضرت مولانا محمد الیاسؒ (م ۱۹۴۴ء) کی ولادت ہوئی تھی۔ اس کے سامنے گلی کے پار وہ تاریخی مکان تھا جس میں جنگِ شاملی میں شکست کے بعد کچھ عرصے کے لئے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۸۹۹ء) نے ایک خفیہ مینارہ نما کمرے میں پناہ لی تھی۔ یہ مکان اب ظہیر الحسن کی ملک ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں اور نورالحسن راشد کیرانہ روانہ ہوئے۔ کاندھلہ سے کیرانہ زیادہ دور نہیں ہے۔ بس وہاں بیس منٹ میں پہنچا دیتی ہے۔ مجھے اب یاد نہیں رہا کہ کاندھلے سے کیرانے کا فاصلہ سات میل ہے یا نو میل۔ کیرانہ ایک قدیم بستی ہے اور برِّعظیم پاک و ہند میں موسیقی کا ایک گھرانہ کیرانے کی جانب منسوب ہے۔ پاکستان میں ملکۂ موسیقی روشن آرا، بیگم اسی گھرانے کی نمائندہ تھیں۔ کیرانے کے کھیتوں میں قدیم زمانے کے مقبرے موجود ہیں جن کے بارے میں اب کسی کو علم نہیں کہ وہ کن کے مقبرے ہیں۔ اس قصبے کی نسبت راجہ کرن پال دت کی جانب ہے۔ اسی کے نام کی مناسبت سے یہ کیرانہ کہلاتا ہے۔

نورالحسن راشد مجھے محلہ خیل میں توفیق احمد نامی ایک صاحبِ ذوق سے ملانے لے گئے۔ میں ان کے نام اور کام سے ناواقف تھا۔ ان کے پاس جا کر یہ بات کھلی کہ وہ تو میرے قریبی رشتے دار ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم (م ۱۹۸۵ء) کے بھانجے مصطفیٰ احمد علوی ان کے برادر نسبتی ہیں۔ توفیق صاحب نے ہی مجھے بتایا کہ انہوں نے تھوڑی دیر پہلے ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والے خبرنامے میں ڈاکٹر سید عبداللہ (م ۱۹۸۶ء) کی رحلت کی خبر سنی ہے۔ سید صاحب کے اس عاجز کے ساتھ بڑے اچھے مراسم تھے اور اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ کے دفتر میں ان کے ساتھ اکثر گپ شپ رہتی تھی۔ اس لئے یہ خبر سن کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔

کیرانہ سے چل کر ہم جھنجھانہ پہنچے۔ دونوں قصبوں کے درمیان نو میل کا فاصلہ ہے۔ بس قریباً بیس منٹ میں جھنجھانہ پہنچا دیتی ہے۔ یہ قصبہ راجہ جھن جھن بدری پرشاد کی راجدھانی تھی اور اسی کے نام کی مناسبت سے اس کا نام جھنجھانہ پڑ گیا۔ یہ بارہ تیرہ ہزار کی آبادی کا قصبہ ہے جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ آبادی سے باہر جانبِ مغرب ایک وسیع قبرستان ہے جس میں بیشتر قبروں کے نشان مٹ چکے ہیں۔ اس قبرستان میں ایک جدید تعمیر شدہ مسجد کے شمال میں ایک چھوٹے سے احاطۂ قبور میں حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانویؒ (م ۱۸۴۳ء) محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کے مزارِ مبارک کے سرہانے جو کتبہ نصب ہے اس پر ان کے مرید خاص حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۸۹۹ء) کی ایک طویل منقبت سے لئے گئے چند اشعار کندہ ہیں۔

ان اشعار کے ایک ایک لفظ سے حاجی صاحب کی اپنے مرشد اور ان کے مسکن کے ساتھ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے وہ منقبت یوں ہے:

شہر جھنجھانہ ہے اک جائے ہدیٰ
مسکن و ماویٰ ہے اس جا آپ کا
مولد پاک آپ کا ہے اور مزار
اس جگہ تو جان لے اے ہوشیار
متصل اس شہر کے اے نیک نام
ہے عجب دلچسپ درگاہ امام
شیخ محمود ہے نام شریف
ہے مکاں وہ بس عجیب و بس لطیف
پاس اس مرقد کے قبلہ رخ بنی
ہے زیارت گاہ میرے پیر کی
اس جگہ ہے مرقد پاک جناب
سر جھکاتے ہیں جہاں سب شیخ و شاب
سارے عالم پر ہے پرتو آپ کا
کونسی جا وہ نہیں جلوہ نما
جس کو ہوئے شوق دیدار خدا
ان کے مرقد کی کرے زیارت وہ جا
چاہیے تجھ کو اگر وصل خدا
سایۂ نور محمدیہ میں تو آ
اعتقاد دل سے جو جائے وہاں
اس پر سب اسرار باطن ہوں عیاں
دیکھتے ہی ان کے مجھ کو ہے یقین
اس کو ہو دیدار رب العالمین

گرچہ یاں سے کر گئے ہیں انتقال
فیض باطن ہے ولے ان کا بحال
یعنی پیر و مرشد و مولے میرے
حضرت نور محمد نیک پے
بارہ سو انسٹھ میں کر گئے انتقال

میانجیو نور محمد کا مولد و مدفن تو جھنجھانہ ہے لیکن ان کی عمر عزیز کا بیشتر حصہ "لوہاری" میں گزرا۔ یہ تاریخی قصبہ اس راستے پر تھا جس سے بنگال و بہار سے خفیہ طور پر مجاہدین بالا کوٹ اور پھر ان کے جانشینوں کو مالی امداد بھیجی جاتی تھی۔ لوہاری میں میانجیو مقیم تھے جو اگلی منزل تک اس رقم کو پہنچانے کے ذمہ دار تھے۔ انہوں نے اخفائے حال کے لئے لوہاری کی مسجد میں دو روپے ماہانہ پر امامت کے فرائض سنبھال لئے تھے۔ لوہاری کی مسجد کے جس حجرے میں آنجناب کا قیام تھا اس کے بارے میں ایک بار حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا کہ انہوں نے جو انوار وہاں مشاہدہ کئے ہیں ویسے انوار دائرۂ شاہ علم اللہ (م ۱٦۸۵ء) رائے بریلی کے علاوہ اور کہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔ حضرت میانجیو کا مجاہدہ اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ ایک بار انہوں نے فرمایا کہ وہ بطورِ فخر نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر کہتے ہیں کہ گزشتہ تیس برسوں سے ان کی تکبیرِ اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔ میانجیو کے خلفاء میں حافظ محمد ضامن شہید (م ۱۸۵۷ء) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۸۹۹ء) اور شیخ محمد فاروقی تھانوی (م ۱۸۷۹ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے حاجی صاحب سے فیضِ عام ہوا اور برِ عظیم پاک و ہند کے نامور علماء مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا اشرف علی تھانوی اور فیض الحسن سہارنپوری ان سے بیعت ہوئے۔ ایک بار مولانا محمد قاسم نانوتوی سے کسی نے استفسار کیا کہ اتنے بڑے بڑے علماء حاجی صاحب سے کیونکر بیعت ہوئے؟ اس پر مولانا نے فرمایا "بھائی! ہم نے دین کتابوں میں پڑھا ہے اور حاجی صاحب نے بزرگوں سے سیکھا ہے"۔ ایک بار کسی شخص نے مولانا محمد قاسم نانوتوی سے پوچھا کیا حاجی صاحب بھی عالم ہیں؟ مولانا صاحب نے فرمایا "عالم ہونا کیا معنی اللہ تعالیٰ نے انہیں عالم گر بنایا ہے"۔

میں نے عصر کی نماز میانجیو نور محمد رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے ملحقہ مسجد میں ادا کی اور چلتے وقت ان کی قبرِ پُرانوار سے تھوڑی سی مٹی بھی اٹھا لی۔ میں اس متبرک مٹی کو لاہور لے جا کر اپنے والد بزرگوار کی قبر پر ڈالنا چاہتا تھا لیکن افتادِ سفر میرا وہ سوٹ کیس چوری ہو گیا جس میں یہ تبرک محفوظ تھا۔

قصبے کے اندر میانجیو کا مکان دیکھا۔ گو اب اس کی ہیئت تبدیل ہو گئی ہے لیکن مکان کو مکین کے ساتھ نسبت ہوتی ہے۔ اسی نسبت کا خیال کرتے ہوئے میں نے صحن میں لگے ہوئے ایک ہینڈ پمپ کا پانی پیا۔

میانجیو کے اس مکان سے قریب ہی حضرت شاہ عبدالرزاق علوی جھنجھانوی (م ۱۵۴۲ء) کا روضہ ہے جو عرفِ عام میں نیلا روضہ کہلاتا ہے۔ مزار کی عمارت جہانگیر کے عہد (۱۶۲۷ء - ۱۶۰۵ء) میں تعمیر ہوئی تھی۔ جھنجھانہ اور اس کے گرد و نواح میں بسنے والے علویوں کا شجرۂ نسب شاہ عبدالرزاق علوی سے جا ملتا ہے۔ مزار سے ملحق ایک مسجد ہے، جہاں چند حضرات سے ملاقات ہوئی۔ مزارِ مبارک سے قریب ہی ایک کتاب فروش سے "سوانح قطب العالم حضرت میانجیو نور محمد صاحب علوی جھنجھانوی" کا ایک نسخہ خریدا جو میرے سامان کے ساتھ ہی چوری ہو گیا۔ میری استدعا پر نور الحسن راشد نے اپنا نسخہ مجھے بھیج دیا۔ اس پر ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حواشی ہیں جن میں انہوں نے کئی تاریخی غلطیوں کی تصحیح کی ہے۔

میانجیو نور محمد رحمہ اللہ امام ناصر الدین محمود شہید سبزواری (م ۱۱۹۲ء) کے مزارِ مبارک سے ملحقہ قبرستان میں دفن ہیں۔ اس قبرستان میں اور جھنجھانہ کے مختلف مقامات پر بہت سے شہداء کے مزارات ہیں جو ذوقِ جہاد میں امام صاحب کے ساتھ خراسان سے اس دیار میں آئے تھے۔

امام ناصر الدین محمود، سلطان شہاب الدین محمد غوری سے پہلے ایک چھوٹے سے لشکر کے ساتھ بغرضِ جہاد یہاں آئے تھے۔ کسی مورخ نے ان کی آمد کا ذکر نہیں کیا۔ حال ہی میں "کتاب الشہادت" کے عنوان سے ایک مخطوطہ جھنجھانہ میں دریافت ہوا جس میں امام ناصر الدین محمود اور جھنجھانہ کے والی راجہ جھن جھن بدری پرشاد کے مابین ہونے والی جنگ کا ذکر آیا ہے۔ اس میں امام صاحب کے ساتھ شہید ہونے والے شہداء

کے اسمائے گرامی بھی درج ہیں۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، اُستاد شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی جو فارسی کتابوں کو اُردو کے قالب میں ڈھالنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں، فوراً جھنجھانہ گئے اور "کتاب الشہادت" کی نقل لے آئے۔ انہوں نے "تاریخ محمودی" کے عنوان سے اس کا اُردو ترجمہ ۱۹۷۱ء میں شائع کر کے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

تاریخ محمودی کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ امام ناصر الدین محمود کے ساتھیوں نے اضلاع کرنال، سہارنپور اور مظفر نگر میں ہندوؤں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ بابر پہلا حملہ آور تھا جس نے آتشیں اسلحہ استعمال کیا۔ تاریخ محمودی میں مرقوم ہے کہ امام ناصر الدین محمود کے ساتھیوں نے آتشیں ہتھیار استعمال کئے تھے۔ ہندوؤں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے کرنال کے مقام پر امام موصوف کی انگشتِ سبابہ شہید ہو گئی، اسے بڑے احترام کے ساتھ دفن کیا گیا۔ ان کا دستِ مبارک بنت میں اور سرِ مبارک جھنجھانہ میں شہید ہوا۔ ان کا جسدِ مبارک بڈھانہ میں دفن ہوا۔ ان تمام مقامات پر ان کے مزار موجود ہیں۔ ان معرکوں میں جلال الدین کاشغریؒ نے بڑی شجاعت کا مظاہرہ کیا اور وہ "شاہ قتال" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اسی طرح ان کے ایک ساتھی امام رکن الدین ابوالفتحؒ نے بھی بڑی بہادری دکھائی۔ ان شہداء کے مزار جھنجھانہ اور اس کے گرد و نواح میں موجود ہیں۔

کسی صاحبِ کشف بزرگ نے ایک بار میانجیو نور محمد کے مزار پر حاضری دی۔ کچھ دیر مراقبہ کے بعد انہوں نے سر اٹھایا اور حاضرین سے کہا کہ میانجیو کو یہاں نہیں دفنانا چاہیے تھا۔ وہ امام ناصر الدین محمود کے احترام کی وجہ سے اپنے کمالات اور فیوض چھپا رہے ہیں۔ جھنجھانہ سے بس میں سوار ہو کر ہم شاملی پہنچے۔ ان دونوں قصبوں کے درمیان نو میل کا فاصلہ ہے۔ ہم نے مغرب کی نماز ذرا تاخیر سے اس مسجد میں ادا کی جس میں معرکۂ شاملی میں زخمی ہو کر حافظ محمد ضامن نے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی تھی۔ راشد صاحب نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں حافظ صاحب شہید ہوئے تھے۔ راقمِ آثم نے عین اسی جگہ نماز ادا کی۔ مسجد کے عقب میں ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے جہاں درختوں کے جھنڈ میں چند قبروں کے نشان موجود ہیں۔ یہ ان مجاہدین کی قبریں ہیں جو معرکۂ شاملی میں انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔

شاملی، دہلی کو سہارنپور سے ملانے والی شاہراہ پر ایک مشہور قصبہ ہے۔ یہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے۔ یہ علاقہ مرچوں کی پیداوار کے لئے مشہور ہے اس لئے بازاروں میں اسی جنس کا کاروبار ہوتا ہے۔ شاملی سے ہم کاندھلہ واپس آگئے۔ یہ نو ذی الحجہ کی شب تھی۔

اگلے روز عید الاضحیٰ تھی۔ نمازِ فجر ادا کرکے میں نے نمازِ عید کی تیاری شروع کر دی۔ نمازی ظہیر الحسن کے مکان کے سامنے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جب ان کی تعداد بڑھ گئی تو مفتی افتخار الحسن صاحب تشریف لائے۔ ان سے ابھی تک ملاقات نہ ہو سکی تھی حالانکہ میں انہیں کے ہاں قیام پذیر تھا۔ موصوف بڑی شفقت کے ساتھ پیش آئے۔ تھوڑی دیر بعد مفتی صاحب جلوس کی صورت میں عید گاہ پہنچے۔ وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مفتی صاحب کے برادر زادے نے مسائل عید بتائے۔ مفتی صاحب نے نماز پڑھائی اور خطبۂ عید ارشاد فرمایا۔ واپسی پر کاندھلہ میونسپل کمیٹی کے صدر محمد شفیع صاحب سے ملاقات کی اور راقم نے انہیں عید کی مبارک باد دی۔ بھارت میں گئو کشی قانوناً منع ہے اس لئے مسلمانوں کو بھینسوں کی قربانی کرتے ہوئے دیکھا۔ میرے لئے یہ ایک عجیب منظر تھا۔ جگہ جگہ بھینسیں اور بھینسے ذبح کئے جا رہے تھے۔ واپسی پر ہم نے مفتی الٰہی بخش کاندھلوی اور ان کے فرزند ابو الحسن کے مزاروں پر فاتحہ خوانی بھی کی۔

نور الحسن راشد کے مکان سے قریب ہی مولانا محمد ادریس کاندھلوی (م ۱۹۷۴ء) اور مولانا محمد مالک کاندھلوی (م ۱۹۸۸ء) کا آبائی مکان دیکھا۔ لاہور واپسی پر ایک تقریب میں مولانا محمد مالک سے میں نے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا" اچھا! میں بڑی دیر سے یہ سوچ رہا تھا کہ یہ خوشبو کہاں سے آرہی ہے۔ ایک بات اطمینان بخش ہے کہ اس مکان میں اب بھی مسلمان ہی رہتے ہیں"۔ ان کے مکان سے قریب ہی محمد زکی صاحب کا گھر تھا جن کا ذکر "جہان دانش" میں احسان دانش نے کیا تھا۔ انہی کی صحبت میں رہتے ہوئے انہیں شعر و سخن کا چسکہ پڑا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر جامع مسجد تھی جو قابل دید ہے۔ اس میں بڑے بڑے علماء اور صلحاء نے نمازیں ادا کی ہیں۔ جامع مسجد کے بالمقابل ابرار احمد مرحوم کی حویلی تھی۔ ان کی مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم سے

عزیز داری بھی تھی۔ مولانا اکبر آبادی کے والدِ مرحوم ڈاکٹر ابرار حسین (م ۱۹۵۴ء) اور ابرار احمد حضرت شاہ عبد الغنی منگلوری (م ۱۹۲۸ء) کے غالی مرید تھے۔ ابرار احمد صاحب کا چند ماہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے میں ان کے داماد فیضی صاحب سے ملنے گیا۔ انہوں نے اہل خانہ کی فرداً فرداً خیریت دریافت کی اور تواضع فرمائی۔

دوپہر کا کھانا تناول کرنے کے بعد میں اور نور الحسن راشد کاندھلہ سے شاملی پہنچے اور وہاں سے مظفر نگر جانے والی بس میں سوار ہوئے۔ دو میل کے فاصلے پر "بنت" آتا ہے۔ یہ بھی تاریخی قصبہ ہے۔ امام ناصر الدین محمود کا ایک ہاتھ وہاں دفن ہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے پروگرام پروڈیوسر ضمیر کاظمی بھی یہیں کے رہنے والے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی والدۂ ماجدہ کے ماموں ڈاکٹر زبید احمد، جنہوں نے India.s Contribution To Arabic Literature کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تھی۔ وہ بھی بنت ہی کے رہنے والے تھے۔ اس مقالے کا اُردو ترجمہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

بنت کی نسبت راجہ بنت راؤ کی طرف ہے۔ وہ جھنجھانہ کے والی راجہ جھن جھن بدری پرشاد کا باج گزار تھا۔ بنت سے چند میل کے فاصلے پر بگھرہ آتا ہے۔ دیو بند کے بہت سے فاضلین اس گاؤں کی جانب منسوب ہیں۔ احسان دانش کے شیخ طریقت تفضل علی بھی بگھرہ کے رہنے والے تھے۔

بگھرہ سے چند میل کے فاصلے پر مظفر نگر ہے۔ میں نے وہاں پولیس کے دفتر میں اپنی آمد کا اندراج کرانا تھا۔ اس لئے سب سے پہلے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر میں گئے۔ وہاں اپنی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی اپنی روانگی بھی درج کروا دی۔ پولیس کے دفتر سے نکل کر ہم محلہ نالہ پار میں ایک صاحب سے ملنے گئے۔ وہیں ایک اور صاحب آگئے۔ انہوں نے ہمیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ وہیں باتوں باتوں میں یہ انکشاف ہوا کہ وہ میرے مرحوم دوست علامہ منظور احمد عثمانی کے برادر زادے ہیں۔ ان کے ڈرائنگ روم میں ان کے والدِ مرحوم کی تصویر دیوار سے لٹک رہی تھی جو اپنے بھائی سے بڑی مماثلت رکھتے تھے۔ علامہ صاحب کے فرزند ارجمند سلطان عالم عثمانی پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ عمرانیات میں اُستاد ہیں۔ اس لئے مظفر نگر میں ان کے اعزاء سے مل کر مجھے بڑی خوشی

ہوئی۔

مظفر نگر میں میرے دیکھنے کی دو جگہیں تھیں۔ عید گاہ اور مسجدِ سواراں۔ راشد صاحب ان دونوں سے بخوبی واقف تھے۔ عید گاہ طہماس خان (م ۱۸۰۳ء) کے فرزند شہباز بیگ (م ۱۸۳۹ء) کی تعمیر کردہ تھی۔ میں نے طہماس خان کی تصنیفِ دلپذیر "طہماس نامہ" کا فارسی متن شائع کیا تھا۔ اس لئے مجھے ان سے اور ان کی اولاد سے ایک قدرتی لگاؤ تھا۔ عید گاہ دیکھ کر ہم مسجدِ سواراں دیکھنے گئے۔ اس مسجد سے ملحق سواروں کا پڑاؤ تھا جس کے چاروں جانب رہائش کے لئے کوٹھریاں تعمیر کی گئی تھیں اور اب اسے شادی گھر میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس پڑاؤ سے ملحق ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو شہباز بیگ کی تعمیر کردہ تھی۔ اس مسجد میں ہم نے عصر کی نماز ادا کی۔ مسجد کے ساتھ امام صاحب کی رہائش گاہ ہے۔ اس کے صحن میں شہباز بیگ کی قبر ہے۔ امام صاحب راشد صاحب سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے گھر میں پردہ کرانے کے بعد ہمیں اندر بلایا۔ شہباز بیگ کی قبر زمین کے برابر تھی۔ اس کے گرد سنگِ مرمر کا حاشیہ بنا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا پتھر ان کے پائنتی جانب دیوار میں نصب تھا اور دوسرا پتھر قبلہ رُخ دیوار میں۔ اِمتدادِ زمانہ سے حروف مٹ چکے تھے اس لئے باوجود کوشش کے کچھ پڑھے نہ جا سکے۔

مظفر نگر سے ہم بذریعہ بس بڈھانہ روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں بس رکی۔ راشد صاحب نے بتایا کہ اسے شاہ پور کہتے ہیں اور اسے خاقانیٔ ہند محمد ابراہیم ذوق (م ۱۸۵۴ء) اور محمد یحییٰ تنہا (م ۱۹۶۹ء) کا وطنِ مالوف ہونے کا شرف حاصل ہے۔ میں بس سے اترا اور ایک ہینڈ پمپ سے "ترکاً" پانی کے دو گھونٹ پیے۔ شاہ پور سے تھوڑی سی مسافت طے کر کے ہم بڈھانہ پہنچ گئے۔ مظفر نگر سے بڈھانہ کا فاصلہ ۲۴ میل ہے۔

بڈھانہ ہنڈن ندی کے کنارے آباد ہے۔ اس ندی کا ذکر اٹھارہویں صدی میں جاٹوں، مرہٹوں اور روہیلوں کی جنگوں میں بار بار آتا ہے۔ اس قصبے کو بودھن سنگھ نے آباد کیا تھا جو راجہ بھگن بھگن بدری پرشاد حاکم بڈھانہ کا باجگزار تھا۔ بڈھانہ ایک تاریخی بستی ہے۔ وہاں شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۷۶۲ء) کے خاندان کے مکانات کھنڈروں کی صورت میں دیکھے۔ ان کی ویرانی دیکھ کر بڑا رنج ہوا۔ اس قصبے میں اورنگ زیب عالمگیر

کے زمانے میں ۱۰۸۰ھ میں ایک مسجد تعمیر ہوئی تھی۔ اس کے صحن کے جنوب مشرقی حصے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سب سے بڑے فرزند شیخ محمدؒ (م ۱۲۰۸ھ / ۹۴-۱۷۹۳ء) کی ابدی آرام گاہ ہے۔ میں صرف اسے ہی دیکھنے کے لئے بڈھانہ گیا تھا۔ یہ شاہ صاحب کی پہلی بیوی کے فرزند تھے۔ دوسری بیوی سے شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی تھے۔ سوتیلے بھائی ہونے کے باوجود شاہ عبدالعزیز شیخ محمد کو بڑا عزیز رکھتے تھے اور ان سے ملنے دہلی سے بڈھانہ جایا کرتے تھے۔ ہم شیخ محمد کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ امام صاحب نے نورالحسن راشد کو پکڑ کر مصلیٰ امامت پر کھڑا کر دیا اور ہم نے ان کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ بڈھانہ سے چلتے چلتے اندھیرا چھا گیا اور کاندھلہ جانے والی بس ملنے کی اُمید جاتی رہی۔ کافی دیر انتظار کے بعد ایک بس ملی اور ہم عشاء کے بعد کاندھلہ پہنچ گئے۔

اگلی صبح ناشتہ کے بعد راشد صاحب نے اپنے نوادرات دکھائے۔ ان میں میاںجیو نور محمد جھنجھانویؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید، شہباز بیگ کے فرزند امیر بیگ کا دیوان، متعدد قلمی قرآن پاک، مشاہیر کے خطوط، شاہ عبدالغنی مجددیؒ کا ایک رسالہ جو خطاطی کا شاہکار تھا، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا القول الجمیل کا نسخہ، مرزا فخرو ولی عہد بہادر شاہ ظفر کی تحریر کردہ سورۃ یٰس اور اس کا ترجمہ، ایک کتاب پر مولانا رشید احمد گنگوہی کے تحریر کردہ حواشی اور ایک دوسری کتاب پر مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی (م ۱۶۵۶ء) کے حواشی دیکھ کر طبیعت مسرور ہو گئی۔ ان تبرکات میں ایک موٹی سی موم بتی بھی تھی جو کسی زمانے میں روضۂ نبوی کے اندر جل چکی تھی۔ نورالحسن راشد کے پاس بڑا اچھا کتب خانہ ہے۔ ان کے بزرگوں کا کتب خانہ تین حصوں میں تقسیم ہوا تو ان کے والدِ بزرگوار کے حصے میں ستائیس ہزار کتابیں آئیں۔

قصبے کے شمال مغرب میں آبادی سے ذرا ہٹ کر ایک عمارت حظیرہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک قبرستان کے جانبِ شمال تعمیر کی گئی ہے۔ عمارت میں مسافروں اور طلبہ کے قیام کے لئے حجرے موجود ہیں لیکن اب یہ ویران پڑے ہیں۔ حظیرے کے جنوب میں چند قبروں کے نشان موجود ہیں۔ ان میں سے ایک خستہ حال قبر امیر بیگ کی ہے۔ موصوف شہباز بیگ کے فرزند اور طہماس خان کے پوتے تھے۔ انہوں نے معتز

نگر کی بجائے کاندھلے میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔

حقیرے سے واپسی پر راشد صاحب نے مجھے امیر بیگ کی حویلی دکھائی ۔ اس کے صدر دروازے پر ایک کتبہ نصب ہے ۔ میں نے اس کی عبارت نقل کی لیکن وہ میرے سامان کے ساتھ چوری ہو گئی ۔ امیر بیگ شاعر تھے ۔ ان کا دیوان راشد صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ انہوں نے ۱۸۴۹ء میں مہاراجہ دلیپ سنگھ کی تخت سے معزولی اور پنجاب پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد ایک شہر آشوب لکھا تھا جو راشد صاحب کے پاس محفوظ ہے ۔ مجھے یہ شہر آشوب دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک مسلمان کو دلیپ سنگھ کی معزولی پر کیونکر رنج ہو سکتا ہے ؟

امیر بیگ کا انتقال ۱۸۸۸ء کے لگ بھگ ہوا ۔ اس کے ہاں اولاد نرینہ نہ تھی ۔ اس کی اکلوتی بیٹی اللہ بندی پندرہ سولہ سال پہلے تک بقید حیات تھی ۔ آزادی کے بعد مرحومہ کا پوتا مرزا انصار بیگ پاکستان چلا آیا وہ ان دنوں گلگشت کالونی ملتان میں مقیم ہے ۔

امیر بیگ کی حویلی سے قریب ہی محلہ مغل شیلاں میں اس کی بنوائی ہوئی مسجد تاحال موجود ہے ۔ اس کے صدر دروازے پر بانی مسجد کے نام کا کتبہ لگا ہوا ہے ۔ یہ مسجد دیکھ کر میں راشد صاحب کے مکان پر آیا اور اپنا سامان اٹھا کر دلی روانہ ہو گیا ۔

دلی سے دو بجے کے قریب آندھرا پردیش ایکسپرس چلتی ہے ۔ اس میں حیدر آباد کے لئے میری برتھ ریزرو تھی ۔ یہ ٹرین بڑی تیز رفتار ہے اور کئی کئی گھنٹے رکنے کا نام نہیں لیتی ۔ میں اس ٹرین میں سوار ہو کر حیدر آباد روانہ ہوا ۔ راستے میں آگرہ اور گوالیار جیسے اسٹیشن آئے لیکن وہاں بھی یہ ٹرین نہ رکی ۔ آگرہ کے قریب میں اکبر کے مقبرے کے بالکل سامنے سے گزرا اور گوالیار میں قلعہ کے گرد ٹرین گھومتی رہی ۔ میں نے ٹرین ہی میں سے حضرت محمد غوث گوالیاری (م ۱۵۶۲ء) کے مزار کی زیارت کی ۔ شام کو سات بجے کے قریب یہ ٹرین جھانسی جا کر رکی ۔ یہاں ریلوے کی بہت بڑی ورکشاپ ہے ۔ شہر میں ایک پہاڑی پر قدیم قلعے کی فصیل موجود ہے ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے جس جرأت اور بہادری کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا اس کی مثال تاریخ میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے ۔

ٹرین جھانسی سے چل کر رات کو گیارہ بجے بھوپال میں رکی ۔ اس کے بعد اس کا سٹاپ ناگپور میں تھا جہاں اس نے نماز فجر کے وقت پہنچنا تھا ۔ راستے میں دو تین جگہ سگنل نہ ہونے کی بنا پر ٹرین رکی ۔ صبح تین ساڑھے تین بجے میری آنکھ کھلی ، دیکھا تو میرا سامان غائب تھا ۔ میرے ہوش گم ہو گئے ۔ سامان کے ساتھ مختلف لائبریریوں میں لئے گئے نوٹس ، دلی سے خریدی ہوئی کتابیں ، کپڑے اور سب سے بڑھ کر میرا پاسپورٹ بھی چلا گیا تھا ۔ اتنے میں چند مسافر اور بیدار ہو گئے ۔ انہوں نے بھی واویلا مچایا ۔ ان کا سامان بھی چوری ہو گیا تھا ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھیلوں کا علاقہ ہے اور وہ چوری چکاری کے لئے بدنام ہیں ۔ راستے میں جب کسی سگنل پر ٹرین رکی تو وہ چند مسافروں کا سامان اٹھا کر دو ڈبوں کو ملانے والا کینوس پھاڑ کر اتر گئے ۔

اس سانحہ کے گھنٹہ سوا گھنٹہ بعد ناگپور آ گیا ۔ میں نے یہیں اپنا سفر ختم کر دیا ۔ پاسپورٹ کے بغیر آگے جانا مناسب نہ تھا ۔ اس لئے میں نے ناگپور ریلوے اسٹیشن کے تھانے میں چوری کی رپورٹ درج کرائی ۔ انہوں نے مجھے اس کی ایک نقل فراہم کر دی ۔ تھانے میں صدہا ایسے افراد کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جو چلتی ٹرینوں میں اس طرح کی وارداتیں کرتے تھے ۔ یہاں پولیس کا عملہ اور ریلوے کا سٹاف بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا ۔ انہوں نے مجھے چائے پلائی اور ریلوے اسٹیشن کے ریفریشمنٹ روم میں ناشتہ کرنے کی دعوت دی جو میں نے قبول نہ کی ۔

میری جیب میں اس وقت پندرہ صد روپے تھے ۔ میں نے پولیس آفیسر سے شہر جا کر کپڑے اور دوسرا ضروری سامان خریدنے کی اجازت مانگی ۔ انہوں نے کہا جہاں چاہے جائیے ۔ میں نے اسٹیشن کے ایک سٹال سے شیو کا سامان ، صابن ، کنگھی ، تیل ، ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ خریدا ۔ ویٹنگ روم میں جا کر شیو بنائی ، نہایا اور ناشتہ کیا ۔ جب دکانیں کھلنے لگیں تو میں اسٹیشن سے باہر نکلا ۔

اسٹیشن کی عمارت قدیم انگریزی وضع کی ہے جو راولپنڈی کے ریلوے اسٹیشن سے ملتی جلتی ہے ۔ اسٹیشن سے باہر ویرانی سی نظر آتی ہے ۔ میں نے دل میں کہا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا ۔ اب خدا جانے کب ناگپور آنا ہو ۔ اس لئے لگے ہاتھوں بابا تاج الدین ناگپوری (م ۱۹۲۵ء) کا مزار دیکھ آؤں ۔ علامہ اقبال بھی ان کے بڑے معتقد تھے

اور انہوں نے اپنے ایک خط میں مہاراجہ سرکشن پرشاد مدار المہام سلطنتِ آصفیہ کو ان سے ملنے اور اپنے لئے دعا کروانے کا مشورہ دیا تھا۔ بابا صاحب کے جانشین بابا عبدالکریم المعروف بہ یوسف شاہ قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے آئے اور وہیں ۱۹۴۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے جانشین بابا ذہین شاہ تاجی نے رُوحانی اور ادبی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ راقم کو دو بار ان سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ بابا ذہین شاہ ۱۹۷۸ء میں فوت ہو گئے۔ آج کل انور شاہ ذہینی تاجی ان کے جانشین ہیں۔

میں نے ایک رکشا ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے بابا تاج الدینؒ کے مزار پر لے چلے وہ مجھے بابا جلال شاہ بخاری کے مزار پر لے گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ چلتے وقت میں نے اس سے دریافت کیا تھا کہ وہ بابا تاج الدین کی درگاہ کے بارے میں جانتا ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا تھا، پھر مجھے یہاں کیوں لے آیا؟ اس نے کہا کہ یہ بھی ایک بابا کی درگاہ ہے۔ میں نے اسے کرایہ دے کر رخصت کیا اور ایک مسلمان رکشا ڈرائیور سے کہا کہ مجھے بابا تاج الدینؒ کی درگاہ پر لے چلے۔ اس جگہ سے بابا صاحب کا مزار پانچ میل سے کم نہ ہو گا۔ بابا صاحب کا مزار ان کی وفات ۱۹۲۵ء کے بعد تعمیر ہوا تھا۔ اب وہاں ایک نیا ماڈل پڑا تھا جس کے مطابق اسے از سرِ نو تعمیر کرنا تھا۔ ہندو مسلم سِکھ تینوں ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

میں کچھ دیر وہاں رکا اور پھر اس خیال سے کہ شاید آئندہ کبھی وہاں آنے کا موقع نہ ملے، وہاں سے بحسرت تمام روانہ ہوا۔ اس روز رکشا بندھن کا تہوار تھا۔ اس لئے بہت سی دکانیں بند تھیں۔ شہر کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر رانی جھانسی چوک کے قریب تھا۔ وہاں سے ایک پتلون، ٹی شرٹ اور بنیان خریدی اور شہر کی ایک جھلک دیکھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچا۔

میں نے دل میں پھر وہی سوچا کہ اب جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا، اس لئے راستے میں بھوپال دیکھتا جاؤں۔ میں نے بھوپال کا ٹکٹ خریدا اور شام کو مغرب سے تھوڑی دیر پہلے بھوپال پہنچ گیا۔ اسٹیشن سے قریب ہی نواب حمید اللہ روڈ پر ایک ہوٹل میں قیام کیا اور نہا دھو کر بازار گھوڑا نخاس پہنچا۔ وہاں میں نے ایک شخص سے کسی اچھے ریسٹورنٹ کا پتہ پوچھا تو اس نے پاکیزہ ہوٹل کا نام بتایا۔ اتنے میں ایک اور شخص وہاں پہنچ گیا۔

اس نے کہا کہ وہ ہوٹل آج کل بند ہے لہٰذا میں گھوڑا نخاس میں تیل والوں کی دکانوں کے پاس سے بائیں ہاتھ مڑ جاؤں تو وہاں ایک بڑا دروازہ نظر آئے گا۔ اس دروازے کے اندر مسلمانوں کے کئی ریسٹورنٹ ہیں۔ ایک ریسٹورنٹ میں کھانا تناول کر کے میں آگے بڑھا تو جامع مسجد دکھائی دی۔ یہ لاہور کی بادشاہی مسجد کی طرح بلند جگہ پر واقع ہے۔ مسجد کی اندرونی دیواروں پر پچی کاری کا کام قابلِ دید ہے۔ میں نے اس مسجد میں عشاء کی نماز ادا کی اور کچھ دیر شہر میں گھومنے کے بعد اپنے ہوٹل میں آکر سو گیا۔

صبح نمازِ فجر کے فوراً بعد میں ہوٹل سے نکلا۔ مجھے تاج المساجد دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ یہ مسجد بھوپال کی سب سے بڑی مسجد ہے اور جامع مسجد دہلی کی طرز پر تعمیر ہوئی ہے۔ اس مسجد کی بانیہ نواب شاہجہان بیگم اس کی تکمیل سے پہلے ہی رحلت کر گئیں، اس لئے اس کے منارے نامکمل رہ گئے۔ قریباً اسّی سال بعد ایک مردِ درویش مولانا محمد عمران خان ندوی (م ۱۹۸۶ء) نے اسے مکمل کیا۔ خدا نے شاہجہان بیگم کے وارثوں میں سے کسی کو ان کا شروع کردہ کام مکمل کرنے کی توفیق نہ دی۔ مولانا نے گجرات اور بمبئی کے تاجروں سے چندہ لے کر اس کام کو مکمل کیا اور ان کے نام کے کتبے جگہ جگہ لگا دیئے۔ مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ہے اور اس کا ہاسٹل کسی کالج کے ہاسٹل سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ میں نے مسجد میں نوافل ادا کئے اور مولانا عمران خان کا پتہ پوچھ کر مینارے والی مسجد دیکھنے چلا گیا۔ یہ مسجد بھوپال کے مشہور تال کے کنارے تعمیر ہوئی ہے۔ یہ تال دراصل ایک قدرتی جھیل ہے جو میلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے کنارے میڈیکل کالج کی عمارت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

مینارے والی مسجد سے ملحق ایک چھت کے نیچے نواب حمید اللہ خان (م ۱۹۶۰ء) اور ان کی والدہ نواب سلطان جہاں بیگم (م ۱۹۳۰ء) کی قبریں ہیں۔ افسوس کہ میں اس بے سرو سامانی کے عالم میں ان کی قبروں کے کتبے نقل نہ کر سکا۔ اس مسجد سے تھوڑے سے فاصلے پر نواب محمد حمید اللہ خان کی صاحبزادی مہر تاج ساجدہ سلطان کی کوٹھی ہے۔ نواب صاحب کی ایک صاحبزادی گوہر تاج عابدہ سلطان بیگم کراچی میں ملیر کے علاقے میں قیام پذیر ہیں۔ موصوفہ برازیل میں پاکستان کی سفیر بھی رہ چکی ہیں۔

مینارے والی مسجد سے میں دوبارہ شہر کی جانب آیا۔ راستے میں ایک قبرستان آتا

ہے جس میں شاہی خاندان کے بہت سے افراد محوِ خواب ابدی ہیں ۔ ان میں سے نواب جہانگیر محمد خان (م ۱۸۳۷ء) والد ماجد نواب شاہجہان بیگم (م ۱۹۰۱ء) ، نواب قدسیہ بیگم (م ۱۸۸۱ء) اور نواب شاہجہان بیگم کے شوہرِ ثانی اور معروف عالمِ دین نواب سیّد صدیق حسن خان قنوجی (م ۱۸۹۰ء) کی قبریں قابلِ ذکر ہیں ۔ نواب موصوف بخاری سید تھے اور ان کا سلسلۂ نسب مخدوم جہانیاں سید جلال الدین جہانگشت بخاریؒ (م ۱۳۸۳ء) سے جا ملتا ہے ۔ مرحوم مسلکاً اہلِ حدیث تھے ۔ ان کے دورِ اقتدار میں بہت سے اہلِ حدیث علماء بھوپال میں جمع ہو گئے تھے ۔ نواب صدیق حسن خان کی سعی و کاوش اور علماء اہلِ حدیث کی سرپرستی کی وجہ سے اس مسلک کی خوب اشاعت ہوئی ۔ انہوں نے اُردو ، فارسی اور عربی زبانوں میں ۲۲۲ کتابیں لکھیں اور اپنے خرچ پر عربی کتابیں مصر سے چھپوا کر اہلِ علم میں تقسیم کیں ۔ اہلِ حدیث ہونے کے باوجود انہیں بزرگانِ دین سے بڑی عقیدت تھی ۔ ان کا رُوحانی تعلق حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (م ۱۸۹۵ء) سے تھا ۔ ان کے فرزندِ ارجمند نواب سیّد علی حسن خان (م ۱۹۳۶ء) تو شاہ صاحب سے باقاعدہ بیعت تھے ۔

میں باوجود کوشش کے نواب صدیق حسن خان کی قبر تلاش نہ کر سکا ۔ ایک صاحب نے نشاندہی کی تو میں جھاڑ جھنکار سے گذر کر ان کی قبر تک پہنچا ۔ قبر مسلک اہلِ حدیث کے برعکس سنگِ مرمر کے ایک چبوترے پر ہے ۔ قبر کا تعویذ اور جالیاں بھی سنگِ مرمر سے بنائی گئی ہیں لیکن قبر کے سرہانے کتبہ نصب نہیں ہے ۔ جب میں ان کے مزار پر پہنچا اس وقت انہیں انتقال کئے ۹۶ برس گزر چکے تھے ۔ اس لئے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ امتدادِ زمانہ سے کتبہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہو گا ۔

نواب شاہجہان بیگم اپنے شوہر کے پاس دفن نہیں ہوئیں ۔ میں نے اسی صاحب سے ، جس نے نواب صدیق حسن خان کے مزار کی نشاندہی کی تھی ، بیگم صاحبہ کے مزار کے بارے میں دریافت کیا ۔ اس نے بتایا کہ وہ بھوپال کے ایک علاقے ناریل کھیڑا میں دفن ہیں ۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی رکشا ڈرائیور کو سمجھا دے جو مجھے وہاں لے جائے ۔ اس کے سمجھانے کے باوجود رکشا ڈرائیور کے پلے کچھ نہ پڑا ۔ میں نے اس سے کہا کہ میں بہت دُور سے بڑے اشتیاق کے ساتھ یہاں آیا ہوں ، اس لئے اگر وہ میرے ساتھ رکشا میں سوار ہو کر مجھے ناریل کھیڑا تک لے جائے تو میں واپسی پر اسے اسی جگہ اتار

دوں گا ۔ اس اللہ کے بندے نے مجھ پر بڑی مہربانی کی اور مجھے ناریل کھیڑا لے گیا ۔

شاہجہان بیگم کی قبر ایک چوراہے میں ایک راؤنڈ آباؤٹ میں ہے ۔ دُور دُور تک آبادی کا نشان نہیں ملتا ۔ قبر پر کسی زمانے میں چھتری بنی ہوئی تھی جو امتدادِ زمانہ سے گر گئی ہے اور اب تک چھتری کے ستونوں کے نشان باقی تھے ۔ قبر کا تعویذ بھی ٹوٹ پھوٹ چکا ہے ۔ شاید آئندہ چند برسوں میں قبر کا نشان بھی باقی نہ رہے ۔ اتنے جاہ و جلال والی حکمران نواب شاہجہان بیگم کی قبر کو خستہ حالت میں دیکھ کر مجھے دلی رنج ہوا ۔ مہر تاج ساجدہ سلطان سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہ اپنی جدہ محترمہ کی قبر کی مرمت کروا دیتیں ۔ یہ خستہ حال قبر اس عظیم خاتون کی ہے جس کی داد و دہش صدہا علماء ، فضلاء اور شعراء کو برِّعظیم پاک و ہند کے گوشے گوشے سے بھوپال کھینچ لائی تھی ۔

مجھے شاہجہان بیگم سے ایک طرح کا قلبی تعلق ہے ۔ انہوں نے ۱۸۶۸ء سے ۱۹۰۱ء تک حکومت کی ہے ۔ ان کا دورِ حکومت ملکہ وکٹوریا کے ساتھ ساتھ چلتا ہے ۔ جہاں تک علم و ادب کا تعلق ہے بھوپال کی تاریخ میں ان کے عہد کی مثال نہیں ملتی ۔ ان کے شوہرِ نامدار نواب صدیق حسن خان قنوجی بھوپال کو مرکزِ علم و ادب بنانے میں ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں ۔ بھوپال کی ایک اسکالر ڈاکٹر رضیہ حامد نے نواب صاحب کے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا جس پر انہیں مولوی برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال نے پی ۔ ایچ ۔ ڈی ۔ کی ڈگری عطا کی ہے ۔ یہ مقالہ چھپ کر میرے پاس پہنچ گیا ہے ۔ اس میں ان تمام علماء ، فضلاء اور شعراء کا ذکر ہے جو اس عہد میں بھوپال میں جمع ہو گئے تھے ۔ میں نے بھی اپنی ایک عزیز طالبہ رضوانہ ترمذی سے شاہجہان بیگم پر ایک مقالہ لکھوایا تھا ۔ اس مقالے کی اہلِ علم نے دل کھول کر داد دی ہے ۔ یہ مقالہ اس لائق ہے کہ اسے پنجاب یونیورسٹی اپنے خرچ پر شائع کرے ۔

بھوپال مدھیہ پردیش کا دارالحکومت ہے ۔ پہلے اس صوبے کا دارالحکومت گوالیار تھا جو صوبے کے ایک کونے میں واقع ہے ۔ اس لئے عوام کو وہاں تک جانے آنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا ۔ بعد ازاں انتظامی دفاتر گوالیار سے بھوپال منتقل کئے گئے ۔ شاید اسی بہانے اس کا اسلامی تشخص مٹانا مقصود ہو ۔ بھوپال کی آبادی اٹھارہ لاکھ بتائی جاتی ہے جس میں دس لاکھ مسلمان ہیں ۔ اس لئے شہر پر اسلامی چھاپ اب تک لگی ہوئی

ہے۔

بھوپال میں یونیورسٹی قائم ہوئی تو اسے مولوی برکت اللہ یونیورسٹی کا نام دیا گیا۔ مولوی صاحب بھوپال کے رہنے والے تھے لیکن نوجوانی میں ہی وہ ترکِ وطن کر گئے۔ انہوں نے لالہ ہر دیال وغیرہ کے ساتھ مل کر غدر پارٹی قائم کی جس نے یورپ اور امریکہ میں انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں بڑا کام کیا۔ جب ۱۹۱۵ء میں مولانا عبیداللہ سندھی اور راجہ مہندر پرتاپ (م ۱۹۷۹ء) نے کابل میں حکومتِ مؤقتۂ ہند کی بنیاد رکھی تو برکت اللہ اس کے وزیر اعظم اور راجہ مہندر پرتاپ صدر مقرر ہوئے۔ مولوی برکت اللہ نے بڑا عرصہ برلن، سوئٹزر لینڈ اور امریکہ میں گزارا۔ ان کا انتقال ۲۸ ستمبر ۱۹۲۷ء کو سکرے منٹو میں ہوا اور انہیں میرز ویل کے قبرستان میں امانتاً دفن کیا گیا۔ انہیں دفناتے وقت ان کے ساتھیوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ برِ عظیم آزاد ہونے کے بعد ان کی میت بھوپال منتقل کر دیں گے۔ یہ وعدہ ہنوز ایفا نہیں ہوا۔ تاہم یہ بات اطمینان بخش ہے کہ حکومت ہند نے بھوپال یونیورسٹی ان کے نام سے منسوب کر دی ہے۔ محمد عرفان بھوپالی نے "برکت اللہ بھوپالی" کے عنوان سے اور سید عابد علی وجدی الحسینی نے "مولانا برکت اللہ بھوپالی" کے عنوان سے ان کی حیات اور کارناموں پر کتابیں لکھی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں میرے مجموعۂ کتب میں موجود ہیں۔ راقم الحروف نے اقبال شیدائی کے نام ان کے پندرہ خط مجلّہ "پاکستان" پشاور یونیورسٹی میں شائع کئے ہیں۔

میں سیفیہ کالج جا کر پروفیسر عبدالقوی دسنوی سے ملنا چاہتا تھا لیکن حالات کے پیش نظر مجھے بعجلتِ ممکنہ دہلی جا کر پاسپورٹ حاصل کرنا تھا۔ اس لئے ان سے ملاقات نہ کر سکا۔

بھوپال شہر سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصے کا نام ہفتے کے ایک دن سے منسوب ہے۔ مثلاً اتوارہ، سوموارہ، بدھ وارہ، وغیرہ۔ سوموارے میں عبدالشکور خان کی مسجد کے قریب عمران خان ندوی رہتے تھے۔ ان سے ملنا بہت ضروری تھا۔ میں ان سے ۱۹۵۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ملا تھا جہاں وہ اس ادارے کے مہتمم تھے۔ اس واقعہ کو ۳۱ برس گزر چکے تھے۔ میں ان کے مکان پر حاضر ہوا۔ اپنا نام بتایا تو ان کے ایک عزیز نے مجھے ایک کمرے میں بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد مولانا تشریف لے آئے۔ اس

طویل عرصے کے دوران ان کا جسم بھاری ہو چکا تھا اور وہ چند ماہ پہلے فالج کا ایک شدید حملہ برداشت کر چکے تھے۔ ان کی زبان پر ابھی تک اس کا اثر تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف اس زمانے میں کسی کو ملاقات کا وقت نہیں دیتے۔ مجھے شاید غیر ملکی سمجھ کر انہوں نے شرفِ ملاقات بخشا۔ میں شاید آخری غیر ملکی تھا جو ان سے ملا۔ میری ان کے ساتھ ملاقات ۲۰ اگست کو ہوئی اور وہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بھوپال کی تاج المساجد اور ملحقہ مدرسہ ان کی ابدی یادگاریں ہیں جو ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھیں گی۔

مولانا عمران خان سے مل کر میں اپنے ہوٹل پہنچا، نہا کر کپڑے تبدیل کئے اور اپنا سامان اٹھا کر ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں مجھے جہلم ایکسپریس مل گئی جس نے مجھے نماز عصر کے وقت آگرے پہنچا دیا۔ آگرے سے علی گڑھ کا فاصلہ سڑک کے راستے ۵۳ میل ہے۔ میں جب بس اسٹینڈ پہنچا تو علی گڑھ جانے والی بس تیار کھڑی تھی۔ میں اس میں سوار ہو کر عشاء سے قبل علی گڑھ پہنچ گیا۔ مجھے اچانک اپنے درمیان پا کر میرے اعزاء و اقارب بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان سے اپنے سامان کی چوری کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ میں بہت تھک چکا ہوں اس لئے ذرا جلدی سو جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کھانا تیار ہے کھا کر سو جایئے۔ میں کھانا کھا کر سو گیا۔ صبح نماز کے وقت میری اہلیہ نے پوچھا کہ سوٹ کیس کہاں ہے؟ کہیں رکشے میں تو نہیں رہ گیا؟ میں نے تمام واقعہ انہیں سنایا اور کہا کہ اگر پاسپورٹ مل جائے تو مجھے کسی نقصان کی پرواہ نہیں۔ میں علی گڑھ میں جو میلے کپڑے چھوڑ گیا تھا وہ دھوبی کے ہاں سے دھل کر آ چکے تھے۔ اس لئے کپڑوں کا مسئلہ حل ہو گیا۔

صبح ناشتے کے بعد میں نے پولیس اسٹیشن میں جا کر پاسپورٹ گم ہونے کی اطلاع دی۔ ان کے رجسٹر سے پاسپورٹ نمبر اور تاریخ اجراء حاصل کئے اور ایس پی سے اس کی تصدیق کرائی۔ اگلے روز میں علی الصبح خسرو ایکسپریس کے ذریعے علی گڑھ سے روانہ ہوا اور نو بجے کے قریب نئی دہلی پہنچ گیا۔ ریلوے اسٹیشن سے میں پاکستانی سفارت خانے گیا اور متعلقہ افسر سے ملا۔ میں نے ان سے استدعا کی کہ وہ مجھے تھرڈ سیکرٹری سے ملا دیں۔ ان کے توسط سے میں تھرڈ سیکرٹری سے ملا۔ انہوں نے میری بات سن کر اسی روز شام کو

چار بجے پاسپورٹ جاری کرنے کا حکم دیا۔ اس روز جمعہ تھا۔ میں درخواست جمع کرانے کے بعد مرینہ ہوٹل پہنچا۔ یہ ہوٹل کناٹ پلیس میں ہے اور اس کے بالمقابل حضرت عبدالسلام چشتی کی درگاہ ہے۔ وہاں مشہور مؤرخ ذکاء اللہ کی قبر ہے۔ میں نے ان کی قبر کا کتبہ نقل کیا تھا لیکن وہ میرے سامان کے ساتھ ہی گم ہو گیا تھا۔ اس لئے مجھے دوبارہ یہاں آنا پڑا۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

کل من علیہا فان

صاحبِ این قبر خان بہادر شمس العلماء منشی ذکاء اللہ از مشاہیرِ فضلائے این دیار است مردے مستقیم الحال و مجموعۂ کمال بود در علوم قدیمہ وشیرہ فنون جدیدہ ید طولیٰ داشت تا زیست ہمت بر خدمتِ طلاب علم گماشت و در تالیف و تصنیف قصب السبق از اقران و امثال برد۔ چندیں کتب از مؤلفاتش متداول بین الطلاب است۔ چون ہشتاد و یک منزل از منازلِ عمر بہ پیمودہ چہاردہم ماہ ذی قعدہ ۱۳۲۸ ہجری روحش بفرمان ارجعی الی ربکِ نقلِ آخرت فرمود و پیکرِ خاکیش زیرِ خاک بیاسود۔ اللھم اغفرلہ 11746

یہ کتبہ نقل کرکے میں ٹیا محل پہنچا۔ وہاں مدرسہ حسین بخش سے ملحقہ مسجد میں مولانا اخلاق حسین قاسمی خطبۂ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں۔ جب میں وہاں پہنچا تو ان کی تقریر شروع ہو چکی تھی۔ نماز کے بعد میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا تو مولانا نے حیرت سے مجھے دیکھ کر فرمایا "بھئی آپ تو حیدر آباد گئے تھے۔ اتنی جلدی واپس آگئے" میں نے سارا ماجرا سنایا تو فرمانے لگے کہ آندھرا پردیش ایکسپریس میں سامان چوری ہو جانا بڑے تعجب کی بات ہے۔ مولانا میرے ساتھ ایک حجرے میں تشریف لے گئے۔ وہاں کئی

اصحاب ان کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ان میں حفیظ الرحمن واصف (م ۱۹۸۷ء) بھی تھے، جو مفتی کفایت اللہ (م ۱۹۵۲ء) کے فرزند تھے۔ ان سے وہیں پہلی بار تعارف ہوا۔ افسوس اب وہ بھی وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ وہ چائے لائیں۔ پھر ایک اور ساتھی سے کہا کہ وہ میری تالیفِ قلب کے لئے کیلے خرید لائیں۔ میں نے ہنس کر کہا "مولانا! میں طلقاء میں سے نہیں ہوں"۔ اس روز مولانا کے ساتھ طویل صحبت رہی۔ وہاں سے اٹھ کر میں اپنے سفارت خانے پہنچا۔ میرا پاسپورٹ تیار تھا۔ میں پاسپورٹ لے کر سیدھا نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ علی گڑھ جانے والی ٹرین تیار ملی۔ میں رات نو بجے کے قریب علی گڑھ پہنچ گیا۔ ۳۰ اگست کو علی گڑھ سے چل کر ۳۱ اگست کی شام کو میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ لاہور پہنچ گیا۔ اب بھی جب کبھی سامان کی چوری یاد آجاتی ہے تو اس کے بعد پیدا ہونے والی کیفیت اپنی تلخ یاد چھوڑ جاتی ہے۔

یہ میرا بھارت کا آخری سفر تھا۔ اس کے بعد میں وہاں نہیں گیا۔

بائیس خواجہ کی چوکھٹ

دہلی

دہلی پہنچتے ہی میں نے ندوۃ المصنفین میں اپنا سامان رکھا اور نہا دھو کر اردو بازار کی طرف نکلا۔ کتب خانہ عزیزیہ پر مولوی سمیع اللہ مرحوم کے دونوں فرزند عبدالسلام اور عبدالحکیم تشریف فرما تھے۔ دونوں بھائی بڑے تپاک سے ملے اور اگلے روز دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ اگلے روز میں مقررہ وقت پر ان کی دکان پر پہنچا تو دونوں بھائی مجھے کوچہ چیلان میں اپنے عظیم المرتبت نانا مفتیٔ اعظم ہند مولانا کفایت اللہ مرحوم (م ۱۹۵۲ء) کے گھر لے گئے۔ کھانے کے دوران انہوں نے مجھے بتایا کہ اسی کمرے میں علماء کرام کی نشست ہوا کرتی تھی۔ سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی (م ۱۹۵۹ء) مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی (م ۱۹۶۲ء) مولانا اسعد مدنی، مفتی عتیق الرحمن عثمانی (م ۱۹۸۴ء) مفتی ضیاء الحق دہلوی اور دوسرے علماء کرام کی نشست گاہیں خالی دیکھ کر یوں محسوس ہونے لگا جیسے دنیا سے علم اٹھ گیا ہو۔ عبدالسلام اور عبدالحکیم نے مجھے بتایا کہ ان کے نانا ابا نے ۱۹۴۲ء میں قیام پاکستان کی مخالفت ترک کر دی تھی۔ اس سے میرے دل میں ان کی عظمت دوچند ہو گئی۔

کوچہ چیلان ہی میں ایک چھوٹی سی گلی ہے جس میں گنتی کے چار پانچ گھر ہیں۔ یہ گلی "کوچہ مومن خان" کے نام سے موسوم ہے۔ یہیں مومن (م ۱۸۵۲ء) کی رہائش تھی۔

کھانا تناول کرنے کے بعد ہم دوبارہ کتب خانہ عزیزیہ آئے۔ یہ کتب خانہ دہلی کے ارباب علم و فن کی نشست گاہ ہے۔ وہاں آنے والے ایسے بزرگ بھی ہیں جو سالہاسال سے بلاناغہ وہاں آتے ہیں۔ ان میں حاجی سلیم صاحب بھی ہیں جو دہلی کی قدیم اور معروف فرم علی جان کی یادگار ہیں۔ ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ عید الاضحیٰ کے دن اپنے مکان سے باہر گلی میں بکرے ذبح کرواتے ہیں اور اس روز اس گلی میں رہنے

والے ہندو اپنے دروازے بند رکھتے ہیں اور گلی میں جھانک کر بھی نہیں دیکھتے۔ کتب خانہ عزیزیہ پر احباب کی آمد کا سلسلہ مولوی سمیع اللہ مرحوم (م ۱۹۷۹ء) کی زندگی میں شروع ہوا تھا اور اب تک چل رہا ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ دِلّی والے اپنی وضع داری نبھاہ رہے ہیں۔ میں نے ایک بار علامہ اخلاق حسین دہلوی (م ۱۹۹۳ء) سے سوال کیا کہ "دِلّی والا" کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا "جس کے اجداد ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی میں آباد ہوئے ہوں"۔

میں نے ظہر کی نماز جامع مسجد میں ادا کی۔ مسجد کے شمالی دروازے کے باہر ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جو "امام صاحب کا قبرستان" کہلاتا ہے۔ اسی قبرستان میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی (م ۱۹۵۶ء) اور مولوی سمیع اللہ (م ۱۹۷۹ء) محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ مولانا لدھیانوی ایک زمانے میں مجلس احرار کے صدر تھے اور پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ قیام پاکستان کے بعد موصوف مہاجروں کے قافلے کے ساتھ پاکستان پہنچے لیکن یہاں ان کا جی نہ لگا اور موصوف دسمبر ۱۹۴۷ء کے اواخر میں دوبارہ بھارت چلے گئے۔ ۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو وہ گاندھی جی سے ملے۔ گاندھی جی نے ان سے کہا "مولانا کیا آپ بھی پاکستان چلے گئے تھے؟ کیا آپ نے لدھیانہ کی سکونت اس بنا پر ترک کی کہ وہاں کے ہندو اور سکھ آپ کو قتل کرنا چاہتے تھے؟ اگر آپ کا یہی جرم تھا تو آپ اپنے دین کے لئے جان کا نذرانہ پیش نہ کر سکے"۔ یہ بات خود مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے راقم الحروف کو سنائی تھی۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ وہ گاندھی جی کی باتیں سن کر اس قدر شرمندہ ہوئے کہ انہیں کوئی جواب نہ دے سکے۔ یہ گاندھی جی کے ساتھ ان کی آخری ملاقات تھی۔ ۳۰ جنوری کو ناتھو رام گاڈسے نے انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے ساتھ میری پہلی ملاقات سرہند شریف میں ۱۹۵۴ء میں ہوئی تھی۔ موصوف چوہدری محمد شفیع ممبر پارلیمنٹ کے ساتھ حضرت مجدد الف ثانی کے عرس پر سرہند آئے ہوئے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں لدھیانہ کے نواحی قصبے پھلور کا رہنے والا اور ان کی ارائیں برادری کا فرد ہوں تو وہ مجھ پر شفقت فرمانے لگے۔ میں پہلی بار دہلی جانا چاہتا تھا، مولانا نے مجھ سے پوچھا "وہاں قیام کہاں ہو

گا۔ میں نے عرض کیا کہ کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔ مولانا فرمانے لگے کہ ہوٹل میں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں، میں ان کے گھر میں قیام کروں۔ انہوں نے سرہند سے کہیں اور جانا تھا اس لئے مجھے اپنے بیٹوں کے نام ایک رقعہ لکھ دیا کہ اسے اپنی برادری میں شامل کرلیں۔ میں وہ رقعہ لے کر دہلی گیا اور کوچہ رحمٰن میں ان کے مکان میں ٹھہرا۔ چند روز بعد مولانا بھی دہلی پہنچ گئے اور شام کو ان کے ہاں اہلِ علم اور سیاستدانوں کی محفلیں جمنے لگیں۔ ایک روز چوہدری محمد شفیع نے مجھے مدعو کیا۔ انہوں نے مجھے پارلیمنٹ کی سیر کرائی، وہاں کے کیفے ٹیریا میں چائے پلائی اور چند کتابیں خرید کر مجھے بطورِ تحفہ دیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن کے فرزندوں، عزیز الرحمٰن، طیب اور اظہر سے ملاقات رہی میں نے ان تینوں کو اور خاص طور پر عزیز الرحمٰن کو سچا پکا کانگرسی پایا۔ عزیز الرحمٰن ان دنوں تعلیم بالغاں کا ایک پروگرام چلا رہے تھے جس کا آغاز شفیق الرحمٰن قدوائی نے کیا تھا۔

آمدم برسر مطلب۔ مولانا حبیب الرحمٰن کی قبر کے سرہانے جو لوح نصب ہے اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

زمانہ لے کر جسے آفتاب کرتا ہے
انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

پیدائش ۱۸۹۲ء وفات ۲ ستمبر ۱۹۵۶ء، بروز اتوار

خدمتِ خلق بُو و خُلق حبیب الرحمٰن

سجع از مفتی اعظم کفایت اللہ۔ ملتان جیل ۱۹۲۹ء

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی قبر سے اندازاً دس میٹر جانب قبلہ کتب خانہ عزیزیہ کے بانی مولوی سمیع اللہ مرحوم کی قبر ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

هوالباقی هوالحی

مولانا محمد سمیع اللہ نور اللہ مرقدہ

صدر مجلس احرار خدامِ خلق صوبہ دہلی

۶ اگست ۱۹۷۹ء بروز چہار شنبہ بوقتِ اذانِ عشاء بعمر ۶۵ سال داعیٔ اجل کو لبیک کہا:

اناللہ و انا الیہ راجعون

اسی قبرستان میں جامع مسجد کے موجودہ امام سید عبداللہ بخاری کے والد محترم سید حمید بھی آسودہ خاک ہیں۔ مرحوم راقم الحروف کے ساتھ بڑی شفقت کے ساتھ پیش آیا کرتے تھے۔ انہوں نے قرآن مجید سے متعلق سواطع القرآن کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ اس مقدس کتاب میں "ب" کتنی بار استعمال ہوا ہے "ج" کتنی جگہ آیا ہے اور قرآن مجید میں زیر، زبر، تشدید اور جزم کتنے ہیں، وغیرہ۔ انہوں نے ایک سفر میں یہ کتاب مجھے اپنے دستخطوں کے ساتھ عنایت فرمائی تھی۔

جامع مسجد دہلی کا مشرقی دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ اس دروازے سے باہر عہدِ شاہجہان کے مشہور صوفی اور شاعر سرمد (م ۱۶۶۱ء) کا مزار ہے۔ دارا شکوہ (م ۱۶۵۹ء) کو ان کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ اورنگ زیب نے اپنے دورِ حکومت میں سرمد کو بجرم عریانی اور الحاد قتل کروا دیا تھا۔ سرمد کی رباعیات طبع ہو چکی ہیں۔ ان کی ایک حکیمانہ رباعی پیش خدمت ہے:

سرمد تو حدیث کعبہ و دیر مکن
در کوچہ شک چو گمرہاں سیر مکن
رو راہروی ز شیطان آموز
یک قبلہ گزین و سجدہ غیر مکن

سرمد کی قبر سے ملحق ابوالقاسم عرف ہرے بھرے کی قبر ہے۔ ان کے نام کی مناسبت سے ان کی قبر پر ہرا رنگ کیا ہوا ہے، جبکہ سرمد کی قبر پر سرخ رنگ پھیرا ہوا ہے۔ جاہل عوام میں یہ روایت مشہور ہے کہ جب جامع مسجد دہلی بن کر تیار ہوئی تو اس وقت پتہ چلا کہ قبلہ کی سمت درست نہیں ہے۔ اس زمانے میں ابوالقاسم کی ولایت کا بڑا شہرہ تھا۔ شاہجہان نے ان سے التماس کی اور انہوں نے اپنی کرامت سے قبلہ کی سمت درست کر دی۔ پیر شرافت نوشاہی نے شریف التواریخ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ

جامع مسجد کے قبلہ کا رُخ شاہ رحمٰن بھوئی والا نے شاہجہاں کی درخواست پر درست کیا تھا بقول شرافت نوشاہی، شاہ رحمٰن پیشہ کے اعتبار سے دُھوبی تھے۔ انہوں نے کپڑا نچوڑتے ہوئے قبلہ رُخ دیوار کی سمت درست کر دی۔ ہمارے خیال میں تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی جیسی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرنے والے معماروں پر یہ ایک اتہام ہے کہ انہوں نے مسجد کی بنیاد رکھتے وقت سمتِ قبلہ کا خیال نہیں رکھا۔ حالانکہ یہ خاندان ریاضی دانی اور جیومیٹری کے علم میں مہارت کے لئے پورے عالم میں اپنی مثال آپ تھا۔

ابو القاسم اور سرمد کی قبروں کے عقب میں ایک مسجد حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے۔ پہلے یہ ایک ویران جگہ تھی جس پر کباڑیے قابض تھے، لیکن جب سے یہاں زیر زمین بازار بنا ہے اس وقت سے یہاں رونق ہو گئی ہے۔ مسجد میں تبلیغی جماعت کے افراد وعظ و تلقین میں معروف رہتے ہیں۔ اسی مسجد کے صحن میں شمالی دیوار کے ساتھ تحریکِ خلافت کے عظیم رہنما مولانا شوکت علیؒ کی ابدی آرام گاہ ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

یاحیی یا قیوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کل نفس ذائقۃ الموت

فاتحہ مرقدِ ویران پر بھی پڑھتے جائیں
ان سے کہدو جو ہیں اس راہ سے گذرنے والے

(امیر مینائیؒ)

مرقد پاک

خادمِ کعبہ ضیغمِ اسلام

حضرت مولانا شوکت علی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخِ وصال ۱۸ نومبر ۱۹۳۸ء بمقام دہلی

مولانا شوکت علی مرحوم کی قبر سے اندازاً پچاس میٹر کے فاصلے پر ایک خوشنما

چھتری کے نیچے مولانا ابو الکلام آزاد کی آخری آرام گاہ ہے۔ ان کا انتقال ۲۱ فروری ۱۹۵۸ء کو ہوا تھا۔ ان کی قبر کے تعویذ کے دونوں جانب اور اوپر انگریزی، ہندی اور اُردو میں "محی الدین احمد ابو الکلام آزاد" مرقوم ہے۔ قبر کے گرد ایک چار دیواری بنا دی گئی ہے اور دن کے وقت ایک چوکیدار وہاں رہتا ہے۔ چوکیدار کے تقرر سے پہلے راقم نے ایک سفر میں یہاں لوگوں کو تاش اور شطرنج کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس لئے مزار کے احترام کو برقرار رکھنے کے لئے سرکار کو چوکیدار مقرر کرنا پڑا۔

نمازِ عصر سے قبل میں مطبع مجتبائی کی قدیم عمارت میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی صدر شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی سے ملنے گیا۔ موصوف بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے صحیفۂ ابرار خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ہم نے عصر کی نماز شاہ ابو الخیر کی خانقاہ میں ادا کرنے کا پروگرام بنایا اور چند منٹوں میں وہاں پہنچ گئے۔ جس وقت ہم خانقاہ میں پہنچے تو اس وقت شاہ زید ابو الحسن جھاڑو تھامے خانقاہ کی صفائی میں معروف تھے۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی بآواز بلند کہا: "شاہ صاحب! اس خانقاہ میں جاروب کشی سے بڑھ کر اور کوئی سعادت نہیں ہے"۔ شاہ صاحب نے ہمیں دیکھتے ہی فرمایا: "دیکھئے میں نے خانقاہ میں لائبریری تعمیر کی ہے اور یہ پتھر ملاحظہ کیجئے" وہ پتھر لائبریری کی دیوار پر نصب تھا اور اس پر "فیہا کتبٌ قیمہ" منقوش تھا۔ میں نے عرض کیا کہ لائبریری کے لئے اس سے بہتر اور کوئی عبارت موزوں نہیں تھی۔ لائبریری کی پیشانی پر شاہ صاحب کی کہی ہوئی یہ تاریخ مرقوم تھی:

خدا را منت و مدحت نبی را
کہ شد تعمیر بر بنیاد مسعود
ز ہاتف زید چوں پرسید سالش
مبارک ایں کتب خانہ ۔ فرمود

شاہ صاحب نے ہمیں اپنی نشست گاہ میں بٹھایا اور مشروب سے تواضع کی۔ تھوڑی دیر بعد نماز کا وقت ہو گیا اور ہم نے مسجد میں نماز ادا کی۔ امامت کے فرائض خود شاہ صاحب نے انجام دیے۔ مسجد کی پیشانی پر ایک لوح نصب ہے جس پر شاہ ابو الخیر کی کہی ہوئی یہ تاریخ منقوش ہے:

تعالی اللہ عجب مسجد بنا شد
کہ شد اسلام را ازو رونق تام
رقم زد خیر تاریخ بنائش
عبادت خانہ پاکیزہ اسلام

۱۲۳۳ھ

صحن مسجد کے جنوب مشرقی گوشے میں ایک تھڑے پر حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ (م ۱۷۸۰ء)، شاہ غلام علیؒ (م ۱۸۲۴ء)، شاہ ابو سعیدؒ (م ۱۸۳۶ء) اور شاہ ابوالخیرؒ (م ۱۹۲۳ء) کے مزارات ہیں۔ مرزا صاحب قبلہ کی قبر کے سرہانے مجر کے اوپر ایک کتبہ نصب ہے جس پر یہ عبارت درج ہے:

مزار حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید قدس سرہٗ
۱۱۹۵ھ تاریخ دہم محرم

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ این مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیرے

یہ الہامی شعر مرزا صاحب نے اپنی وفات سے بہت پہلے کہا تھا۔ موصوف ایک مذہبی جنونی کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ شاہ غلام علیؒ کے سرہانے جو لوح نصب ہے۔ اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

مزار حضرت شاہ عبداللہ معروف بشاہ غلام علی قدس سرہٗ
۱۲۴۰ھ تاریخ ۲۲ صفر

شاہ ابو سعیدؒ کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

مزار حضرت شاہ ابو سعید قدس سرہٗ
۱۲۵۱ھ تاریخ یکم شوال

حضرت شاہ ابوالخیرؒ کا نام نامی اور تاریخ وفات ان الفاظ میں مرقوم ہے:

مزار حضرت شاہ محی الدین عبداللہ معروف بشاہ ابوالخیر قدس سرہٗ
۱۳۴۱ھ تاریخ ۱۵ جمادی الاخریٰ

۱۹۸۰ء تک یہ مجر بے سقف تھا۔ اسی سال اپریل میں شاہ زید ابوالحسن نے اس پر ایک

خوبصورت گنبد بنوا دیا ہے۔ گنبد پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹائلیں بڑی بھلی دکھائی دیتی ہیں۔ پرانے مجر کو اپنی اصلی حالت میں رہنے دیا ہے اور چار ستونوں پر گنبد اٹھایا گیا ہے۔ میں نے شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ انہوں نے گنبد تعمیر کرتے وقت حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ کی نفاست طبع کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ شاہ صاحب میری بات سن کر محظوظ ہوئے اور اثبات میں سر ہلایا۔ گنبد کی گردن پر شاہ صاحب نے عبارت لکھوائی ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
آرام گاہ مشائخ عالی نسب
۱۴۰۰ھ

وہ چہ عالی شان گنبد بنا
بر قبور اولیائے محترم
سال تعمیرش ز عطفو کردگار
چہ نور اینست زیبا شد رقم

۱۴۰۰ھ

تاریخ تعمیر گنبد ماہ جمادی الآخر ۱۴۰۰ھ اپریل ۱۹۸۰ء

مجر سے باہر جانب مشرق دو قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک قبر مولانا محمد علی اور شوکت علی کی والدہ آبادی بیگم (م ۱۹۲۴ء) کی ہے جو عوام میں "بی اماں" کے لقب سے مشہور ہیں۔ شاہ زید ابوالحسن نے راقم کو بتایا کہ ان کی تدفین میں گاندھی جی بھی شریک ہوئے تھے۔ شاہ صاحب نے مجھے وہ جگہ بھی دکھائی جہاں گاندھی جی بی اماں کی تدفین کے وقت بیٹھے تھے۔ شاہ صاحب نے فرمایا ایک بار بی اماں کی قبر سے قریب زمین بیٹھ گئی تو انہوں نے دیکھا کہ بی اماں کا جسد خاکی ایک پختہ سُرنگ کے اوپر پڑا ہے۔ دوسری قبر شاہ صاحب کے اکلوتے اور جواں سال بیٹے ڈاکٹر ابوالفضل کی ہے۔ (اب وہاں تیسری قبر شاہ صاحب کی بن گئی ہے)۔ سرسید احمد خان کے والد بزرگوار سید متقی نے یہ وصیت کی تھی کہ انہیں اس خانقاہ میں دفن کر کے قبر کا نشان مٹا دیا جائے اور جو لوگ حضرت شاہ غلام علیؒ کے مزار کی زیارت کے لیے جائیں وہ ان کی قبر کے اوپر سے گزر کر جائیں۔

یہ سید متقی کی شاہ صاحب کے ساتھ عقیدت اور نیاز مندی کا بیّن ثبوت ہے ۔ سرسید احمد خان کو بھی ان کے ساتھ بڑی عقیدت تھی ۔ انہوں نے اپنے اس شعر میں اس کا اظہار یوں کیا ہے:

بہ یحب رفتم و آموختم اسرارِ یزدانی
ز فیضِ نقشبندِ وقت جانِ جانِ جانانی

شاہ زید ابوالحسن (م ۱۹۹۳ء) جامعہ ازہر کے فاضل اور خانقاہ شاہ ابوالخیر کے سجادہ نشین تھے ۔ انہوں نے ساٹھ برس اس خانقاہ کی خدمت کی ہے ۔ ان کی تصانیف میں سے مقاماتِ خیر، حضرت مجددؒ اور ان کے ناقد اور ابنِ تیمیہؒ جیسی تصانیف قابلِ ذکر ہیں. جب میں ان سے ملا تو ان دنوں وہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے خلاف مواد جمع کرنے میں مصروف تھے ۔ یہ جان کر مجھے بڑا دکھ ہوا کہ موصوف کس کام میں لگ گئے ہیں ۔ راقم کی ان کے ساتھ باقاعدہ خط و کتابت رہتی تھی ۔ اللھم اغفرلہٗ و ارحمہٗ

بی اماں کی قبر کی پائنتی جائے نماز کے سائز کا ایک سرخ پتھر نصب ہے ۔ پہلے یہ پتھر ایک مکان کے اندر نصب تھا ۔ شاہ صاحب نے اسے وہاں سے ہٹا کر یہاں نصب کر دیا ہے ۔ اس پتھر پر حضرت شاہ غلام علیؒ نے برسوں تہجد کے نوافل ادا کئے تھے ۔

حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ کی خانقاہ مغلوں کے دورِ زوال میں بڑی بارونق تھی ۔ رُوہیلوں کا ان کی طرف رجوعِ عام تھا اور مرہٹوں کے ساتھ مقابلے کی اسکیمیں یہیں تیار ہوا کرتی تھیں ۔ مرزا صاحب کی وفات کے بعد انہیں اپنے رہائشی مکان میں سپردِ خاک کیا گیا ۔ بعد میں یہ مکان ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء میں شاہ غلام علی اور نعیم اللہ بہرائچی مؤلف مقاماتِ مظہری نے ان کی بیوہ سے خرید کر وقف کر دیا ۔ اصل دستاویز راولپنڈی میں پروفیسر منظور الحق صدیقی کے پاس محفوظ ہے اور اس پر بطورِ گواہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحبِ تفسیرِ مظہری ، شاہ عبدالعزیز دہلوی اور قاضی القضاۃ عنایت اللہ کی مُہریں ثبت ہیں ۔ مکان فروخت کرنے کے بعد مرزا صاحب کی اہلیہ محترمہ مرزا صاحب کے مریدِ خاص قاضی ثناء اللہ کے پاس پانی پت چلی گئیں اور بقیہ عمر وہیں گزاری ۔ ان کی قبر، قاضی صاحب کی قبر سے متصل ایک چھوٹے سے احاطے میں حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء قدس سرہٗ کے مزارِ پُرانوار سے قریب موجود ہے ۔

سرسید احمد خان نے شاہ غلام علیؒ کی حیات میں یہاں ملک ملک کے لوگ دیکھے تھے جو حصولِ فیض کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ۔ سرسید فرماتے ہیں کہ انہوں نے پانصد کے لگ بھگ درویش اس خانقاہ میں دیکھے ہیں اور شاہ صاحب کو اس کی مطلق فکر نہ ہوتی تھی کہ انہیں کھانا کہاں سے فراہم کرنا ہے ۔ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے ۔ شاہ صاحب نے درویشوں کی خور و نوش کا معاملہ اسی ذاتِ پاک پر چھوڑا ہوا تھا ۔ شاہ صاحب کے ایک مرید شاہ رؤف احمد مجددی اپنی تصنیف "جواہرِ علویہ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ ایک بار ٹونک کے نواب امیر الدولہ امیر محمد خان نے شاہ صاحب سے یہ درخواست کی کہ وہ اس کی سرکار سے مستقل وظیفہ قبول فرمالیں ۔ اس پر شاہ صاحب نے فرمایا:

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم
بامیر خان بگو کہ رُوزی مقرر است

شاہ صاحب نے اپنی زندگی فقر و تجرد میں گزاری ۔ انہوں نے سرسید کے والد سید متقی کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا اسی تعلقِ خاطر کی بنا پر سرسید، شاہ صاحب کو "دادا ابا" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے ۔ سرسید فرماتے ہیں کہ اگر انہوں نے شاہ غلام علی کو نہ دیکھا ہوتا تو وہ صالحینِ سلف کی بزرگی کے قائل نہ ہوتے ۔ شاہ صاحب کو دیکھ انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ جب ان کے زمانے میں اس پائے کے بزرگ موجود ہیں تو پہلے زمانے میں کتنے اُونچے پائے کے بزرگ ہوں گے ۔

خانقاہ شاہ ابوالخیرؒ سے رخصت ہوتے وقت شاہ زید ابوالحسن نے وہ تاریخی دروازہ کھلوایا جو گزشتہ ایک صدی سے بند پڑا ہے ۔ میں اور علوی صاحب وہاں سے ندوۃ المصنفین آئے ۔ اس ادارے کے بانی اور رُوحِ رواں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی فروری ۱۹۸۲ء سے اپنے گھر میں مفلوج پڑے تھے ۔ مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی تو موصوف مجھے دیکھتے ہی رونے لگے ۔ پھر اصرار کر کے ہمیں چائے پلائی اور مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا ۔ فالج کے باوجود ان کا ذہن بالکل درست تھا اور یادداشت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا ۔ اس سے گزشتہ سفر میں انہوں نے اپنی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ "منارِ صدا" یہ عبارت لکھ کر اس ناچیز کو عطا فرمایا تھا:

بگرامی خدمت برادرِ عزیز پروفیسر محمد اسلم صاحب
عتیق الرحمن عثمانی

مفتی عتیق الرحمن عثمانی، دارالعلوم دیوبند کے چھ بانیوں میں سے ایک بانی شاہ فضل الرحمن عثمانی (م ۱۹۰۷ء) کے پوتے اور مفتی اعظم دیوبند حضرت مولانا عزیز الرحمن عثمانی (م ۱۹۲۸ء) کے فرزند اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۹۴۹ء) کے بھتیجے تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۸ء میں ندوۃ المصنفین قائم کیا جو ایک اشاعتی ادارے سے بڑھ کر علمی تحریک بن گیا۔ اس ادارے کا ماہانہ مجلّہ برہان ۱۹۳۸ء سے شائع ہونا شروع ہوا اور مسلسل ۴۷ سال تک مولانا سعید احمد اکبر آبادی (م ۱۹۸۵ء) کی ادارت میں چھپتا رہا۔ کہنے کو تو یہ اب بھی چھپ رہا ہے:

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اگلے روز میں دہلی یونیورسٹی گیا۔ وہاں شعبۂ عربی میں ڈاکٹر خورشید احمد فارق سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنی دو نئی تصانیف "تاریخ اسلام" اور "تاریخی تمدنی قانونی ادبی جائزے" راقم کو عنایت فرمائیں۔ ان کی تصانیف میں سے حضرت ابوبکر صدیق کے سرکاری خطوط، حضرت عمر فاروق کے سرکاری خطوط اور حضرت عثمان غنی کے سرکاری خطوط خاص طور پر مشہور ہیں۔ فارق صاحب اپنی بعض نگارشات کی بنا پر دینی حلقوں میں اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھے جاتے۔

اسی شعبے سے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی بھی منسلک ہیں۔ موصوف فارق صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد صدر شعبہ بھی ہو گئے تھے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک تصنیف "نقدِ ملفوظات" لاہور سے بھی چھپ گئی ہے۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے دیوانِ غالب بخطِ غالب شائع کیا تھا۔ موصوف پروفیسر خلیق احمد نظامی، مولانا نسیم احمد فریدی (م ۱۹۸۸ء) اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے ہم جد ہیں۔ موصوف ایک بار لاہور تشریف لائے تو راقم کے ساتھ اپنے جدِ امجد بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کے مزارِ پُر انوار کی زیارت کے لئے پاکپتن حاضر ہوئے۔

شعبۂ اردو میں خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور فضل الحق جیسے فضلاء موجود تھے۔ اس شعبہ میں ہر سال نظام لیکچرز کے نام سے مختلف علمی موضوعات پر لیکچر

کرائے جاتے ہیں جنہیں بعد میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ اس وقت تک اس شعبہ نے "فلسفہ شاعری اور اقبال"، "حضرت نظام الدین اولیاء، حیات اور تعلیمات" ہندوستانی کلچر کا ارتقاء، تاریخ کے آئینہ میں، اقبال نظریۂ شعر اور شاعری، دکنی کلچر اور اوراق مصوّر: عہدِ وسطیٰ کی دلی جیسی بلند پایہ کتابیں شائع کی تھیں جن کے مصنفین میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر محمد حبیب، ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر ہارون خان شروانی اور پروفیسر خلیق احمد نظامی جیسے فضلاء کے نام آتے ہیں۔ پروفیسر فضل الحق صاحب نے یہ کتابیں راقم کو عطا فرمائیں۔

شعبۂ فارسی میں ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر نورالحسن انصاری اور ڈاکٹر امیر حسن عابدی سے ملاقات رہی۔ قاسمی صاحب نے اپنی تصنیف دلپذیر "فارسی نثر کی تاریخ" راقم کو عنایت کی۔ ان کے والدِ بزرگوار مولانا اخلاق حسین دہلوی نے "محاسن موضح القرآن" لکھ کر شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے اُردو ترجمۂ قرآن کی خوبیاں بیان کی ہیں اور معاندین کے مُنہ بند کر دیئے ہیں۔ انہوں نے بعض نام نہاد عالموں کے ترجمۂ قرآن مجید کو معنوی تحریف سے تعبیر کیا ہے۔

ڈاکٹر نورالحسن انصاری نے شعبۂ فارسی کا شائع کردہ "راگ درپن" کا ایک نسخہ مجھے عنایت فرمایا۔ یہ فنِ موسیقی پر فقیر اللہ سیف خان کی مشہور تصنیف ہے۔ فاضل مصنف شاہجہاں اور اورنگ زیب کے ہم عصر اور عہدۂ گورنری پر فائز تھے۔ ان کا مقبرہ پٹیالہ کے قلعہ بہادر گڑھ کے عقب میں موجود ہے۔ میرا ایک جاپانی شاگرد تشویا اس کی تصاویر اتار کر لایا ہے، جو میرے پاس موجود ہیں۔ مقبرے کی دیکھ بھال ایک مسلمان کر رہا ہے۔ انصاری صاحب نے اپنی تالیف "امیر خسرو، احوال و آثار" کا ایک نسخہ مجھے دیا۔ اس کتاب میں انہوں نے امیر خسرو کی حیات اور تصانیف پر برّ عظیم پاک وہند کے نامور علماء و فضلاء کے مقالے جمع کر دیئے ہیں۔ "خسرو کی غزل" کے عنوان سے ان کا بھی ایک مقالہ اس کتاب میں شامل ہے۔ افسوس کہ یہ جواں ہمت اسکالر ۵ دسمبر ۱۹۸۷ء کو بعمر ۵۵ سال داغِ مفارقت دے گیا۔

ڈاکٹر امیر حسن عابدی دو بار راقم الحروف کو شرفِ میزبانی بخش چکے ہیں۔ ایک بار موصوف ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، سابق صدر شعبۂ فارسی، مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اور ڈاکٹر تلکم چند نیرؔ (م ۱۹۹۲ء) سابق صدر شعبۂ اُردو، ہندو یونیورسٹی بنارس کے ساتھ لاہور تشریف لائے اور راقم انہیں مُلّا شاہ بدخشی کا مزار دکھانے لے گیا۔ ڈاکٹر تلکم چند نے مجھے بتایا کہ وہ کوٹ مٹھن کے رہنے والے ہیں اور خواجہ غلام فریدؒ کے عرس کے موقع پر چادر کا جلوس ان کے گھر سے روانہ ہوتا تھا۔

ڈاکٹر امیر حسن عابدی "ایوانِ غالب" کے سہ ماہی مجلّہ "غالب نامہ" کی مجلسِ مشاورت کے ایک اہم رکن ہیں۔ انہوں نے مجھے "ایوانِ غالب" میں "غالب کے عہد کا لاہور" کے موضوع پر تقریر کرنے کی دعوت دی اور اخبارات میں اس کی خوب تشہیر کی۔ میں نے دیکھا کہ سامعین میں لاہور کے ہندو بڑی تعداد میں موجود تھے۔ بعد میں انہوں نے سوالات بھی کئے جن کا راقم نے تسلی بخش جواب دیا۔ تقریب کے اختتام پر عابدی صاحب نے مجھے کتابوں کا ایک سیٹ عنایت فرمایا، ان میں اُستاد چاند خان کی کتاب "موسیقیٔ حضرت امیر خسروؒ" بھی شامل تھی جو تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے بازار سے نہیں مل سکی تھی۔

"ایوانِ غالب" ایک عظیم ادارہ ہے جو غالب کے بارے میں تحقیق کے لئے قائم ہوا تھا۔ بھارت کے سابق صدر فخر الدین علی احمد کی والدہ رقیّہ سلطان (م ۱۹۵۶ء) غالب کے مُنہ بولے بیٹے زین العابدین عارف (م ۱۸۵۲ء) کی پُوتی تھیں۔ اس لئے فخرالدین علی احمد کے دل میں غالب کی بڑی عزت تھی اور انہوں نے اپنے دورِ وزارت میں یہ ادارہ قائم کیا جو ان کے دورِ صدارت میں پروان چڑھا۔ اس ادارے میں ایک شاندار لائبریری کے علاوہ ایک عجائب گھر بھی ہے۔ ایک کاریگر نے غالب کے گھر کی منظر کشی کی ہے۔ غالب کی اہلیہ ایک چوکی پر بیٹھی وضو کر رہی ہے اور غالب جوتے اتار کر کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ ایک مشہور لطیفہ کی تمثیل ہے۔ اسی طرح ایک فنکار نے بڑی محنت کے ساتھ "دِلّی کا آخری یادگار مشاعرہ" کی تمثیل بنائی ہے۔ غالب، ذوق، مومن، شیفتہ اور آزردہ جیسے شعراء کے مجسمے بنائے گئے ہیں اور انہیں اسی عہد کے لباس میں مشاعرہ میں بیٹھے دکھایا گیا ہے۔

ایوانِ غالب، ماتا سُندری روڈ پر، حضرت شاہ ولی اللہ کی درگاہ کے عقب میں اندازاً دو فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے۔ دہلی میں غالب اکیڈیمی کے نام سے بھی ایک

ادارہ قائم ہے جو بستی حضرت نظام الدینؒ میں غالب کی قبر سے متصل تعمیر ہوا ہے۔ یہ ادارہ ہمدرد دواخانہ کے متولّی حکیم عبدالحمید صاحب نے غالب پر تحقیق کے لئے قائم کیا ہے۔ (اس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا)۔

"ایوانِ غالب" سے مہندیوں کی طرف آتے ہوئے میر دردؔ روڈ پر سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس سڑک کے مغربی سرے پر ایک چھوٹی سی بستی "شکور کی ڈنڈی" کے نام سے موسوم ہے۔ اسی بستی میں ایک مسجد ہے جس میں آزادی سے قبل مولانا احتشام الحق تھانوی (م ۱۹۸۰ء) خطبۂ جمعہ دیا کرتے تھے۔ اسی مسجد کے جنوب میں ایک احاطے کے اندر چار قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت مرقوم ہے:

هُوَالنَّاصِر

امیر المحدثین خواجہ محمد ناصر عندلیب

(والدِ خواجہ میر دردؔ)

مصنف فارسی: نالۂ دردؔ، رسالہ ہوش ربا قلمی

ولادت ۲۵ شعبان ۱۱۰۵ھ وفات ۲ شعبان ۱۱۷۲ھ

دوسری قبر مشہور صوفی اور اُردو زبان کے مایہ ناز شاعر حضرت خواجہ میر دردؔ کی ہے۔ خواجہ صاحب پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اُردو غزل کی بنیاد خالص عشقِ حقیقی پر رکھی ہے۔ موصوف وحدت الشہود کے حامی تھے اور اس موضوع پر ان کا یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے:

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

هُوَالنَّاصِر

اوّل المحمدیین خواجہ میر دردؔ

مصنف رسالہ اسرار الصلوٰۃ، واردات، علم الکتاب، نالۂ درد، آہ سرد، دردِ دل، شمعِ محفل، دیوان فارسی اور دیوان اُردو

ولادت ۱۹ ذیقعدہ ۱۱۳۳ھ وفات ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ

خواجہ میر دَرد کے پہلو میں ان کے برادرِ اصغر خواجہ میر اثر محوِ خواب اَبدی ہیں۔ ان کی قبر کے سرہانے جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت منقوش ہے:

ہوَالنّاصِر

خواجہ میر اثر محمدی

برادرِ خورد خواجہ میر دَرد

مصنّف: مثنوی خواب و خیال، مثنوی بیانِ واقع، دیوانِ اثر

وفات صفر ۱۲۰۹ھ

اسی میں چوتھی قبر میر الم کی ہے اور ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

ہوَالنّاصِر

میر الم محمدی الملقب (بہ) خواجہ ضیاء الناصر

فرزند خواجہ میر دَرد

وفات ۲۱ جمادی الثانی ۱۲۱۵ھ

اس احاطۂ قبور سے چند قدم کے فاصلے پر وہ نہ خانہ شکستہ حالت میں موجود ہے جہاں خواجہ میر دَرد عبادت کیا کرتے تھے۔ دن رات لاکھوں افراد پرانی دلّی سے نئی دلّی جاتے ہوئے ان مزارات کے قریب سے گزر جاتے ہیں لیکن ان میں سے شاید ہی کسی کو یہ علم ہو کہ اس جگہ مسلمانوں کا کتنا قیمتی خزانہ دفن ہے:

چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

اگلی صبح میں مہرولی روانہ ہوا۔ کہنے کو تو مہرولی دلّی ہی کا ایک حصہ ہے لیکن وہاں کی آب و ہوا شہر کی نسبت زیادہ خوشگوار ہے۔ بھلے وقتوں میں دلّی کے شرفاء برسات کے موسم میں شہر چھوڑ کر مہرولی چلے جایا کرتے تھے اور موسمِ برشگال میں وہاں بڑی رونق ہو جایا کرتی تھی۔ اب دلّی کی آبادی مہرولی سے بھی آگے نکل گئی ہے۔

مہرولی کے قریب ہی رائے پتھورا کے آباد کردہ شہر "لال کوٹ" کے کھنڈرات موجود ہیں۔ حضرت بندہ نواز گیسو دراز فرماتے ہیں کہ ان کی بارھویں پُشت میں جدِ امجد

ابوالحسن جندی فتحِ دلّی سے بہت پہلے جہاد کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے کفار سے جنگ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ان کی قبر دروازۂ شکار کے باہر فصیل سے متصل تھی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ان کے زمانے تک اس مزار پر شبِ جمعہ کو انوار نظر آیا کرتے تھے۔ اب اس مزار کا سراغ بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

میں قطب مینار کے قریب جا کر بس سے اتر گیا۔ یہاں بہت سی پرانی عمارتیں قابلِ دید ہیں۔ سلطان علاء الدین خلجی نے قطب مینار سے بھی اونچا مینار تعمیر کرنے کی ٹھانی تھی اور اس کی بنیادیں بھی پڑ چکی تھیں لیکن سلطان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اب یہ کھنڈر علائی مینار کے نام سے موسوم ہے۔ اگر یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا تو دنیا کا سب سے اونچا مینار ہوتا۔

علائی مینار کے قریب ہی مسجد قوۃ الاسلام شکستہ حالت میں کھڑی ہے۔ فتحِ دلّی سے قبل اس نواح میں ہندوؤں اور جینیوں کے مندر تھے جو مسلمانوں کی یلغار کے وقت ویران ہو گئے۔ انہی مندروں کے ملبے سے ۱۱۹۰ء میں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔ اب تک مسجد کے ستونوں پر بتوں کے ٹوٹے پھوٹے مجسمے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اس مسجد کی بلند محرابیں قابلِ دید ہیں۔ قطب کی عمارتوں پر پروفیسر محمد مجیب، سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی (م ۱۹۸۵ء) نے ایک عالمانہ مضمون لکھا تھا جو "نذرِ عرشی" میں شامل ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ اتنی بلند عمارتیں وہی قوم تعمیر کر سکتی ہے جس کا حوصلہ بھی اتنا ہی بلند ہو اور مسجدوں کے وسیع و کشادہ صحن بھی وہی قوم بنا سکتی ہے جس کا دل بھی اتنا ہی کشادہ ہو۔

مسجد قوۃ الاسلام سے قریب ہی قطب مینار کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کی بنیاد فتحِ دلّی کی یادگار کے طور پر قطب الدین ایبک (م ۱۲۱۰ء) نے رکھی تھی لیکن وہ اس کی تکمیل سے پہلے ہی راہیٔ ملکِ بقا ہوا۔ اس کی تکمیل سلطان شمس الدین التمش (م ۱۲۳۶ء) نے کی۔ عہدِ علائی میں اس کی مرمت کی ضرورت پیش آئی تو سلطان علاء الدین خلجی (م ۱۳۱۶ء) نے اس کی مرمت کروائی اور اس کا ذکر ایک کتبے میں کر دیا جو مینار پر نصب ہے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق (م ۱۳۸۸ء) کے عہد میں اس مینار کو آسمانی بجلی سے نقصان پہنچا تو سلطان نے ۱۳۶۸ء میں اس کی تلافی کر دی۔ پروفیسر محمد مجیب

نے اس طرح کے میناروں کا سراغ ترمذ کے قریب جرقرگاں میں لگایا ہے جسے انہوں نے قطب مینار کے "آباو اجداد" کا نام دیا ہے۔

ہندوؤں کا یہ کہنا ہے کہ یہ مینار رائے پتھورا نے بنوایا تھا۔ اس کی ماتا جب تک دریائے جمنا کے درشن نہیں کر لیتی تھی، ناشتہ نہیں کرتی تھی۔ جب وہ بوڑھی ہو گئی اور طویل سفر طے کرنے کے لائق نہ رہی تو رائے پتھورا نے اسے یہ مینار بنوا دیا تاکہ وہ اس پر چڑھ کر جمنا کے درشن کر لیا کرے۔ بدیں وجہ ہندو اسے "رائے پتھورا کی لاٹھ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مینار کے اطراف میں پتھر تراش کر آیات قرآنی کوفی خط میں کندہ کی گئی ہیں۔ ان آیات کی خط کوفی میں موجودگی ہندوؤں کے دعوے کی تردید کر رہی ہے۔ ثانیاً اتنی کم حوصلہ قوم اتنا بلند مینار تعمیر نہیں کر سکتی۔ یہ مسلمانوں ہی کا حوصلہ ہے جو اتنی بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرتے رہے۔

قطب مینار سے قریب ہی علائی دروازہ کی شاندار عمارت کھڑی ہے۔ ماہرین فن تعمیر کا یہ خیال ہے کہ منگولوں کے حملے کے وقت وسط ایشیاء سے جو مسلمان کاریگر بھاگ کر دہلی آ گئے تھے، اس کی تعمیر کا سہرا ان کے سر ہے۔ اس عمارت میں سلجوقیوں کے فن تعمیر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ باہر سے دیکھنے میں یہ عمارت دو منزلہ نظر آتی ہے لیکن اندر جا کر دیکھیں تو یک منزلہ ہے۔

علائی دروازے سے گزر کر امام ضامن کے مقبرے تک پہنچتے ہیں۔ سر سید احمد خان (م ۱۸۹۸ء) نے آثار الصنادید میں ان کا نام سید محمد علی مشہدی تحریر کیا ہے۔ اس مقبرے کی عمارت ۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء میں ہمایوں کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی اور فنی اعتبار سے قابل تعریف ہے۔ مقبرے پر گنبد کی بجائے ڈھلوان چھت تعمیر کی گئی ہے۔ بعد میں اسی طرز پر حضرت میاں میر لاہوری (م ۱۶۳۵ء) کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

مسجد قوۃ الاسلام کے عقب میں دو مقبرے آمنے سامنے نظر آتے ہیں ان میں جو مقبرہ شمال مغربی گوشے میں ہے وہ سلطان شمس الدین التمش (م ۱۲۳۶ء) کا ہے۔ اس مقبرے کا گنبد مدت ہوئی گر چکا ہے۔ مقبرے کی اندرونی دیواروں پر خط کوفی میں قرآن حکیم کی آیات کندہ ہیں۔ اس کے بالمقابل سلطان علاء الدین خلجی (م ۱۳۱۶ء) کا مقبرہ ہے جو اب ویران پڑا ہے۔ خیر المجالس میں مرقوم ہے کہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی (م

۱۳۵۶ء) کے زمانے میں نماز جمعہ کے بعد نمازی بکثرت سلطان علاء الدین خلجی کے مزار کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے اور وہاں منتیں مانا کرتے تھے۔ اب وہاں الّو بولتے ہیں۔

قطب صاحب کی عمارتیں دیکھ کر میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی (م ۱۲۳۵ء) کی درگاہ کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں ایک باؤلی نظر آئی جس کے بارے میں یہ روایت ہے کہ یہ سلطان شمس الدین التمش کی تعمیر کردہ ہے۔ اس باؤلی کے قریب ایک گوردوارہ ہے جہاں اس وقت شبد کیرتن ہو رہا تھا۔

خواجہ صاحب کی درگاہ کے احاطے میں سیکڑوں قبریں اور کئی مسجدیں ہیں۔ آخر میں ایک مسجد آتی ہے جس کے صحن میں مغل شہزادوں کی متعدد قبریں ہیں، انہی میں ایک قبر مغل حکمران فرخ سیر (م ۱۷۱۹ء) کی ہے جسے سیدان بادشاہ گر نے قید خانے میں مروا دیا تھا۔ یہ وہی فرخ سیر ہے جس کا سکہ جعفر زٹلی نے یوں کہا تھا:

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر

پادشاہ دانہ کش فرخ سیر

بعض حضرات نے دانہ کش کی بجائے پٹہ کش بھی لکھا ہے۔ لیکن جناب مشفق خواجہ کی یہ تحقیق ہے کہ یہ لفظ تسمہ کش ہے کیونکہ فرخ سیر چمڑے کے تسمے سے اپنے مخالفین کا گلا گھونٹ کر مروا دیتا تھا اور وہ خود بھی اسی طرح مرا۔ اس کی تاریخ وفات کسی نے کیا خوب کہی تھی:

سادات بوی نمک حرامی کردند

۱۱۳۱ھ

اس کے ایک ہم عصر بزرگ نے اس کی تاریخ ۔ فاعتبروا یا أولی الابصار (۱۱۳۱ھ) سے بھی نکالی ہے۔

اس مسجد کے عقب میں محراب سے متصل چشتیہ نظامیہ سلسلہ تصوف کے مشہور بزرگ مولانا فخر الدین اور ان کے پوتے حضرت نصیر الدین عرف کالے صاحب محو خواب ابدی ہیں۔ آخری مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر نے مولانا فخر الدین کی مدح میں چند اشعار کہے تھے، ان میں سے دو ہدیہ قارئین ہیں:

مرشدِ پاک روان فخر الدین

قبلہ و کعبہ جان فخرالدین
اک جہاں فخر جہاں کہتا ہے
پر ہے فخر دو جہاں فخرالدین

حضرت کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
اللھم صلی علی محمد و علیٰ آل محمد

بگذاشت فخرالدین چوں مہمان سرائے فانی
بر آستانہ جا داد آن قطب جاودانی
سال وصال آن ماہ از غیب چون بجستم
تاریخ گفت ہاتف - خورشید دو جہانی -

۱۱۹۹ھ

و من کلام سید الشعراء فخرالدین مقبول الٰہی ۱۲۲۲ھ

حضرت مولانا فخرالدین کے خلیفۂ اعظم خواجہ نور محمد مہارویؒ (م ۱۷۹۰ء) سے شاہ سلیمان تونسویؒ (م ۱۸۵۰ء) نے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور ان سے خواجہ شمس الدین سیالویؒ (م ۱۸۸۲ء) فیض یاب ہوئے۔ ان کے خلفاء میں سے پیر مہر علی شاہ گولڑوی (م ۱۹۳۷ء) اور پیر غلام حیدر شاہ جلالپوری (م ۱۹۰۸ء) نے بڑا نام پیدا کیا۔ پنجاب میں گزشتہ صدی میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی اشاعت مولانا فخرالدینؒ کے ذریعے ہوئی۔

مولانا فخرالدین کے مزار پر انوار سے قریب ہی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشیؒ (م ۱۲۳۵ء) کی ابدی آرام گاہ ہے۔ موصوف خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ کے خلیفۂ اعظم اور بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے مرشد تھے۔ ان کا آبائی وطن فرغانہ کا ایک قصبہ اُوش تھا جس کا ذکر مغل فرمانروا بابر نے اپنی تزک میں کیا ہے۔ ان کے مزار پر پہلے سنگِ مرمر کا سادہ سا گنبد تھا۔ اب اس پر ان کے کسی معتقد نے رنگ برنگے شیشوں کا بہت ہی نفیس کام کروایا ہے۔ خواجہ صاحب کے مزار مبارک کو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ہندو مفسدوں نے بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ گاندھی جی نے اپنے قتل (۳۰

جنوری ۱۹۴۸ء) سے چند روز پہلے اس نقصان کی تلافی کرائی۔ ایک کتبے پر اس کی تفصیل درج ہے۔ ان کی قبر کے بارے میں یہ روایت زبان زدِ خلائق ہے کہ اس کی مٹی بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ نے اپنے سر پر ٹوکریاں اٹھا کر ڈالی تھی۔

خواجہ صاحب کے مزار سے قریب ہی ایک بلند چبوترے پر ان کے زندگی بھر کے رفیق قاضی حمید الدین ناگوریؒ (م ۱۲۴۵ء) کی ابدی آرام گاہ ہے۔ موصوف نے شیخ الشیوخ شہاب الدین ابو حفص عمر سہروردیؒ (م ۱۲۳۴ء) صاحبِ عوارف المعارف سے خرقۂ خلافت پایا تھا۔ یوں تو حضرت سہروردیؒ کے اور بھی کئی خلفا برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش تشریف لائے لیکن اپنے مرشد کی نگاہ میں حضرت ناگوری سب سے افضل تھے۔ موصوف سماع کے بڑے دلدادہ تھے اور انہی کی ذات سے سماع کو برِ عظیم میں فروغ ہوا۔

قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور فرخ سیر کی قبروں کے درمیان ایک بے سقف کمرہ "صندل خانہ" کے نام سے موسوم ہے جہاں خاندان لوہارو کے کئی بزرگ شعراء آرام فرما ہیں۔ ان میں ایک قبر نواب مرزا سراج الدین احمد خان سائل (م ۱۹۴۵ء) کی ہے۔ راقم نے جب سے مجلّہ "نقوش" لاہور میں ان کی شخصیت پر مالک رام (م ۱۹۹۳ء) کا مضمون پڑھا تھا، ان کے ساتھ ایک قلبی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔

ان کی اہلیہ لاڈلی بیگم (م ۱۹۷۳ء) نواب مرزا خان داغ دہلوی کی سالی اولیاء بیگم کی نواسی تھی، جسے داغ نے گود لے لیا تھا۔ لاڈلی بیگم قیامِ پاکستان کے بعد اپنے بیٹے غلام قطب الدین احمد قطب (م ۱۹۶۲ء) کے ہمراہ لاہور چلی آئی تھیں۔ یہیں قبرستان میانی صاحب میں ماں بیٹا محو خوابِ ابدی ہیں۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اُوشیؒ کی درگاہ میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو "موتی مسجد" کے نام سے موسوم ہے۔ اس مسجد میں ایک نوجوان جوڑے نے سکونت اختیار کرلی ہے۔ اس مسجد کی جنوبی دیوار کے ساتھ اورنگ زیب عالمگیر (م ۱۷۰۷ء) کے جانشین شاہ عالم بہادر شاہ (م ۱۷۱۲ء) اور اکبر شاہ ثانی (م ۱۸۳۷ء) کی قبریں ہیں۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے بھی اپنی زندگی میں اپنے لئے یہاں قبر کے لئے جگہ مخصوص کر لی تھی لیکن اس کی مٹی اسے رنگون لے گئی۔ اب یہ قبر خالی پڑی ہے۔

بندہ بیراگی کو جب عبدالصمد خان دلیر جنگ بہادر نے گرفتار کرکے دہلی بھیجا تو اسے قتل کرنے سے پہلے شاہ عالم بہادر شاہ کی قبر کا طواف کرایا گیا تھا تاکہ مرحوم بادشاہ کی رُوح کو اس سفاک کے قتل سے سکون پہنچے۔

قطب صاحب کی درگاہ سے قریب ہی بہادر شاہ ظفر کا محل ہے جہاں وہ برسات کا موسم گزارتا تھا۔ اس محل کے صدر دروازے سے قریب ایک چبوترے پر مولانا مفتی کفایت اللہ اور ان کے رفیقِ خاص مولانا احمد سعید دہلوی کی قبریں ہیں۔ مفتی صاحب کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

فقیہ الامت مولانا کفایت اللہ

۷۲ھ ۱۳

ارتحال مفتیٔ اسلام سے
مضطرب دل اور مختل ہے دماغ
مطلعِ انوار تھا ان کا وجود
تھے وہ محرابِ شریعت کے چراغ
ان کے اٹھ جانے سے ویراں ہو گیا
ملّتِ اسلام کا سرسبز باغ
سالِ رحلت ہے یہ مصرع اے خیال
ہو گیا گل آہ دہلی کا چراغ

۷۲ھ ۱۳

لوح کی دوسری جانب یہ عبارت کندہ ہے:

الیس اللہ بکاف عبدہٗ

مرقد

مفتیٔ اعظم حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ
مہتمم شیخ الحدیث مدرسۂ امینیہ دہلی
صدر اوّل جمعیت علمائے ہند

۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء

مولانا احمد سعید دہلوی کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

۷۸۶

نذرِ عقیدت

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے

۱۔ ہندوستان کی آزادی کا نڈر جنرل اور عظیم رہنما
۲۔ جمعیت العلمائے ہند کے روحِ رواں
۳۔ آفتابِ فصاحت و بلاغت
۴۔ شہنشاہِ خطابت
۵۔ عارفِ اسرارِ شریعت و طریقت
۶۔ مبلغ اسلام
۷۔ متوکل علی اللہ
۸۔ علم مجلسی میں یکتا
۹۔ حق فہم و حق گو

مفسر قرآن سحبان الہند حضرت علامہ حافظ الحاج مولانا احمد سعید نور اللہ مرقدہ
تاریخ وفات ۴ دسمبر ۱۹۵۹ء بروز جمعہ بعد نماز مغرب

علمائے کرام کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے بعد میں مہرولی کے صدر بازار میں سے ہوتا ہوا حوض شمسی پہنچا۔ ایک روائت کے مطابق سلطان شمس الدین التمش نے خواب میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ یہاں پانی کی کمی ہے لہٰذا تم ایک حوض بنوا دو۔ حضورؐ نے خود ہی زمین پر نشان لگایا۔ سلطان نے حوض تیار کرایا تو اس کے کنارے اللہ والوں نے رہائش اختیار کرلی جو اس کی قبولیت کی دلیل ہے۔

حوض کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو اولیاء مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ اس مسجد میں خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشیؒ، بابا

فرید الدین مسعود گنج شکرؒ اور حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ جیسے بزرگانِ دین نے نمازیں ادا کی ہیں۔ لوگ حصولِ برکت کے لئے اس مسجد میں نوافل ادا کرتے ہیں۔

حوضِ شمسی سے ذرا آگے بڑھیں تو لودھی عہد کے مشہور بزرگ شیخ سماء الدین سہروردیؒ (م ۱۴۹۶ء) کی خانقاہ آتی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م ۱۶۴۲ء) کے بزرگوں کو ان کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور "سیر العارفین" کے فاضل مصنف شیخ جمالی بھی ان کے دامنِ ارادت سے وابستہ تھے۔ شیخ سماء الدین کی نمازِ جنازہ قطب العالم شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ (م ۱۵۳۷ء) نے پڑھائی تھی۔ اس کی دلچسپ تفصیل "لطائفِ قدوسی" میں موجود ہے۔

شیخ سماء الدین کی درگاہ سے قریب ایک ٹیلہ موجود ہے جو فردوسیہ پہاڑی کے نام سے موسوم ہے۔ اس ٹیلے پر حضرت نجیب الدین فردوسیؒ (م ۱۲۹۲ء) کا مزار پُرانوار ہے۔ موصوف کے خلیفہ حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ (م ۱۳۸۱ء) نے ان کے سلسلے کو بہار اور بنگال میں فروغ دیا۔ اس سلسلے کی خانقاہیں بہار اور بنگال کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں۔ شیخ شرف الدین احمد کو صوبہ بہار کا سب سے بڑا ولی تسلیم کیا جاتا ہے۔

حوضِ شمسی کے کنارے پر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م ۱۶۴۲ء) کا عالی شان مقبرہ دُور دُور سے زائرین کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ مقبرے کی عمارت زرد رنگ کے پتھروں سے تعمیر کی گئی ہے۔ شیخ محدث بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے سیرت النبیؐ پر ان کی تصنیف مدارج النبوۃ خاص طور پر مشہور ہے۔ ان کی ایک تصنیف اخبار الاخیار کی مغل فرمانروا جہانگیر (م ۱۶۲۷ء) نے اپنی تزک میں بڑی تعریف کی ہے۔ یہ اولیائے کرام کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شیخ محدث کے سوانح حیات پر ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے۔

حضرت کی اولاد کے مزارات بھی گنبد سے باہر چار دیواری کے اندر ہیں۔ ان کے سب سے بڑے فرزند شیخ نور الحقؒ (م ۱۶۷۳ء) صاحبِ زبدۃ التواریخ بھی وہیں مدفون ہیں۔ اس خانوادے کی علمی اور رُوحانی روایات میرے شیخ طریقت حضرت شاہ ابرار الحق حقی

مدظلہم العالی خلیفۂ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے قائم رکھی ہوئی ہیں۔

اس مقبرے کے اِرد گرد ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔ کاش دہلی کے مسلمان اپنی اس متاعِ گراں مایہ کی کماحقہ حفاظت کر سکتے اور وہاں ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کرکے اس درگاہ کو آباد کر دیتے۔ الیس منکم رجل رشید۔ مغلوں کے آخری دورِ حکومت میں حوضِ شمسی کے کنارے موسمِ برسات میں "پھول والوں کی سیر" کے نام سے ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ برطانوی عہد میں یہ میلہ بند ہو گیا۔ مرزا غالب بڑے افسوس کے ساتھ میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں دلّی کی ہستی منحصر تھی کئی ہنگاموں پر قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلّی کہاں" ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا"۔

اب چند سالوں سے یہ میلہ دوبارہ ہونے لگا ہے۔ اس میلے میں پھولوں کے پنکھوں کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ مسلمان میلے کے اختتام پر اپنے پنکھے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اُوشیؒ (م ۱۲۳۵ء) کے مزار پر چڑھاتے ہیں اور ہندو جوگ مایا کے مندر میں لے جا کر دیوی کے چرنوں میں ڈال دیتے ہیں۔

قطب صاحب سے جو سڑک گوڑگانواں جاتی ہے اس سڑک پر اندازاً دو فرلانگ کے فاصلے پر سڑک سے ہٹ کر سلطان غیاث الدین بلبن (م ۱۲۸۷ء) کا مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ ڈھ گیا تھا۔ ان دنوں محکمہ آثار قدیمہ اس کی تعمیر نو کروا رہا تھا۔ اب یہ کام مکمل ہو چکا ہو گا۔ اس مقبرے کے عقب میں قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر جنگل میں ایک خوبصورت اور کشادہ مسجد مسلمانوں کے زوال پر نوحہ کر رہی ہے۔ یہ مسجد اب بے چراغ ہے۔ ماہرینِ فن نے اس مسجد کو لودھی عہد کے فنِ تعمیر کا شاہکار تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ اس کی تعمیر مغل حکمران ہمایوں کے عہد (۱۵۳۰ء ـ ۱۵۴۰ء) میں ہوئی تھی تاہم ابھی بالکل صحیح و سالم حالت میں موجود ہے۔ جس وقت میں وہاں پہنچا اس وقت مسجد کے اندر ایک ہندو نوجوان بھرپُور ایکشن کے ساتھ فلمی مکالمات کی ریہرسل کر رہا تھا۔ اس مسجد کو یوں ویران دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ اس مسجد کی شمالی دیوار کے ساتھ شیخ جمالی (م

۱۵۳۵ء) کا مزار ہے ۔ موصوف سلطان سکندر لودھی کے اُستاد، سیر العارفین کے مصنف اور مولانا عبدالرحمن نورالدین جامیؒ (م ۱۴۹۲ء) کے ہم نشین تھے ۔ علامہ اقبال نے ان کے درج ذیل شعر کو نعت کا بہترین شعر قرار دیا ہے اور بقول عبدالحق محدث دہلویؒ یہ شعر بارگاہِ رسالت میں قبول ہو چکا ہے:

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پرتو صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

مسجد کی نسبت مقبرے کی حالت بہت اچھی ہے اور ساڑھے چار صدیاں گزر جانے کے بعد بھی مقبرے کی اندرونی دیواروں پر نقش و نگار ماند نہیں پڑے بلکہ ایسا گمان گزرتا ہے کہ شاید نقاش ابھی ابھی اپنے کام سے فارغ ہوا ہے ۔

شیخ جمالی کے مزار سے میں واپس قطب مینار آیا اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر مہرولی روڈ پر شیخ عبدالرحمن چشتی کے مزار کے قریب اتر گیا ۔ اس مزار سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر سلطان علاء الدین خلجی (م ۱۳۱۶ء) کا تعمیر کردہ حوض ہے ۔ یہ راستہ پیدل طے کرنا ہوتا ہے ۔ اگرچہ سڑک کے دونوں جانب شاندار بنگلے موجود ہیں لیکن اس سڑک پر بس نہیں چلتی ۔ یہ علاقہ حوض خاص انکلیو (Enclave) کہلاتا ہے ۔ حوض خاص کے کنارے کئی عمارتیں موجود ہیں، جو کسی مدرسے کا حصہ معلوم ہوتی ہیں ۔ اسی جگہ سلطان فیروز تغلق (م ۱۳۸۸ء) کا مقبرہ ہے ۔ اس کے علاوہ بھی کئی بے نام مقبرے وہاں موجود ہیں ۔ جب امیر تیمور ۱۳۹۸ء میں دہلی آیا تو اس نے ان عمارتوں کی بڑی تعریف کی تھی ۔

حوض خاص دیکھ کر میں شہر آیا اور شام کو شاہ زید ابوالحسن کی نشاندہی پر کناٹ پلیس پہنچا ۔ جن لوگوں نے یہ جگہ دیکھی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہاں دکانیں اور دفاتر ایک گول دائرہ کی شکل میں ہیں اور وہاں اس طرح کے تین دائرے ہیں ۔ درمیانی دائرے میں جو کناٹ سرکس کے نام سے موسوم ہے میں ریلوے ریزرویشن آفس کے پاس اترا اور شاہ صاحب کی ہدایت پر دائرے میں چلنا شروع کیا ۔ میں قریباً ایک فرلانگ چلا ہوں گا کہ دائیں جانب ایچ بلاک میں رگھو نندن بلڈنگ کے عقب میں ایک گول تھڑا نظر آیا ۔ اس تھڑے پر دو تین دکانیں بن گئی ہیں اور ایک ہندو نے چھوٹا سا مکان بھی بنا لیا ہے ۔

(دوسرے سفر میں دیکھا وہاں مزید کئی دکانیں بن گئی ہیں) اسی تھڑے پر حضرت سعد اللہ گلشن مجددیؒ (م ۱۷۳۱ء) صاحبِ "گلشن وحدت" کا مزار ہے ۔ مزار کے سرہانے دیوار پر ایک کتبہ نصب ہے جس پر یہ عبارت درج ہے:

درگاہ حضرت شاہ سعد اللہ گلشن مجددی

تاریخ وفات ۱۱۵۳ھ

جامع بود میان کمالات ظاہری و باطنی و زہد و تقویٰ و تجرید و تفرید ۔ ریاضتِ شاقہ کشید و طعام بعد از سہ روز زیادہ از سہ لقمہ تناول نکردے و تا سی سال عمرِ خود در یک گلیم گزارنید ۔ آخر در ۱۱۵۳ھ وفات یافت۔

ایک دن شاہ گلشن یہی گلیم اوڑھے اپنے دروازے پر کھڑے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ پالکیوں کا ایک جلوس جا رہا ہے اور ایک پالکی پر انوار کی بارش ہو رہی ہے ۔ شاہ صاحب نے اپنی گلیم زمین پر دے ماری اور اپنے ساتھیوں سے فرمانے لگے کہ تیس برس سے وہ یہ گلیم اوڑھ کر تہجد کی نماز ادا کر رہے ہیں لیکن جو انوار اس پالکی پر نظر آ رہے ہیں، ویسے اس گلیم میں نظر نہیں آتے ۔ ان کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا کہ اس پالکی میں خواجہ محمد زبیر سرہندیؒ تشریف لے جا رہے ہیں ۔ شاہ صاحب نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا اور فرمایا۔ "الحمد للّٰہ! یہ نعمت ہمارے خاندان سے باہر نہیں گئی ۔ موصوف ہمارے ہی پیرزادے ہیں" ۔

شاہ گلشن مجددیؒ، حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کابلی فاروقی نقشبندی حنفی ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۶۲۴ء) کے پوتے حضرت عبدالاحد المتخلص بہ "وحدت" (م ۱۷۱۳ء) کے مرید تھے اور اُردو شاعری کا باوا آدم ولی دکنی (م ۱۷۰۷ء) شاہ گلشن کا شاگردِ رشید تھا بلکہ شاہ صاحب نے ہی اسے اُردو شاعری کی طرف لگایا تھا ۔ ولی دکنی کے شاگردوں میں سے شاہ حاتم نے بڑا نام پیدا کیا ۔ محمد رفیع سودا (م ۱۷۸۱ء) شاہ حاتم (م ۱۷۸۳ء) کا شاگرد تھا ۔ اسی طرح خواجہ میر دردؔ (م ۱۷۸۵ء) کے والدِ محترم میر ناصر عندلیبؔ (م ۱۷۵۸ء) بھی شاہ گلشنؒ کے شاگرد اور مرید تھے ۔ خواجہ میر درد کے تلامذہ میں سے بیدار (م ۱۷۹۶ء) نثار، میر اثر (م ۱۷۹۴ء)، میر الم (م ۱۸۰۰ء)، ہدایت (م ۱۸۰۱ء)، قائم

چاند پوری (م ۱۷۹۷ء) اور ثنا، اللہ خان فراق (م ۱۸۳۰ء) بڑے مشہور ہوئے ہیں ۔ یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ شاہ گلشن نے اُردو شاعری کو چار چاند لگا دیئے ہیں ۔ ان کے مزار کے ارد گرد ناجائز تجاوزات ہو رہے ہیں اس لئے اسے قبضہ گروپ سے بچانا دلی والوں کا کام ہے:

الیس منکم رجل رشید

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری پنجابی زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ کرنے کے بڑے ماہر تھے ۔ وہ اس آیت کریمہ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا کرتے تھے: "تہاڈے وچ بندے دا پتّر کوئی نئیں؟"

اس استاد الاساتذہ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد میں ندوۃ المصنفین لوٹ آیا ۔ رات کو وہاں باقاعدگی کے ساتھ محفل جما کرتی تھی جس میں اصحاب فضل و کمال شرکت کیا کرتے تھے ۔ یہ محفل بھی مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے ساتھ ہی ختم ہو گئی ۔ اس رات ان کی محفل میں قاری محمد ادریس خطیب جامع مسجد نئی دہلی، احمد بخش ایڈووکیٹ ساکن کوٹہ (راجستھان) اور کئی دوسرے اصحاب موجود تھے ۔

اگلی صبح میں شاہ زید ابوالحسن کی نشاندہی پر سبزی منڈی پہنچا اور برف خانے کے چوک سے شہزادی روشن آراء کے باغ کی طرف چل پڑا ۔ اندازاً دو فرلانگ کے فاصلے پر دائیں ہاتھ دکانوں کی قطار میں ایک چھوٹے سے کمرے میں حضرت شاہ محمد آفاق مجدّدیؒ کا مزار ہے ۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں ایک بدبخت سکھ نے ان کی قبر شہید کر کے وہاں رہائش اختیار کر لی تھی ۔ مسلمانوں نے بڑی مشکل سے اسے وہاں سے دفع کیا اور فرش کھود کر مزار کا نشان تلاش کر لیا ۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے:

مزارِ پُر انوار

عارف حق حضرت شاہ محمد آفاق مجدّدی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ

۷ محرم الحرام ۱۲۵۱ھ یوم چہار شنبہ ۶ مئی ۱۸۳۵ء

چوں جناب شاہ آفاق از جہاں
کرد رحلت سوئے جنت نعیم
گفت سال رحلتش خیر حزیں

خلد را ماوائے او کن اے کریم
۱۲۵۱ھ

اس قطعہ تاریخ میں تخلص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ حضرت شاہ ابوالخیر کی کہی ہوئی ہے ۔

شاہ محمد آفاق، حضرت خواجہ محمد زبیر سرہندی (م ۱۸۳۸ء) کے خلیفہ خواجہ ضیاء اللہ کے مرید تھے ۔ ان کے خلفاء میں سے حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی (م ۱۸۹۵ء) نے برعظیم پاک و ہند کے دینی حلقوں اور رُوحانی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا ہے ۔ شاہ فضل رحمٰن فرمایا کرتے تھے: "ہم نے دو دکانیں دیکھی ہیں: ایک شاہ غلام علی صاحبؒ کی اور دوسری شاہ آفاق کی کہ اس دکان میں عشق کا سودا بکا کرتا تھا"

شاہ فضل رحمٰن اپنے مرشد کے بارے میں فرماتے ہیں: "ہمارے حضرت دس ہزار مرتبہ درود شریف اور پچاس ہزار بار کلمہ طیبہ پڑھتے تھے اور دس پارے قرآن مجید کے تہجد میں پڑھنے کا معمول تھا ۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا، دس پارے اتنی جلدی ہو جاتے کہ انجان کہے ایک پارہ پڑھا ہو گا اور پانچوں وقت صلوٰۃ التسبیح پڑھتے تھے ۔ مزاج میں نہایت تواضع اور مسکنت تھی ۔ سب باتیں سنت کے مطابق کرتے تھے لیکن کسر نفسی سے ایسا فرماتے تھے کہ ہم سے جو بات موافق سنت ہو جاتی ہے تو عرش سے ایسا فیض آتا ہے کہ تر بتر ہو جاتے ہیں"۔

شاہ محمد آفاق کے مزار سے دو فرلانگ کے فاصلے پر شہزادی روشن آراء بیگم (م ۱۶۷۱ء) بنت شاہجہان کا باغ ہے ۔ اسی باغ کے وسط میں مغلیہ طرز کی ایک عمارت کے اندر شہزادی کی ابدی آرام گاہ ہے جس کی دیکھ بھال باغ کا عملہ کرتا ہے ۔ جس وقت میں وہاں پہنچا تو قبر پر تازہ پھول پڑے ہوئے تھے ۔

شاہجہان کے بیٹوں کے درمیان جب تخت نشینی کے لئے جنگ ہوئی تو روشن آراء بیگم نے اورنگ زیب کا ساتھ دیا تھا اور اس کی بڑی بہن جہاں آراء بیگم نے شہزادہ داراشکوہ کی حمایت کی تھی ۔ اس لئے داراشکوہ کی شکست کے بعد جہاں آراء بیگم خانہ نشین ہو گئی اور عالمگیر اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد روشن آراء بیگم کا ستارہ چمکا ۔ روشن آراء بیگم بھی اپنی بڑی بہن جہاں آراء کی طرح صوفی منش خاتون تھی ۔

جہاں آراء نے مشہور قادری بزرگ مُلّا شاہ بدخشیؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی اور روشن آراء بیگم حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فرزند ارجمند خواجہ محمد معصومؒ (م ۱۶۶۸ء) کی مریدہ تھیں۔ مکتوباتِ معصومیہ میں ان کے نام بھی کئی خط موجود ہیں۔ خواجہ محمد معصومؒ کی وفات کے بعد روشن آراء بیگم نے ان کے فرزندوں حضرت سیف الدین سرہندیؒ (م ۱۶۸۵ء) اور محمد نقشبندؒ (م ۱۷۰۲ء) کے ساتھ روابط قائم رکھے۔ نقشبندی حلقوں میں یہ بات مشہور ہے کہ سرہند شریف میں خواجہ محمد معصومؒ کا روضۂ مبارک شہزادی روشن آراء نے تعمیر کروایا تھا۔

روشن آراء بیگم کا مزار دیکھ کر میں ندوۃ المصنفین واپس آگیا۔ دوپہر ہو چکی تھی اس لئے میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ٹیا محل بازار میں کریم ہوٹل پر کھانا تناول کرنے چلا گیا۔ اتفاق سے وہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کی صدر محترمہ ثریا آپا دو تین خواتین کے ساتھ تشریف فرما تھیں۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا اور میری اور میرے اہل خانہ کی خیریت دریافت کی۔ انہوں نے کھانے کی دعوت دی لیکن میں نے معذرت چاہی۔ محترمہ کی بہن بھارت سے باہر تشریف لے جا رہی تھیں یہ انہیں الوداع کہنے دہلی آئی تھیں۔ ایک بار دوبارہ علی گڑھ میں قرۃ العین کے ساتھ ایک کھانے پر ان کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے میں علی یونیورسٹی کے مہمان خانے میں سیّد برکات احمد سے ملنے گیا ہوا تھا۔ ان دنوں یونیورسٹی کے کورٹ کی میٹنگ ہو رہی تھی جس میں شرکت کے لئے سیّد برکات احمد اور قرۃ العین آئے ہوئے تھے۔ دوپہر کو وائس چانسلر کی طرف سے کورٹ کے ممبران کے اعزاز میں کھانے کی دعوت تھی۔ سیّد برکات احمد نے مجھے اپنی طرف سے کھانے میں شرکت کی دعوت دی۔ میں قرۃ العین کو نہ پہچان سکا۔ ثریا آپا نے ان کا تعارف کرایا تو میں نے کہا کہ میں نے نقوش کے شخصیات نمبر میں ان کی تصویر دیکھی تھی۔ ثریا آپا نے فوراً کہا کہ وہ تصویر بھی بہت پرانی تھی جو انہوں نے طبع کرائی تھی۔

دہلی میں کریم ہوٹل کا کھانا بڑا لذیذ مانا جاتا ہے۔ اس سے قریب ہی سلیمان ٹی سٹال ہے جہاں دہلی کے پرانے وضع دار بزرگ چائے نوش کرنے جاتے ہیں۔ ان چائے خانوں میں بھی لوگ رُوز مرّہ درست کرنے کے لئے جایا کرتے ہیں۔ مجھے ایک دکنی بزرگ نے بتایا کہ حیدر آباد میں وہ زبان سیکھنے کے لئے چائے خانوں میں جایا کرتے تھے۔ جب ہوٹل کا بیرا آرڈر لینے کے آتا تو گاہک اسے چائے کا ایک کپ لانے کے لئے کہتا۔ بیرا فوراً پوچھتا "حضور کتنی چینی" گاہک جواب میں کہتا "کھرا مچھ" (یعنی اتنی چینی کہ اس میں مچھ کھڑا ہو جائے)۔ پھر وہ پوچھتا "حضور کیسی چائے" اگر چائے میں بالائی ڈلوانی ہوتی تو گاہک کہتا "برقعے والی" اور جب کوئی اچھی چائے طلب کرتا تو بیرا اس سے پوچھتا "جناب کیسی چائے چلے گی" تو وہ جواب میں کہتا "حضرت قبلہ والی"۔

سلیمان ٹی سٹال میں بھی دہلی کے "کرخندار" آتے ہیں۔ میں بھی ایک کپ لے کر ایک میز پر بیٹھ جاتا تو مزے لے لے کر ان کی باتوں سے لطف اندوز ہوتا۔ اسی جگہ کئی بار خان غازی کابلی کے ساتھ میری ملاقات ہوئی۔ وہ کوچہ رحمان میں رہتے تھے لیکن چائے پینے کے لئے یہیں آتے تھے۔

قیام پاکستان سے قبل خان غازی کابلی کا شمار پاکستان کے مخالفین میں ہوتا تھا۔ وہ ملاپ اور پرتاپ جیسے متعصب ہندو اخبارات کے مالکان سے چند ٹکے لے کر پاکستان اور قائداعظم کے خلاف مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس لئے خان صاحب کو ہمارے سیاسی حلقوں میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ قیام پاکستان کے موقع پر جب لوہاری دروازے اور انارکلی بازار کے ہندوؤں نے بھاگ کر ڈی اے وی کالج کے ہاسٹل میں پناہ لی تو وہ بھی مسلمانوں کے خوف سے اپنی رہائش گاہ چھوڑ کر ڈی اے وی کالج کے ہوسٹل میں پناہ گزین ہو گئے۔ ایک رُوز مردولا بہن سارا بائی بھارت سے بسوں کا ایک فلیٹ لے کر ہندو شرنارتھیوں کو لینے لاہور آئی تو خان صاحب بھی دوڑ کر بس میں سوار ہو گئے اور اس سے کہنے لگے کہ انہیں بھی ساتھ لے جائیں ورنہ مسلمان انہیں مار ڈالیں گے۔ یوں خانصاحب دہلی پہنچ گئے۔ میں جتنی بار دہلی گیا، ہر بار ان سے سرراہے ملاقات ہو جاتی تھی۔ سلیمان ٹی سٹال تو ان کا اڈہ تھا۔ ایک روز انہوں نے مولانا حسرت موہانی کی ایک غزل "قبرص کی پری" کی تضمین لکھی۔ حسرت کی اس غزل کا ایک شعر ہے:

ساتھ ان کے جو ہم آئے تھے بیروت سے حسرت
یہ روگ نتیجہ ہے اسی ہم سفری کا

خان غازی کابلی نے کہا:

دل ہو گیا بیتاب علی گوھ کے سفر میں
کیا بن گئے اسباب علی گوھ کے سفر میں
بیتاب کیا جس نے وہ اک حور لقا۔ تھی
زاہد کی وہ بیٹی تھی مگر شوخ ادا تھی

یہ غزل انہوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی تھی، جو اب خدا جانے کہاں پڑی ہے۔ دہلی سے میرے ایک کرم فرمانے۔ الواح الصنادید۔ کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی ہے جس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ غازی صاحب ۱۹۸۸ء میں وہاں چلے گئے ہیں جہاں جاکر کوئی واپس نہیں آتا۔

درگاہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ

ترکمان دروازے کے باہر دلی کا معروف ہسپتال۔ اِروِن ہسپتال۔ ہے۔ اس ہسپتال کے عقب میں مہندیوں کا قبرستان ہے اور وہاں جانے کے لئے ہسپتال میں سے گزر کر جانا ہوتا ہے۔ میں نے ۱۹۷۶ء میں اس قبرستان میں صدہا قبریں دیکھی تھیں۔ اب دلی کارپوریشن کی مہربانی سے وہاں خوبصورت لان بن چکے ہیں۔ اللہ کریم علی محمد شیر میوات کو جزائے خیر دے کہ اس مرد مجاہد کی بھاگ دوڑ سے قبروں کے دو تاریخی احاطے کارپوریشن کی دستبرد سے بچ گئے ہیں۔ اگر یہ مردِ مجاہد بر وقت مقابلے کے لئے کھڑا نہ ہو جاتا تو کارپوریشن ان احاطوں پر بھی بُل ڈوزر چلا دیتی۔ ایک بار مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (م ۱۹۸۴ء) نے راقم کو بتایا کہ اس تاریخی قبرستان کو اس مرد قلندر نے بچایا ہے ورنہ ہماری اتنی ہمت نہ تھی کہ ہم اس بکھیڑے میں پڑتے اور حوالات میں بند رہتے۔

مہندیوں میں داخل ہوتے ہی ایک مسجد نظر آتی ہے جو کئی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کے صحن میں چالیس پچاس قبریں ہیں جن میں سب سے نمایاں قبر دسویں صدی ہجری کے مشہور محدّث شیخ عبدالعزیز شکر بار رحمۃ اللہ (م ۱۵۶۷ء) کی ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے:

۷۸۶

مرقد

حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار
ابن حضرت شیخ حسن طاہر
سن پیدائش ۹۰۷ھ تاریخ وفات ۶ جمادی الثانی ۹۷۵ھ بعمر ۶۸ سال

فسبحٰن الذی بیدہ الملکوت کل شی والیہ ترجعون

پڑھتے ہوئے رحلت فرمائی۔ حضرت مولانا شاہ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے آپ کی تاریخ اس قطعہ میں کہی:

شیخ کامل عارف دوران خود عبدالعزیز
آنکہ میداد اہلِ دل را مجلسش یاد از بہشت
ہرچہ از اوصافِ اہلِ اللہ در عالم بُود
حق تعالیٰ ز اوّل فطرت بذاتِ او سرشت
یادگارِ اہلِ چشت اُو بود در دورانِ خود
گشت ازاں تاریخ نوتش ۔ یادگارِ اہلِ بہشت

(۹۷۵ھ)

آپ کا وطن اُچہ ضلع ملتان تھا (یہاں ملتان کی بجائے بہاول پُور ہونا چاہیے تھا) اور حضرت خواجہ باقی باللہ اور حضرت شاہ عبدالحق محدّث دہلوی اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ آپ کے مزار کی جاروب کشی کیا کرتے تھے۔ نصب کردہ فقیر علی محمد متولی درگاہ ہذا۔

حضرت شکر بار کے مزار پُر انوار سے چھ میٹر جانب جنوب سرسید احمد خان (م ۱۸۹۸ء) اور حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (م ۱۸۸۰ء) کے اُستاد مولانا مملوک العلیؒ (م ۱۸۵۰ء) محوِ خواب ابدی ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

اُستاد الکل

مولٰینا مملوک العلی نانوتوی

وفات ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ

نصب کردہ محمد ایوب میرہ

حضرت شکر باز کے مزار اقدس سے قریب ہی سرسیّد احمد خان کے قریبی ساتھی خان بہادر مولوی سمیع اللہ کی ابدی آرام گاہ ہے۔ بعض روایات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ آخری عمر میں ان دونوں بزرگوں میں کالج کے بارے میں کسی پالیسی پر اختلاف ہو گیا تھا اور ان کی بول چال تک بند ہو گئی تھی۔ ان کی قبر کے کتبے پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حاجی مولوی محمد سمیع اللہ "خان بہادر" (سی۔ ایم۔ جی) رحمۃ اللہ علیہ

پیدائش ۱۲۵۰ ہجری مطابق ۱۸۳۴ء

تاریخ وفات ۷ اپریل ۱۹۰۸ء

شاگردِ رشید حضرت مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ علیہ

ہمعصر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ۔ عالیجناب سرسیّد احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ

HAJI MOULVI MOHAMMED SAMEEULLAH KHAN BAHADUR (C.M.G)

DIED 7 APRIL 1908 A.D BORN - 1834 A.D

PUPIL OF HAZRAT MOULVI MAMLUK ALI

ASSOCIATE OF SIR SYED AHMAD KHAN

CO - FOUNDER OF MUSLIM ANGLO ORIENTAL COLLEGE ALIGARH

GREAT GRANDSON - ZAFAR H.JUNG

HAMEED MANZIL DARYAGANG NEW DELHI

حضرت شکر باز کی تربت سے جانبِ جنوب مشرق تین میٹر کے فاصلے پر بھارت کا مشہور سارنگی نواز عبدالشکور خاں کیرانوی محوِ خوابِ ابدی ہے۔ کیرانہ موسیقی کا بہت بڑا گھرانہ ہے۔ خان صاحب عبدالوحید خان اور ملکۂ موسیقی روشن آراء بیگم (م ۱۹۸۲ء) کا تعلق اسی گھرانے سے تھا۔ مجھے اس فنکار کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ اسے کہاں اور کن بزرگوں کے قریب دفن ہونے کی سعادت ملی۔ کسی نے سچ کہا ہے:

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

خان صاحب مذکور کی قبر کے کتبے پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

اللھم اغفرہ و ارحم

مشہور سارنگی نواز پدم شری عبدالشکور خان کیرانوی

نے ۷۵ سال کی عمر میں پیر کے روز ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ

مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب داعیٔ اجل کو لبیک کہا:

انا للہ و انا الیہ راجعون

للہ کرم ہوگا ذرا ہاتھ اٹھایے

اور فاتحہ اس قبر پہ بھی پڑھتے جایے

تکی مسجد میں ان دنوں طلبہ رہتے ہیں اس لئے یہ مسجد آباد ہے اور وہاں پانچوں وقت اذان اور نماز باجماعت ہوتی ہے۔ اس مسجد کے عقب میں علی محمد فقیر میوات کا گھر ہے۔ انہوں نے بہت سی بھینسیں پالی ہوئی ہیں جن کا دودھ فروخت کرکے وہ مدرسے کا خرچ چلاتے ہیں۔ آسام میں ان کے چائے کے باغ تھے جو انہوں نے فروخت کرکے جامعہ رحیمیہ اور درگاہ شاہ ولی اللہ کی تعمیر پر لگا دیے۔

ان کے گھر سے متصل شاہ ولی اللہ ہال ہے۔ میں نے علی محمد صاحب سے کہا کہ میں بہت دور رہتا ہوں۔ اگر دہلی میں رہتا ہوتا تو ہر ہفتے اس ہال میں شاہ صاحب کی تعلیمات پر لیکچر دیا کرتا۔

تکی مسجد سے جو راستہ شاہ ولی اللہ کی درگاہ کی طرف جاتا ہے اس راستے میں سڑک کے کنارے مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی (م ۱۹۶۲ء) کی یاد میں دو ستون بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ستون پر یہ شعر درج ہے جو مرحوم نے بھارتی پارلیمنٹ کے اجلاس میں پڑھا تھا:

جب زمانہ میں کوئی فتنہ نیا اٹھتا ہے

وہ اشارہ سے بتا دیتے ہیں تربت میری

ان ستونوں سے آگے بڑھیں تو اندازاً چالیس میٹر کے فاصلے پر نئے تعمیر شدہ کمرے

نظر آتے ہیں جن میں مدرسہ رحیمیہ قائم ہے ۔ ابتدا میں اس کا نام مدرسہ رحیمیہ ضیاء العلوم رکھا گیا تھا ۔ ان دنوں مفتی ضیاء الحق دہلوی اس مدرسہ کے مہتمم تھے ۔ ان کی شیر میوات کے ساتھ کسی بات پر ناچاقی ہو گئی تو انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ۔ ان کی جگہ "محاسن موضح القرآن" کے فاضل مصنف مولانا اخلاق حسین قاسمی مہتمم مقرر ہوئے ۔ ان کے دورِ اہتمام میں ضیاء العلوم کا لاحقہ ختم ہو گیا اور یہ پھر سے مدرسہ رحیمیہ بن گیا ۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی نے بھی کچھ عرصے بعد مدرسے سے علیحدگی اختیار کر لی اور ان کی جگہ مولانا فقیہ الدین نے مسندِ اہتمام کو رونق بخشی ۔

مدرسہ رحیمیہ جس کا اجراء شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ نے کیا تھا ، وہ عملاً ۱۸۴۲ء میں شاہ عبدالعزیز محدث کے نواسے شاہ محمد اسحٰق کی حجازِ مقدس روانگی کے ساتھ ختم ہو گیا تھا ۔ ۱۸۵۷ء میں اس پر ایک ہندو سیٹھ رام کشن داس کا قبضہ ہو گیا ۔ "واقعات دارالحکومت دہلی" میں اس کا ذکر آیا ہے ۔ ۱۹۸۱ء میں علی محمد شیرِ میوات کی سعی و کاوش سے اس کا دوبارہ اجراء ہوا ۔ اس مردِ قلندر نے جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر دیا ہے ۔ اب شاہ ولی اللہ کی درگاہ میں شب و روز قال اللہ و قال الرسول کی آوازیں سننے میں آتی ہیں ۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء ۔

مدرسے میں سے گزر کر شاہ ولی اللہ کی درگاہ کے احاطے میں داخل ہوتے ہیں ۔ درگاہ کا دروازہ "بابُ الولی" کے نام سے موسوم ہے اور اس کی پیشانی پر یہ شعر لکھا ہوا ہے :

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

بابُ الولی سے گزرتے ہی دائیں ہاتھ ایک شاندار اور وسیع مسجد نظر آتی ہے ۔ ۱۹۶۷ء میں جب میں پہلی بار یہاں آیا تو یہاں ایک چھوٹی سی پرانی طرز کی مسجد تھی جس کی محراب کے عقب میں مومن خان کی شکستہ قبر تھی ۔ اب اس پرانی مسجد کی جگہ ایک نئی طرز کی مسجد بن گئی ہے جس میں سو طلبہ کے قیام کی گنجائش موجود ہے ۔ اس مسجد کے صحن کے ساتھ ہی جانبِ جنوب مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کی قبر ہے ۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کی والدہ زینب اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی (م ۱۹۸۵ء) کی والدہ

شمس النساء حقیقی بہنیں تھیں اور مولانا اکبر آبادی میرے خسر تھے ۔ اس طرح میری مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کے ساتھ رشتے داری نکل آتی ہے ۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے :

الله ۷۸۶ محمد

مرقد

مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن

سابق ناظم عمومی جمعیتہ العلماء ہند

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

تاریخِ وفات : یکم ربیع الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ۲ اگست ۱۹۶۲ء

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کی تربت سے ایک میٹر کے فاصلے پر جانبِ مشرق پاکستان کے بدترین مخالف اور کانگرسی راہنما ڈاکٹر سید محمود کی قبر ہے ۔ راقم ایک بار جناب حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ دہلی کے ساتھ غالب اکیڈمی سے پرانی دہلی جا رہا تھا ۔ ان دنوں سید محمود سندر نگر میں شروانی صاحب کے مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ انہیں فیل پا کی شکایت تھی ۔ اس روز راقم نے پہلی بار فیل پا کے مریض کو دیکھا ۔ حکیم صاحب نے ان کا مزاج پوچھا اور میرا ان کے ساتھ تعارف کروایا ۔ یہ میری ان کے ساتھ پہلی اور آخری ملاقات تھی ۔ ان کی قبر کے سرہانے صرف ان کا نام لکھا ہوا ہے ۔ تاریخ وفات اور سن بھی درج نہیں ہے ۔ مولانا عطاء الرحمن قاسمی نے قبرستان مہندیاں میں مدفون حضرات کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے ۔ انہیں بھی تاریخ اور سن وفات نہیں ملا ۔

درگاہ کے احاطے میں ایک چبوترے پر برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کا ایک صدی کا علم و تقویٰ دفن ہے ۔ اس چبوترے پر سب سے قدیم قبر شاہ عبدالرحیم (م ۱۷۱۸ء) کی ہے ۔ موصوف شاہ ولی اللہ کے والدِ بزرگوار اور اپنے عہد کے نامور عالمِ دین تھے ۔ انہوں نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں بھی حصہ لیا تھا ۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے ۔

مرقد

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ

ابن

حضرت مولانا شیخ وجیہہ الدین محدث دہلویؒ

سن پیدائش ۱۰۵۴ھ (عہد شاہجہان بادشاہ)

تاریخ وفات ۱۲ صفر المظفر ۱۱۳۱ھ یوم چہار شنبہ

بعمر ۷۷ سال (عہد فرخ سیر)

علی محمد شیر میوات متولی درگاہ ہذا

شاہ عبدالرحیمؒ کے قدموں میں ان کے عظیم المرتبت پوتے اور قرآن پاک کے مترجم شاہ عبدالقادر دہلویؒ (م ۱۸۱۵ء) محو خواب ابدی ہیں۔ بازار خانم میں مسجد اکبر آبادی میں انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ کھانا ان کے برادر بزرگ شاہ عبدالعزیز محدث کے گھر سے آتا تھا اور وہ انہیں گرمیوں اور سردیوں میں ایک ایک جوڑا کپڑوں کا سلوا دیتے تھے۔ اسی مسجد میں قیام کے دوران میں انہوں نے **موضح القرآن** کے عنوان سے قرآن حکیم کا اردو زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ اہل علم کا یہ کہنا ہے کہ اگر قرآن مجید اردو زبان میں نازل ہوتا تو وہ شاہ عبدالقادر کی زبان میں نازل ہوتا۔ ان کے بعد جن اصحاب نے قرآن حکیم کے اردو میں تراجم کئے ہیں، انہوں نے **موضح القرآن** سے کماحقہ استفادہ کیا ہے۔ انگریزوں نے ۱۸۵۸ء میں بازار خانم اور مسجد اکبرآبادی صاف کرکے یہاں ایک پارک بنا دیا۔ ایڈورڈ ہفتم کے دور حکومت میں اس کا نام ایڈورڈ پارک رکھا گیا اور آزادی کے بعد ہندوؤں نے اس کا نام سبھاش پارک رکھ کر اس کا بت وہاں نصب کر دیا۔ شاہ عبدالقادر کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

مرقد

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ

ابن

حجۃ الاسلام حضرت مولانا امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

سن پیدائش ۱۱۹۷ھ

سن وفات ۱۲۳۰ھ (بزمانۂ اکبر شاہ ثانی)

بعمر ۷۳ سال رحلت نمود

علی محمد شیر میوات متولی درگاہ ہذا

شاہ عبدالقادر کے مزار سے جانب مشرق ان کے برادر اصغر اور شاہ اسمٰعیل شہید (م ۱۸۳۱ء) کے والد محترم شاہ عبدالغنی (م ۱۸۱۲ء) کی آخری آرام گاہ ہے۔ اپنے تین بڑے بھائیوں کی طرح انہوں نے کوئی علمی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی لیکن بقول شیخ محمد اکرام (م ۱۹۷۳ء) ان کی کسر ان کے جلیل القدر فرزند شاہ اسمٰعیل شہید نے پوری کر دی۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے:

مرقد

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ

ابن

حجۃ الاسلام حضرت مولانا امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

وفات ۱۲۲۷ھ (بزمانۂ اکبر شاہ ثانی)

بعمر ۵۷ سال رحلت یافت

علی محمد شیر میوات متولی درگاہ ہذا

شاہ عبدالغنی کے سرہانے ان کی دادی اور حضرت شاہ عبدالرحیم کی اہلیہ محترمہ فخر النساء رحمۃ اللہ علیہا آرام فرما رہی ہیں۔ شاہ عبدالقادر کی تربت سے جانب قبلہ ان کے برادر بزرگ شاہ رفیع الدین (م ۱۸۱۸ء) محو خواب ابدی ہیں۔ انہوں نے بھی قرآن حکیم کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو ہمارے ہاں متداول ہے۔ جب شاہ عبدالعزیز نے گونا گوں عوارضات کی بنا پر طلبہ کو پڑھانا موقوف کر دیا تھا تو ان کا کام شاہ رفیع الدین نے ہی سنبھالا تھا۔ ان کے ذریعے شاہ ولی اللہ کے علوم کی خوب اشاعت ہوئی۔ ان کے مزار کے کتبے پر یہ عبارت کندہ ہے:

مرقد

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ

ابن

حجۃ الاسلام حضرت مولانا امام شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ
وفات ۱۱۷۶ھ (زمانۂ اکبر شاہ ثانی)
بعمر ۸۰ سال رحلت یافت
علی محمد شیر میوات متوّلی درگاہ ہذا

شاہ رفیع الدین کے چار فرزند تھے، جن میں سے شاہ محمد موسیٰ اور شاہ مخصوص اللہ نے علمی اور دینی حلقوں میں بڑا نام پایا۔ یہ دونوں بھائی بھی اسی چبوترے پر شاہ عبدالعزیز محدّث کے مزارِ مبارک سے جانبِ قبلہ آرام فرما ہیں۔ شاہ محمد موسیٰ کی قبر شاہ مخصوص اللہ کے قدموں میں ہے۔

شاہ رفیع الدین کے سرہانے ان کے عظیم المرتبت والد امام شاہ ولی اللہ محدّث محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

مرقد

حجۃ الاسلام حضرت مولانا امام شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ
ابن
حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم محدّث دہلویؒ
تاریخِ پیدائش ۴ شوال المکرّم ۱۱۱۴ھ بروز بدھ
تاریخِ وفات ۲۹ محرم الحرام ۱۱۷۶ھ بروز ہفتہ
مطابق اگست ۱۷۶۲ء بوقتِ ظہر
بعمر ۶۲ سال رحلت نمود
(عہد شاہ عالم ثانی)
علی محمد شیر میوات متوّلی درگاہ ہذا

شاہ ولی اللہ محدّث کے مزارِ پُر انوار سے جانبِ قبلہ شاہ عبدالسلام اور سید رؤف احمد کی قبریں ہیں اور ان کے بعد جانبِ قبلہ شاہ عبدالعزیز محدّث (م ۱۸۲۳ء) محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ انہوں نے اپنے والدِ محترم کے مشن کو ۱۷۶۲ء سے لے کر ۱۸۲۳ء تک مسلسل ۶۱ برس تک جاری رکھا اور اپنے تینوں بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی۔ ایک بار میں ان

کے مزار پر اتفاقاً اس روز حاضر ہوا جس روز ان کا عرس منایا جا رہا تھا۔ عرس کا اہتمام علی محمد شیر میوات نہیں کرتے بلکہ مسجد فتح پوری سے پچاس ساٹھ افراد وہاں آکر میلے کا سماں پیدا کر دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

مرقد

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ
ابن
حجۃ الاسلام حضرت مولانا امام شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ
سنِ پیدائش ۱۱۵۹ھ
تاریخِ وفات ۷ شوال المکرّم ۱۲۳۹ھ بروز یکشنبہ
بعمر ۸۰ سال رحلت نمود (عہد اکبر شاہ ثانی)
علی محمد شیر میوات متوّلی درگاہ ہذا

شاہ عبدالعزیز کی وفات پر مومن خان مومن نے جو تاریخ کہی ہے، اس کی مثال تاریخ گوئی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مومن نے اس موقع پر یہ سات اشعار کہے تھے:

انتخابِ نسخۂ دین مولوی عبدالعزیز
بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل
جانبِ ملکِ عدم تشریف فرما کیوں ہوئے
آ گیا تھا کیا کہیں مُردوں کے ایماں میں خلل
بے ستم اے چرخ تو کس کو جہاں سے لے گیا
کیا کیا یہ ظلم تو نے بیکسوں پر اے اجل
جب اٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا
لوٹتا تھا خاک پر ہر قدسیِ گردوں محل
کیا کس و ناقص پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن
ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل
مجلسِ درد آفرینِ تعزیت میں میں بھی تھا
جب پڑھی تاریخ مومن نے آ کر بے بدل

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دین و فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

۱۲۳۹ھ

اگر آخری مصرعے میں فقر، دین، فضل، ہنر، لطف، کرم، علم اور عمل کو بے سر و پا کر دیں تو باقی ق، ی، ض، ن، ط، ر، ل اور م رہ جائیں گے۔ ان کے اعداد جمع کر لیں تو سن وفات ۱۲۳۹ھ برآمد ہو گا۔

شاہ عبدالغنی کے مزار سے جانب قبلہ ایک قبر کی جگہ خالی پڑی ہے۔ اس کے برابر ان کے پوتے اور شاہ اسمٰعیل شہید کے صاحبزادے شاہ محمد عمر کی ابدی آرام گاہ ہے۔ ان کی وفات پر مومن خاں مومن نے یہ قطعہ تاریخ کہا تھا:

محمد عمر کا ہوا انتقال
بزرگ ایسے ہوتے ہیں پیدا کہاں
مجھے سالِ تاریخ کا تھا خیال
کہ سب نے کہا "مرگِ شیخ زمان"

۱۲۶۸ھ

شاہ محمد عمر بقول مومن ۱۲۶۸ھ (۲-۱۸۵۱ء) میں فوت ہوئے لیکن ان کے لوح مزار پر ۱۲۶۹ھ کندہ ہو گیا ہے۔ پوری عبارت یوں ہے:

مرقد

حضرت مولانا شاہ محمد عمرؒ

ابن

مجاہد اسلام حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی

ابن حضرت مولانا شاہ عبدالغنی محدث دہلوی

وفات ۱۲۶۹ھ

علی محمد شیر میوات متوّلی درگاہ ہذا

بطلِ حریت شاہ محمد اسمٰعیل شہید (م ۱۸۳۱ء)، شاہ محمد عمرؒ کے والدِ بزرگوار، شاہ عبدالغنی کے فرزندِ ارجمند اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے جلیل القدر پوتے تھے۔

موصوف ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے میدان میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کے جسدِ خاکی کو شیر سنگھ نے اپنے سامنے دفن کروایا اور اس پر ایک دو شالہ ڈالا۔ شاہ اسمٰعیل کا مزار اگرچہ پاکستان میں ہے لیکن یہاں ان کا کتبہ نقل کرنا نامناسب نہ ہو گا۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدفن

حضرت مولوی شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی

بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہم

ولادت شنبہ ۲۷ شوال ۱۱۹۶ھ

شہادت جمعہ ۲۴ ذیقعد ۱۲۴۶ھ

اے ذبیح اللہ اسماعیل
شد ندایت صورِ اسرافیل
خون خود را در کُہ و کہسار ریخت
لیکن بیخِ حرمت در ہند بیخت

احقر العباد سید اسد علی انوری فرید آبادی این کتبا (کذا) در ماہ محرم ۱۳۶۲ھ نصب کیا۔

حضرت مخصوص اللہ کے مزار سے قریب جانبِ قبلہ حکیم مومن خان مومن (م ۱۸۵۲ء) کی قبر ہے۔ مومن شاہ عبدالقادر محدث کے شاگردِ رشید اور سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ اسی بنا پر مرنے کے بعد انہیں خانوادۂ ولی اللہی کا قرب نصیب ہوا۔ مومن خان نے سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کے دہلی کے معاشرے پر اثرات کا ذکر اپنے کلام میں جابجا کیا ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ بڑے اور قد آور درخت کے نیچے چھوٹے پیڑ اور پودے نہیں بڑھتے لیکن یہ مومن کی عظمت اور کمال ہے کہ انہوں نے غالب کے ہمعصر ہونے کے باوجود خود کو اُستاد منوایا۔ یہ بات تو زبان زدِ خلائق ہے کہ غالب یہ کہا کرتے تھے:

"کاش مومن میرا سارا کلام لے لیں اور اپنا یہ شعر مجھے دے دیں"

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کے لوحِ مزار کے ایک جانب ان کے سوانح حیات کندہ ہیں اور دوسری جانب یہ عبارت درج ہے:

حکیم محمد مومن خان مومن دہلوی

۱۲۱۵...۱۲۶۸ھ

نصب کردہ فقیر علی محمد عفی عنہ متولی درگاہ ہذا در ۱۳۹۳ھ

تاریخ وفات مومن فرمودہ خود

دست و بازو بشکست

کسی صاحب ذوق نے "ماتمِ مومن خان" (۱۲۶۸ھ) سے ان کا سن وفات نکالا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے چبوترہ قبور سے جانب مشرق سو سے زائد قبریں تا حال محفوظ ہیں۔ ان میں ایک قبر مدرسہ امینیہ دہلی کے بانی مولانا امین الدین اورنگ آبادی کی بھی ہے۔ موصوف ۱۸۶۰ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی اور پھر مزید اکتساب کے لئے شاہجہان پور جا کر مشہور فلسفی اور منطقی مولانا نادر الدین کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مؤخرالذکر بزرگ علامہ عبدالحق خیر آبادی (م ۱۸۹۹ء) کے ارشد تلامذہ میں شامل ہوتے ہیں۔ مولانا امین الدین نے چاندنی چوک دہلی کی سنہری مسجد میں ۱۸۹۷ء میں مدرسہ امینیہ کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسے میں مولانا انور شاہ کشمیری جیسے نابغۂ عصر اُستاد پڑھاتے رہے ہیں۔ جب سنہری مسجد میں طلبہ کی تعداد بڑھ گئی تو مدرسے کے منتظمین نے کشمیری دروازے میں مدرسے کے لئے ایک بڑا مکان حاصل کر لیا۔ اسی جگہ راقم نے پہلی بار مولانا سید محمد میاں صاحب "علمائے ہند کا شاندار ماضی" کی زیارت کی تھی۔ مولانا امین الدین کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

اللہ ۷۸۶ محمد

مرقد

حضرت مولانا محمد امین الدین

بانی

مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی

تاریخ وفات

۱۵ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۶ جون ۱۹۲۰ء

مفتی عتیق الرحمن عثمانی، بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا فضل الرحمن عثمانی (م ۱۹۰۷ء) کے پوتے، مفتیٔ اعظم دیوبند مولانا عزیز الرحمن عثمانی (م ۱۹۲۸ء) کے فرزند ارجمند اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی (م ۱۹۴۹ء) کے برادر زادے تھے۔ انہوں نے مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا بدر عالم میرٹھی اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کے ساتھ مل کر ۱۹۳۸ء میں ندوۃ المصنفین کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ ادارہ بالآخر ایک علمی تحریک بن گیا۔ راقم جب بھی دہلی جاتا تو مفتی صاحب کے ہاں ہی قیام کرتا تھا۔ ایک بار مجھے رمضان میں دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ سخت گرمی کے دن تھے۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ مسافر ہونے کی وجہ سے راقم کو اللہ تعالیٰ نے رخصت دی ہے اس لئے روزہ نہ رکھوں۔ مفتی صاحب گھر میں ناشتہ تیار کرواتے اور خود اٹھا کر ندوۃ المصنفین میں لاتے۔ راقم نے اتنا بلند حوصلہ مفتی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ میں نے متعدد بار ان کی اقتداء میں نماز ادا کی ہے۔ ان کی قرأت ابوالکلام آزاد کو بہت پسند تھی اور اگر میٹنگ کے دوران نماز کا وقت آجاتا تو آزاد انہیں ہی امامت کے لئے کہتے۔

مفتی صاحب کی ابدی آرام گاہ "باب الولی" سے درگاہ کی طرف جانے والے راستے میں ہے۔ ان کے برابر علی محمد شیر میوات نے اپنے لئے جگہ مختص کر لی ہے۔ مفتی صاحب کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

مرقد مبارک

مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی

(خلف الرشید قدوۃ السالکین حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیو بندیؒ)

بانیٔ ادارۂ ندوۃ المصنفین دہلی

صدر کل ہند مجلس مشاورت و رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیو بند

ولادت دسمبر ۱۹۰۱ء وفات بروزِ ہفتہ بعد نمازِ عصر ۱ شعبان ۱۴۰۳ھ

۱۴ مئی ۱۹۸۳ء

غفر اللہ لہ واسکنہ فسیح جناتہ

یوں تو اس قبرستان میں اور بھی بہت سے مشاہیر کی قبریں ہیں لیکن اس کتاب کا موضوع الواح الصنادید جمع کرنا نہیں بلکہ اپنے سفر کی روداد لکھنا ہے ۔ اس لئے میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں ۔

۱۹۸۱ء کے سفر میں علی محمد شیر میوات نے میری آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلوی کی درگاہ میں ان کی تعلیمات پر میرا لیکچر رکھ دیا اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو صدارت کی زحمت دی ۔ دہلی کے مسلم اخبارات میں اس لیکچر کے اشتہارات دیئے گئے تھے اس لئے اس موقع پر اچھی خاصی حاضری ہو گئی تھی ۔ اگلے روز اخبارات میں لیکچر کے اقتباسات بھی شائع ہوئے ۔

مہندیوں سے نکل کر میں بہادر شاہ ظفر روڈ پر مُلّا عبدالنبی (م ۱۵۸۳ء) کی مسجد دیکھنے گیا ۔ بانیٔ مسجد حضرت عبدالقدوس گنگوہی (م ۱۵۳۷ء) کے پوتے اور مغل حکمران اکبر کے عہد میں صدر الصدور کے منصب پر فائز تھے ۔ ان دنوں اس مسجد میں جمعیت العلماء ہند کا صدر دفتر ہے اور اسی وجہ سے یہ مسجد آباد ہے ، ورنہ دُور دُور تک مسلم آبادی کا نشان نظر نہیں آتا ۔

مسجد مُلّا عبدالنبی سے قریب ہی سڑک کے کنارے ایک چوکور مقبرہ دکھائی دیتا ہے ۔ لوگ اسے بھولی بھٹیاری کا مقبرہ بتاتے ہیں ۔ دراصل یہ بُو علی بختیاری کا مقبرہ ہے جسے عوام الناس نے بھولی بھٹیاری کا مقبرہ مشہور کر دیا ہے ۔

بہادر شاہ ظفر روڈ آگے جا کر متھرا روڈ سے مل جاتی ہے ۔ متھرا روڈ پر بائیں ہاتھ پرانا قلعہ دکھائی دیتا ہے ۔ اس قلعہ میں شیر شاہ سوری (م ۱۵۴۵ء) کی تعمیر کردہ مسجد اور شیر منڈل کی عمارت قابلِ دید ہیں ۔ مسجد کے دروازے پر ایک ہندو چوکیدار ہر وقت موجود رہتا ہے اور وہ سیاحوں کو جُوتے اتار کر مسجد میں جانے دیتا ہے ۔ مسجد میں اگرچہ اب نماز نہیں ہوتی تاہم اس کا تقدس برقرار رکھا گیا ہے ۔ اس کا مشاہدہ راقم نے لال

قلعہ کے اندر عالمگیری مسجد میں بھی کیا ہے ۔

مسجد سے قریب ہی شیر منڈل کی مینار نما عمارت ہے ۔ یہ عمارت ریل میں سفر کرتے وقت بھی دکھائی دیتی ہے ۔ ہمایوں نے دوبارہ تخت نشینی کے بعد شیر منڈل کو لائبریری میں تبدیل کر دیا تھا ۔ اسی شیر منڈل سے گر کر ہمایوں نے وفات پائی اور کسی نے " ہمایوں پادشاہ از بام افتاد " سے اس کی تاریخ وفات (۹۶۳ھ) نکالی تھی ۔ ہوا یوں کہ اس شام زُہرہ ستارہ طلوع ہونے والا تھا اور ہمایوں اس کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے شیر منڈل کی چھت پر موجود تھا ۔ جب نماز مغرب کا وقت قریب آیا تو وہ نماز ادا کرنے کے لئے مسجد جانے لگا ۔ وہ ابھی سیڑھیوں میں ہی تھا کہ اذان شروع ہو گئی ۔ وہ اذان کے احترام میں سیڑھیوں میں بیٹھ گیا ۔ اتفاق سے اس کی قبا کا دامن اس کے پاؤں تلے آگیا اور اسے اس کی مطلق خبر نہ ہوئی ۔ اذان ختم ہوتے ہی وہ اٹھا تو لڑکھڑا کر نیچے گرا اور اس کے سر پر شدید چوٹ آئی ۔ اسی صدمے سے اس نے وفات پائی ۔ میں اپنے تلامذہ سے یہ کہا کرتا ہوں کہ ہمایوں شیر شاہ کے ہاتھوں سے تو بچ نکلا لیکن اس کی بنائی ہوئی عمارت اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی ۔ اسٹانلے لین پول نے کیا خوب کہا ہے کہ ہمایوں زندگی بھر ٹھوکریں کھاتا رہا اور بالآخر ٹھوکر کھا کر اس جہان سے اگلے جہان پہنچ گیا ۔

۱۹۴۷ء کے مسلم کش فسادات میں دہلی کے مظلوم مسلمانوں نے اسی قلعہ میں پناہ لی تھی ۔ قلعہ کے بالمقابل سڑک کے کنارے ایک قلعہ نما عمارت کے کھنڈرات نظر آتے ہیں ۔ یہ مدرسہ خیر المنازل کی شکستہ عمارت ہے ۔ یہ مدرسہ مغل فرمانروا اکبر کی رضاعی ماں ماہم انگہ نے تعمیر کیا تھا ۔ " خیر المنازل " سے ہی اس کی تاریخ بنا (۹۶۹ھ) نکلتی ہے ۔ ان کھنڈرات کو دہلی کارپوریشن کی دستبرد سے بچانے کے لئے مسلمانوں نے اسے عید گاہ کا درجہ دے دیا ہے اور یہاں نماز عید ادا ہونے لگی ہے ۔

متھرا روڈ پر ایک باغ میں مشہور شاعر عبدالقادر بیدل کی قبر ہے ۔ اسی مناسبت سے یہ باغ " باغ بیدل " کے نام سے موسوم ہے ۔ بعض محققین کے نزدیک یہاں بیدل کی جعلی قبر بنائی گئی ہے ۔ اصل قبر کسی اور جگہ تھی اور اس کا اب نشان مٹ چکا ہے ۔ بیدل کا کلام افغانستان میں بہت مقبول ہے ۔ اسی لئے اس کے چند افغان مداحوں نے

وہاں ایک یادگاری پتھر نصب کروا دیا ہے ۔ یہ وہی بیدل ہے جس کے بارے میں غالب نے کہا تھا:

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خان قیامت ہے

ڈاکٹر عبدالغنی (م ۱۹۸۹ء) نے تمام عمر بیدل پر تحقیق کرنے میں ہی صرف کی ہے ۔ راقم کے ساتھ ان کے بڑے دوستانہ مراسم تھے اور اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ ، پنجاب یونیورسٹی کے دفتر میں ان کے ساتھ اکثر گپ شپ رہتی تھی ۔ بسا اوقات شیخ نذیر حسین، ڈاکٹر عبدالقیوم، مقبول بیگ بدخشانی ، سید امجد الطاف اور ڈاکٹر سید عبداللہ بھی چائے کے وقفے میں ہمارے ساتھ مل بیٹھتے ۔ سید صاحب جب خوشگوار موڈ میں ہوتے تو فرماتے:

الگپ والشپ طراوۃ الذہن

باغ بیدل سے آگے بڑھیں تو بائیں ہاتھ ہمایوں کا مقبرہ نظر آنے لگتا ہے ۔ اسے مغلوں کا ویسٹ منسٹر ایبے کہنا بیجا نہ ہو گا ۔ ہمایوں کے علاوہ وہاں ۱۵۷ شہزادوں اور شہزادیوں کی قبریں ہیں ۔ اسی جگہ ہمایوں کی ملکہ حمیدہ بانو بیگم اور شہزادہ دارا شکوہ بھی مدفون ہیں ۔ اسی مقبرے میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے پناہ لی تھی اور اسے انگریزوں نے یہیں سے گرفتار کیا تھا ۔

یہ دہلی کا سب سے بڑا مقبرہ ہے ۔ ماہرینِ تعمیرات کا کہنا ہے کہ اسے تاج محل کا ابتدائی خاکہ سمجھنا چاہیے ۔ تاج محل کی طرح ہی یہ مقبرہ ایک بلند کرسی پر تعمیر کیا گیا ہے ۔ گنبد سنگِ مرمر کا ہے باقی عمارت سنگِ سرخ سے تعمیر ہوئی ہے ۔ اس مقبرے میں مینارے تعمیر نہیں کیے گئے ۔

ابتداء میں اس مقبرے کے تہ خانوں میں طلبہ رہتے تھے اور یہاں دن رات قال اللہ اور قال الرسول ہوا کرتی تھی ۔ اس لئے دہلی کے بڑے بوڑھے اسے ہمایوں کا مقبرہ کی بجائے ہمایوں کا مدرسہ کہتے ہیں ۔

اسی مقبرے کے احاطے میں ایک چھوٹا سا مقبرہ ہے جس پر نیلے رنگ کا گنبد عجب بہار دکھاتا ہے ۔ یہ مقبرہ ہمایوں کے بہت ہی قریبی رشتے دار کا ہونا چاہیے ۔ یہ بھی

ممکن ہے کہ ہمایوں کی کوئی اور بیوی اس میں دفن ہوئی ہو ۔ مقبرے کے اوپر کتبہ نہ ہونے کے سبب لوگوں نے یہ مشہور کر دیا ہے کہ یہ ہمایوں کے حجام کا مقبرہ ہے ۔ اسی طرح الہ آباد میں خسرو باغ میں شہزادہ خسرو کے مقبرے کے قریب ایک مقبرہ بی تمبولن کے مقبرے کے نام سے موسوم ہے ۔ وہاں لوگوں نے یہ بات مشہور کر دی ہے کہ یہ اس تمبولن کا مقبرہ ہے جو شہزادہ خسرو کو پان بنا کر کھلایا کرتی تھی ۔ یاللعجب ۔

ہمایوں کے مقبرے کے ایک گوشے میں افغان دورِ حکومت کے ایک نامور امیر عیسیٰ خاں کا مقبرہ ہے جو افغان طرزِ تعمیر کا شاہکار کہا جاتا ہے ۔ ماہرینِ تعمیرات کا یہ کہنا ہے کہ مغلوں کی عمارتوں میں ان کی نفاستِ طبع کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور پٹھانوں کی سخت مزاجی کا اظہار ان کی عمارتوں سے بھی ہوتا ہے ۔

ہمایوں کے مقبرے کی چار دیواری سے باہر جانبِ جنوب ایک گوردوارہ نظر آتا ہے ۔ دہلی کے قدیم باشندوں کا یہ کہنا ہے کہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کا قیام اسی جگہ تھا ۔ اب شاہین کا یہ نشیمن زاغوں کے تصرّف میں ہے ۔

ہمایوں کے مقبرے سے بھوگل کی جانب روانہ ہوں تو عرب سرائے کے بعد عبدالرحیم خانخاناں (م ۱۶۲۶ء) کا مقبرہ آتا ہے ۔ اس کے ارد گرد اب بنگلے تعمیر ہو گئے ہیں اور یہ آبادی " نظام الدین ایسٹ " کے نام سے موسوم ہے ۔ خانخاناں کا مقبرہ بھی ایک بلند کرسی پر اٹھایا گیا ہے ۔ اس کا گنبد بڑا خوشنما ہے تاہم مقبرے کی عمارت بڑی خستہ حالت میں ہے ۔

خانخاناں اپنے دور کے نامور جرنیل اور عالم و فاضل شخص تھے ۔ بیرم خان کے قتل کے بعد مغل فرمانروا اکبر نے اسے بیٹوں کی طرح پالا تھا ۔ وہ ترکی زبان کا زبردست عالم تھا ۔ اسی نے بابر کی تزک کا ترکی زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا جو ان دنوں متداول ہے ۔

حضرت خواجہ باقی باللہ (م ۱۶۰۳ء) شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۶۴۲ء) اور حضرت مجدد الفِ ثانی (م ۱۶۲۴ء) کے ساتھ خانخاناں کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے ۔ ان بزرگوں کے مجموعہ ہائے مکتوبات میں اس کے نام بہت سے خط موجود ہیں ۔ مجدد صاحبؒ نے خانخاناں کے بیٹوں مرزا ایرج اور مرزا داراب کے ساتھ بھی تعلقات قائم رکھے ۔ ان

کے نام مجدّد صاحب کے کئی کئی صفحات کے طویل مکتوبات موجود ہیں۔

خانخاناں علماء و فضلاء کا مربی تھا۔ اس نے بہت سے شاعروں کی سرپرستی کی اور کئی شاعر اس کے توسّط سے شاہی دربار میں باریاب ہوئے۔ عرفی اور نظیری خانخاناں کی سرکار سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ عبدالباقی نہاوندی نے ماثرِ رحیمی میں خانخاناں کی علم دوستی اور زرپاشیوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ہمایوں کے مقبرے سے حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کی جانب واپس آئیں تو دائیں ہاتھ عرب سرائے پڑتی ہے۔ میرے استفسار پر علامہ اخلاق حسین دہلوی (م ۱۹۹۳ء) نے بتایا کہ جب حمیدہ بانو اور اکبر کی پھوپھیاں اور بعض بیگمات حج کے لئے گئیں تو وہ اپنے ساتھ متعدد عرب خاندانوں کو دہلی لے آئیں اور انہیں اس عرب سرائے میں آباد کیا۔ خود علامہ مرحوم کے آباؤ اجداد بھی عرب سرائے میں رہ چکے ہیں۔

متھرا روڈ سے سلطان جی کے مزارِ پر انوار کی طرف جانے کے لئے بنگلے والی مسجد کے سامنے سے ہو کر گزرنا ہوتا ہے۔ یہ مسجد تبلیغی جماعت کا مرکز ہے۔ اس مسجد کو حضرت مولانا محمد اسمٰعیل نے آباد کیا اور ان کے بعد ان کے فرزند ارجمند مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے اسے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور میواتیوں کو سوامی شردھا نند (م ۱۹۲۶ء) کے ہاتھوں شدھ ہونے سے بچایا۔ یہ مسجد اس وقت دہلی کی سب سے زیادہ رونق والی مسجد ہے۔ مسجد کے جنوبی گوشے میں مولانا محمد الیاس (م ۱۹۴۴ء) اور ان کے فرزند اور جانشین۔ حضرت جی۔ محمد یوسف (م ۱۹۶۵ء) کی ابدی آرام گاہیں ہیں۔ اسی مسجد میں ۱۹۷۳ء میں راقم السطور کی ملاقات شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نوّر اللہ مرقدہ (م ۱۹۸۲ء) سے ہوئی تھی۔ مرحوم مجھ بے نوا سے نصف گھنٹے تک مصروف گفتگو رہے تھے۔

اس مسجد میں ہر وقت وعظ و تذکیر اور ذکر و تسبیح کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پورے بھارت سے تبلیغی جماعت سے وابستہ حضرات یہاں آتے ہیں اور یہیں سے تبلیغی جماعتیں تیار ہو کر نکلتی ہیں۔ اس حقیقت میں ذرہ بھر شک نہیں کہ اس جماعت نے آزادی کے بعد بھارت میں لاکھوں مسلمانوں کو مُرتد ہونے سے بچا لیا ہے۔

اس مسجد کے مشرق میں ایک چار منزلہ ہوٹل تعمیر ہوا ہے جہاں عموماً غیر ممالک

سے آنے والے تبلیغی جماعت کے افراد ٹھہرتے ہیں۔ اس ہوٹل میں ان کی سہولت کا پوری طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔

سڑک کے پار ہندوؤں کے دو بڑے ہوٹل ہیں۔ ایک کا نام لُودھی ہوٹل ہے اور دوسرے کا نام اوبرائے ہوٹل۔ یہ غالباً فائیو سٹار ہوٹل ہیں۔ راقم کو دہلی کے بااعتماد حضرات نے بتایا کہ آزادی سے قبل یہاں قبرستان تھے۔ ہندوؤں نے ان قبرستانوں کو صاف کر کے یہاں شاندار ہوٹل تعمیر کرلئے ہیں۔

بنگلے والی مسجد کے شمال میں ایک مقبرہ نُما عمارت "لال محل" کے نام سے موسوم ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ کسی امیر کا مقبرہ ہو۔ جب میں وہاں گیا تو اس زمانے میں علامہ اخلاق حسین دہلوی لال محل میں مقیم تھے۔ میں متعدد بار ان سے ملا ہوں۔ ایک بار انہوں نے اپنی ایک گراں مایہ تصنیف "آئینۂ ملفوظات" مجھے عنایت فرمائی جس میں انہوں نے فوائد السالکین، اسرار الاولیاء اور راحت القلوب کا تفصیلی تعارف کرانے کے بعد قارئین کے شکوک رفع کر کے انہیں GENUINE کتابیں ثابت کیا ہے۔ اس کے باوجود راقم کو ان کے صحیح ہونے میں شبہ ہے۔ آج مورخہ ۳ نومبر ۱۹۹۳ء کو بھارت سے ایک عرصے کے بعد ڈاک آنا شروع ہوئی ہے۔ اسی ڈاک سے ماہ اکتوبر کا ماہنامہ معارف اعظم گڑھ وصول ہوا اور اس میں علامہ صاحب کے ارتحال کی خبر پڑھ کر بڑا دکھ ہوا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔ ان کی رحلت سے تصوّف پر کام کرنے والوں کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔

میں تلاش بسیار کے باوجود حضرت مرزا مظہر جانجاناں (م ۱۷۸۰ء) کے مرشدِ گرامی حضرت خواجہ نور محمد بداؤنیؒ (م ۱۷۲۳ء) کے مزار کا پتہ نہ چلا سکا تھا۔ شاہ زید ابوالحسن نے مجھے اس کا محلِ وقوع بھی بتایا تھا لیکن میں کوشش کے باوجود وہاں نہ پہنچ سکا۔ میں نے علامہ اخلاق حسین دہلوی سے اس کا پتہ پوچھا تو انہوں نے اپنے فرزند کو میرے ساتھ کیا اور وہ مجھے نالہ پار ایک قبرستان میں لے گیا، وہاں ایک چار دیواری کے اندر حضرت نور محمد بداؤنیؒ کا مزار ہے۔ اسی جگہ شاہ زید ابوالحسن کی والدۂ ماجدہ اور اہلیۂ محترمہ کی بھی ابدی آرام گاہیں ہیں۔ شاہ صاحب مرحوم نے چند سال ہوئے حضرت بداؤنیؒ کے مزار کی مرمت کروا دی ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ۔ حضرت خواجہ نور محمد بداؤنیؒ،

حضرت امام ربانی مجدّدِ الفِ ثانیؒ (م ۱۶۲۴ء) کے پوتے حضرت خواجہ سیف الدین سرہندیؒ (م ۱۶۸۵ء) کے مرید باصفا اور خلیفۂ ارشد تھے۔ ان کا روحانی فیض ترکی اور شام تک پہنچا ہے۔ شاہ زید ابوالحسن صاحب ورع و تقویٰ بزرگ تھے اس لئے ان کی بات پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ انہوں نے "مقاماتِ خیر" میں تحریر فرمایا ہے کہ ایک بار ایک نابکار ہندو چمار ان کے مزار کے احاطے سے پتھر کی سلیں اکھاڑ کر لے گیا اور انہیں اپنے مکان کی چھت میں استعمال کر لیا۔ اتفاق سے ایک رات جب وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ اس چھت کے نیچے سو رہا تھا تو چھت گر پڑی اور وہ اہل و عیال سمیت رام جی کو پیارا ہو گیا۔

دوسری روائت انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ جس زمانے میں خواجہ صاحب کے مزار کی مرمت ہو رہی تھی تو اس زمانے میں اشیاء کمیاب ہونے والی تھیں اور دہلی میں سیمنٹ اور سریے کی بڑی قلت تھی۔ انہوں نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد سیمنٹ اور سریا خریدا۔ انہیں اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ رات کے وقت یہ کہیں چوری نہ ہو جائیں۔ اس لئے انہیں ایک چوکیدار کی ضرورت پیش آئی لیکن رات کے سناٹے میں ایک چوکیدار قبرستان میں پہرہ دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ انہوں نے دو چوکیداروں کا انتظام کیا اور ان کے لئے وہاں ایک چھولداری لگوا دی۔ چوکیداروں کا یہ کہنا ہے کہ انہوں نے نصف شب کے بعد ایک بزرگ کو خواجہ صاحب کی قبر کے اوپر بیٹھے ہوئے دیکھا تو ان کی گھگھی بندھ گئی۔ انہوں نے شاہ صاحب سے اس بزرگ کا جو حلیہ بیان کیا، بقول شاہ صاحب ان کا وہی حلیہ کتابوں میں مرقوم ہے۔ یہ چوکیدار بالکل اَن پڑھ تھے اور وہ خواجہ صاحب کی شخصیت سے متعارف نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی کتاب میں ان کے حلیے کے بارے میں پڑھا تھا۔ مزدوروں نے یہ بھی دیکھا کہ اس نورانی صورت والے بزرگ کی گردن بائیں طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ کثرتِ مراقبہ سے ان کی گردن بائیں جانب جھک گئی تھی اور ان کا منہ قلب سے قریب ہو گیا تھا۔

بنگلے والی مسجد سے آگے بڑھیں تو بائیں ہاتھ غالب اکیڈمی کی پانچ منزلہ عمارت نظر آتی ہے۔ اس عمارت کا دروازہ کسی راجے یا نواب کے محل کا دروازہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ عمارت ہمدرد دواخانہ کے متولی جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے غالب پر تحقیق کے لئے بنوائی ہے۔ راقم کو اس میں تقریر کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ یہیں مالک

رام اور پروفیسر محمد زبیر سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ اکیڈمی میں غالب کے بارے میں کتابوں اور رسائل پر مشتمل ایک نادر لائبریری اور عجائب گھر موجود ہیں۔ ریسرچ اسکالرز کی رہائش کا بھی بہترین انتظام ہے۔ ان دنوں سید اکبر علی ترمذی صاحب اس کے ناظمِ اعلیٰ ہیں۔ موصوف دو بار لاہور تشریف لا کر راقم کو شرفِ میزبانی بخش چکے ہیں۔ ان کی کئی تصانیف ان کے دستخطوں کے ساتھ اس ناچیز کی لائبریری میں موجود ہیں۔ انہوں نے اجمیر کے کتبات پر ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہے۔ ترمذی صاحب اصلاً گجرات کے رہنے والے ہیں۔ اس لئے ڈاکٹر عبدالحمید فاروقی، پروفیسر ابراہیم ڈار اور ضیاء الدین ڈیسائی سے خوب متعارف ہیں۔

غالب اکیڈمی کی مغربی دیوار سے ملحق ایک نو تعمیر شدہ چار دیواری کے اندر غالب کی قبر ہے۔ راقم نے ۱۹۵۵ء میں یہاں درجنوں قبریں دیکھی تھیں لیکن اب صرف تین قبریں باقی رہ گئی ہیں۔ زین العابدین عارف کے بیٹے مرزا باقر علی خاں کامل (م ۱۸۷۶ء) کی نواسی حمیدہ سلطان احمد نے، جو فخر الدین علی احمد (م ۱۹۷۷ء) سابق صدر جمہوریہ بھارت کی ہمشیرہ ہیں، "خاندانِ لوہارو کے شعراء" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ باقر علی خان اور ان کے بھائی مرزا حسین علی خاں شاداں (م ۱۸۸۰ء) کی قبریں بھی اسی جگہ تھیں۔ اب ان قبروں کا نشان بھی باقی نہیں رہا۔ خدا جانے اور کتنے مشاہیر یہاں دفن ہوں گے۔ شاید ایسے ہی موقع پر کسی نے کہا تھا:

نہ ہے قبرِ دارا نہ گورِ سکندر
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

غالب کی قبر ایک چھتری کے نیچے ہے۔ جس وقت میں وہاں پہنچا تو ایک کتا وہاں "آرام فرما" رہا تھا۔ افسوس کہ چھتری کے دروازے پر کسی نے دروازہ لگانے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ غالب کی یاد میں کتنے ادارے قائم ہو چکے ہیں اور اس کے نام سے کتنے لوگوں کا روزگار وابستہ ہے لیکن اس کی قبر کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ غالب کے لوح

مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

یاحی یاقیوم

رشکِ عرفیؔ و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خان غالب مُرد
کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزوں
تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا "گنجِ معانی ہے تہ خاک"

۱۲۸۵ھ

چھتری سے باہر غالب کی پائنتی اس کے منہ بولے فرزند نواب زین العابدین عارف المتوفیٰ ۱۸۵۲ء کی ابدی آرام گاہ ہے۔ راقمِ آثم نے سعادت یار خان رنگین کے والدِ محترم طہماس خان کی ایک نادر تصنیف۔ **طہماس نامہ**۔ مدوّن کی تھی جسے پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۸۶ء میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ طہماس خان کی پرورش نواب معین الملک ناظمِ پنجاب (م ۱۷۵۳ء) نے کی تھی۔ نواب صاحب کی اچانک وفات کے بعد ان کی بیوہ مغلانی بیگم (م ۱۷۷۹ء) نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ طہماس خان رقمطراز ہے کہ جس زمانے میں وہ نواب معین الملک کا منظورِ نظر تھا، ان دنوں وسطِ ایشیا۔ کا ایک نوجوان قاسم خان ان کے درِ دولت پر پہرہ دیا کرتا تھا۔ اس نے ایک روز طہماس خان سے استدعا کی کہ وہ کسی روز موقع و محل دیکھ کر نواب صاحب سے اس کی سفارش کرے۔ چنانچہ طہماس خان کی سفارش پر نواب معین الملک نے قاسم خان پر توجہ کرنا شروع کی اور یہیں سے اس کا عروج شروع ہوا۔ نواب صاحب کی رحلت کے بعد مغلانی بیگم نے قاسم خان کو پٹی کا فوجدار مقرر کیا تو طہماس خان نے بھی اس کے ساتھ جانے پر اصرار کیا۔ بیگم صاحبہ نے اسے اجازت مرحمت فرمائی لیکن راستے میں سکھوں نے انہیں گھیر لیا اور انہیں پٹی نہ جانے دیا۔

جب لاہور کے سیاسی حالات زیادہ خراب ہو گئے تو قاسم خان نے دلی جا کر شاہی فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ طہماس خان نے اس کا تذکرہ اچھے انداز سے نہیں کیا۔

وہ طہماس خان سے رقم ادھار لے کر مکر گیا تھا۔

بہرحال قسمت نے قاسم خان کی یاوری کی اور وہ دلی جا کر قاسم جان بن گیا۔ اس نے شاہ عالم ثانی کی فوج میں بھرتی ہو کر بڑی ترقی کی اور ہوتے ہوتے وہ ہفت ہزاری منصب پر فائز ہوا اور بادشاہ نے اسے نواب شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب مرحمت کیا۔ (کاندھلہ میں نورالحسن راشد کے پاس طہماس خان کے مکان کا قبالہ موجود ہے جو اس نے دلی میں خریدا تھا۔ گواہوں میں قاسم خان بھی تھا اور اس کی مُہر اور دستخط اس قبالے پر ثبت ہیں۔ راقم نے اس کا عکس **طہماس نامہ** میں شامل کر دیا ہے)۔

قاسم جان کے چار فرزند تھے: محمد بخش خان، قدرت اللہ بیگ، نبی بخش خان اور فیض اللہ بیگ۔ مؤخر الذکر کے دو بیٹے تھے: نقشبند خان اور نواب غلام حسین خان مسرور۔ مؤخر الذکر غالب کا ہم زلف تھا۔ اس کی اہلیہ بنیادی بیگم اور غالب کی رفیقۂ حیات امراؤ بیگم حقیقی بہنیں تھیں۔ جب مرزا غالب کے سات بچے نو عمری میں فوت ہو گئے تو امراؤ بیگم نے بنیادی بیگم کے بیٹے زین العابدین عارف کو گود لے لیا تھا۔ غالب نے اپنا ہی بیٹا سمجھ کر اسے پالا پوسا تھا۔ بدقسمتی سے غالب ہی کے سامنے ۳۵ سال کی عمر میں ۱۸۵۲ء میں عارف کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وفات پر غالب نے جو مرثیہ لکھا اس میں بوڑھے "باپ" کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ اس مرثیے کا ایک شعر زبان زد خلائق ہے:

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

عارف کی قبر مزار غالب کے پائنتی موجود ہے اور اس کے لوح پر یہ عبارت کندہ ہے:

۱۲۶۸ھ

آن پسندیدہ خوئے، عارف نام
کہ رخش شمع دودمان شست
اے کہ میراث خوار سن باشی

اندر اُردو کہ آن زبانِ منست
ارمغانی ز سیدِ فیاض
باد آن تر ہرچہ آن منست
(غالب)

نواب زین العابدین خان عارف
تاریخ وفات ۱۲۶۸ ہجری

عارف کی قبر سے جانب مشرق، احاطے سے باہر، غالب کے سُسر نواب الٰہی بخش خاں معروف (م ۱۸۲۶ء) کی قبر ہے۔ موصوف قاسم جان کے بھائی عارف جان کے فرزند تھے اور زین العابدین عارف کے نانا۔ ان کی قبر خدا جانے کس مصلحت کے تحت اس احاطے سے باہر نکال دی گئی ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس وقت وہاں بہت سا کوڑا کرکٹ موجود تھا اور دکانداروں نے فالتو سامان وہاں رکھا ہوا تھا۔ اگر اسے بھی چار دیواری کے اندر لے لیا جائے تو اس کی مناسب دیکھ بھال ہو سکتی ہے۔ معروف کی قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا کتبہ نصب ہے جس پر صرف ان کا نام اور سن وفات ۱۲۴۲ھ درج ہے۔

جس زمانے میں علّامہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے تعلقات خوشگوار تھے اس زمانے میں اقبال دہلی گئے تو خواجہ صاحب نے غالب کی قبر پر محفل سماع کا اہتمام کیا۔ اس موقعہ پر قوالوں نے غالب کی وہ مشہور غزل گائی جس کا مطلع ہے:

مارا زمانے نے اسد اللہ خان تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

سنا ہے کہ جب قوالوں نے یہ شعر پڑھا:

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

تو انہوں نے ایسا سماں باندھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ غالب قبر سے اب باہر نکلے کہ اب نکلے۔

غالب کے احاطۂ مزار کا ایک دروازہ چونسٹھ کھمبہ کی عمارت میں کھلتا ہے۔ یہ

عمارت سرتاپا سنگِ مرمر سے تعمیر ہوئی ہے۔ اس کی چھت چونسٹھ ستونوں کے سہارے کھڑی ہے اس لئے اس کا نام چونسٹھ کھمبہ پڑ گیا۔ چھت کے نیچے دس قبریں ہیں اور ان میں سب سے نمایاں قبر مغل فرمانروا اکبر کے رضاعی بھائی خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی ہے۔ وہ اتکہ خاں اور ماہم انگہ کا فرزند تھا۔ یہ وہی محترم خاتون ہے جس نے مدرسہ خیر المنازل تعمیر کیا تھا۔ مرزا عزیز بڑا خود سر تھا اور اس نے اکبر اور جہانگیر کے عہد میں کئی بار شاہی احکام کی خلاف ورزی کی۔ اکبر ہر بار یہ کہہ کر اس کی غلطی معاف کر دیا کرتا تھا کہ اس کے اور مرزا عزیز کے درمیان جوئے شیر بہہ رہی ہے جسے وہ عبور نہیں کر سکتا۔ مرزا عزیز کی بیٹی جہانگیر کے فرزند شہزادہ خسرو کے عقد میں تھی۔ اکبر کی وفات پر شہزادہ خسرو نے اپنے سُسر مرزا عزیز اور ماموں راجہ مان سنگھ کی مدد سے تخت پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مرزا عزیز کا انتقال ۱۶۲۳ء میں جہانگیر کے آخری دور حکومت میں ہوا تھا۔ مرزا عزیز کوکلتاش کی قبر نمایاں ہے۔ باقی قبروں پر کسی کا نام درج نہیں ہے۔ اس لئے یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہاں کون کون دفن ہے۔

چونسٹھ کھمبہ سے متصل سماع خانہ ہے، جہاں سلطان المشائخ کے عرس کے موقع پر قوالی ہوتی ہے۔ نیا سماع خانہ خواجہ حسن نظامی کے مقبرے سے متصل تعمیر ہوا ہے۔

غالب کے احاطۂ قبور کے بعد قبروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ۱۹۴۰ء کے اوائل میں کشمیری رہنما شیخ عبداللہ کی ساس فوت ہوئی تو اسے یہیں دفن کیا گیا۔ شیخ صاحب اس زمانے میں قید میں تھے۔ انہوں نے "جذباتِ اسیر" کے عنوان سے علامہ اقبال کے اشعار منتخب کرکے اس کے لوحِ مزار پر کندہ کروائے۔ شیخ عبدالشکور (م ۱۹۸۵ء) نے اپنی تصنیف "سبزۂ بیگانہ" میں اس خاتون کے حالات تفصیل کے ساتھ نقل کئے ہیں جو لائق مطالعہ ہیں۔

چند قدم آگے بڑھیں تو دائیں ہاتھ وہ تاریخی قبرستان آتا ہے جو "چبوترۂ یاراں" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں سلطان المشائخ کے بہت سے عزیز و اقارب اور خاص خاص مریدین محو خوابِ ابدی ہیں۔ یہیں سیر الاولیاء کے فاضل مصنف امیر خورد کرمانی کی آخری آرام گاہ ہے۔ ابتداء میں موصوف تاجر پیشہ تھے اور کرمان سے سامان تجارت لا

کر لاہور اور ملتان میں فروخت کیا کرتے تھے۔ ملتان جاتے تو حضرت بہاء الدین زکریا کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اجودھن جاتے تو بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی صحبت میں بیٹھتے۔ انہوں نے بابا صاحب کے دست حق پرست پر بیعت کر لی اور ان کے انتقال کے بعد سلطان المشائخ کے دامن ارادات سے وابستہ ہو گئے۔ ان کا انتقال ۷۱۱ھ / ۱۳۱۱ء میں ہوا۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کی قبر پر کتبہ لگوا دیا ہے۔

امیر خورد کرمانی کی قبر سے جانب مشرق چند قدم کے فاصلے پر حضرت نظام الدین اولیاء کے خواہر زادے شیخ تقی الدین نوح کی ابدی آرام گاہ ہے۔ موصوف سلطان اور امراء کے ہاں آمد و رفت رکھتے تھے اور یہ بات سلطان المشائخ کو پسند نہ تھی۔ ایک روز انہوں نے اپنے بھانجے سے کہا کہ اگر وہ سلطان اور امراء کے ہاں جانا ترک کر دیں تو موصوف انہیں اپنا جانشین نامزد کر دیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی عادت ترک نہ کی۔ حضرت کو ان کی وفات کا اتنا زیادہ رنج ہوا کہ مدتوں تک ان کے لبوں پر کسی نے مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ چند ماہ بعد بسنت کا تہوار آیا تو امیر خسرو نے بسنتی لباس زیب تن کیا اور سرسوں کے پھول اپنی دستار میں لگا کر راگ بسنت گاتے ہوئے والہانہ انداز میں سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو موصوف ان کو اس ہیئت میں دیکھ کر مسکرائے اور سوگ ختم کرنے اعلان فرمایا۔

راگ بسنت کی درجنوں اقسام ہیں جن کا آفتاب موسیقی چاند خان نے۔ موسیقی حضرت امیر خسرو۔ میں ذکر کیا ہے، خدا جانے اس روز حضرت امیر خسرو نے ان میں سے کونسا راگ پیش کیا تھا۔ راقم نے سنا ہے کہ ایک بار جالندھر میں ہر دلبھ کے راگ میلے میں شام چوراسی کے کسی گوّیے نے یہ راگ یوں پیش کیا تھا:

سکل بن پھول رہی سرسوں
بیت گئے برسوں
پیا آنے کو کہہ گئے
آج، کل، پرسوں

اور وہ میلہ لوٹ کر لے گیا تھا۔

سلطان المشائخ کے ایک نامور خلیفہ حضرت شمس الدین یحییٰ بھی یہیں کہیں محو

خواب ابدی ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کے مزار کا محل وقوع چبوترۂ یاراں ہی بتایا ہے لیکن راقم کو ان کا مزار نہیں ملا۔ سلطان محمد بن تغلق (م ۱۳۵۱ء) نے مشائخ پر بڑی سختی کی تھی اور انہیں سرکاری ملازمت اختیار کرنے یا دُور دراز علاقوں میں جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے ایک روز حضرت شمس الدین یحییٰ کو حکم دیا کہ وہ کشمیر جا کر کسی بت خانے میں بیٹھ جائیں اور وہاں اسلام کی تبلیغ کریں۔ اسی دوران میں ان کے سینے پر ایک پھوڑا نکلا۔ سلطان نے خیال کیا کہ موصوف کہیں اسے کشمیر نہ جانے کا بہانہ نہ بنا رہے ہوں۔ لہٰذا انہیں اپنے حضور طلب کیا۔ سلطان نے پھوڑا دیکھ کر انہیں واپس بھیج دیا اور چند رُوز بعد حضرت کا انتقال ہو گیا۔ یہ ۱۳۳۶ء کا واقعہ ہے۔

سلطان المشائخ کی درگاہ میں باؤلی سے متصل بائی کوکلدی بنتِ ملائم خان (م ۱۴۹۹ء) کا مقبرہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھی۔ یہاں اس کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ میاں تان سین (م ۱۵۸۸ء) کی بیٹی کا بھی یہی نام تھا اور اس نے اجمیر میں ایک مسجد بھی بنوائی تھی جس کا ذکر راقم نے اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔ اگر اس کے نام کے ساتھ بنتِ ملائم خان نہ لکھا ہوتا تو راقم یہی سمجھتا کہ یہ میاں تان سین کی بیٹی کوکلدی کا مقبرہ ہے۔ اس سے ایک بات اور صاف ہوئی کہ کوکلدی بظاہر ہندوانہ نام نظر آتا ہے لیکن اس زمانے میں مسلمان بھی اپنی بچیوں کا نام کوکلدی رکھتے تھے۔

درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ

درگاہ کے احاطے میں سب سے پہلے حضرت امیر خسروؒ (م ۱۳۲۵ء) کا مقبرہ نظر آتا ہے۔ سلطان المشائخ کی زندگی میں جو لوگ ان سے ملنے آتے تھے وہ امیر خسروؒ کے توسط سے ان کی خدمت میں باریاب ہوتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد بھی یہ دستور قائم رہا۔ اب بھی زائرین پہلے امیر خسروؒ کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں، اس کے بعد سلطان جی کے روضے پر حاضر ہوتے ہیں۔

امیر خسروؒ بیک وقت ایک بلند پایہ مؤرخ، عدیم المثال شاعر، اُونچے درجے کے موسیقار، کامیاب درباری، تجربہ کار سپاہی اور صوفیٔ باصفا تھے۔ حال ہی میں ان کی

ذات ستودہ صفات پر بڑا تحقیقی کام ہوا ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمن (م ۱۹۸۷ء) کی تصنیف "ہندوستان امیر خسروؔ کی نظر میں" چاند خان کی تالیف "موسیقیٔ حضرت امیر خسرو" اور ڈاکٹر نور الحسن انصاری (م ۱۹۸۶ء) کی مرتبہ "امیر خسرو احوال و آثار" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حکومتِ ہند نے ایک خصوصی سیمینار بھی منعقد کرایا تھا جس میں امیر خسروؔ کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

مولانا شہاب معمائی نے ان کا قطعہ تاریخ کہا تھا، جو ان کے لوحِ مزار پر کندہ کروا دیا گیا ہے:

زمیں را ازیں لوح شد سرفرازی
بدوران بابر، شہنشاہ غازی
میر خسرو، خسروِ ملکِ سخن
آن محیطِ فضل و دریای کمال
نثر او دل کش تر از ماء معین
نظمِ او صافی تر از آبِ زلال
بلبلِ دستان سرائے بیقرین
طوطیٔ شکر مقالِ بی مثال
از پیٔ تاریخ سالِ فوتِ او
چوں نہادم سر بزانوی خیال
شد "عدیم المثال" یک تاریخ او
دیگری شد "طوطی شکر مقال"

عدیم المثال اور طوطی شکر مقال سے ۷۲۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ امیر خسرو کے مزار سے جانبِ مشرق کئی قدیم قبریں ہیں جن پر الواح نہیں لگائی گئیں۔ انہی قبروں میں عماد کاشانی اور حماد کاشانی کی قبریں ہونی چاہیں۔ انہوں نے حضرت برہان الدین غریبؒ (م ۱۳۳۸ء) کے ملفوظات جمع کئے تھے۔

امیر خسروؔ کے مزار کی پائنتی خواجہ حسن نظامی مرحوم (م ۱۹۵۵ء) کا حجرہ ہے۔ اس کے دروازے پر آمنے سامنے دو قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک قبر ضیاء الدین برنی صاحب

تاریخ فیروز شاہی کی اور دوسری مؤرخِ شہیر شمس سراج عفیف کی بتائی جاتی ہے لیکن راقم الحروف کو ان کے صحیح ہونے میں شبہ ہے۔

امیر خسروؔ کے مزار سے جانبِ مغرب چند قدم کے فاصلے پر سلطان المشائخ کے خادمِ خاص خواجہ اقبالؒ کی قبر ہے۔ علامہ اقبالؔ نے ایک منقبت میں ان کے ہم نام ہونے پر اظہار فخر کیا ہے اور ان کے واسطے سے سلطان المشائخ سے نگاہِ کرم کی بھیک مانگی ہے۔

امیر خسروؔ کے مزار کے سرہانے مغل فرمانرواؤں میں سے محمد شاہ (م ۱۷۴۸ء) اور احمد شاہ (م ۱۷۷۵ء) کی قبریں ہیں۔ یہ دونوں حکمران شاہ ولی اللہ (م ۱۷۶۲ء) کے ہم عصر تھے۔ محمد شاہ کی رنگ رلیوں اور امورِ سلطنت میں عدمِ دلچسپی کی بناء پر مغل حکومت اور عوام کو بُرے دن دیکھنے پڑے۔ اسی کے عہدِ حکومت میں نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر حملہ کرکے دہلی میں قتلِ عام کیا تھا۔

ان دونوں بادشاہوں کی قبروں کے ساتھ تیسری قبر شہزادہ میرزا جہانگیر (م ۱۸۲۱ء) کی ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں خسرو باغ الہ آباد میں اپنے لئے مقبرہ تعمیر کروا لیا تھا لیکن اس کی مٹی دہلی کی تھی۔ اب وہ مقبرہ خالی پڑا ہے۔

مغل حکمرانوں کی قبروں کے عقب میں سنگ مرمر کے حجرے کے اندر شہزادی جہاں آراء بیگم (م ۱۶۸۱ء) محوِ خواب ابدی ہے۔ اسے خواجگانِ چشت کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور اس نے اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ (م ۱۲۳۶ء) کے مزار پر ایک دالان تعمیر کیا تھا جو اس کے نام کی مناسبت سے "بیگمی دالان" کے نام سے موسوم ہے۔ شہزادی جہاں آراء نے "مونس الارواح" اور "رسالۂ صاحبیہ" کے عنوانات سے دو کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ آخر الذکر تصنیف کو راقم الحروف نے فارسی متن اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ سردار علی احمد خان نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ان تینوں کو یکجا چھاپ دیا ہے۔ اس کتاب میں اس نے اپنے مرشد ملا شاہ بدخشیؒ (م ۱۶۶۳ء) کے سوانحِ حیات قلمبند کئے ہیں۔ اس نے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ولادت (۱۷۰۳ء) سے نصف صدی قبل قرآنِ حکیم کا بین السطور فارسی ترجمہ کرنا شروع کیا تھا جسے وہ مکمل نہ کر سکی۔ اس کے چند اجزاء مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں حبیب گنج کلکشن

میں محفوظ ہیں۔ اس کی مُہر ستارہ میوزیم میں اور بیاض بنارس یونیورسٹی کے کتابخانے میں محفوظ ہیں۔

جہاں آرا کا لوح مزار قابل دید ہے اور اس پر خط نستعلیق میں یہ عبارت درج ہے:

هوالحی القیوم

بغیر سبزہ نپوشد کسی مزار مرا
کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است
الفقیرہ الفانیہ جہاں آراء مرید خواجگانِ چشت بنتِ شاہ جہاں پادشاہ غازی
انار اللہ برہانہ ۱۰۹۲ھ

اس کی بھتیجی زینت النساء بیگم اپنی تعمیر کردہ مسجد زینت المساجد میں مدفون ہے۔ اس نے اس سے ملتا جلتا شعر اپنی قبر کے کتبے پر لکھوایا تھا:

مونسِ ما در لحد فضلِ خدا تنہا بس است
سایۂ ابرِ رحمت قبرپوشِ ما بس است

سلطان المشائخ (م ۱۳۲۵ء) کا مزار مسجد کے صحن میں ایک سفید قاش دار گنبد کے نیچے ہے۔ مزار کے چاروں طرف برآمدہ بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے مزار کے اندر ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ مزار کے اوپر صندل کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک چھپرکھٹ نصب ہے جس پر سیپ کا بہت عمدہ کام بنا ہوا ہے۔ یہ چھپرکھٹ جہانگیر کے منصب دار نواب مرتضیٰ خان فرید بخاریؒ (م ۱۶۱۹ء) کا ہدیۂ عقیدت ہے۔ نواب مرحوم و مغفور کا حضرت خواجہ باقی باللہ (م ۱۶۰۳ء)، مجدد الف ثانیؒ (م ۱۶۲۴ء) اور شیخ عبدالحق محدثؒ (م ۱۶۴۲ء) کے ساتھ بڑا قریبی رابطہ تھا۔ ان تینوں بزرگوں کے مکاتیب میں نواب مرتضیٰ خان کے نام خط موجود ہیں۔

سلطان المشائخ سے چشتیہ نظامیہ سلسلے کی بنیاد پڑی۔ دکن میں ان کے سلسلے کے بزرگوں میں سے حضرت منتجب الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت زین الدینؒ، بندہ نواز گیسو درازؒ اور حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ نے بڑا کام کیا ہے۔ شمالی ہند اور پاکستان میں ان کے سلسلے کے بزرگوں میں سے شاہ کلیم اللہ ولی شاہجہان

آبادیؒ، شاہ فخر الدین دہلویؒ، خواجہ نور محمد مہارویؒ، خواجہ سلیمان تونسویؒ، خواجہ شمس الدین سیالویؒ اور پیر مہر علی گولڑویؒ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

سلطان المشائخ کے مزار کے قریب ایک شاندار مسجد موجود ہے۔ ایک روایت کے مطابق یہ مسجد علاء الدین خلجی کے فرزند خضر خان نے تعمیر کرائی تھی۔ وہ سلطان جی کا مرید تھا۔ اس مسجد کے محراب پر جس انداز سے عربی عبارات اور قرآنی آیات لکھی گئی ہے وہ قابل دید بلکہ قابل تعریف ہیں۔ اس مسجد کی شمالی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جو باہر سے نظر نہیں آتا۔ اب اس قبرستان میں چند افراد نے رہائش اختیار کرلی ہے۔ یہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ جاگیر دار جہانگیر آباد (م ۱۸۶۹ء) کی خاندانی حظیرہ ہے۔ نواب موصوف غالب اور مومن کے خاص دوست تھے۔ ایک روایت کے مطابق اسد اللہ خان کو غالب بنانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی کڑی تنقید نے غالب کو اپنے بعض اشعار پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ شیفتہ کا یہ شعر زبان زد خلایق ہے:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

شیفتہ کی قبر پر جو لوح نصب ہے اس پر یہ عبارت درج ہے:

یااللہ
جزاهم بما صبروا جنات و حریرا
۱۲۸۶ھ

شیفتہ کی قبر کے ساتھ ہی ان کے فرزند نواب محمد اسحٰق خان کی قبر ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے:

نواب حاجی محمد اسحٰق خان رئیس جہانگیر آباد
کل نفس ذائقۃ الموت
۱۹۱۸ء
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم انا للہ و انا الیہ راجعون
۱۳۳۷ھ
وقتِ چاشت یوم یک شنبہ ۲۲ محرم الحرام ۱۳۳۷ھ ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۸ء

نواب اسحاق خان کی قبر کے ساتھ ہی ان کے فرزند نواب محمد اسمٰعیل خان کی آخری آرام گاہ ہے۔ موصوف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ ان کی ٹوپی کی طرز قائداعظم کو پسند آگئی اور انہوں نے اسی وضع کی ٹوپی اپنے لئے بنوائی جو "جناح کیپ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ حکومتِ پاکستان نے ان کی یاد میں ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

نواب محمد اسمٰعیل خان

ابن نواب محمد اسحاق خان ابن نواب محمد مصطفےٰ خان شیفتہ حسرتی

پیدائش ۲ ستمبر ۱۸۸۴ء آگرہ

وفات ۲۸ جون ۱۹۵۸ء میرٹھ

غریقِ رحمت

سلطان المشائخ کی درگاہ میں مدفون بزرگوں کی قبریں دیکھ کر معاً ذہن میں یہ مصرع آتا ہے:

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

بستی نظام الدینؒ میں سلطان فیروز تغلق (م ۱۳۸۸ء) کی تعمیر کردہ ایک پرشکوہ مسجد موجود ہے۔ لیکن گلیوں میں گھر جانے کی وجہ سے عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ پہلے اس مسجد کی حالت بڑی خستہ تھی اب تبلیغی جماعت نے اس کی طرف توجہ دی ہے۔ جب بنگلے والی مسجد میں مجمع زیادہ ہو جاتا ہے تو انہیں یہاں بھیج دیا جاتا ہے۔ الحمد للہ! اب یہ مسجد بھی آباد رہنے لگی ہے۔

بستی نظام الدینؒ میں خواجہ حسن نظامی کا مقبرہ بھی قابلِ دید ہے۔ ان کے معتقدین نے ان کی قبر پر ایک بڑا گنبد بنوا دیا ہے جو سلطان جیؒ کے گنبد سے بھی اونچا ہو گیا ہے۔ اس پر بہت سے لوگوں نے اعتراض بھی کیا ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی زندگی میں ہی اپنی قبر کا کتبہ لکھوا لیا تھا۔ اس پر یہ عبارت منقوش ہے:

۷۸۶

ہوالکل یا معین

سلطان المشائخ حضرت خواجہ سید نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے

جانشین امام المشائخ شمس العلماء مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

ادیب المغفور ۱۳۷۴ھ غوثِ وقت ۲۰۱۲ بکرمی

آخری آرامگاہ

حضرت کا خود نوشتہ کتبہ

یہ قبر ایک مسلمان کی ہے اس خاک میں وہ سوتا ہے جس نے دنیا کی بیداری میں سونے والوں کو جگانے کی خاطر اچھی اور بری موت کا فرق قلم کی بجلی سے زندہ کر کے دکھایا۔ چار دن کی شہرت پر گھمنڈ نہ کرنا، کہ یہ بھی بہت مشہور تھا۔ قوت تحریر و تقریر کا غرور دل میں نہ لانا کہ اس کی طاقتِ انشاء پردازی نے بھی تمام ہندوستان میں دھاک بٹھا دی تھی۔ مگر آج وہ ساری دھوم اس تودۂ خاک میں چپ چاپ پڑی ہے۔ یہ اس کی قبر ہے جس نے الواحِ قبور اس وقت لکھیں جب کہ دنیا کی کسی زبان میں ان کی نظیر موجود نہ تھی۔ لیکن یہ بے مثال باتیں ایجاد کرنے والا بھی آخر میں گیا اور کہہ گیا کہ کام آخرت کی نیت سے کرنا جس کا نتیجہ لازوال ہے۔ اس زندگی کے لئے نہیں جہاں کا رہنا چند ساعت کا خواب و خیال ہے (ماخوذ از قبروں کے قلمی نوشتے)

آفتاب اہل علم و یقین حسن نظامی ۱۹۵۵ء۔ تاریخ ولادت ۲ محرم ۱۲۹۶ھ یوم پنجشنبہ بوقتِ صبح صادق تاریخ وصال ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ دوشنبے کی رات۔

خواجہ حسن نظامی کے احاطۂ مزار میں سرشاہ سلیمان (م ۱۹۴۱ء) سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و جج الہ آباد ہائیکورٹ کی قبر ہے۔ ان کی قبر پر کتبہ نصب نہیں ہے۔ سرشاہ سلیمان کا شمار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لائق ترین وائس چانسلروں میں ہوتا ہے۔ قانون کے علاوہ انہوں نے سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی قابلیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مشہور جرمن سائنسدان آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کا رد کیا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے فرزندان اگر اپنے اس مہمان کی قبر پر کتبہ لگا دیں تو زائرین کو ان کی قبر تلاش کرنے میں آسانی رہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کی درگاہ سے میں "چراغِ دلی" روانہ ہوا۔ ان دونوں درگاہوں کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔ میرے اندازے کے مطابق سات آٹھ میل سے کم مسافت نہیں ہے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی رحمۃ اللہ (م ۷۵۷ھ) کی درگاہ تک پہنچنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ پرانی دہلی سے وہاں جانے کے لئے موٹر رکشا میں سفر کرنا بڑا مہنگا پڑتا ہے۔ تیس پینتیس روپے سے کم بھی میٹر بھلا کیا چلتا ہوگا۔

حضرت کی درگاہ ایک قلعہ نما عمارت کے اندر ہے۔ اس قلعہ میں زیادہ تر ہندو آباد ہیں۔ قلعہ کی مغربی سمت میں ایک بڑے احاطے کے اندر حضرت نصیر الدین محمود اودھی المعروف بہ چراغ دہلی کا مزار ہے۔ مزار کی عمارت پر بیس دری بنی ہوئی ہے اور اس کی محرابیں مغل طرز تعمیر کی غمازی کرتی ہیں۔ گنبد پر پرانی وضع کے نقش و نگار اب تک موجود ہیں۔ حضرت کا مزار ایک کمرے کے اندر ہے اور اس کے چاروں طرف غلام گردش بنا ہوا ہے۔ آپ کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

مزار شریف

مستغرق بحرِ شہود شمس العارفین حضرت مخدوم نصیر الدین محمود چراغ دہلی چشتی نظامیؒ

وصال ۱۸ رمضان ۷۵۷ھ

خانقاہِ عالیہ کے صحن میں حضرت چراغ دہلی کے خلیفۂ اعظم حضرت قاضی محمد ساوی کی قبر ہے۔ اس کے قریب ہی حضرت چراغ دہلیؒ کے خواہر زادے علامہ کمال الدینؒ (م ۷۵۶ھ) اور ان کے بھائی خواجہ زین الدین احمدؒ کی قبریں ہیں۔ علامہ کمال الدینؒ کا مقبرہ حال ہی میں تعمیر ہوا ہے۔ علّامہ صاحب کا رُوحانی فیض گجرات، پنجاب اور دکن کی طرف خوب پھیلا ہے۔

درگاہ کی مسجد کے عقب میں لُودھی خاندان کے بانی سلطان بہلول لُودھی (م ۸۹۴ھ) کا مقبرہ ہے۔ یہ عمارت اب بڑی خستہ حالت میں ہے اور کسی وقت بھی زمین بوس ہو سکتی ہے۔ مقبرہ کے اوپر ایک بڑا گنبد ہے اور اس کے گرد آٹھ چھوٹے گنبد بنے ہوئے ہیں۔ مقبرے کے اندر تین قبریں ہیں۔ بڑی قبر سلطانِ مرحوم کی ہے۔ قبر کے تعویذ کے سرہانے کلمۂ توحید کندہ ہے۔ تمام محرابوں پر آیاتِ قرآنی کوفی خط میں مرقوم ہیں اور جگہ جگہ سبحان اللہ اور یا اللہ کندہ ہے۔

بہلول لودھی کے مقبرے کے باہر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس لئے جنگلی جانور مقبرے تک آجاتے ہیں۔ میں نے وہاں کئی سوروں کو گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک دیوار پر ایک جنگلی نیور بیٹھا تھا۔ میرے استفسار پر ایک شخص نے بتایا کہ یہ جگہ جنگل میں واقع ہے اس لئے جنگلی جانور یہاں آجاتے ہیں۔

سبحان اللہ یہ کیا جگہ تھی۔ سلطان المشائخ کی رحلت کے بعد یہیں حضرت چراغ دہلیؒ نے حوادث زمانہ کے مخالف جھونکوں میں چشتیہ سلسلے کا چراغ روشن رکھا تھا۔ اسی خانقاہ میں حضرت بندہ نواز گیسو دراز سیّد محمد الحسینیؒ (م ۸۲۵ھ) کی تربیت ہوئی تھی اور اسی خانقاہ میں علّامہ کمال الدینؒ درس دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہاں کے در و دیوار قال اللہ و قال الرسول کی صداؤں سے گونجا کرتے تھے۔ یہیں سلطان فیروز تغلق حضرت چراغ دہلی کی زیارت کو آیا کرتا تھا اور حضرت کمال بے نیازی سے نوافل میں مشغول ہو جایا کرتے تھے۔ اسی خانقاہ میں مخدوم جہانیاں سیّد جلال الدین جہاں گشت بخاریؒ (م ۷۸۵ھ) نے حضرت چراغ دہلیؒ سے اخذِ فیض کیا تھا۔ اب شاہین کا یہ نشیمن زاغوں کے تصرف میں ہے اور وہاں دن دہاڑے سؤر لوٹنیں لگاتے ہیں۔ کاش دہلی کے غیرت مند مسلمان ان مقدس مقامات کی صفائی کی طرف توجہ دیں تاکہ زائرین وہاں سے بیزار ہو کر واپس نہ جائیں۔

چراغ دہلی سے میں ندوۃ المصنفین واپس آیا اور کچھ دیر سستانے کے بعد جملی قبر بازار، بھوجلا پہاڑی اور تبلیغی خانہ ہوتے ہوئے مسجد کلاں پہنچ گیا۔ یہ مسجد سلطان فیروز تغلق کے وزیر جہاں خان کی تعمیر کردہ ہے۔ اس کی کرسی زمین سے ایک منزل بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند ہے۔ یہی وہ تاریخی مسجد ہے جہاں گزشتہ صدی کے نصف آخر میں نواب مولوی قطب الدین خانؒ درس دیا کرتے تھے۔ موصوف شاہ محمد اسحاق کے شاگرد رشید تھے اور وضع قطع میں بھی اپنے اُستاد کے مشابہ تھے۔ سرسید احمد خان لکھتے ہیں کہ وہ اپنے اُستاد سے اس قدر مشابہ تھے کہ جس نے شاہ اسحاق کو نہ دیکھا ہو، وہ ان کو دیکھ لے۔ موصوف اتباعِ شریعت میں اپنے ہم عصروں پر سبقت لے گئے تھے۔ ان کا شمار دہلی کے نامور علماء میں ہوتا تھا۔

اسی مسجد کے قریب پیچ دار گلیوں کے اندر ایک جگہ رتی بجی کے مقبرے کے نام

سے مشہور ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا احاطہ ہے جو چاروں اطراف سے مکانوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس احاطے میں پرانے وقتوں کی دو قبریں ہیں۔ مقامی روایت کے مطابق ایک قبر سلطانہ رضیہ (م ۱۲۳۹ء) کی ہے اور دوسری اس کے شوہر التونیہ حاکم بھٹنڈہ کی۔ التونیہ کی شکست کے بعد میاں بیوی جان بچانے کے لئے بھاگے تو راستے میں کیتھل کے قریب ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئے۔ شاہی فوج ان کی نعشیں دہلی اٹھا لائی اور انہیں موجودہ جگہ پر سپردِ خاک کر دیا۔

شام کے وقت میں ٹہلتے ہوئے حضرت کلیم اللہ ولی شاہجہان آبادی رحمۃ اللہ (م ۱۷۲۹ء) کی درگاہ میں پہنچ گیا۔ یہ درگاہ جامع مسجد سے بمشکل سو سوا سو گز کے فاصلے پر ہو گی۔ حضرت کلیم اللہ ولی کا شمار سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے مجددین میں ہوتا ہے۔

ان کی درگاہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں سے پہلے گنجان آبادی کے اندر تھی۔ جب انگریزوں نے انتقامی جذبے کے تحت اس آبادی کو صاف کیا تو حضرت کی درگاہ کو بھی نقصان پہنچا۔ اب ان کا مزار ایک کھلے میدان میں ٹین کی چھت کے نیچے ہے اور اس کے قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ حضرت کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے:

فانی فی اللہ باقی باللہ

لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

حضرت شیخ کلیم اللہ شاہجہان آبادی

فضل و کمال خویش بود

مرہم قلب ریش بود

سال وصالش گفتہ ہاتف

قطب زمانۂ خویش بود

۱۱۴۲ھ

ایک بڑی لوح پر حضرت کے سوانح حیات بھی درج ہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت کلیم اللہ کا آبائی وطن خجند تھا لیکن ان کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ انہوں نے شیخ یحییٰ مدنی سے خرقۂ خلافت پایا تھا۔ حضرت کلیم اللہ تاج محل کے معمار اُستاد احمد کے احفاد میں سے تھے۔ ان کی ایک علمی یادگار "کشکولِ کلیمی" کے نام سے مشہور ہے۔ ان

کا انتقال ۱۷۲۹ء میں ہوا تھا۔

اس درگاہ کے احاطے میں بہت سی قبریں ہیں جن میں سے ایک قبر صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی مدیر "آستانہ" کی ہے۔ "تربتِ فاروقی" (۱۳۸۹ء) سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

انہوں نے دوسری عالمی جنگ سے قبل انڈو جرمن دواخانہ کے نام سے ایک اشتہاری قسم کا دواخانہ کھولا تھا۔ جب دوسری جنگ میں انگریز اور جرمن ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوئے تو انہوں نے اس کا نام انڈو جینوئن دواخانہ رکھ دیا۔ ماہنامہ آستانہ کے ۴۱ صفحے اس دواخانے کے اشتہارات کے لئے وقف تھے۔ غرضیکہ انہیں پیسہ کمانے کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ دہلی کے سابق میئر نورالدین احمد بیرسٹر اور ان کی انگریز نژاد اہلیہ بھی اسی درگاہ کے احاطے میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ راقم مفتی ضیاء الحق کی معیت میں ان سے مل چکا ہے۔ اللہ بخشے مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔

نورالدین احمد کی قبر کے سرہانے جو لوح نصب ہے اس پر یہ عبارت درج ہے:

نورالدین احمد بیرسٹر دلی کے میئر

۱۹۰۲ء - ۱۹۷۳ء

مرقد معدن پاک

۱۳۹۳ھ

متوطنہ ریاض جنت

۱۹۷۳

سالِ ولادت مبارک سیر و صورت

۱۹۰۲ء

سالِ وفات اندوہ افزا پُر غم

۱۹۷۳ء

شام کے وقت درگاہ کلیم اللہ میں کافی رونق ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی قوالی کی محفل بھی جمتی ہے۔ یہ درگاہ ایک کھلے میدان میں ہے۔ اس لئے پرانے شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں رہنے والے لوگ ہوا خوری کے لئے لوگ یہاں چلے آتے ہیں۔ مزار

مبارک کے پاس ایک مارکیٹ ہے جس میں ہر طرح کے پرندے فروخت ہوتے ہیں۔

مزار نواب مرتضیٰ خان

نواب مرتضیٰ خان فرید بخاری کا شمار اکبر اور جہانگیر کے نامور امراء میں ہوتا ہے۔ اکبر نے ان کی خدمات جلیلہ سے خوش ہو کر انہیں "فرزند" کا خطاب عطا کیا اور جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد انہیں مرتضیٰ خان کا خطاب دیا تھا۔

نواب موصوف کا تعلق امراء کے اس گروہ کے ساتھ تھا جنہیں حضرت مجدد الف ثانی "جگر گوشہ ممدان دولت اسلام" کے نام سے یاد فرماتے ہیں۔ مکتوبات امام ربانی میں نواب مرتضیٰ خان کے نام دو درجن کے قریب گرامی نامے موجود ہیں۔ اسی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مجموعہ "المکاتیب والرسائل" میں ان کے نام متعدد خط محفوظ ہیں۔ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ کے مکتوبات میں بھی نواب موصوف کے نام ایک سے زائد خط موجود ہیں۔

نواب مرتضیٰ خان اس گروہ امراء کے سرخیل تھے جو اسلامی نظام حکومت کا حامی تھا اور نفاذ شریعت کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی اپنے ایک مکتوب مرغوب میں نواب صاحب کو لکھتے ہیں کہ احیائے دین کی تحریک ان ہی کے دم قدم سے چل رہی ہے۔ حضرت امام ربانی فرماتے ہیں کہ ان کی اپنی مثال تو اس بڑھیا کی سی ہے جو سوت کی ایک انٹی لے کر حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں شامل ہو گئی تھی۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ کی اس تحریر سے نواب موصوف کا مقام متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

نواب مرتضیٰ خان کی قبر شیخ محمد اکرام مرحوم، صاحب "رود کوثر" نے قیام پاکستان سے قبل دہلی میں دیکھی تھی اور ان کے لوح مزار کا کتبہ بھی نقل کیا تھا۔ میں گزشتہ سولہ برسوں سے اس قبر کی تلاش میں تھا لیکن سڑکوں کے نام بدل جانے اور نئی نئی آبادیاں بن جانے سے ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ دہلی کے بڑے بوڑھے بھی ان کے مزار کی نشاندہی نہ کر سکے بلکہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مفتی ضیاء الحق اور مولانا شاہ زید ابوالحسن نے تو مجھے اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ اب ان کی قبر مٹ چکی ہو گی

اور اس کے گرد لوہے کے جس جنگلے کی نشاندہی شیخ محمد اکرام نے کی تھی اسے کسی کباڑیے نے اکھاڑ کر فروخت کر دیا ہو گا۔ اس لئے اس قبر کی موجودگی کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔

میں ایک روز مفتی ضیاء الحق صاحب کے پاس مدرسۂ رحیمیہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ فرید آباد کے خطیب ان سے ملنے آئے۔ مفتی صاحب نے میرا ان سے یہ کہتے ہوئے تعارف کرایا کہ مجھے بھی ان کی طرح پرانے مقبرے اور تاریخی مقامات دیکھنے کا شوق ہے۔ خطیب صاحب اس پر بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ ابھی حال ہی میں انہوں نے نواب مرتضیٰ خان کی قبر دیکھی ہے۔ ان کی بات سن کر میں اپنی جگہ سے اُچھل پڑا اور ان سے کہا کہ میں تو سولہ برسوں سے اس کی تلاش میں ہوں، لیکن مجھے اس کا اتہ پتہ نہیں ملتا۔ خطیب صاحب نے فرمایا کہ ان کی مسجد کے اندر ایک قبر ہے جسے وہ نواب صاحب کی قبر سمجھتے رہے (یہ قبر دراصل میرے فاضل دوست جناب خورشید انصاری فرید آبادی کے جدِ امجد محمد اعظم پانی پتی کی ہے)۔

گزشتہ دنوں کراچی سے ہاشمی مطلبی فرید آبادی کے ایک عزیز فرید آباد آئے تو انہوں نے ان سے اس کی تصدیق کرنا چاہی تو انہوں نے بتایا کہ یہ قبر نواب مرتضیٰ خان کی نہیں ہے۔ ان کی قبر تو مالویہ نگر میں ہے۔ ان کی نشاندہی پر خطیب صاحب نے مالویہ نگر جا کر قبر تلاش کر لی۔

میرے استفسار پر خطیب صاحب نے فرمایا کہ میں کسی دن لال قلعہ سے مالویہ نگر جانے والی ۵۰۳ نمبر بس میں سوار ہو جاؤں۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ بعد یہ بس مالویہ نگر پہنچ گی۔ میں کنڈکٹر کو بتا دوں کہ وہ مجھے بیگم پور کے بس اسٹاپ پر اتار دے۔ بس سے اتر کر میں ایک چھوٹی سی بستی "سراوڑی" کا پتہ پوچھوں۔ اس بستی میں چوہدری دلیپ سنگھ کا ٹیوب ویل ہے اور اسی کے قریب ہی کھنڈروں میں نواب صاحب کی قبر ہے۔ اس پر کتبہ نصب ہے اور لوہے کا جنگلہ بھی موجود ہے۔

میں اگلے روز چوہدری دلیپ سنگھ کے ٹیوب ویل پر پہنچ گیا۔ وہاں دو تین بوڑھیاں بیٹھی تھیں۔ میں نے ان سے نواب مرتضیٰ خان کی قبر کا پتہ پوچھا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگیں۔ میں نے قبر کی بجائے مزار اور پھر مقبرے کا نام لیا لیکن وہ

خاموش رہیں۔ میں نے تنگ آکر ان سے پوچھا کہ یہاں کسی مسلمان کی سمادھی ہے؟ اس پر انہوں نے اثبات میں سرہلایا اور ایک کھنڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ اس کے پار وہ "سمادھی" موجود ہے۔ وہاں سے کھنڈر کا فاصلہ سو گز کے قریب تھا اور موسم برسات میں خودرو جھاڑیوں نے وہاں تک پہنچنے کا راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ میں نے ایک نو عمر لڑکے سے کہا کہ میں اسے کچھ رقم دے دوں گا وہ مجھے وہاں تک پہنچا دے۔ اس نے کہا کہ راستے میں سانپ کا خطرہ ہے اس لئے وہ مجھے وہاں تک نہیں لے جا سکتا۔

میں اللہ کا نام لے کر زمین پر زور زور سے پاؤں مارتا ہوا اور منہ سے شی شی کی آوازیں نکالتا ہوا بمشکل تمام اس کھنڈر تک پہنچا۔ جب میں ڈھلان کے اوپر چڑھا تو معلوم ہوا کہ میں ایک مسجد کی دوسری منزل پر کھڑا ہوں۔ میں جب گھوم کر جنوبی سمت گیا تو ایک احاطے میں چند قبریں نظر آئیں۔ ان میں لوہے کے جنگلے والی قبر سب سے نمایاں تھی اور صرف اسی پر کتبہ نصب تھا۔

میں ایک زینے کے راستے نیچے اترا اور احاطۂ قبور میں داخل ہوا۔ برسات کا موسم تھا۔ خود رو جھاڑیوں کی وجہ سے زمین پر پاؤں دھرنا محال تھا۔ میں بادل نخواستہ پختہ قبریں پھلانگتا ہوا اور مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوا نواب صاحب کی قبر تک پہنچا۔ یہاں آکر مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ لڑکا جان بوجھ کر مجھے یہاں تک نہیں لایا۔ ٹیوب ویل پر کام کرنے والے ملازمین رفع حاجت کے لئے یہاں آتے ہیں۔ گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے زمین پر بیٹھنا محال ہے۔ اس لئے وہ پختہ تعویذوں پر بیٹھ کر مزارات کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ خواجہ باقی باللہ، مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث کے ممدوح اور "جرگۂ ممدان دولت اسلام" کے سرخیل نواب مرتضیٰ خان کی قبر اب کس حال میں ہے؟ یہ اس بزرگ کی قبر ہے جس کے دم قدم سے عہد مغلیہ کے کئی مدارس اور خوانق کی رونق قائم تھی۔

نواب موصوف کی قبر کے سرہانے سنگِ مرمر کی قد آدم لوح نصب ہے۔ سنگ تراش نے حروف کھودنے کی بجائے ابھار دیئے ہیں۔ اس لئے وہ دور سے پڑھے نہیں جاتے تھے۔ میں نے نواب صاحب کے لئے دعائے مغفرت کی اور ہمت کر کے جنگلے کے اندر کود گیا۔ میں نے تعویذ پر کھڑے ہو کر بدقت تمام وہ عبارت نقل کر لی۔ وَہُوَ ہٰذا:

یااللہ

سبحان الملک الحی الذی لایموت و لایفوت، در زمان دولت حضرت عرش آشیانی جلال الدین اکبر پادشاہ غازی شیخ فرید الدین ابن سید احمد بخاری بعنایات آں حضرت ممتاز بود و در عہد عدالت نور الدین جہانگیر بادشاہ ابن اکبر پادشاہ بخطاب مرتضیٰ خانی سرفراز گردید۔ بتاریخ ۵ جلوس مطابق ۱۰۲۵ ہجری برحمت الٰہی پیوست۔

مرتضیٰ خاں چو بحق واصل شد
گشت اقلیم بقا مفتوحش
بہر تاریخ ملائک گفتند
باد پرنور الٰہی روحش

شیخ محمد اکرام مرحوم نے یہ عبارت پڑھنے میں چند غلطیاں کی تھیں۔ وہ میں نے درست کر لی ہیں۔ انہوں نے شیخ فرید الدین اور سید احمد بخاری کے درمیان "ابن" حذف کر دیا ہے۔ اسی طرح اکبر پادشاہ کو اکبر بادشاہ بنا دیا ہے۔ لوحِ مزار پر مرتضیٰ یائے معروف کے ساتھ لکھا ہے۔ انہوں نے یائے مجہول کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے "خانی" کو "خان" لکھا ہے۔ مزید براں انہوں نے "چو" کو "چون" قلم بند کیا ہے۔ (رود کوثر مطبوعہ لاہور سن ۱۹۶۹، ص ۱۸۹)۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے، جو بھارت کے نامور ماہر آثار قدیمہ ہیں، عرش آشیانی کو عرش آستانی بتایا ہے۔ ان کے خیال میں یہی صحیح ہے۔

نواب مرتضیٰ خان کا مزار تو کہنے کو "محفوظ" ہے اور محکمۂ آثارِ قدیمہ کی حفاظت میں ہے لیکن اس سے زیادہ غیر محفوظ عمارت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ ساداتِ کرام کے اس مقدس قبرستان کو رفعِ حاجت کے لئے مختص کر لیا گیا ہے اور قبروں کے تعویذ غلاظت سے اٹے پڑے ہیں۔ کاش دہلی کے باغیرت مسلمان اس کی حفاظت اور صفائی کی طرف توجہ دیں (مسلم اوقاف کی مجرمانہ چشم پوشی بھی قابلِ صد مذمت ہے) اگر سڑک پر ایک تختی لگا کر مزار کی نشاندہی کر دی جائے تو کئی بھولا بھٹکا مسلمان راہی وہاں جا کر فاتحہ پڑھ لے۔ اسی بہانے مزارات کی صفائی کا انتظام ہو جائے گا۔

اتفاق دیکھئے کہ مجھے اسی سفر کے دوران خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ میں ایک فارسی مخطوطہ مل گیا۔ اس کا عنوان "معارج الکمال" تھا اور اس پر مصنف کا نام اسمٰعیل بن شاہ عالم عبدالعزیز درج تھا۔ فاضل مصنف نواب مرتضیٰ خان کا ملازم تھا اور اس نے یہ کتاب نواب موصوف کے لئے تحریر کی تھی۔ اس کتاب کا موضوع اخلاق ہے لیکن مصنف نے آخری باب میں نواب صاحب کے ذاتی حالات قلم بند کئے ہیں۔ اس باب میں ایسا مواد بھی موجود ہے جو ذخیرۃ الخوانین اور مآثر الامراء میں نہیں ملتا۔ میں نے اس تصنیف کی اہمیت پر ایک مقالہ لکھا تھا جو ماہنامہ "قومی زبان" کراچی میں ۱۹۸۳ء میں چھپ چکا ہے۔

نواب مرتضیٰ خان کی قبر ملنے سے مجھے جو خوشی ہوئی اس کا اندازہ میرے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ میری سولہ سال کی محنت اور تجسس رائگاں نہیں گئے۔ میں نے اس قبر کا اتہ پتہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، حکیم عبدالحمید، ڈاکٹر مختار الدین احمد (آرزو) اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو دیا اور ان سے یہ درخواست کی کہ وہ محکمۂ آثارِ قدیمہ پر دباؤ ڈال کر اس کی حفاظت اور صفائی کا انتظام کریں۔

نواب مرتضیٰ خان ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔ اکبر کے آخری عہدِ حکومت میں جب شیخ مبارک، فیضی، ابوالفضل، راجہ بیربر، سلطان خواجہ، راجہ ٹوڈرمل اور بھگوان داس جیسے با اثر اور دینِ الٰہی کے حامی اُمراء اور فضلاء فوت ہوئے تو اس خلا کو پُر کرنے کے لئے مرتضیٰ خان، لالہ بیگ، عبدالرحیم خان خاناں، خان جہاں لودھی، نواب قلیج خان اور میراں صدر جہاں جیسے اسلام اور مسلمانوں کا درد رکھنے والے اُمراء آگے بڑھے۔ اکبر کی وفات پر جب ہندو راجپوتوں نے جہانگیر کے بیٹے شہزادہ خسرو کو، جو ایک راجپوت شہزادی مان بائی کے بطن سے تھا، تخت پر بٹھانے کی سازش کی، تو اس موقعہ پر نواب مرتضیٰ خان نے ان اُمراء سے مشورہ کرکے جہانگیر کو اس وعدے پر تخت پر بٹھایا کہ وہ الحاد و بے دینی کا خاتمہ کرکے شریعت کے احکام نافذ کرے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہانگیر نے تخت نشین ہوتے ہی بارہ احکام نافذ کئے جن سے مسلمانوں کو بڑی تقویت ملی۔

جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد خسرو نے بغاوت کردی اور وہ اپنے حمایتیوں کے

ساتھ لاہور کی جانب فرار ہو گیا۔ جہانگیر نے نواب مرتضیٰ خان کو اس کے تعاقب میں بھیجا اور خود بھی لاہور کی طرف روانہ ہوا۔

نواب مرتضیٰ خان جب آگرہ سے روانہ ہوئے تو اس وقت خسرو لاہور کا محاصرہ کئے پڑا تھا۔ جب خسرو کو یہ اطلاع ملی کہ نواب موصوف اپنے لشکر سمیت سلطان پور لودھی پہنچ گئے ہیں، تو وہ لاہور کا محاصرہ اٹھا کر کابل جانے کے ارادے سے راوی پار کر گیا۔

نواب مرتضیٰ خان نے اسے دریائے چناب کے کنارے بھیروں وال میں جا لیا۔ وہاں فریقین میں بڑی خون ریز جنگ ہوئی جس میں نواب صاحب کے بہت سے عزیز و اقارب کام آئے۔ نواب صاحب نے بڑی جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خسرو کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔

اسی اثنا میں جہانگیر بھی بھیروں وال پہنچ گیا۔ اس نے اس فتح کی خوشی میں نواب صاحب سے معانقہ کیا اور ان کے خیمے میں رات گزار کر ان کی عزت افزائی کی۔ جہانگیر نے فتح کی خوشی میں وہ گاؤں نواب صاحب کو بخش دیا۔ نواب صاحب کی درخواست پر جہانگیر نے اس کا نام فتح آباد رکھا۔

جہانگیر نے نواب صاحب کے منصب میں اضافہ کرکے انہیں گجرات و کاٹھیاواڑ کا گورنر مقرر کیا۔ انہوں نے احمد آباد میں ایک محلہ آباد کیا جو "بخارا" کے نام سے موسوم ہوا۔ ان کی ہمت اور کوشش سے احمد آباد میں ان کے ہم جد حضرت قطبِ عالم اور حضرت شاہ عالم کی درگاہیں آباد ہو گئیں۔ نواب صاحب نے احمد آباد میں قیام کے دوران بیس ہزار افراد فوج میں بھرتی کئے اور گجرات کے نظم و نسق کی طرف خصوصی توجہ دی۔ ان کے حسنِ انتظام سے اس علاقے میں امن و امان قائم ہو گیا۔

پانچ سال بعد ۱۶۱۰ء میں نواب صاحب کا تبادلہ لاہور ہو گیا۔ یہاں آکر انہوں نے اپنے لئے ایک حویلی تیار کرائی اور حویلی کے صحن میں ایک مسجد بنوائی جس میں موصوف نماز باجماعت ادا کیا کرتے تھے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے ایک مکتوبِ گرامی میں مسجد کی تعمیر اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے پر ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کیا۔

نواب صاحب نے لاہور میں ایک باغ لگایا جو بعد میں نواب وزیر خان کے تصرف میں آگیا۔ اس باغ میں آج کل عجائب گھر اور پنجاب پبلک لائبریری کی شاندار عمارتیں کھڑی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے عوام کی سہولت کے لئے ایک حمام بھی بنوایا تھا، جس کا اب نشان بھی نہیں ملتا۔

نواب مرتضیٰ خان نے جہانگیر کے حکم سے ۱۶۱۹ء میں کانگڑہ پر چڑھائی کی۔ اس مہم کے دوران موصوف پٹھانکوٹ میں مقیم تھے کہ انہیں پیغامِ اجل آپہنچا۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت دلی لے جاکر ان کے خاندانی قبرستان میں دفن کی گئی۔

نواب صاحب اولادِ نرینہ سے محروم رہے۔ انہوں نے صدہا یتامیٰ کی اپنے بچوں کی طرح پرورش کی۔ ان کی سرکار سے یتامیٰ اور بیوگان کے وظیفے مقرر تھے۔ انہوں نے جو کچھ کمایا راہِ خدا میں لٹا دیا۔ ان کی وفات پر ان کے خزانے سے صرف ایک ہزار اشرفیاں نکلیں۔ کسی تاریخ گو نے "داد، خورد، بُرد" (۱۰۲۵ھ) سے ان کی تاریخِ وفات نکالی ہے۔

تغلق آباد

۱۹۶۳ء میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی مُسلم یُونیورسٹی علی گڑھ سے ریٹائر ہو کر تغلق آباد، دہلی میں ہمدرد کے ایک تحقیقی ادارے سے منسلک ہو گئے۔ موسمِ گرما کی تعطیلات شروع ہوتے ہی راقم اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ دہلی روانہ ہوا۔ ہمیں امرتسر سے فلائنگ میل مل گئی۔ یہ ٹرین رات کو ساڑھے نو بجے کے قریب دہلی پہنچتی ہے۔ امرتسر سے ہمارے ڈبے میں دو فوجی آفیسر بھی سوار ہو گئے۔ ہم نے ان سے تغلق آباد کا محلِ وقوع پوچھا تو انہوں نے ہمیں یہ مشورہ دیا کہ ہم رات کے وقت وہاں نہ جائیں کیونکہ ہمارے پاس سامان بھی کافی ہے اور میری اہلیہ نے سُونے کے زیورات بھی پہنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دہلی راجدھانی ہے اس لئے وہاں جرائم پیشہ لوگ بہت رہتے ہیں۔ تغلق آباد ایک ویرانے میں واقع ہے اس لئے ٹیکسی ڈرائیور پر بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے ہمیں یہ مشورہ دیا کہ ہم رات کسی عزیز کے ہاں بسر کر لیں یا کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں۔ علاوہ ازیں ہم ان میں سے کسی ایک کا فون نمبر لے لیں اور ٹیکسی میں سوار

ہونے سے پہلے ٹیکسی کا نمبر انہیں نوٹ کروا دیں اور اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر انہیں اپنی خیریت سے مطلع کر دیں۔ ان حالات میں ہم نے رات نئی دہلی کے ایک ہوٹل میں گزاری اور صبح ناشتے کے بعد میں ذُفر کو ساتھ لے کر مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے استفسار پر میں نے عرض کیا اہلیہ اور بچے نئی دہلی میں ہیں اس لئے موصوف کسی بااعتماد ٹیکسی ڈرائیور کو تغلق آباد میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی قیام گاہ کا پتہ لکھا دیں اور وہ ہمیں وہاں پہنچا دے۔ مفتی صاحب نے ایک مسلمان ٹیکسی ڈرائیور کو پتہ لکھا کر مجھے اور ذُفر کو ٹیکسی میں بٹھا دیا۔ میں نئی دہلی سے اپنے اہلِ خانہ کو ساتھ لے کر تغلق آباد پہنچا۔ ادارے کے گیٹ پر مولانا اکبر آبادی کے فلیٹ کا نمبر دریافت کیا اور ہم وہاں پہنچ گئے۔ اسی دوران میں مفتی صاحب نے مولانا اکبر آبادی کو فون پر ہمارے آنے کی اطلاع کر دی۔ ہمارے تغلق آباد پہنچتے ہی مولانا اکبر آبادی بھی دفتر سے اُٹھ کر گھر تشریف لے آئے۔

تغلق آباد کا محلِ وقوع ایسا ہے کہ وہاں پہنچنا دشوار ہے۔ سی اسٹیشن دہلی سے ہر گھنٹے بعد ایک بس چلتی تھی جو لال قلعہ، پُرانا قلعہ، بستی حضرت نظام الدینؒ، بھوگل اور جامعہ ملیہ ہوتے ہوئے سوا گھنٹے میں بدر پور پہنچتی تھی۔ وہاں جا کر بس دس پندرہ منٹ کے لئے رُکتی تھی اور مسافر چائے پینے کے لئے بس سے اتر جاتے تھے۔ وہاں مسلم آبادی نظر نہیں آتی لیکن پرانے وقتوں کی ایک مسجد سڑک کے کنارے موجود ہے۔ بدر پور سے ایک سڑک فرید آباد، متھرا ہوتی ہوئی آگرہ چلی جاتی ہے اور دوسری سڑک مہرولی کو جاتی ہے۔ اسی سڑک پر چوتھے میل پر ہمدرد کا تحقیقی ادارہ ہے جو اب یونیورسٹی بن گیا ہے۔

ہمدرد دواخانہ دہلی کے متوَلی جناب محترم حکیم عبدالحمید صاحب نے بہت عرصہ پہلے یہاں ساٹھ ایکڑ زمین خرید لی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے یہاں انسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ کے نام سے ایک عظیم ادارہ قائم کیا۔ پچھلے وقتوں میں اس کی تعمیر پر ۸۵ لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ حکیم صاحب نے پنڈت جواہر لعل نہرو (م ۱۹۶۴ء) وزیرِ اعظم بھارت کے ہاتھوں اس کا افتتاح کروایا تھا۔ اس ادارے میں ایلوپیتھی، طبِ یونانی اور آیور ویدک کے تعاون اور اشتراک سے طب پر تحقیق کی جاتی ہے۔ جڑی بوٹیوں کے خواص جدید طریقے سے معلوم کر کے چوہوں پر ان کے تجربات کئے جاتے ہیں۔

اس ادارے کے اندر ایک عجائب گھر بھی ہے جہاں ابن الہیثم، بو علی سینا، زکریا رازی اور علی بن ربن طبری جیسے نامور اطباء کی تصویریں، ان کی تصانیف اور ان کے حالات پر مشتمل کتابیں موجود ہیں۔ آیور ویدک کے شعبے میں مشہور وید چرک کی تصویر اور اس کے بارے میں مواد موجود ہے۔ حکیم صاحب نے اس ادارے میں طبی کتب پر مشتمل ایک شاندار لائبریری قائم کی ہے۔ جن دنوں راقم وہاں موجود تھا، حیدر آباد دکن کے نامور طبیب حکیم عبدالوحاب قمھوری عربی، بان میں لکھی جانے والی کتابوں کے اردو میں ترجمے کرنے پر مامور تھے۔ مولانا عبدالشکور مجذوبی لکھنوی کے پوتے عبدالحی فاروقی بھی اسی شعبے سے منسلک تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا تقرر بھی اس شعبے میں ہوا تھا۔

اس ادارے سے قریب ہی ہمدرد کالج آف فارمیسی کی شاندار عمارت تھی۔ یہ کالج دہلی یونیورسٹی سے منسلک تھا اور وہاں دور دور سے طلب حصول تعلیم کے لئے آتے تھے۔ اسی کمپاؤنڈ میں حکیم صاحب نے بھارتی پارلیمنٹ کی طرز پر ایک گول عمارت تعمیر کی تھی۔ اس میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ قائم تھا۔ اس عمارت میں چار لاکھ کتابیں رکھنے کی گنجائش تھی اور آٹھ علمی شعبے اس ریسرچ سنٹر سے منسلک تھے جن میں اسلامی اقتصادیات کا شعبہ قابل ذکر ہے۔ اُن دنوں ڈاکٹر اوصاف علی اس انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ تھے۔ وہ متعدد بین الاقوامی اسلامی کانفرنسوں میں بھارت اور ہمدرد کی نمائندگی کر چکے ہیں۔

حکیم عبدالحمید صاحب ہر جمعہ کے روز، بعد نماز جمعہ، تغلق آباد تشریف لاتے اور تمام اداروں کی کارکردگی ملاحظہ فرماتے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں تغلق آباد آیا ہوا ہوں تو موصوف مولانا اکبر آبادی کے فلیٹ میں مجھے دیکھنے آئے۔ انہوں نے ادارے کے سٹیٹ آفیسر ابنار حسن سے کہا کہ وہ مجھے ایک فرنشڈ فلیٹ الاٹ کر دیں تاکہ میں جب تک یہاں رہوں، اس میں قیام کروں۔ ذکر کو ان دنوں بھوک کم لگتی تھی۔ میری اہلیہ نے حکیم صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے اگلے روز معجون فواکہ بھجوا دی۔ میں پاکستان سے آلو بخاروں کا ایک کریٹ لے گیا تھا۔ میں نے ایک پلیٹ بھر کر آلو بخارے حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کئے۔ انہوں نے صرف ایک آلو بخارا اٹھایا اور فرمایا کہ ایک سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے اور یہ بھی رات کو کھاؤں گا۔ مولانا سعید

احمد اکبر آبادی فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے "مرتاض" کی اصطلاح پڑھی تھی لیکن عملاً حکیم عبدالحمید صاحب اور حکیم محمد سعید صاحب کو مرتاض پایا ہے۔ جمعہ کی شام کو حکیم صاحب ادارے کی کارکردگی دیکھ کر سورج کنڈ چلے جاتے۔ وہاں ان کا ایک بنگلہ تھا جس کا علم ان کے ڈرائیور کے سوا کسی کو نہ تھا۔ حکیم صاحب چوبیس گھنٹے تنہائی میں گزارتے اور اگلے روز ڈرائیور جا کر انہیں لے آتا۔ اس دوران میں حکیم صاحب مختلف سکیموں پر غور کرتے اور مستقبل کے لئے منصوبے بناتے۔

تغلق آباد میں نماز جمعہ کا انتظام نہ تھا اس لئے ہم ایک قریبی بستی مدن گیر جا کر جمعہ ادا کرتے تھے۔ نماز سے قبل ایک بس تغلق آباد سے مدن گیر جاتی اور نماز جمعہ وہاں ادا کر کے ہم اسی بس میں واپس تغلق آباد آجاتے۔ تغلق آباد سے مہرولی اندازاً چار میل تھی۔ راقم کئی بار تغلق آباد سے مہرولی جا کر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی کے مزار پر انوار پر حاضر ہوا۔ مہرولی سے ایک بس "چراغ دلی" کے راستے دہلی کی طرف جاتی ہے۔ دو تین بار میں چراغ دلی جا کر حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے مزار مبارک پر بھی حاضر ہوا۔

تغلق آباد میں ہمدرد کے کمپلیکس سے قریب ہی تغلق آباد کا قلعہ تھا۔ قلعے اور کمپلیکس کے درمیان سے ایک سڑک گزرتی ہے جو ہندوؤں کے مشہور مندر کالکا جی جاتی ہے۔ اب اس نام سے ایک آبادی بھی وجود میں آگئی ہے۔ یہ قلعہ بے آباد ہے۔ اس کی فصیل اور برج موجود ہیں۔ سنا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ نے قلعہ کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد فرمایا تھا: "یا رہے اُجڑ یا بسے گوجر"۔ اس قلعے کے کھنڈروں میں گیدڑ رہتے ہیں، جو رات کے وقت باہر آکر چلاتے ہیں۔ شام کے وقت قلعے کی فصیل پر مور آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہاں بندر بھی کافی تعداد میں رہتے ہیں۔ جب کوئی بس ادھر سے گزرتی ہے تو ڈرائیور ایک خاص انداز میں ہارن بجاتا ہے تو بندر بھاگ کر سڑک پر آجاتے ہیں۔ ہندو مسافر انہیں گاجریں، چنے اور روٹیاں کھلاتے ہیں۔

اس قلعہ کے بالمقابل سلطان غیاث الدین تغلق (م ۱۳۲۵ء) کا مقبرہ ہے۔ مقبرے کے گرد قلعہ نما فصیل ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے ایک چوکیدار وہاں موجود رہتا ہے۔ یہ مقبرہ ایک جھیل کے وسط میں بنایا گیا تھا۔ سڑک سے مقبرے تک

ایک محراب دار پل تاحال موجود ہے۔ وہ جھیل تو اب ختم ہو گئی ہے اور وہاں کاشتکار فصلیں اگاتے ہیں۔ شام کے وقت اس پل پر بندر آکر بیٹھ جاتے تھے۔ بندریا عموماً جون میں بچہ جنتی ہے۔ جب ہم وہاں گئے تو بچے بہت چھوٹے تھے اور وہ عموماً اپنی ماؤں کی کمر پر سوار ہوتے یا پیٹ سے چپٹے رہتے۔ میں شام کو اپنے بچوں کو ساتھ لے کر انہیں یہ تماشا دکھانے لے جاتا۔

فصیل کے اندر غیاث الدین تغلق کا سنگِ سرخ کا بنا ہوا مقبرہ ہے لیکن اس کا گنبد سنگِ مرمر سے بنایا گیا ہے۔ مقبرے کی دیواریں قائداعظم کے مقبرے کی طرح ڈھلوان ہیں۔ ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحب کا یہ کہنا ہے کہ قائداعظم کا مقبرہ، تغلق طرزِ تعمیر کی غمازی کرتا ہے۔ تغلقوں نے یہ طرزِ تعمیر اغلباً سامانیوں سے لیا ہے کیونکہ اسمٰعیل سامانی (م ۹۰۷ء) کا مقبرہ اسی طرز پر تعمیر ہوا تھا۔ غیاث الدین تغلق کی قبر سے جانب مشرق اس کی اہلیہ کا مزار ہے جو مخدومۂ جہاں کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کے پہلو میں محمد بن تغلق (م ۱۳۵۱ء) کی آخری آرام گاہ ہے۔ اس کا انتقال سندھ میں ایک باغی طغی کا تعاقب کرتے ہوئے ہوا تھا۔ سندھ میں بھی ایک مقبرہ اس کے نام سے موسوم ہے۔ مؤرخین کا یہ کہنا ہے کہ اسے امانتاً سندھ میں دفن کیا گیا تھا بعد ازاں اس کا تابوت دہلی منتقل کر دیا گیا۔ تغلق آباد میں قیام کے زمانے میں راقم ہر روز نمازِ عصر کے بعد اپنے بچوں کو ساتھ لے کر غیاث الدین تغلق کے مقبرے پر جایا کرتا تھا۔

تغلق آباد اور بدر پور کے درمیان ایک چھوٹا سا قلعہ آتا ہے جو "عادل آباد" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ قلعہ سلطان محمد بن تغلق کا تعمیر کردہ ہے۔ اسے السلطان العادل کہلانے کا بڑا شوق تھا۔ یہ قلعہ اس نے اسی مناسبت سے بنوایا تھا۔ اس کے ایک ہم عصر عالم شہاب الدین "حق گو" کے لقب سے ملقب ہیں۔ ایک بار سلطان نے ان سے کہا کہ وہ اسے عادل کہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ ظالم کو عادل نہیں کہہ سکتے۔ اس پر سلطان نے حکم دیا کہ انہیں قلعے کی فصیل پر کھڑا کرکے نیچے گرا دیں۔ اسی صدمے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ شیخ عبدالحق محدثؒ (م ۱۶۴۲ء) کے عہد تک ان کی قبر قلعہ کے نیچے موجود تھی۔

ایک دن مولانا سعید احمد اکبر آبادی کسی میٹنگ میں شرکت کی غرض سے جامعہ

ملّیہ جانے لگے تو راقم بھی ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ جامعہ ملّیہ اوکھلا میں دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے۔ یہاں منتقل ہونے سے قبل جامعہ قرول باغ میں تھی۔ جب طلبہ کی تعداد بڑھی تو جامعہ اوکھلا میں منتقل کر دی گئی۔ مولانا اکبر آبادی تو وائس چانسلر مسعود حسن سے ملنے چلے گئے اور مجھے عبداللطیف اعظمی کے سپرد کر گئے۔ اعظمی صاحب سب سے پہلے مجھے جامعہ کالج کے پرنسپل ضیاء الحسن فاروقی سے ملانے لے گئے۔ اس ملاقات کا ذکر اسی کتاب میں دیوبند کے جشن صد سالہ کے ضمن میں آگیا ہے۔ ضیاء الحسن فاروقی سے مل کر میں شعبۂ تاریخ میں گیا۔ وہاں میرے جاننے والوں میں محمود صاحب تھے۔ موصوف کسی زمانے میں گورو نانک دیو یونیورسٹی امرتسر کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ تھے بعد ازاں وہ جامعہ سے منسلک ہو گئے تھے۔ ان کے ساتھ کئی سال بعد ملاقات ہوئی تو مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ جامعہ کا شعبۂ اُردو بھی بڑا جاندار ہے۔ مشہور اسکالر گوپی چند نارنگ شعبۂ اُردو کے سربراہ تھے۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ بھکر کے رہنے والے ہیں اور ان کی مادری زبان سرائیکی ہے۔ ان کی برادری کے بہت سے افراد پانی پت میں آباد ہو گئے ہیں۔ میں نے پانی پت کے سفر کے دوران وہاں بھکر دری ہاؤس، لیہ دری ہاؤس اور کلور کوٹ دری ورکس کے بورڈ لگے ہوئے دیکھے ہیں۔

بھارت کے سابق صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خان (م ۱۹۶۹ء) کا مقبرہ جامعہ ملّیہ میں تعمیر کیا گیا ہے۔ مقبرے کی عمارت قابلِ دید ہے۔ مقبرے سے ملحق ایک عجائب گھر بھی بنایا گیا ہے جہاں ڈاکٹر صاحب کی اسناد، ان کا ڈاکٹریٹ کا گاؤن، ان کی اعزازی ڈگریاں، کتابیں، فرنیچر اور لباس نمائش کے لئے رکھے گئے ہیں۔ غیر ملکی سرکاری دوروں کے مواقع پر انہیں جو تحائف ملے تھے، وہ بھی عجائب گھر کی زینت بن گئے ہیں۔

جامعہ ملّیہ کا ٹیچر ٹریننگ کالج آزادی سے پہلے ہی بامِ عروج تک پہنچ چکا تھا۔ اسے بنانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین خان کے علاوہ چوہدری عبدالغفور (م ۱۹۸۶ء) کا بھی بڑا دخل ہے۔ جامعہ ملّیہ کو بنانے والوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین خان (م ۱۹۶۹ء) کے علاوہ ڈاکٹر سیّد عابد حسین (م ۱۹۷۸ء) اور ڈاکٹر محمد مجیب (م ۱۹۸۵ء) کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

جامعہ ملّیہ کا قبرستان میرے نزدیک بڑا اہم ہے۔ وہاں بھارت کے نامور علماء و فضلاء محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر سیّد عابد حسین کے لوحِ مزار پر یہ عبارت

کندہ ہے:

سیّد عابد حُسین

ولادت ۳ صفر ۱۳۱۳ھ مطابق ۲۷ جنوری ۱۸۹۶ء

وفات ۱۲ محرم ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۷۸ء

۷۸۶

۹۲

۱۱۰

دانشور عالی دماغ دوران   آن خلد نشین شد

۱۹۷۸ء   ۱۳۹۹ھ

قطعہ

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
وہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
مرنے والوں کی جبین روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں
(اقبال)

ان کی عالمہ و فاضلہ رفیقۂ حیات صالحہ عابد حسین ۸ جنوری ۱۹۸۸ء کو انتقال کر گئی تھیں۔ انہیں بھی ان کے شوہر نامدار کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین کی آخری آرام گاہ سے قریب جامعہ کے سرپرست اور مشہور سیاسی رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کا انتقال دہرہ دون سے دہلی جاتے ہوئے ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء کو ٹرین میں ہوا تھا۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

کل من علیھا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

ولادت   وفات

۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۰ء   ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء

یٰلیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی و جعلنی من المکرمین

ڈاکٹر انصاری مرحوم کی ابدی آرام گاہ سے قریب ہی مشہور کمیونسٹ سید سجاد ظہیر کی قبر ہے۔ وہ راولپنڈی سازش کیس میں ملوث تھے۔ ان کی قبر کے سرہانے جو لوح نصب ہے، اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

مرقد

سید سجاد ظہیر

ولادت   ۵ نومبر ۱۹۰۵ء

وفات   ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی تو کوئی بات نہیں

سید سجاد ظہیر کی قبر سے قریب ہی ان کی عالمہ و فاضلہ رفیقۂ حیات رضیہ کی قبر ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

مرقد

رضیہ سجاد ظہیر

ولادت ۱۵ فروری ۱۹۱۷ء

وفات ۱۸ دسمبر ۱۹۷۹ء

اسی احاطے میں مشہور ماہرِ تعلیم خواجہ غلام السیدین کی آخری آرام گاہ ہے۔ ان کی قبر کے سرہانے جو لوح نصب ہے، اس پر یہ عبارت منقوش ہے:

۷۸۶

اناللہ و انا الیہ راجعون

خواجہ غلام السیدین خلف خواجہ غلام الثقلین

ولادت ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۴ء

وفات ۲۹ دسمبر ۱۹۷۱ء

خواجہ صاحب کے مزار سے قریب ہی محمد شفیع الدین نیر کی ابدی آرام گاہ ہے۔

ان کا مختصر سا تعارف ان کے لوحِ مزار پر درج ہے:

محمد شفیع الدین نیر

ولد حکیم الدین

بچوں کے شاعر اور ادیب

ولادت ۳ فروری ۱۹۰۳ء منگل مطابق ۵ ذی قعدہ ۱۳۲۰ھ

وفات ۳۰ جنوری ۱۹۷۸ء پیر مطابق ۲۰ صفر ۱۳۹۸ھ

اسی قبرستان میں ہمایوں کبیر (م ۱۹۶۹ء) ڈاکٹر یوسف حسین خان (م ۱۹۷۹ء) محمد اسلم جیراجپوری (م ۱۹۵۵ء) سید حسن ظہیر (م ۱۹۸۰ء) ریحانہ طیب جی (م ۱۹۷۵ء)، پروفیسر ڈاکٹر نور الحسن (م ۱۹۹۳ء)، شفیق الرحمٰن قدوائی (م ۱۹۵۳ء) کوثر چاند پوری (م ۱۹۹۰ء)، ڈاکٹر مشیر الحق (م ۱۹۹۰ء)، نائب حسین نقوی (م ۱۹۷۹ء)، ڈاکٹر سیف الدین کچلو (م ۱۹۶۳ء) اور میرزا محمود بیگ (م ۱۹۷۵ء) مدفون ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی وفات کے بعد جامعہ ملیہ میں ایک شاندار مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ اس سے قبل جامعہ والے ایک ہال میں نماز اور جمعہ ادا کیا کرتے تھے۔ جب ڈاکر صاحب کا مقبرہ تعمیر ہوا تو اس سے قریب مسجد بھی بنائی گئی۔ جامعہ کے دوسرے دورے میں راقم نے اس مسجد میں تبلیغی جماعت کا اجتماع بھی دیکھا تھا۔ تبلیغی جماعت کی وجہ سے اس مسجد میں رونق رہنے لگی ہے ورنہ جامعہ ملیہ کے کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کو ان باتوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

قدم شریف

سلطان فیروز شاہ تغلق (م ۱۳۸۸ء) کا ولی عہد شہزادہ فتح خان اپنے والد کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ فیروز تغلق نے زرد رنگ کے پتھروں سے اس کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ مقبرے کی عمارت اتنی وسیع ہے کہ جب مخدوم جہانیاں سید جلال الدین جہانگشت بخاری (م ۱۳۸۳ء) اُچہ سے دہلی تشریف لاتے تو موصوف یہیں قیام فرماتے تھے۔ اب بھی اس عمارت میں اتنی گنجائش ہے کہ وہاں دینی مدرسہ کھل سکتا ہے۔

شہزادہ فتح خان اپنے والد کا بڑا لاڈلا بیٹا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد سلطان فیروز

تغلق نے اس کی یاد میں سکے ڈھلوائے۔ سلطان فیروز تغلق کے عہد میں حجاز مقدس سے ایک پتھر آیا جس پر قدمِ رسول ﷺ کا نشان تھا۔ سلطان نے اس پتھر کو اپنے چہیتے بیٹے کی قبر پر نصب کروا دیا۔ وہاں ایسے نشانات موجود ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ معتقدین اس پتھر کو دُھو کر اس کا دھوون پیا کرتے تھے۔ یہ مقدس پتھر ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں بلوائیوں نے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ اب وہاں یہ پتھر موجود نہیں ہے۔

مغلوں کے عہد میں لوگ قدم شریف کے نواح میں دفن ہونا اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے تھے۔ متاخر مغلوں کے دَور میں نواب روشن الدولہ (م ۱۷۳۶ء)، جو حضرت میراں بھیکؒ (م ۱۷۱۸ء) کے غالی مرید تھے، یہیں دفنائے گئے تھے۔ شاہ عبد العزیز محدث نے ان کی قبر بارہا دیکھی تھی۔ اس پر سبز رنگ کی چادر پڑی رہتی تھی جس پر اللہ، محمد، بھیکہ منقوش تھا۔ اب یہ قبر موجود نہیں ہے۔ قدم شریف سے باہر درجنوں قبروں کے تعویذ اکھڑے پڑے ہیں۔ خدا جانے ان میں کتنے یادگارِ زمانہ لوگ ہوں گے جن کے دم قدم سے دِلّی کی رونق قائم تھی۔ اسی نواح میں میر کلو کے بجے میں خاقانی ہند اُستاد شیخ محمد ابراہیم ذوق (م ۱۸۵۴ء) کی آخری آرام گاہ تھی۔ چند سال قبل اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ذوق کی قبر مسمار کر کے وہاں دہلی میونسپلٹی نے "فلتھ ڈپو" تعمیر کر دیا ہے، جہاں لوگ کوڑا کرکٹ پھینک جاتے ہیں۔ یہیں کہیں مشہور شاعر امام بخش صہبائی دہلوی (م ۱۸۵۷ء) کی آخری آرامگاہ تھی۔ موصوف صہبائی اور شاہ نصیر کے شاگردِ رشید تھے۔ اُستاد داغ (م ۱۹۰۵ء) کے والد نواب شمس الدین احمد خان والیٔ فیروز پور جھرکہ کو ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو ولیم فریزر کے قتل کے جُرم میں پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ ان کا جسدِ خاکی قدم شریف میں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ اسی طرح نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں کے فرزند مرزا شہاب الدین احمد خان ثاقب (م ۱۸۶۹ء) کو بھی ان کے پہلو میں دفنایا گیا تھا۔ مرزا ممتاز الدین احمد خان المتخلص بہ مائل دہلوی (م ۱۸۹۲ء) کو ایک روایت کے مطابق اُستاد داغ دہلوی سے تلمذ تھا۔ انہیں قدم شریف میں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ اسی طرح شاہ نصیر (م ۱۸۳۸ء) کے شاگردِ رشید میر شجاعت علی المتخلص بہ تسلی دہلوی (م ۱۸۵۷ء) کا جسدِ خاکی قدم شریف میں دفنایا گیا تھا۔ غالب کے ہم عصروں میں قطب الدین "مشیر" کے شاگرد شاہ نجم الدین صغیر دہلوی (م ۱۸۶۰ء) کی ابدی آرام گاہ اسی جگہ تھی۔

اب ان کی قبروں کا نشان بھی نہیں ملتا۔ رہے نام اللہ کا۔

قدم شریف کی عمارت بھی بڑی خستہ حالت میں ہے۔ بھارت کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کو عہدِ سلطنت کی اس عمارت کی مناسب طریقے سے دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ وہاں کا متولی قیامِ پاکستان کے بعد کراچی چلا گیا تھا لیکن اس کا ایک بیٹا وہاں سکونت پذیر ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل یہ مسلم اکثریت کا محلّہ تھا۔ جب دہلی میں وسیع پیمانے پر فسادات ہوئے تو یہاں کی مسلم آبادی پاکستان چلی گئی اور پاکستان سے بھارت جانے والے ہندو اور سکھ شرنارتھی اس محلّے میں آباد ہو گئے۔ اس کے باوجود یہ محلّہ اب بھی "محلّہ نبی کریمؐ" کے نام سے موسوم ہے۔

مجھے دہلی میں مولوی محرّم علی چشتی لاہوری (م ۱۹۳۳ء) کی قبر کی تلاش تھی۔ تذکروں میں صرف اس قدر مرقوم ہے کہ ان کی قبر مستان شاہ کابلی کی درگاہ میں ہے۔ اب دہلی میں مستان شاہ کابلی کو کوئی نہیں جانتا۔ قدیم دہلی کو جاننے والے دو ہی بزرگ تھے، شاہ زید ابوالحسن اور علامہ اخلاق حسین دہلوی۔ راقم نے علامہ صاحب سے مستان شاہ کابلی کی درگاہ کا اتہ پتہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ موصوف قیامِ پاکستان کے بعد اس علاقے میں نہیں گئے۔ نوعمری میں وہ ایک بار اپنے والد بزرگوار کے ساتھ قدم شریف جاتے ہوئے مستان شاہ کابلی کی درگاہ کے پاس سے گزرے تھے۔ انہوں نے راقم کو بتایا کہ قدم شریف کی عمارت ایک قلعہ کے اندر ہے۔ میں قلعے کے صدر دروازے سے آگے بڑھوں تو ایک اور دروازہ آئے گا۔ اس دروازے سے گزرتے ہی بائیں ہاتھ مستان شاہ کابلی کی درگاہ ہے۔

میں اگلے روز وہاں گیا تو میں نے دیکھا کہ دوسرے دروازے کے دونوں جانب مکانات بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر مکانات نئے ہیں۔ ان مکانوں کے باہر جن سفید پتھروں پر مالکانِ مکانات کے نام لکھے ہوئے ہیں، وہ یقیناً قبروں کی الواح کے ٹکڑے ہیں۔ مجھے وہاں کوئی درگاہ نظر نہیں آئی۔ اس محلّے میں ایک مسلمان درزی اپنی دکان میں بیٹھا اپنے کام میں معروف تھا۔ میں نے اس سے مستان شاہ کابلی کی درگاہ کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ درزی نے مجھے قدم شریف کے متولی سے رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے قدم شریف کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک

بچہ باہر نکلا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی بڑے بزرگ کو باہر بھیجے۔ تھوڑی دیر بعد اس کا والد باہر آیا۔ میں نے اس سے مستان شاہ کابلی کی درگاہ کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے کہا کہ اس کے والد ان چیزوں سے واقف تھے وہ کراچی جا چکے ہیں، اس لئے وہ کچھ بتانے سے قاصر ہے۔ اس نے کہا کہ میں برابر والے محلّے میں اس درگاہ کے بارے میں استفسار کروں۔ میں اس کی ہدایت پر برابر والے محلّے میں گیا تو وہاں کے ساکنوں نے مجھے بتایا کہ اس محلّے میں کوئی درگاہ نہیں ہے۔ میں دوبارہ اس درزی کے پاس آیا تو اس نے ایک مکان کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ وہاں ایک معمّر خاتون رہتی ہے جو اسی محلّے میں پیدا ہوئی تھی اور یہیں بیاہی گئی تھی۔ وہ میری مدد کر سکتی ہے۔

درزی کی نشاندہی پر میں نے اس خاتون کو تلاش کر لیا۔ جب میں نے اس سے مستان شاہ کابلی کی درگاہ کے بارے میں سوال کیا تو اس نے مجھ سے پوچھا "چشتی کی قبر ڈھونڈ رہے ہو"۔ میں نے اثبات میں جواب دیا اور مجھے اس پر خوشی ہوئی کہ میری مشکل حل ہونے والی ہے۔ بڑی بی مجھے لے کر ایک مکان تک گئی۔ وہ مکان گلی کی سطح سے تین چار فٹ بلند تھا اور مالک مکان کی نو دس سالہ بیٹی دروازے میں کھڑی تھی۔ بڑی بی نے مجھے بتایا کہ یہ مکان اس تہ خانے کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے جس میں مستان شاہ کابلی مدفون ہیں۔ جہاں مکان کے صحن تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں بنائی گئی ہیں، وہیں اس تہ خانے تک جانے کا راستہ تھا۔ بڑی بی نے مجھے بتایا کہ "چشتی کو میرے سامنے یہاں لٹایا گیا تھا"۔ بڑی بی کی اس وضاحت کے بعد میری کامل تشفی ہو گئی کہ چشتی اس مکان کے نیچے ابدی نیند سو رہا ہے۔ حالی نے ایسے ہی موقع پر کہا تھا:

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیّاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

مولوی محرّم علی چشتی، مولوی نور احمد صاحبِ "تحقیقاتِ چشتی" کا بھائی اور مولوی احمد بخش یکدل کا فرزند تھا۔ وہ سرسیّد احمد خاں رحمۃ اللہ کے مخالفین کی صفِ اوّل میں شامل تھا۔ اس نے لاہور سے "رفیقِ ہند" کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا جو سرسیّد احمد خاں کے خلاف مضامین چھاپنے کے لئے بدنام تھا۔

مولوی محرم علی چشتی، مستان شاہ کابلی کا مرید اور داماد تھا۔ اس نے یہ وصیت کی تھی کہ اس کا جسدِ خاکی اس کے شیخِ طریقت کے پہلو میں سپردِ خاک کیا جائے۔ مولوی صاحب کا انتقال ۱۸ دسمبر ۱۹۳۳ء کو لاہور میں ہوا تو اس کی میت راتوں رات دہلی لے جا کر اس کی وصیت کے مطابق اس کے شیخِ طریقت کی درگاہ میں سپردِ خاک کی گئی۔ بڑی بی کے بقول - چشتی کو میرے سامنے یہاں لٹایا گیا تھا۔

مولوی محرم علی چشتی کے بعد اس کے فرزند مولوی ابراہیم علی چشتی (م ۱۹۶۸ء) نے اس کے مشن کو جاری رکھا۔ مؤخر الذکر نے تجرّد کی زندگی بسر کی اس لئے اس کا مشن اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

یہاں صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ بسا اوقات ایک ایک مزار کی تلاش کے لئے کتنی کھکھیڑ کرنا پڑتی ہے۔ جن حضرات نے چشتی خاندان کی علمی و ادبی خدمات پر پی ایچ ڈی کے لئے مقالے لکھے ہیں انہوں نے بھی محرم علی چشتی کی قبر کی تلاش کے لئے اتنی کھکھیڑ نہیں کی۔ ایسے کام ہمت کی بجائے جنون سے انجام پاتے ہیں۔

درگاہ خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ

قدم شریف سے قریب ہی قطب روڈ پر حضرت خواجہ باقی باللہ فانی فی اللہ رحمۃ اللہ کی درگاہ مرجع خلائق ہے۔ آزادی کے بعد قبضہ گروپ نے درگاہ سے ملحقہ قبرستان پر قبضہ کرکے بہت سی قبروں کو صاف کر دیا۔ اب چند سال ہوئے کہ درگاہ کمیٹی نے چار دیواری تعمیر کرکے بچے کھچے قبرستان کو بچا لیا ہے۔

درگاہ کے صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی حافظ غلام رسول ویراں (م ۱۸۸۷ء) کی قبر نظر آتی ہے۔ چند سال پہلے تک اس پر کتبہ نصب تھا، جو اب غائب ہو گیا ہے۔ ہماری اگلی نسل کو یہ بھی معلوم نہ ہو گا کہ یہ ویراں کی ابدی آرام گاہ ہے۔ مالک رام لکھتے ہیں کہ ویران، ذوق کے شاگرد تھے۔ شاگرد ہی نہیں، عاشق تھے۔ کیا مجال جو ان کی موجودگی میں کوئی استاد کے خلاف کچھ کہہ جائے۔ زبان ہی تک نہیں لاٹھی سے بھی اس کی خبر لینے سے نہیں چوکتے تھے۔ قدرت بڑی منصف مزاج ہے۔ اگر کہیں ایک طرف کمی رہ جاتی ہے تو اس کی کسر کہیں اور سے پوری کر دیتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔

ویران نابینا تھے مگر بلا کے ذہین اور حافظے کا کیا کہنا۔ قرآن حفظ تھا، ہزاروں شعر نوکِ زبان تھے۔ کسی نے کوئی اعتراض کیا اور انہوں نے ترت سے سند میں کسی اُستاد کا شعر پڑھا جیسے اعتراض کے انتظار ہی میں تو بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی وفات سے دو سال پہلے اپنی تاریخ وفات "خاک شدہ خواجہ" (۱۳۰۵ھ) سے نکالی تھی۔ ان کے لوحِ مزار پر ان کا یہ شعر ۱۹۶۷ء تک موجود تھا:

فاتحہ مرقدِ ویراں پہ بھی پڑھتے جانا
ان سے کہہ دو جو ہیں اس رہ سے گذرنے والے

ان کے اس شعر کو قبولِ عام کا درجہ ملا اور لوگوں نے اسے اپنے اعزاء کی قبروں کے کتبوں پر لکھوانا شروع کر دیا۔

ویران مرحوم کی قبر سے آگے بڑھیں تو دائیں ہاتھ سیّد وحید الدین احمد المتخلص بہ بیخود دہلوی کی ابدی آرام گاہ ہے۔ لوحِ مزار پر صرف یہ مختصر سی عبارت کندہ ہے:

بیخود دہلوی

۱۸۶۳ء — ۱۹۵۵ء

بیخود، اُستاد داغ دہلوی (م ۱۹۰۵ء) کے محبوب شاگرد تھے۔ وہ داغ کے جانشین سمجھے جاتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر (م ۱۸۶۲ء) کے پوتے مرزا خورشید عالم (م ۱۹۴۳ء) نے داغ کی وفات کے بعد بیخود کے سر پر پگڑی بندھوا کر اسے داغ کا جانشین بنا دیا مگر داغ کے "داماد" نواب سراج الدین احمد خان سائل بھلا انہیں کب خاطر میں لاتے تھے۔ ان دونوں حضرات نے مشاعروں میں اُلجھنا اپنا شعار بنا لیا تھا اور بقول شاہد احمد دہلوی، دلّی کے مشاعرے، اکھاڑے اور دنگل بن گئے اور وہ بیہودگی پھیلی کہ بھلے آدمیوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا۔ بیخود دہلوی کی قبر سے قریب ہی ان کے شاگرد مخمور دہلوی (م ۱۹۵۶ء) کی ابدی آرامگاہ ہے۔ افسوس کہ وہ اپنے اُستاد کی وفات کے صرف ایک سال بعد انتقال کر گئے اس لئے انہیں وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔

بیخود کی قبر سے قریب ہی درگاہ شریف کی مسجد کا دروازہ ہے۔ اس مسجد سے گزر کر ہی حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ کے مزارِ مبارک تک پہنچتے ہیں۔ جب راقم پہلی بار دہلی آیا تو حضرت کا مزار کھلے آسمان کے نیچے ایک چبوترے پر تھا جس کے گرد سنگ

مرمر کا حجرہ بنا ہوا تھا۔ اب درگاہ کمیٹی نے مزار شریف پر بارہ دری بنوا دی ہے۔

خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے مؤسس ہیں۔ موصوف مغل فرمانروا اکبر کے آخری دورِ حکومت میں کابل سے دہلی تشریف لائے اور کوٹلہ فیروز شاہ میں فروکش ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب اکبر کے بیدین مصاحب ایک ایک کرکے راہیِ ملکِ بقاء ہو گئے تھے اور اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے نواب مرتضیٰ خان فرید بخاری، عبدالرحیم خانخاناں، لالہ بیگ، خان قلیچ خاں اندجانی اور میراں صدر جہاں جیسے دیندار امراء آگے بڑھے تھے۔ خواجہ صاحب نے انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور ان کے جانشین حضرت امامِ ربانی مجدّد الفِ ثانیؒ نے انہیں "جرگۂ ہمدرانِ دولتِ اسلام" کا نام دیا۔ خواجہ صاحب کا قیام دہلی میں چار سال سے زائد نہیں رہا۔ انہوں نے ۱۶۰۳ء میں صرف چالیس سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبّیک کہا لیکن یہاں تحریک احیائے دین کی داغ بیل ڈال گئے۔

دہلی کے عوام ان کے مزارِ پُر انوار کے قریب دفن ہونا باعثِ سعادت سمجھتے تھے اسی لئے وہاں بڑے بڑے نامور اصحاب محوِ خوابِ ابدی ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کے اُستاد مُلّا احمد جیون (م ۱۷۱۷ء) صاحبِ "تفسیرِ احمدی" کو خواجہ صاحب کے قدموں میں امانتاً دفن کیا گیا تھا۔ بعد ازاں ان کے لواحقین ان کا تابوت نکال کر امیٹھی لے گئے۔ راقم نے امیٹھی کے سفر میں ان کے مزار کی زیارت کی ہے۔ خواجہ صاحب کی درگاہ میں ان کی قبر کا نشان ہنوز باقی ہے۔

مُلّا احمد جیون کی عارضی قبر سے متصل خواجہ باقی باللہ کے چھوٹے بیٹے خواجہ عبداللہ المعروف بہ خواجہ خوردؒ کی ابدی آرام گاہ ہے۔ جب ان کے والدِ محترم کا انتقال ہوا تو موصوف بڑے کمسن تھے۔ اس لئے ان کی تعلیم و تربیت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ کے ایک جاں نثار مرید خواجہ حسام الدینؒ (م ۱۶۳۴ء) نے کی۔ خواجہ حسام الدینؒ، ابوالفضل اور فیضی کے بہنوئی تھے اور وہ شاہی منصب ترک کرکے خواجہ صاحب کی درگاہ میں آ پڑے تھے۔ خواجہ خورد اپنے عہد کے بہت بڑے عالم تھے اور ان کی علمیت کی اس سے بڑی اور کیا دلیل ہوگی کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والدِ محترم شاہ عبدالرحیمؒ ان کے شاگردِ رشید تھے۔

خواجہ باقی باللہ کے مزارِ پُر انوار سے جانبِ مشرق "واقعاتِ دارالحکومت دہلی" کے فاضل مصنف، ڈپٹی نذیر احمد کے فرزندِ ارجمند اور شاہد احمد دہلوی کے والدِ بزرگوار مولوی بشیر الدین احمد (م ۱۹۲۷ء) کی آخری آرام گاہ ہے۔ موصوف کو نواب سراج الدین احمد خان سائل سے شرفِ تلمذ تھا۔ انہوں نے "واقعاتِ دارالحکومت دہلی" لکھ کر سرسیّد احمد خان صاحبِ "آثار الصنادید" کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔

مولوی بشیر الدین احمد کے مزار سے قریب ہی ان کے والد ڈپٹی نذیر احمد مترجمِ قرآنِ حکیم (م ۱۹۱۲ء) کی ابدی آرام گاہ ہے۔ ڈپٹی صاحب بڑے کامیاب ناول نگار تھے اور انہوں نے فروغِ تعلیم کے لئے سرسیّد احمد خان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ ہمارے دوست جناب اشرف صبوحی (م ۱۹۹۰ء) ڈپٹی صاحب کے نواسے تھے۔

اسی قبرستان میں الم مظفر نگری اور علامہ سیماب اکبر آبادی کے تلمیذِ رشید، علیم اختر مظفر نگری کی ابدی آرام گاہ ہے۔ ان کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۶۷ء کو ہوا تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے مزار سے جانبِ مشرق چند قدم کے فاصلے پر ہمدرد دواخانہ کے بانی حکیم حافظ عبدالمجید (م ۱۹۲۲ء)، اُن کی اہلیہ رابعہ خاتون، حکیم صاحب کے برادرِ نسبتی بانیٔ ہمدم دواخانہ کی قبریں ہیں۔ اب حکیم عبدالحمید صاحب نے اس قبرستان کے جنوبی حصے میں ایک دیوار کھنچ کر اسے ہمدرد والوں کے لئے مختص کر لیا ہے۔ حال ہی میں ان کی اہلیۂ محترمہ کو وہیں دفنایا گیا ہے۔

حکیم عبدالمجید صاحب کی ابدی آرام گاہ سے چند قدم کے فاصلے پر خواجہ باقی باللہ کے بڑے فرزند خواجہ عبید اللہ المعروف بہ خواجۂ کلاںؒ کا مزار ہے۔ انہوں نے "مبلغ الرجال" کے عنوان سے ایک بلند پایہ کتاب تصنیف کی ہے جس میں نقطوی فرقے کے عقائد پر روشنی ڈالی ہے۔ خواجہ صاحب کی اس تصنیف کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مغل فرمانروا اکبر اور اس کے مصاحب اسی گمراہ فرقے کے عقائد اپنا کر صراطِ مستقیم سے ہٹے تھے۔ مبلغ الرجال کا ایک مخطوطہ لندن میں اور دوسرا علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ راقم نے ان دونوں کی نقول حاصل کر لی ہیں اور اسے طباعت کے لئے مرتب کر لیا ہے۔

خواجہ باقی باللہ دہلوی کی اولاد دہلی اور کراچی میں مقیم ہے اور وہ اپنے نام کے بعد "بقائی" لکھتے ہیں۔ مٹیا محل دہلی میں بقائی دواخانہ بڑا مشہور ہے اور اس کے مالکان کے پُر

انوار چہرے دیکھنے سے جی نہیں بھرتا ۔ کراچی میں بقائی ہسپتال بڑا مشہور ہے جس کے روحِ رواں ڈاکٹر فرید الدین بقائی ان دنوں میڈیکل یونیورسٹی بنانے کے لئے دن رات ایک کر رہے ہیں ۔ دہلی میں عزیز حسن بقائی نام کے ایک صحافی تھے جو ایک مذہبی رسالہ " پیشوا " نکالا کرتے تھے ۔ مجھے علامہ منظور احمد عثمانی (م ۱۹۸۴ء) نے بتایا کہ ان کے مخالفین اس مجلّے کو پیشوا کی بجائے " بیسوا " کہا کرتے تھے ۔

درگاہ شریف کی مسجد کے عقب میں ایک احاطۂ قبور ہے ، جو باہر سے نظر نہیں آتا ۔ مسجد کے ساتھ ایک تنگ سی گلی ہے جس کا دروازہ عموماً بند رہتا ہے ۔ میری درخواست پر درگاہ کمیٹی کے سیکریٹری نے وہ دروازہ کھلوایا اور مجھے ساتھ لے کر وہاں پہنچے ۔ اس احاطۂ قبور میں گنتی کی چند قبریں ہیں ، جن میں سب سے اہم قبر مولانا عبد الحق حقانی (م ۱۹۱۷ء) کی ہے ۔ ان کی " تفسیر حقانی " ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں متداول ہے ۔ ان کی قبر پر کتبہ نہیں ہے اور قبر بھی سادہ سی ہے ۔ ان کے بعض اعزا بھی ان کے دائیں بائیں ابدی نیند سو رہے ہیں ۔

درگاہ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ میں راقم متعدد بار حاضری دے چکا ہے ۔ مجھے جب بھی دہلی جانے کا موقع ملا ، میں اپنی اوّلین فرصت میں وہاں گیا ۔ اب بھی اس قبرستان کی تمام قبریں میری آنکھوں کے سامنے ہیں ۔

کوچہ رُود گراں

ایک روز حبیبِ مکرم ڈاکٹر شریف حسین قاسمی ، صدر شعبۂ فارسی ، دہلی یونیورسٹی مجھے کوچہ رُود گراں لے گئے ۔ ان کے والدِ محترم مولانا اخلاق حسین قاسمی اسی کوچے میں رہتے ہیں ۔ انہوں نے " محاسنِ موضح القرآن " لکھ کر دینی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا ہے ۔ موصوف اکثر لاہور آتے رہتے ہیں اور راقم کو ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہے ۔ انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے ۔ اس کے ایک باب کا عنوان ہے : " وہ حضرات جنہیں شاہ ولی اللہ کی دہلی فراموش نہیں کر سکتی " ۔ ان حضرات میں راقمِ آثم بھی شامل ہے ۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی کے مکان سے قریب ہی میرزا فرید بیگ رہتے ہیں ۔

انہوں نے ہزاروں کی تعداد میں قدیم ہندوستان کے سکے جمع کئے ہیں ۔ مجھے بھی یہی شوق ہے ۔ شریف صاحب مجھے ان سے ملانے لے گئے ۔ انہوں نے اپنے نوادرات مجھے دکھائے ۔ انہوں نے متاخر مغلوں کے دورِ حکومت میں آزاد ہو جانے والی ریاستوں کے سکے بڑی جانفشانی کے ساتھ جمع کئے ہیں ۔ ان میں مرہٹوں کے سکے قابلِ دید ہیں ۔ ان کی محنت اور تلاش کی داد نہ دینا بڑی ناانصافی ہو گی ۔

میرزا فرید بیگ ، مشہور ادیب اور ماہرِ تعلیم میرزا محمود بیگ (م ۱۹۷۵ء) پرنسپل دہلی کالج کے قریبی عزیز ہیں ۔ محمود بیگ کہانی نویس اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں ۔ ان کے ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتے رہے ہیں ۔ ان کی کہانیاں اور ڈرامے طبع ہو چکے ہیں ۔ میں نے جامعہ ملیہ دہلی میں ان کی قبر بھی دیکھی ہے ۔ ایک رُوز میں سلطان جیؒ سے شہر کی جانب آرہا تھا کہ بس میں ایک سیٹ پر ایک مسلمان بی بی بیٹھی تھی اور اس کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی ۔ بھارت میں عورتوں کے لئے الگ نشستیں مختص کرنے کا رواج نہیں ہے ۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا ۔ اس کے ہاتھ میں چند کتابیں تھیں ، سفر ذرا لمبا تھا ، اس لئے میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا پڑھ رہی ہے ؟ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پی ایچ ڈی کر رہی ہے ۔ میں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کا موضوعِ تحقیق پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ میرزا محمود بیگ پر مقالہ لکھ رہی ہے ۔ میں اس وقت تک ان کے نام اور کام سے متعارف نہ تھا ۔ اس لئے میں نے ان کے کوائف معلوم کئے ۔ اس کے چند روز بعد میرزا فرید بیگ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے میرزا محمود بیگ کا ذکر کیا ۔ اب مجھے صحیح طرح سے یاد نہیں رہا کہ فرید صاحب ان کے فرزند ہیں یا داماد ، بہرحال ان میں سے ایک رشتہ ان کے ساتھ ضرور ہے ۔

دہلی کے سفرنامے میں فتح پُوری مسجد کا ذکر نہ کرنا بڑی ناانصافی ہو گی ۔ یہ مسجد ایسی جگہ واقع ہے جہاں سے چاندنی چوک شروع ہوتا ہے ۔ یوں سمجھیے کہ چاندنی چوک کے ایک سرے پر مسجد فتح پوری ہے اور دوسری جانب لال قلعہ ، اس بازار کو دہلی کی انار کلی سمجھنا چاہیے ۔ مسجد فتح پوری سے ملحق ایک " کالج " تھا جہاں شام کو طلبہ کو پنجاب یونیورسٹی کے امتحاناتِ منشی فاضل اور مولوی فاضل کی تیاری کرائی جاتی تھی ۔ قاضی

سجاد حسین کرتپوری ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا محبوب الٰہی منگوری آزادی سے قبل اسی ادارے سے منسلک تھے ۔ جب یہ ادارہ ختم ہوا تو قاضی صاحب اسی مسجد کے دینی مدرسے کے صدر مدرّس بن گئے ۔ راقم نے ان کے درسِ حدیث میں شرکت کی سعادت حاصل کی ہے ۔

مسجد فتح پوری میں مولانا مظہر اللہ صاحب (م ۱۹۶۶ء) نے مدت العمر تک امامت کے فرائض انجام دیئے ہیں ۔ موصوف رتر چھتر عرف مکان شریف کے بزرگ سید صادق علی شاہ (م ۱۸۹۹ء) سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت تھے ۔ ان کی وفات کے بعد انہیں مسجد کے صحن میں ہی دفن کیا گیا ہے ۔ ان کے ایک فرزند ڈاکٹر محمد مسعود احمد نے مولانا احمد رضا خان کے بارے میں بڑی کتابیں لکھی ہیں ۔ موصوف ان دونوں کراچی میں مقیم ہیں جہاں وہ ۱۳ شعبان کو اپنے والد بزرگوار کا عُرس مناتے ہیں ۔ ان کے ایک بھائی مشرف احمد کچھ عرصے تک مسجد فتح پوری میں امامت و خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں ۔ ان کی صاحبزادی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے سربراہ ڈاکٹر قاری رضوان اللہ (م ۱۹۸۵ء) کے عقد میں تھیں ۔ قاری صاحب رشتے میں لاہور کے نامور شاعر حکیم صفیر حسن زیبا ناروی (م ۱۹۸۷ء) کے بھانجے تھے ۔ کچھ عرصے بعد مشرف احمد اور ان کے بھتیجے محمد مکرّم میں مولانا مظہر اللہ کی جانشینی کے لئے چپقلش شروع ہو گئی اور محمد مکرّم اپنے چچا کو منصبِ امامت و خطابت سے الگ کرکے خود امام اور خطیب بن گئے ۔

راقم نے کئی بار اس مسجد میں نماز ادا کی ہے ۔ اس مسجد کے محراب میں ، جہاں امام کھڑے ہو کر نماز پڑھاتا ہے ، بھارت کی بڑی بڑی درگاہوں کی تصویریں آویزاں ہیں ۔ مجھے اس پر حیرت ہے کہ آج تک کسی فقیہ نے اس پر اعتراض نہیں کیا کہ جب امام سجدہ ریز ہوتا ہے تو اس کے سامنے خواجہ معین الدین اجمیریؒ ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ، بابا فرید الدین گنج شکرؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ جیسے بزرگوں کے مقابر کی تصویریں ہوتی ہیں ۔ ان تصویروں کی وجہ سے نمازیوں کی توجہ بھی بٹ سکتی ہے ۔

مسجد فتح پوری سے قلعے کی جانب چلیں تو راستے میں بائیں ہاتھ دہلی کارپوریشن کی عمارت نظر آتی ہے ۔ اس کے لان میں سوامی وویکانند (م ۱۹۰۲ء) کا بُت نصب ہے ۔ سوامی

وویکانند ہندوؤں کا بہت بڑا فلاسفر اور ریفارمر ہو گزرا ہے ۔ کارپوریشن کی عمارت کا وہ حصہ جو ریلوے اسٹیشن کی جانب ہے ، وہاں گاندھی جی کا بُت نصب ہے ۔ کسی زمانے میں کارپوریشن کی عمارت کے سامنے نئی سڑک کے چوک میں گھنٹہ گھر ہوا کرتا تھا ، جو اب نہیں ہے ۔ اسی طرح چاندنی چوک میں ٹرام چلا کرتی تھی ، جو اب ختم کر دی گئی ہے ۔ نئی سڑک پر کتابوں ، کاپیوں اور کپڑے کی دکانیں ہیں ۔ یہ سڑک چاوڑی بازار کو چاندنی چوک سے ملاتی ہے ۔ اور آگے بڑھیں تو دائیں ہاتھ سنہری مسجد ہے اور بائیں ہاتھ چوک فوارہ ۔ یہ وہی تاریخی مسجد ہے جس کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں دہلی میں قتلِ عام کا حکم دیا تھا ۔ یہیں مولانا امین الدین نے ۱۸۹۷ء میں مدرسۂ امینیہ کی بنیاد رکھی تھی جس میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ ، مولانا سید محمد میاں اور مفتی ضیاء الحق پڑھاتے رہے ہیں ۔

سنہری مسجد کے سامنے شری رُوپ لعل مہتہ (م ۱۹۸۶ء) کا گھر تھا ۔ وہ پاکستانی تھے اور لاہور میں رہتے تھے ۔ ان کی دھرم پتنی اور بچیاں دہلی میں رہتی تھیں ۔ رُوپ لعل مہتہ کافی ہاؤس ، چینیز لنچ ہوم اور پاک ٹی ہاؤس لاہور کی مقبول شخصیت تھی ۔ میں دو بار دہلی میں ان سے ملا ہوں ۔ ایک بار انہوں نے مجھے کناٹ پلیس کے ایک بڑے معروف ریستوران میں چائے کی دعوت دی اور وہاں لاہور کے نامور ہندوؤں سے میرا تعارف کرایا ۔ افسوس کہ ۱۹۸۶ء میں ان کا وہیں انتقال ہو گیا ۔

سنہری مسجد سے ملحق گوردوارہ سیس گنج ہے ۔ یہ اس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں ۱۶۷۵ء میں اورنگ زیب کے حکم پر سکھوں کے نویں گورو تیغ بہادر کو قتل کیا گیا تھا ۔ پہلے سنہری مسجد اور گوردوارے کے درمیان کوتوالی کی عمارت تھی جو سکھوں نے حکومت سے مطالبہ کرکے حاصل کرلی اور اب وہاں سدا برت (لنگر) جاری ہے ۔ یہ بڑا بارونق گوردوارہ ہے اور ہر وقت وہاں رونق لگی رہتی ہے ۔

گوردوارہ سیس گنج سے آگے بڑھیں تو دائیں ہاتھ صرافہ بازار آتا ہے ۔ اس کا صحیح نام دریبہ ہے اور یہ بازار جامع مسجد جا نکلتا ہے ۔ اور آگے بڑھیں تو بائیں ہاتھ بیگم سمرو (م ۱۸۳۶ء) کی رہائش گاہ آتی ہے ۔ اب وہاں بنک قائم ہو گئے ہیں ۔ بیگم سمرو کا اصل نام زیب النساء بیگم تھا ۔ اس نے عیسائیت قبول کرکے ایک عیسائی جرنیل سمرو صاحب

(م ۱۸۳۶ء) سے شادی کر لی تھی ۔ سمرو صاحب ۱۷۷۸ء میں کسی جنگ میں مارا گیا تو اس کی بیوہ نے سَردھنہ میں رہائش اختیار کر لی ۔ وہاں اس نے ایک گرجا تعمیر کیا تھا جو تا حال موجود ہے ۔ اس کی قبر اسی گرجا گھر میں ہے ۔

بیگم سمرو کی رہائش گاہ سے ایک سڑک دائیں جانب مڑتی ہے جو جامع مسجد جا نکلتی ہے ۔ اگر سیدھے جائیں تو دائیں ہاتھ جین مندر کی شاندار عمارت نظر آتی ہے ۔ جینیوں نے وہاں بیمار اور معذور پرندوں کے لئے ایک بہت بڑا پنجرہ بنوایا ہوا ہے ۔ جس میں صدہا پرندے پرورش پا رہے ہیں ۔ دہلی میں جینی تاجر جتنی تعداد میں موجود ہیں اور وہ بہت مالدار ہیں ۔ ان میں سے ایک گھنٹے والا حلوائی بھی ہے ۔ اس کی دکان چاندنی چوک میں سنہری مسجد سے قریب ہے ۔ یہ دکان سوا دو سو سال سے قائم ہے ۔ اس کی دکان پر میٹھی اور نمکین چیزوں کی جتنی اقسام نظر آتی ہیں ، اتنی میں نے کہیں نہیں دیکھیں ۔

جین مندر سے آگے بڑھیں تو لال قلعہ آ جاتا ہے ۔ قلعے کے صدر دروازے کے سامنے اورنگ زیب نے ایک دیوار بنوا دی تھی جو "دیوارِ گھونگھٹ" کے نام سے موسوم ہے ۔ قلعے میں داخل ہوتے ہی دونوں جانب دکانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ۔ ان دکانوں پر تحفے تحائف میں دینے والی چیزیں فروخت ہوتی ہیں ۔ لال قلعہ کے اندر دیوان عام ، نوبت خانہ ، دیوان خاص ، رنگ محل اور ساون بھادوں کی عمارتیں قابل دید ہیں۔ رنگ محل کے وسط سے ایک نہر گزرتی ہے جس میں جا بجا فوارے لگے ہوئے ہیں ۔ یہ اس زمانے کا ایئر کنڈیشنگ سسٹم ہے ۔ قلعہ کے دوسری جانب دریائے جمنا ہے ۔ جمنا کے کنارے اندر پرست کے کھنڈرات ہیں جن کا سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا ہے ۔ ہندوؤں کے خیال میں یہ کھنڈرات کوروؤں اور پانڈوؤں کے عہد کی دِلّی کے ہیں ۔ جمنا کے کنارے ہی راج گھاٹ ہے جہاں گاندھی جی کی سمادھی ہے ۔ اس کے نواح میں پنڈت جواہر لعل نہرو ، لال بہادر شاستری ، اندرا گاندھی ، چوہدری چرن سنگھ ، سنجے گاندھی اور راجیو گاندھی کی سمادھیں ہیں ۔ یہ علاقہ ہندوؤں کا ویسٹ منسٹر ایبے بنتا جا رہا ہے ۔

کوچہ بَلّیماراں

بَلّی اس لمبے بانس کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کشتی کھیتے ہیں ۔ ملاح بلّی کو

دریا کی تہ میں ٹکا کر زور لگاتا ہے تو کشتی آگے بڑھ جاتی ہے ۔ انگریزی میں اس عمل کو PUNTING کہتے ہیں ۔ کسی زمانے میں یہاں بلّی مار رہتے ہوں گے جن کی وجہ سے یہ محلہ "کوچہ بلّیماراں" کے نام سے مشہور ہو گیا ۔ ایک روز میں بلّیماراں میں قاضی سجاد حسین کرتپوری اور مولانا سید محمد میاں سے ملنے گیا ۔ بلّیماراں سے ایک گلی نکلتی ہے جو گلی قاسم جان کے نام سے موسوم ہے ۔ یہ دہلی کی ایک معروف گلی ہے ۔ گلی کی نکڑ پر ایک مسجد ہے اور اس کے برابر میں مرزا غالب (م ۱۸۶۹ء) کا مکان ہے اب اس مکان کی جگہ لکڑی کی ایک ٹال ہے ۔ یہ وہی مسجد ہے جس کے بارے میں مرزا غالب نے یہ کہا تھا:

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

اسی مسجد میں غالب کی حیات میں غوث علی شاہ قلندر پانی پتی (م ۱۸۸۰ء) قیام پذیر ہوئے تھے ۔ ان کے ملفوظات نگار گل حسن "تذکرۂ غوثیہ" میں لکھتے ہیں کہ غالب نے ان کے لئے کھانے کا ایک خوان بھجوایا تھا ۔ راقم نے اس تاریخی مسجد میں نماز ادا کی ہے ۔ اس مسجد کے بالمقابل ہندوستانی دواخانہ کی بلڈنگ ہے ۔ یہ دواخانہ حکیم محمد اجمل (م ۱۹۲۷ء) نے وقف کر دیا تھا ۔ اسی گلی میں خاندان شریفی کی حویلی تھی جس کے افراد میں سے حکیم شریف خان ، حکیم بھورے خان ، حکیم واصل خان ، حکیم محمد اجمل خان ، حکیم حبیب اشعر ، حکیم جمیل خان اور حکیم جماق نبی سویدا نے طب کو حیاتِ نو بخشی ہے

اس حویلی کے قریب سے گلی میں ذرا سا خم آجاتا ہے ۔ اسی خم کے پاس اس گلی کی معروف ترین مسجد ، قاسم جان کی مسجد ہے ۔ قاسم جان خاندان لوہارو کے بانی تھے ۔ حمیدہ سلطان صاحبہ کے بقول وہ خواجہ احمد یسوی رحمۃ اللہ کے احفاد میں سے تھے ۔ ان کی جوانی لاہور میں گزری جہاں وہ نواب معین الملک (م ۱۷۵۳ء) کے دربان تھے ۔ طہماس خان کی سفارش پر نواب مرحوم نے ان پر نظر عنایت کی اور پھر وہ ترقی کرتے کرتے ہفت ہزاری منصب پر فائز ہوا ۔ طہماس خان نے اس کی سیرت و کردار پر حرف گیری کی ہے ۔ اس مسجد کے نیچے دکانیں ہیں اس لئے بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر مسجد میں

داخل ہوتے ہیں۔ مسجد سے ملحق "ادارۂ ادبیاتِ دلّی" ہے جہاں سے بڑی قابلِ قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

مولانا سید محمد میاںؒ اس مسجد سے قریب ہی احاطہ کالے صاحب میں رہتے تھے۔ موصوف نماز ادا کرنے کے لئے یہیں تشریف لایا کرتے تھے۔ راقم کو ان کے ساتھ اس مسجد میں نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل ہے۔ ان کا مکان "نیم والی حویلی" کے نام سے موسوم تھا جہاں مَیں ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ موصوف مولانا سید حامد میاںؒ (م ۱۹۸۸ء) کے والدِ محترم، سید رشید میاں اور سید محمود میاں کے جدِ امجد تھے۔ ان کا آبائی وطن دیوبند تھا لیکن انہوں نے دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی جہاں وہ مدت تک جمعیت العلماء ہند کے سیکریٹری رہے۔ موصوف دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رُکن رکین تھے۔ مولانا اکبرآبادی کے ساتھ راقم کے تعلق کی وجہ سے موصوف راقم پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔

یہ وہی احاطہ کالے صاحب ہے جہاں ایک زمانے میں غالب کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ غالب ایک بار قمار بازی کے جرم میں پکڑے گئے اور اس جرم میں انہیں قید کی سزا ہو گئی۔ اس دوران میں مکان کا کرایہ ان کے سر چڑھ گیا۔ جب موصوف قیدِ فرنگ سے رہا ہوئے تو ایک عقیدت مند نے مبارک باد پیش کی۔ اس پر غالب نے کہا "کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے؟ پہلے گورے کی قید میں تھا اور اب کالے کی قید میں ہوں۔"

کالے صاحب کا نام نامی غلام نصیر الدینؒ (م ۱۸۵۱ء) تھا اور موصوف حضرت شاہ فخرالدینؒ (م ۱۷۸۵ء) کے پوتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر ان کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے ان کی شان میں ایک زور دار منقبت لکھی تھی، جس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

نظامِ خاندانِ فخرِ جہاں تمہیں تو ہو
قیامِ سلسلہ و خاندان تمہیں تو ہو
نہ کیونکر تم سے ہوں ظاہر صفاتِ قطب الدین
خدا رکھے تمہیں، ان کا نشان تمہیں تو ہو
نثار تم پہ ہیں پروانہ ساں ہزاروں دل

کہ شمعِ محفلِ صاحبدلاں تمہیں تو ہو
ظفر کی چاہیے نصرت تمہیں نصیرالدین
کہ اس کے یار و مددگار تمہیں تو ہو

یہاں کسی زمانے میں حضرت کالے صاحب کی حویلی تھی۔ اب وہاں سیکڑوں مکان بن چکے ہیں۔ حویلی کا صدر دروازہ بطور یادگار تا حال قائم ہے۔ اسی احاطے میں قاضی سجاد حسین کرتپوری کا مکان ہے۔ ان کے والدِ محترم قاضی شمشاد حسین کرتپوری اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے والدِ بزرگوار ڈاکٹر ابرار حسین برادرِ طریقت تھے اور وہ دونوں شاہ عبدالغنی منگوریؒ (م ۱۹۲۸ء) کے دامنِ ارادت سے وابستہ تھے۔ اس لئے قاضی سجاد حسین راقم پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ انہوں نے مثنوی مولانا رومؒ کا اُردو میں بین السطور ترجمہ کیا ہے اور حاشیے پر شرح لکھی ہے۔ میں نے ایک بار ان سے کہا کہ وہ مجھے وہ کمرہ اور وہ جگہ دکھائیں جہاں بیٹھ کر انہوں نے اتنا بڑا کام کیا ہے۔ قاضی صاحب نے میری فرمائش پوری کر دی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مثنوی پر کام کرتے ہوئے ان کی کمر پر ایک دمن پڑ گیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس کا نام "رُومی" رکھ دیں۔ میں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا کہ مشہور فلمی اداکارہ الزبتھ ٹیلر نے ایک بار پریس کانفرنس میں بتایا کہ اس کے سر پر جب کوئی سفید بال نمودار ہوتا ہے تو وہ اپنے محبوب کے نام پر اس کا نام "برٹن" رکھ دیتی ہے۔

قاضی صاحب نے فیروز شاہ تغلق کے عہد کی مشہور تصنیف "فتاویٰ تتارخانی" کو مرتب کیا ہے۔ یہ ان کا بہت بڑا کام ہے۔ انہوں نے حوضِ رانی پر ایک بنگلہ تعمیر کروا لیا تھا لیکن وہ مُسلم اکثریت کا یہ محلہ تازیست نہ چھوڑ سکے۔ ایک روز میں ان سے ملنے گیا تو فرمانے لگے کہ اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟ میں نے عرض کہ میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کے فرزند اسلم میاں کے ہاں سے سیدھا ان کے پاس آ رہا ہوں۔ قاضی صاحب اس پر بہت ہنسے۔ میں نے ہنسی کی وجہ پوچھی تو فرمانے لگے کہ ان کے ہاں شام کو سیوہارے کے "لاگی" جمع ہو جاتے ہیں اور وہ رات گئے تک وہاں محفل جماتے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی احاطہ کالے صاحب کے بالمقابل جمعیت العلماء ہند کے ترجمان "الجمعیۃ" کے دفتر کے عقب میں رہتے تھے۔ میں نے انہیں نہیں دیکھا۔

موصوف مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی خالہ کے بیٹے تھے ۔ اس لئے ان کے ہاں ہمارا آنا جانا رہتا تھا ۔ ان کی اہلیہ محترمہ مجھ سے پردہ کرتی تھیں لیکن جب بھی میں ان کے ہاں جاتا تو بڑی مروت سے پیش آتیں ۔ ان کا اکلوتا بیٹا لطف الرحمن المعروف بہ اسلم سے ہماری دوستی تھی ۔ وہ دہلی میں حکومتِ کشمیر کے لیبر آفیسر تھے اور دہلی میں ملازمت کرنے والے کشمیریوں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے ۔ یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ اب ان کے بیٹے متحدہ عرب امارات میں جا کر ملازم ہو گئے ہیں جس سے ان کے حالات سدھر گئے ہیں ۔

سہارنپور اور اس کے اطراف

سہارنپور پہنچنے کے فوراً بعد میں بازار چوب فروشاں میں مدرسہ مظاہرالعلوم دیکھنے گیا ۔ وہاں میری ملاقات حلیم اللہ ناظم کتاب خانہ سے ہوئی ۔ انہوں نے میرا تعارف شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب سے کرایا ۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی لیکن موصوف بُرہان کے حوالے سے مجھ سے متعارف تھے ۔ انہوں نے چائے سے میری تواضع کی اور دیر تک علمی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے ۔ شیخ الحدیث بالکل نوجوان ہیں اور ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ برِّعظیم پاک و ہند کے کسی مدرسے میں اتنا نو عمر شیخ الحدیث نہیں ہے ۔ موصوف کھیتا سرائے ضلع جونپور کے ایک نواحی گاؤں کے رہنے والے ہیں ۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ طالب علم، مظاہرالعلوم میں ہیں اور ان میں اکثریت گجراتی ، بہاری اور بنگالی طلبہ کی ہے ۔

ناظم کتاب خانہ نے مجھے مدرسے کی خوبصورت مسجد دکھائی جو کلثوم نامی ایک مخیر خاتون نے بنوائی ہے اور اسی کے نام سے منسوب ہے ۔ طلبہ کا ایک ہاسٹل اسی بازار میں تھوڑے سے فاصلے پر ہے اور اس کی مسجد بڑی وسیع ہے ۔ اسی مسجد میں حضرت مولانا محمد زکریا مرحوم و مغفور (م ۱۹۸۲ء) اپنے متوسلین کے ساتھ اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے ۔

مظاہر العلوم سے فارغ ہو کر میں بس اسٹینڈ پر پہنچا اور رُڑکی جانے والی بس میں سوار ہو گیا ۔ تقریباً ایک گھنٹے میں بس رُڑکی پہنچ گئی ۔ بس اسٹینڈ سے میں ایک رکشا میں سوار ہو کر نہر کے پل پر پہنچا ۔ وہاں کلیر شریف جانے کے لئے رکشے ہر وقت تیار ملتے ہیں۔ رُڑکی سے کلیر شریف کا فاصلہ سات کلو میٹر ہے اور تین روپے میں رکشا والے وہاں پہنچا دیتے ہیں ۔ رُڑکی سے کلیر شریف تک نہر کے کنارے کنارے جاتے ہیں ۔ اسی نہر کے بارے میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی (م ۱۸۸۴ء) نے فرمایا تھا کہ اس کے پانی میں انوار نبوت دکھائی دیتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا پانی کسی نبی کی قبر

کے پاس سے گزر کر آتا ہے۔

میں ساڑھے بارہ بجے کے قریب کلیر شریف پہنچا۔ اس وقت جمعہ کی اذان ہو رہی تھی۔ اذان کے بعد درگاہ کے احاطے میں نوبت بجنے لگی۔ میرے استفسار پر نقارچی نے بتایا کہ وہاں جمعہ کی نماز کے لئے لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے نوبت بجائی جاتی ہے۔ میں نے درگاہ کی مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی اور نماز کے بعد حضرت علاء الدین علی احمد صابرؒ (م ۱۲۹۱ء) کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوا۔

حضرت صابرؒ کا مزار ایک وسیع احاطے کے وسط میں واقع ہے۔ مزار پر ایک سفید گنبد بنا ہوا ہے جس میں سبز دھاریاں بڑی خوب صورتی کے ساتھ بنائی گئی ہیں۔ روضۂ مبارک کے چاروں کونوں میں برجیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ مزار شریف کے گرد غلام گردش بنا ہوا ہے جس میں زائرین قرآن خوانی اور ذکر و تسبیح میں مصروف رہتے ہیں۔

درگاہ کی مسجد میں وضو کا بڑا اچھا انتظام ہے لیکن طہارت خانہ کوئی نہیں ہے۔ اس لئے زائرین استنجا کے لئے باہر کھلے میدان میں جاتے ہیں اور وہاں بڑی بے حیائی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ کاش یُوپی وقف بُورڈ اس طرف بھی توجہ دے۔ درگاہ کی حدود میں مسلمان بی بیاں بے پردہ گھومتی ہیں۔ کم از کم ایسی جگہوں پر عورتوں کے یوں کھلے بندوں گھومنے پھرنے پر پابندی عائد کرنی چاہیے۔ اگر ایسی مقدس جگہوں پر بھی شریعت کی پابندی نہ ہو گی تو پھر کہاں ہو گی؟ یُوپی وقف بورڈ نے درگاہ کے قریب ایک پرائمری اسکول کھولا ہوا ہے۔ درگاہ سے باہر متعدد دکانیں ہیں جہاں تبرکات اور کھانے پینے کی اشیاء مل جاتی ہیں۔ کلیر شریف کی مختصر سی آبادی پر جنگل میں منگل کی ضرب المثل صادق آتی ہے۔

حضرت علاء الدین علی احمد صابرؒ (م ۱۲۹۱ء) سے چشتیہ صابریہ سلسلۂ تصوّف کی اشاعت ہوئی۔ ان کے واحد خلیفہ حضرت شمس الدین تُرک پانی پتی (م ۱۳۱۸ء) سے حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتیؒ فیضیاب ہوئے۔ مُسلم وقف بُورڈ ہریانہ کی غفلت اور نالائقی کے سبب حضرت شمس الدین ترکؒ کے مزار کو ایک سکھ نے گوردوارے میں تبدیل کر دیا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ حضرت کبیر الاولیاءؒ سے حضرت احمد عبدالحق رودولویؒ (م ۱۴۳۳ء) نے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

حضرت احمد عبدالحقؒ کے بعد ان کے فرزند ارجمند شیخ عارفؒ مسند نشین ہوئے اور ان کے بعد ان کے فرزند شیخ محمدؒ ان کے جانشین ہوئے۔ آخر الذکر بزرگ سے حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ (م ۱۵۳۷ء) نے فیض پایا۔ شیخ الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (م ۱۸۹۹ء) کا سلسلۂ بیعت چند واسطوں سے حضرت عبدالقدوسؒ سے جا ملتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب کے خلفاء میں سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (م ۱۸۸۰ء) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۹۰۵ء) مولانا احمد حسن محدثؒ (م ۱۹۱۱ء) اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۹۴۳ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن (م ۱۹۲۰ء) بھی مکہ مکرمہ جا کر حاجی صاحب سے فیضیاب ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے علومِ ظاہری کی تحصیل حضرت نانوتویؒ سے اور علومِ باطنی کی تعلیم حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں رہ کر مکمل کی تھی۔ یہ محض حُسنِ اتفاق نہیں کہ گذشتہ ایک صدی میں جن بزرگوں نے برِّعظیم پاک و ہند میں تجدیدِ دین کا بیڑا اٹھایا، ان کا رُوحانی تعلق حضرت علاء الدین علی احمد صابرؒ سے تھا۔

کلیر شریف سے میں رکشا میں سوار ہو کر رُڑکی پہنچا۔ رُڑکی بڑا صاف ستھرا شہر ہے۔ یہاں برطانوی عہد میں انجینئرنگ کالج ہوا کرتا تھا۔ اب یہ کالج ترقی کر کے یُونیورسٹی بن گیا ہے۔ اس شہر میں ایک بڑی فوجی چھاؤنی بھی ہے۔

رُڑکی کے بس اسٹینڈ سے مجھے منگلور جانے والی بس مل گئی۔ رُڑکی سے منگلور کا فاصلہ پانچ میل ہے اور کرایہ صرف ستر پیسے۔ میں چند منٹوں میں منگلور پہنچ گیا۔

اس تاریخی قصبے کی آبادی ۷۰ ہزار ہے اور اس میں مُسلمانوں کا تناسب ستر فیصد ہے۔ وہاں ایک اِنٹر میڈیٹ کالج بھی ہے اور چھوٹے چھوٹے کئی دینی مدرسے بھی ہیں۔ ایک جگہ "توسیع تعلیم دیہاتی کتب خانہ" کا بُورڈ بھی نظر آیا۔

بس سے اترتے ہی مجھے ایک رکشا مل گیا جو مجھے شاہ محی الدین صاحب کے عالی شان بنگلے پر لے گیا۔ اس بنگلے سے ملحق ایک وسیع و عریض مسجد کے صحن میں شمالی جانب قاضی محمد اسمٰعیلؒ (م ۱۸۹۲ء)، اُن کے جانشین قاضی عبدالغنی منگلوریؒ (م ۱۹۲۸ء) اور اُن کے فرزند قاضی عبدالولیؒ (م ۱۹۸۱ء) کی پکی قبریں ہیں۔ قاضی محمد اسمٰعیل صاحب کو میانجیو نور محمد جھنجھانویؒ (م ۱۸۴۳ء) کے خلیفۂ ارشد شیخ محمد تھانویؒ سے خرقۂ خلافت ملا

تھا ۔ قاضی صاحب کی وفات کے وقت حضرت عبدالغنی کی حالت اچھی نہ تھی ، لیکن انہوں نے جلد ہی مجاہدہ و ریاضت کر کے خود کو اپنے والدِ بزرگوار کا صحیح جانشین ثابت کر دکھایا۔ ان کی دونوں حالتوں کا ذکر سید عبدالحی لکھنوی (م ۱۹۲۳ء) نے "دہلی اور اس کے اطراف" میں بھی کیا ہے۔

قاضی عبدالغنی منگوری ، اصغر گونڈوی (م ۱۹۳۶ء) جگر مراد آبادی (م ۱۹۶۰ء) اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی (م ۱۹۸۵ء) کے والدِ ماجد ڈاکٹر ابرار حسین (م ۱۹۵۷ء) کے مُرشد تھے ۔ خود مولانا اکبر آبادی ان ہی کی دعا سے پیدا ہوئے تھے ۔ جگر نے ایک شعر میں اپنے مُرشدِ گرامی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

پابند شریعت نہیں ہوں
خاکِ درِ دولتِ غنی ہوں

"شجرۂ مبارکہ ساداتِ کاظمیہ منگور" میں قاضی عبدالغنی کا تفصیلی ذکر موجود ہے ۔

موجودہ سجادہ نشین شاہ محی الدین صاحب علی گڑھ کے گریجوایٹ ہیں ۔ وہ یوپی اسمبلی کے رُکن اور صوبائی وزیر رہ چکے ہیں ۔ جب میں مسجد سے باہر نکلا تو موصوف اپنے بنگلے کے برآمدے میں کھڑے تھے ۔ میں نے اپنا نام بتایا تو بڑی محبت سے پیش آئے اور کھانے کے متعلق دریافت فرمایا ۔ میں نے عرض کیا کہ میں سفر میں زیادہ کھانے سے پرہیز کرتا ہوں ۔ انہوں نے کھانے پر اصرار کیا اور ایک ملازم بڑا پُرتکلف کھانا لے آیا ۔ کھانے کے بعد میں نے اجازت چاہی تو فرمانے لگے کہ چائے پی کر جائیے گا ۔ وہی ملازم تھوڑی دیر میں چائے لے آیا اور چائے سے فراغت کے بعد مجھے جانے کی اجازت دی ۔ میں ان کے کریمانہ اخلاق سے بے حد متاثر ہوا ۔

منگور بڑا تاریخی قصبہ ہے ۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ وہاں تشریف لے جا چکے ہیں ۔ سید عبدالحی لکھنوی (م ۱۹۲۳ء) "دہلی اور اس کے اطراف" میں تحریر فرماتے ہیں کہ جن قصبوں میں سید صاحب اور ان کے رفقا نے قدم رنجہ فرمایا وہ آج تک سرسبز و شاداب اور خوب آباد ہیں اور جہاں ان کی مخالفت ہوئی وہ قصبات اُجڑ گئے ۔ منگور کو دیکھ کر یہ حقیقت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے ۔ شجرۂ مبارکہ کاظمیہ میں سید صاحب کے قافلے کی منگور میں آمد کی بڑی لمبی چوڑی تفصیل درج ہے ۔

جناب طفیل احمد منگوری (م ۱۹۴۶ء) جن کی تصنیف "مسلمانوں کا روشن مستقبل" اب کلاسک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے ، اسی بابرکت قصبے کے رہنے والے تھے ۔ مولانا محبوب الٰہی منگوری (م ۹۸۱ ، اُستاد مدرسہ فتحپوری جو خانقاہِ سراجیہ کندیاں کے بزرگوں کے دامن سے وابستہ تھے ، یہیں کے رہنے والے تھے ۔

منگور سے میں دوبارہ رُڑکی آیا اور وہاں سے جھبلپور کے راستے سہارنپور پہنچ گیا ۔ میں نے اپنی قیام گاہ پر نمازِ عصر ادا کی اور سامان اٹھا کر ڈیرہ دون جانے والی بس میں سوار ہو گیا اور قریباً سوا گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا ۔ بس اسٹینڈ سے تھوڑے فاصلے پر ایک نو تعمیر ہوٹل میں جو "اکاش دیپ" کے نام سے موسوم ہے ، قیام کیا ۔ اگلے روز میں ناشتہ سے فارغ ہو کر ہردوار جانے والی بس میں سوار ہوا اور ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا ۔

ہردوار ہندوؤں کا بہت بڑا تیرتھ ہے ۔ اس مقام پر دریائے گنگا پہاڑوں سے نکل کر میدانی علاقے میں داخل ہوتا ہے ۔ گنگا کے کنارے دور تک ہوٹلوں اور مکانوں کا سلسلہ چلا گیا ہے اور دریا کا پانی مکانوں کو چھو کر آگے جاتا ہے ۔ شمالی ہند کے ہنود اپنے مُردوں کی ہڈیاں اسی مقام پر گنگا میں بہاتے ہیں ۔ اس لئے گھاٹوں پر ہر وقت میلہ سا لگا رہتا ہے ۔ ہردوار میں پانی کا بہاؤ بڑا تیز ہے ۔ اس لئے اشنان کرنے والوں کی حفاظت کے لئے گھاٹ پر لوہے کے موٹے موٹے زنجیر لگے ہوئے ہیں اور یاتری انہیں پکڑ کر دریا میں اشنان کرتے ہیں ۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ گنگا میں اشنان کرنے سے پاپ (گناہ) دُھل جاتے ہیں ۔

ان گھاٹوں پر بے حیائی کے مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں ۔ پنجاب کی ہندو عورتیں عموماً کپڑوں سمیت اشنان کرتی ہیں لیکن الصلاح پورب کی عورتیں نیم عریاں ہو کر اپنے جسم پر پانی بہاتی ہیں ۔ اُن بدبختوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جتنے زیادہ لوگ انہیں عریاں حالت میں دیکھیں گے اتنے ہی اُن کے پاپ دُھلیں گے ۔

ہردوار کے مقام پر دریا میں ایک جزیرہ ہے جس کے کناروں کو پختہ کر کے اسے ایک پل کے ذریعے دریا کے ایک کنارے سے ملا دیا ہے ۔ اس جزیرے کا گھاٹ "ہر کی پوڑی" کے نام سے موسوم ہے اور وہاں اشنان کرنا باعثِ نجات سمجھا جاتا ہے ۔ میں نے

بہت سے یاتریوں کو دیکھا کہ وہ ڈھاک کے پتوں سے بنے ہوئے دونوں میں پھول رکھ کر دریا میں بہا رہے تھے۔ رات کے وقت پھولوں کے ساتھ ایک چراغ جلا کر بھی رکھ دیتے ہیں اور وہ دریا میں بہتے ہوئے بڑے بھلے دکھائی دیتے ہیں۔

میں نے پل کے قریب پھیری لگا کر سودا بیچنے والے ایک ہندو سے "ہر کی پوڑی" کا اتہ پتہ پوچھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگا کہ کسی اور سے اس کے بارے میں سوال نہ کیجئے گا۔ وہاں برہمن بیٹھتے ہیں۔ ان سے ہوشیار رہیے گا۔

دریا کے کنارے لکڑی کے تخت پوشوں پر پنڈت چھتر لگائے بیٹھے تھے۔ جب کوئی شخص اپنے کسی عزیز کے پھول (ہڈیاں) لے کر گنگا میں بہانے جاتا ہے تو یہی پنڈت مذہبی رُسوم ادا کرتے ہیں اور اس کا اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ مسوری کے سفر میں ایک ہندو نے، جو اپنی ماں کے پھول لے کر ہردوار آیا تھا، مجھے بتایا کہ برہمن چھ سات سو روپے تک وصول کر لیتے ہیں۔

دریا کے کنارے کم گہرے پانی میں ایک مندر ہے۔ وہاں پانی کی سطح تو پانچ فٹ کے قریب ہے لیکن پانی کا دھارا بڑا تیز ہے۔ اس کے باوجود میں نے کئی مردوں اور عورتوں کو اس مندر کا طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ دریا کے کنارے پر مُردوں کے لواحقین مستحقین کو کھانا کھلانے میں معروف تھے۔ آوارہ گایوں کی بھی وہاں کمی نہ تھی۔ ان کی سیوا بھی ہندو دھرم کا جزو ہے۔ ایسی جگہ پر بندر بھی بکثرت نظر آتے ہیں۔ ان کا نسبی تعلق چونکہ ہنومان سے ہے اس لئے ہندو ان کی بھی تعظیم کرتے ہیں۔

ہردوار شہر کے ایک طرف بڑا اُونچا پہاڑ ہے اور اس کی چوٹی پر منسا دیوی کا مندر ہے۔ وہاں تک جانے کے لئے ایوبیہ جیسی لفٹ چیئر استعمال کرتے ہیں۔ آمد و رفت کا کرایہ صرف چار روپے ہے۔

ہردوار میں دریا کے پار ایک ایسا علاقہ بھی ہے جہاں مادر زاد ننگے سادھو سیکڑوں کی تعداد میں رہتے ہیں۔ ان کے عقیدت مند ہندو مرد اور عورتیں پھل اور مرغن کھانے لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور اپنے دل کی مرادیں پانے کے لئے گھنٹوں ان کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر بھلا اور کیا حیا سوز منظر دیکھنے میں آئے گا۔ لیکن مذہبی عقیدت بھی عجب چیز ہے۔ اسی علاقے میں آریہ سماجیوں نے ۱۹۰۲ء میں

گُورو کل یونیورسٹی قائم کی تھی جہاں جدید تعلیم کے ساتھ ہندوؤں کے قدیم علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ اس یونیورسٹی کے ایک فارغ التحصیل نے مجھے یہ بتایا تھا کہ وسطی امریکہ کا ملک گوئٹی مالا ان بدھوں نے بسایا تھا جو گوتم بدھ کی مالا وہاں لے کر گئے تھے۔ ہنگری کا دارالحکومت بڈاپسٹ بھی دراصل بدھا پوسٹ ہے۔ اسی طرح ارجنٹائن ارجن کا آباد کردہ ہے۔ مہا بھارت کی جنگ میں راکٹ اور ایٹم بم بھی استعمال ہوئے تھے۔ علی ہذا القیاس۔

میں نے ہردوار میں ہندوؤں کو اپنی مذہبی رسوم ادا کرتے دیکھا اور اس بات پر غور کیا کہ رُڑکی سے ہردوار جانے والے راستے پر کلیر شریف پڑتا ہے۔ حضرت علاء الدین علی احمد صابرؒ کی حیاتِ طیبہ میں جو یاتری ہردوار جاتے ہوں گے وہ سرِ راہ ان کی زیارت سے مشرف ہوتے ہوں گے اور اب ان کی درگاہ کے پاس سے گزر کر جاتے ہیں۔ آج بھی ایسے ہی کسی مخدوم کی اشد ضرورت ہے جو وہاں توحید کا پرچم بلند کر سکے۔

ہردوار کا ریلوے اسٹیشن دور سے مندر معلوم ہوتا ہے۔ بنارس کے ریلوے اسٹیشن کا طرزِ تعمیر بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ ہردوار سے بذریعہ ریل یا بس رشی کیش جاتے ہیں۔ وہاں تک بس کا صرف چالیس منٹ کا سفر ہے۔ یہاں بھی گنگا کے کنارے مناور اور مکانات قابلِ دید ہیں۔ رشی کیش سے تین میل آگے ایک پُر فضا مقام لچھمن جھولا کے نام سے موسوم ہے۔ ہندوؤں کا یہ کہنا ہے کہ جب لچھمن تپ دق میں مبتلا ہوا تھا تو وہ بحالیٔ صحت کے لئے یہاں چلا آیا تھا۔ گنگا کے کنارے مکانات کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا ہے اور دریا کا پانی برآمدوں میں چلا جاتا ہے۔ مکانوں کے عقب میں ایک سرسبز پہاڑ ہے۔ ایسی پُر فضا جگہ شاید ہی کہیں ہو۔ دریا عبور کرنے کے لئے لوہے کے رسّوں کا جھولا نما پل بنا ہوا ہے۔ ہندوؤں نے اسے ہی لچھمن جھولا سمجھ لیا ہے۔

رشی کیش سے مجھے براہِ راست ڈیرہ دون جانے والی بس مل گئی اور میں قریباً ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔ اگلے رُوز میں نے مسوری جانے کا پروگرام بنایا۔ ڈیرہ دون سے مسوری کا فاصلہ بائیس میل ہے اور بس دو گھنٹے میں وہاں پہنچا دیتی ہے۔ ڈیرہ دون کے نواح میں راجپورہ کی سرسبز بستی ہے۔ حکیم محمد اجمل خان بحالیٔ صحت کے لئے یہیں آئے تھے۔ انہوں نے یہاں سے ۱۹۲۶ء میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے نام خط لکھے تھے جو

راقم نے ماہنامہ بُرہان دہلی میں شائع کرا دیے ہیں۔ مسوری بہت ہی خوبصورت پہاڑی مقام ہے اور وہاں سے دہرہ دون صاف نظر آتا ہے۔ شہر میں چار مسجدیں ہیں اور شمال مغربی یوپی کے کھاتے پیتے مسلمان رمضان گزارنے کے لئے وہاں چلے جاتے ہیں۔ دہرہ دون میں لائبریری کی عمارت قابل دید ہے۔ میں نے پورا دن مسوری میں گزارا اور شام ہوتے ہی دہرہ دون چلا آیا۔

اگلی صبح میں دہرہ دون سے رڑکی گیا اور وہاں سے منگلور کے راستے دیو بند پہنچ گیا۔ منگلور سے دیو بند تک سڑک بڑی خراب ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے دیہات اور کھیتوں سے ہو کر جاتی ہے۔ میں بس اسٹینڈ سے سیدھا دارالعلوم کے مہمان خانے میں پہنچا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی دوپہر کا کھانا تناول کر کے قیلولہ فرما رہے تھے۔ میں نے انہیں جگایا اور انہوں نے میرے لئے کھانا منگوایا اور چند طالب علم رہنماؤں سے میرا تعارف کرایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں مولانا ظفر الدین مفتاحی سے ملنے گیا اور انہیں ساتھ لے کر خطۂ صالحین میں اکابر کے مزاروں پر حاضری دی۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر تمام کتبے نقل کر لئے۔

اَمروہہ مُراد آباد رَامپور

حسن پور میں جب میں نے اپنے میزبان سے رُخصت طلب کی تو انہوں نے فرمایا کہ وہ میرے ساتھ امروہہ تک چلیں گے اور میری ملاقات مولانا نسیم احمد فریدی (م ۱۹۸۸ء) سے کرائیں گے۔ گجرولہ اور امروہہ کے درمیان صرف ایک ریلوے سٹیشن کافور پور پڑتا ہے۔ اس لئے ہم جلد ہی امروہہ پہنچ گئے۔ ہم محلّہ جھنڈا شہید میں مولانا نسیم احمد فریدی کی قیام گاہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آنجناب کسی جنازے میں شرکت کے لئے قبرستان گئے ہوئے ہیں۔ عزیز الہیٰ صاحب فوراً قبرستان پہنچے اور انہیں اپنے ساتھ ان کی قیام گاہ پر لے آئے۔ مجھے ایک واقفِ حال نے بتایا کہ اس محلّے کا نام زندہ شہید تھا جو کثرتِ استعمال سے جھنڈا شہید ہو گیا۔

مولانا فریدی نے چائے اور پھلوں کے ساتھ ہماری تواضع کی اور اپنی کئی تصانیف مجھے عنائت فرمائیں۔ ان کے ساتھ بڑی دیر تک علمی موضوعات پر گفتگو رہی۔ میری استدعا پر انہوں نے اپنے ایک عقیدت مند کو میرے ساتھ کیا اور میں اس کی رہنمائی میں سلطان معزالدین کیقباد (م ۱۲۹۰ء) کی تعمیر کردہ جامع مسجد دیکھنے گیا۔ اس مسجد کا شمار پاک و ہند کی قدیم ترین مساجد میں ہوتا ہے۔ یہ مسجد بڑی وسیع ہے اور اس کے تین در اور تین ہی گنبد ہیں۔ بعد میں کسی نے دو دَروں کا اضافہ کر دیا ہے۔ ان دنوں اس مسجد کی تولیت کے بارے میں شیعوں اور سنّیوں کے درمیان عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ اس لئے وہاں نماز موقوف ہے اور مسجد ویران پڑی ہے۔ حالاں کہ اس مسجد کا بانی سُنّی تھا اور اُس زمانے میں پاک و ہند میں شیعوں کا وجود نہ تھا۔ کیقباد کی مسجد دیکھنے کے بعد میں نے محمود احمد عباسی (م ۱۹۷۴ء) کا گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو میرا رہنما پلا تامل مجھے وہاں لے گیا۔

عباسی مرحوم کے گھر سے ہم شاہ ولایت، حسین ابن علی نقوی واسطی سہروردی المعروف بہ بچھوؤں والے پیر کا مزار دیکھنے گئے۔ گذشتہ کچھ عرصے سے ان کی اولاد اشنا

عشری مسلک اختیار کر چکی ہے اور ان کا غلو فی الدین مشہور ہے۔ اس بزرگ کے مزار پر بچھوؤں کے لکڑی اور لوہے کے بڑے بڑے مجسمے آویزاں ہیں اور زندہ بچھو بھی درگاہ کے احاطے میں چلتے پھرتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہاں کے عوام کا یہ کہنا ہے کہ شاہ ولایت کی کرامت سے احاطۂ مزار کے اندر بچھو ڈنگ نہیں مارتے۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے ہمیں بتایا کہ جدید تحقیق کے مطابق صدیوں پرانے قبرستان میں فاسفورس کی مقدار اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ وہاں رہنے والے سانپوں اور بچھوؤں کا زہر ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان کا گزند نہ پہنچانے کا شاہ ولائت کی کرامت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

امروہہ کی آبادی سے باہر جنگل میں شاہ نصیر الدین چشتی کا مزار ہے۔ یہ حضرت وہاں گدھوں والے پیر کے لقب سے مشہور ہیں۔ دراصل ان کے مزار کے نواح میں سال بھر سبزہ اُگا رہتا ہے اس لئے آوارہ گدھے وہاں جا پہنچتے ہیں۔ اسی بنا پر لوگوں نے انہیں گدھوں والے پیر کے نام سے مشہور کر دیا ہے۔

امروہہ پہلے وقتوں میں اللہ والوں کی بستی تھی۔ وہاں کے باشندے آم اور رُہو مچھلی کھانے کے بڑے شوقین تھے اس لئے آم اور رہو کی مناسبت سے اس بستی کا نام امروہہ پڑ گیا۔ اس قصبے میں آبادی کے اندر شاہ عضد الدینؒ (م ۱۷۵۷ء) کی درگاہ ہے۔ ایک بڑے دالان میں شاہ جمال الدین چشتی صابریؒ، شاہ عضد الدینؒ، شاہ معزالدین میاں موجؒ، شاہ علاء الدینؒ، شاہ قیام الدینؒ اور ان کی اہلیہ، شاہ سعید الدینؒ، شاہ نظام الدینؒ اور ان کی اہلیہ اور شاہ بدرالدینؒ محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ راقم کے شجرۂ طریقت میں حضرت عضد الدینؒ کا نام نامی آتا ہے۔

شاہ عضد الدینؒ سے شاہ عبدالہادیؒ (م ۱۷۷۶ء) نے خرقۂ خلافت پایا اور ان کے جانشین ان کے پوتے شاہ عبدالباریؒ (م ۱۸۱۱ء) کے خلیفہ سید عبدالرحیم فاطمیؒ (م ۱۸۳۱ء) شہیدِ بالاکوٹ تھے۔ جن کی خدمت میں رہ کر میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ (م ۱۸۴۳ء) نے منازلِ سلوک طے کی تھیں۔ اس طرح ہمارے اکابر دیوبند کے رُوحانی سلسلہ کے تین بزرگ امروہہ میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔

امروہہ کی جامع مسجد بھی قابلِ دید ہے۔ اس وسیع مسجد میں ایک مدرسہ بھی قائم ہے۔ جس کا تاریخی نام "افضل المدارس" ہے۔ اس مدرسہ کے بانی مولانا احمد حسن

امروہیؒ کو حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (م ۱۸۸۰ء) سے شرفِ تلمذ تھا۔ مسجد کے جنوب مشرقی کونے میں مولانا احمد حسن (م ۱۹۱۱ء) مفسرِ قرآن مولانا عبدالرحمن صدیقی (م ۱۹۲۹ء) اور مولانا عبدالقدوس (م ۱۹۷۶ء) کی قبریں ہیں۔ اس مدرسہ میں ایک ہزار سے زائد طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔ ہمارے فاضل دوست مولانا محمد طاسین (مجلسِ علمی کراچی والے) بھی اس مدرسہ میں تدریس کے فرائض انجام دے چکے ہیں اور مشہور عربی دان علّامہ عبدالعزیز میمن (م ۱۹۷۸ء) اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔

مدرسہ کے دفترِ اہتمام میں ناظمِ مدرسہ مولانا فضل الرحمن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جب میرے راہنما نے مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کے حوالے سے میرا تعارف کرایا تو موصوف نے بڑی شفقت کا اظہار فرمایا اور تا دیر مدرسہ کے بارے میں میرے سوالات کے جوابات دیتے رہے۔

جامع مسجد کے عقب میں ایک وسیع جوہڑ ہے اور اس کے پار عبدالکریم انٹر میڈیٹ کالج کی عمارت ہے۔ امروہہ کے اس کالج کا شمار اس علاقے کے اہم علمی مراکز میں ہوتا ہے۔

امروہہ کے گرد و نواح میں آم بکثرت پیدا ہوتے ہیں اس لئے وہاں آم کی لکڑی سے ڈھولک اور لکھنے والی تختیاں بنائی جاتی ہیں۔ راقم نے ان سے بھرے ہوئے ریہڑے اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے دیکھے تھے۔

امروہہ ریل اور سڑک کے ذریعہ مراد آباد سے ملا ہوا ہے۔ گجرولہ سے مراد آباد جانے والی سڑک امروہہ سے چار میل کے فاصلے سے گزرتی ہے۔ میں اور عزیز الٰہی اخون ایک ٹمپو میں سوار ہو کر مین روڈ پر پہنچے اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر رجب پور سے ہوتے ہوئے مراد آباد پہنچ گئے۔ رجب پور میں سڑک کے کنارے حضرت بہاء الدین فریدیؒ کا مزار ہے۔ وہاں ہونے والے سالانہ عرس کی مکمل کارروائی آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی جاتی ہے۔ راقم نے ایک بار پوری کمنٹری سنی تھی لیکن مزار کا محل وقوع معلوم نہ ہو سکا اس لئے جب میں نے اس بزرگ کی درگاہ دیکھی تو پرانی یاد پھر سے تازہ ہو گئی۔

مراد آباد پہنچ کر ہم دونوں سنبھلی گیٹ میں مولانا افتخار فریدی سے ملنے گئے۔

موصوف حضرت بہاء الدین فریدیؒ کے اخلاف میں سے ہیں۔ مولانا افتخار فریدی، حضرت شاہ عبد القادر رائے پوریؒ (م ۱۹۶۲ء) کے دامنِ ارادت سے وابستہ اور تبلیغی جماعت کے سرگرم کارکن ہیں۔ ایک ٹانگ سے معذور ہونے کے باوجود موصوف کئی ممالک کا تبلیغی دورہ کر چکے ہیں۔ ان سے مل کر طبیعت بے حد خوش ہوئی۔ ان کے اخلاق و اطوار قرنِ اول کے مسلمانوں جیسے ہیں۔ موصوف نے چائے اور پھلوں کے ساتھ ہماری تواضع کی اور اپنی کئی تصانیف مجھے عطا فرمائیں۔

مولانا افتخار فریدی نے دورانِ گفتگو فرمایا کہ مراد آباد میں منشی نوُر الحسن نام کے ایک صاحب رہتے تھے جو میونسپل بورڈ کے صدر اور شہر کے رئیسِ اعظم تھے۔ ان کے ایک بیٹے کو علاّمہ اقبال کا پُورا کلام یاد تھا۔ اسی زمانے میں تحریکِ خلافت کے روحِ رواں مسعود الحسن بیرسٹر کی صاحب زادی کی شادی سر محمد شفیع (م ۱۹۳۲ء) کے بیٹے سے ہونا قرار پائی۔ لاہور سے بارات کے ساتھ علاّمہ اقبال بھی تشریف لے گئے۔ اتفاق سے ان دنوں وہ بچہ علیل تھا۔ جب مُنشی صاحب نے علاّمہ اقبال سے اس بچے کے حافظے اور علالت کا ذکر کیا تو علاّمہ فوراً اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور بچے کی دلجوئی کے لئے اسے اپنا کلام سنایا۔

مولانا افتخار فریدی سے اجازت لے کر ہم بس اسٹینڈ پہنچے۔ میرے میزبان تو حسن پُور جانے والی بس میں سوار ہو گئے اور میں رام پور روانہ ہو گیا۔ یہ میرا رام پور کا چوتھا سفر تھا۔

رَضا لائبریری رام پُور: رام پور پہنچ کر میں نے ٹورسٹ ہوٹل میں قیام کیا اور بعجلتِ ممکنہ رضا لائبریری پہنچا۔ اس لائبریری کو عرفِ عام میں کتابوں کا تاج محل کہتے ہیں۔ قلعہ کے اندر نواب رام پور کا ایک عالی شان مہمان خانہ تھا جس میں وائسرائے اور گورنر آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ جب سردار پٹیل کے ہاتھوں ریاستوں کا خاتمہ ہوا تو یہ عمارت حکومتِ ہند کی تحویل میں چلی گئی۔ اب یہ عمارت لائبریری کا کام دے رہی ہے۔

بھارتی پارلیمنٹ کے ایک بل کی رُو سے وفاقی حکومت کا قائم کردہ ایک بورڈ لائبریری کا نظام چلا رہا ہے۔ اس لائبریری میں مطبوعہ کتابوں کو چھوڑ کر اس وقت سترہ ہزار قلمی کتابیں ہیں اور ان میں ایسے مخطوطے بھی ہیں جن کا کوئی دوسرا نسخہ کہیں نہیں

ہے۔ برِ عظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کے صدہا سالہ دورِ حکومت کی تاریخ و ثقافت کے کسی بھی پہلو پر ریسرچ کرنے والے اسکالر کے لیے اس لائبریری سے استفادہ کرنا لابد ہے۔ میں نے رام پُور میں اپنے قیام کے دوران میں شاہ ابُو اسحاق قادری لاہوریؒ کی تصنیف رسالۂ ناطقہ، شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیف القدمۃُ السنیہ، شاہ عبد العزیز محدثؒ کی تالیف ساکیت شاستر اور محمد صالح کولابی کی تصنیف رسالہ در احوال و اعمال و عقائدِ حضرت مجدّدِ الفِ ثانیؒ سے استفادہ کیا ہے۔ میں نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے دَورِ نظامت میں بھی اس لائبریری میں بیٹھ کر کام کیا ہے۔ مرحوم سے کسی کتاب کا ذکر کرتا تو موصوف فوراً وہ کتاب لا کر میرے ہاتھ میں تھما دیتے۔ اب وہ بات ہی نہیں رہی۔ کتاب تلاش کرنے کے باوجود نہیں ملتی۔ اس لئے اس لائبریری کو کتابوں کا گودام کہنا مناسب ہو گا۔ مولانا عرشی کی عمر اسی لائبریری کی خدمت کرتے ہوئے گذری اور ان کی قبر لائبریری کے پہلو میں ہے۔

شام کے وقت احبابِ رام پور نے صولت لائبریری میں ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ جہاں پاکستان میں رفتارِ ادب اور تعلیم و تعلّم کے موضوع پر میری تقریر ہوئی۔ تقریب کے اختتام پر جامع مسجد میں، جو صولت لائبریری کے قریب ہے، تمام حاضرین نماز ادا کرنے گئے۔ یہ مسجد نوابی دَور کی یادگار ہے۔ نماز کے بعد ایک شخص نے کہا کہ مجھے نماز میں شریک دیکھ کر انہیں بڑا تعجب ہوا اور خوشی بھی۔ تعجب اس لئے کہ رام پُور میں یہی مشہور ہے کہ جو شخص یہاں آکر نماز نہ پڑھے تو سمجھئے کہ وہ پاکستان سے آیا ہے اور جو عورت بے پردہ نظر آئے تو وہ بھی یقیناً پاکستانی ہو گی۔ یہ ہے پاکستان کا IMAGE جو ہم نے ہمسایہ ملک میں دیا ہے۔

اگلے دن میں دوبارہ لائبریری گیا اور سارا دن وہیں گذارا۔ چار بجے لائبریری بند ہوئی تو میں محلہ راجدوارہ کی مسجد میں مُلّا غیاث الدین (م ۱۸۵۷ء) کی قبر دیکھنے گیا۔ موصوف غیاثُ اللغات کے مصنّف اور نواب کلبِ علی خان والیٔ رام پُور (م ۱۸۸۷ء) کے اُستاد تھے۔ شارحِ قصائدِ بدر چاچ اور صوتُ الناقوس کے مصنّف عثمان خان قیس کو بھی ان سے تلمذ تھا۔ مُلّا غیاث الدین کی تصنیف غیاثُ اللغات کو مرزا غالب نے "نشۂ حنفی" سے تعبیر کیا تھا۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

مولوی غیاث الدین عرت
مؤلف غیاث اللغات
۲۳ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ

ان کے پائنتی اُن کے فرزند مولوی قمر الدین المتوفیٰ ۲۷ رمضان ۱۲۹۸ھ کی قبر ہے۔

راجدوارہ سے میں سیدھا مدرسہ فرقانیہ پہنچا۔ مدرسے کی مسجد کے عقب میں کئی قبریں ہیں۔ ان میں سے میاں سید نظام الدین (م ۱۸۶۲ء) کی قبر قابلِ ذکر ہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے یہ دو اشعار زبان زدِ خلائق ہیں:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مُسکرا کے ہاتھ
دینا وہ اُن کا ساغرِ مے یاد ہے نظام
مُنہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

سید نظام الدین کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

کسی کی دوست نہیں ہے یہ دشمن ہے
فضول ہے جو کوئی دل لگائے دنیا سے
یہ ذی کمال کو تو دیکھ ہی نہیں سکتی
خدا پناہ میں رکھے بلائے دنیا سے
غضب کی بات ہے افسوس دیکھ اے محمود
میاں نظام گئے ہائے ہائے دنیا سے

۱۲۸۹ھ

مدرسہ فرقانیہ کے صدر مدرس اور رُوحِ رواں مولانا وجیہہ الدین احمد خان قادری مجددی ہیں جو کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ موصوف کے مُرشد وزیر محمد خان (م ۱۹۲۵ء) صاحب بریلوی مسلک کے عالم تھے لیکن انہوں نے اپنے مریدِ باصفا کو اعلیٰ تعلیم کے لئے دیوبند بھیجا۔ جہاں انہوں نے مولانا انور شاہ محدّث کشمیریؒ (م ۱۹۳۳ء) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ مولانا وجیہہ الدین احمد خان صاحب فرقہ وارانہ تعصب سے بالاتر ہو گئے۔ گذشتہ سفر میں جب میں رام پور گیا تو ان دنوں میں مدرسہ فرقانیہ کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا۔ مولانا نے اس موقع پر وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے موضوع پر میری تقریر کرائی تھی۔ افسوس کہ ان کا ۲۵ جون ۱۹۸۷ء کو بعمر ۸۸ سال انتقال ہو گیا۔

اگلے روز میں حکیم محمد حُسین خان شِفا کے ساتھ رام پُور کے مشہور عالم مولانا ارشاد حسین مجدّدی (م ۱۸۹۳ء) کا مزار دیکھنے گیا۔ ان کے علمی مقام کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے تلامذہ میں مولانا شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) نواب کلب علی خان (م ۱۸۸۷ء) اور حافظ عنایت اللہ مجدّدیؒ جیسے فضلاء کے نام آتے ہیں۔ ان کے احاطۂ مزار میں مولوی سلامت اللہ خان کی بھی قبر ہے۔ یہ بزرگ رام پور کے احمد رضا خان تھے۔

حافظ عنایت اللہ مجدّدیؒ کی قائم کردہ خانقاہ عنایتیہ کے سجادہ نشین جناب محمد اللہ خان صاحب سے میری پرانی واقفیت ہے۔ ہماری پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں سرہند شریف میں ہوئی تھی۔ اس بار انہوں نے اصرار کیا کہ میں جب بھی رام پور آیا کروں تو خانقاہ عنایتیہ میں قیام کیا کروں۔ اسی خانقاہ کے احاطے میں رام پُور کے نامور شاعر کشفر عنایتی (م ۱۹۷۶ء) کی قبر ہے۔ ان کا نام صابر رضا خاں تھا اور وہ شاعری میں صفدر رامپوری کے شاگرد تھے۔

رام پُور میں حضرت خواجہ محمد زبیر سرہندیؒ کے خلیفہ حضرت شاہ قطب الدین مجدّدیؒ کے مریدِ باصفا حافظ جمال اللہ (م ۱۷۹۳ء) کی درگاہ مرجعِ خلائق ہے۔ ان کے مزار کے سفید قاش دار گنبد میں سیاہ دھاریاں بڑا حسن پیدا کرتی ہیں۔ مقبرے کی پیشانی پر یہ اشعار کندہ ہیں:

آں شاہ جمال قطبِ عالم
خوش رفت بجلوہ گاہ وحدت
تاریخ فنای با بقایش
سر علم مقبرۂ حیرت

۱۲۰۹ھ

اسی درگاہ کے احاطے میں حضرت شاہ ابُوسعید مجددیؒ (م ۱۸۳۶ء) کے فرزندِ ارجمند شاہ محمد عمر مجددیؒ (م ۱۸۸۱ء) محوِ خوابِ ابدی ہیں "افسوس فتاد برجِ عرفان" (۱۲۹۸ھ)

سے ان کی تاریخِ وفات نکلتی ہے۔ ان کے پہلو میں ان کے مریدِ خاص اور والیٔ رام پور نواب کلب علی خان (م ۱۸۸۷ء) کی قبر ہے۔ "مزارِ نواب خلد آشیاں" (۱۳۰۴ھ) سے ان کی تاریخِ وفات نکلتی ہے۔ حضرت حافظ جمال اللہؒ کے روضۂ مبارک سے جنوب کی جانب نواب حامد علی خان (م ۱۹۳۰ء) کے والد نواب مشتاق علی خان (م ۱۸۸۹ء) کی قبر ہے۔ اس سے حافظ جمال اللہ صاحبؒ کے ساتھ والیانِ رام پور کی عقیدت کا ثبوت ملتا ہے۔

رام پور میں حافظ جمال اللہؒ سے بھی زیادہ شہرت ان کے خلیفہ شاہ درگاہیؒ (م ۱۸۱۸ء) کی ہوئی۔ ان کی درگاہ رام پور میں مرجعِ خلائق ہے۔ حافظ جمال اللہؒ کی طرح شاہ درگاہیؒ بھی پنجاب کے رہنے والے تھے۔ ان کا آبائی وطن دریائے چناب کے کنارے بہلول پور نامی ایک قصبہ تھا لیکن ان کی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ رام پور میں گزرا۔ میری ناقص رائے میں اس زمانے میں پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی اس لئے یہ دونوں بزرگ پنجاب سے ہجرت کرکے رام پور میں جا بسے تھے۔ ان کے مزار کا گنبد ہو بہو حافظ صاحب کے مزار کے گنبد جیسا ہے لیکن اس گنبد کا رنگ سبز ہے۔ رام پور میں موصوف اپنے نام کی بجائے "قطب صاحب" کے لقب سے مشہور ہیں۔ درگاہ کے احاطے میں منی بیگم (م ۱۹۰۶ء) دخترِ نواب حامد علی خان کی قبر بڑی نمایاں ہے۔ رشید رام پوری نے اس کی تاریخِ وفات یوں کہی ہے:

بولا ہاتف سالِ رحلت اے رشید
آگئی باغِ جناں میں بیعدیل
۱۳۲۴ھ

صولت لائبریری میں جماعتِ اسلامی رام پور کے عمائدین سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اگلے روز مرکزی درس گاہ اسلامی میں مجھے اپنے خیالات کے اظہار کی دعوت دی۔ رام پور میں جماعتِ اسلامی نے ایک مثالی تعلیمی ادارہ قائم کیا ہے جہاں تعلیم سے زیادہ تربیت پر زور دیا جاتا ہے۔ مسلم طلبہ دور دور سے وہاں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں۔ ہوسٹل کا انتظام بھی متدین اور مخلص لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔

دوپہر کے وقت حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خان کے ہاں میری دعوت تھی۔ حکیم محمد حسین خان شفا اور مولانا کے نواسے جناب شعائر اللہ خان بھی دسترخوان پر

موجود تھے۔ مولانا کے ساتھ بڑی عالمانہ گفتگو رہی۔ رخصت ہوتے وقت مولانا شعائر اللہ خان نے اپنے نانا جان کی تصانیف کا ایک سیٹ مجھے عطا فرمایا۔

حکیم محمد حسین خان شفا رضا لائبریری میں کیٹلاگر ہیں اور فارغ اوقات میں مطب بھی کرتے ہیں۔ موصوف صاحبِ طرز ادیب ہیں اور مقامی روزناموں میں "کشکولِ شفا" کے عنوان سے اپنا حاصلِ مطالعہ چھپواتے رہتے ہیں۔ قومی سطح کے علمی جرائد میں ان کے فاضلانہ مضمون گاہے ماہے چھپتے رہتے ہیں۔ اس عاجز کے ساتھ ان کی باقاعدہ خط و کتابت رہتی ہے۔

گھیر چپل والا کے ایک علم دوست نوجوان تنویر احمد خان بھی تمام وقت میرے ساتھ رہے۔ انہوں نے دو کتابیں ڈاکٹر بینی پرشاد کی "تاریخِ جہانگیر" اور ہارون خان شروانی کی "دکن کے بہمنی سلاطین" عنایت کیں۔

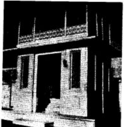
حکیم محمد حسین خان شفا کا مکان مدرسۂ کہنہ کے قریب واقع ہے۔ اس مدرسہ کے صحن میں عالمِ اجل ملا حسن فرنگی محلی (م ۱۷۸۵ء) اور خواجہ میر درد کے شاگردِ رشید قائم چاند پوری (م ۱۷۹۳ء) کی قبریں ہیں۔ ہمارے مرحوم فاضل دوست اور بزرگ حکیم نبی احمد خان صاحب رام پوری ثم لاہوری (م ۱۹۹۳ء) کا مکان بھی اس محلے میں ہے۔

ایک دن میں بازار سے گزر رہا تھا اور حکیم شفا میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے مجھے نوابِ رام پور کے اصطبل کی وہ تاریخی عمارت دکھائی جس میں نواب فصیح الملک داغ (م ۱۹۰۵ء) کا تقرر بطورِ داروغہ ہوا تھا۔ نوابِ موصوف کا رنگ سیاہی مائل تھا۔ اصطبل اور داغ کی نسبت سے کسی نے ان پر یہ پھبتی کسی تھی:

شہرِ دہلی سے آیا ایک مشکی
یہاں آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

نوابِ رام پور کے ہاتھی خانے میں اب سکھ شرنارتھی آباد ہیں۔ نوابی ریلوے سٹیشن میں، جو نوابی دور میں صرف نواب صاحب کی سپیشل ٹرین کی آمد و رفت کے لئے مخصوص تھا، اب پیال ہوٹل کے نام سے ایک ریستوران کھل گیا ہے۔ جس گاڑی میں نواب صاحب رام پور شاہانہ ٹھاٹھ سے سفر کیا کرتے تھے، اب عوام اس میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ ایوانِ شاہی، جہاں نواب صاحب دربار لگایا کرتے تھے اب ہوٹل میں

تبدیل ہو گیا ہے۔ اس ایوان کے ایک حصے میں اب تک نواب صاحب کا تخت اور قیمتی اشیاء محفوظ ہیں۔ دربار ہال اب عجائب گھر بن گیا ہے۔ ان عمارات کو دیکھ کر تلک الایام نداولہا بین الناس کی تفسیر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔



خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

تو تعمیر مزار مرزا غالب

بریلی - بدایوں - شاہجہانپور

رام پور کے متعدد احباب مجھے الوداع کہنے ریلوے اسٹیشن تک آئے اور ان کے اصرار پر اسٹیشن سے قریب ایک مقام پر قدرے قیام رہا۔ رام پور سے میں نے بریلی کا ٹکٹ خریدا اور میں تقریباً ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔

پچھلے وقتوں میں بریلی روہیل کھنڈ کا صدر مقام تھا اور اٹھارھویں صدی میں حافظ الملک حافظ رحمت خان (م ۱۷۷۵ء) کی وجہ سے اسے بڑی شہرت ملی۔ ان دنوں وہاں یونیورسٹی بھی بن گئی ہے جو "یونیورسٹی آف روہیل کھنڈ" کے نام سے موسوم ہے۔

ریلوے اسٹیشن سے چند قدم کے فاصلے پر بریلی ہوٹل اور سول اینڈ ملٹری ہوٹل نام کے دو بڑے اچھے ہوٹل ہیں۔ میں نے اس بار بریلی ہوٹل میں قیام کیا اور نہا دھو کر سیر و تفریح کے لئے نکلا۔ ہوٹل سے قریب ہی ایک مسجد تھی جہاں میں نے مغرب کی نماز قدرے تاخیر سے ادا کی۔ وہاں ایک بورڈ نصب تھا جس پر یہ عبارت مرقوم تھی کہ یہاں دھنگا فساد اور مذہبی بحث کرنے والا نتائج کا خود ذمہ دار ہو گا۔

مسجد کے صحن میں چند آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ جب میں نماز ادا کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو ایک شخص نے مجھے ٹوکا اور کہا کہ میں اپنی گھڑی اتار لوں کیونکہ کلائی کے ساتھ گھڑی باندھنے سے نماز نہیں ہوتی۔ میں نے اس کی سنی ان سنی ایک کر دی اور نماز ادا کر کے مسجد سے باہر آیا۔ قریب ہی ایک مسلمان کا ریستوران تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے مولانا احمد رضا خانؒ کے مزار کا اتہ پتہ پوچھا۔ ڈرنے کی بات یہ تھی کہ اگر میں مولانا صاحب کے لئے لمبے چوڑے القاب استعمال کرتا اور وہ دیو بندی ہوتا تو میں مشکل میں پھنس جاتا اور اگر میں ان کا ذکر عام الفاظ میں کرتا اور میرا مخاطب بریلوی ہوتا تو مجھے جان بچانی مشکل ہو جاتی۔

بہرحال اس بھلے آدمی نے مجھے ان کے مزار کا اتہ پتہ بتایا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی رکشا والے کو کہہ دے اور وہ مجھے وہاں پہنچا دے۔ اس نے فوراً ایک رکشا

والے کو بلایا اور اس سے کہا - " یہ بڑے مولوی صاحب کے ہاں جا رہے ہیں - انہیں وہاں تک لے جاؤ اور خبردار ایک روپیہ پچیس پیسے سے زیادہ کرایہ وصول نہ کرنا " -

مولانا احمد رضا خان (م ۱۹۲۱ء) کے مزار تک جانے کے لئے پرانے شہر کے اندر پُر پیچ اور تنگ گلیوں میں سے گزر کر جانا ہوتا ہے - راستے میں ایک چھوٹا سا بازار پڑتا ہے، جسے بجریا کہتے ہیں - اس بازار کی دکانوں اور مکانوں کی ساخت دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ کسی وقت یہ بریلی کا بازارِ حسن ہو گا - بجریا سے گذر کر سوداگری محلے میں جا پہنچتے ہیں - یہی محلہ مولانا صاحب کی دینی سرگرمیوں کا مرکز تھا -

سوداگری محلے کی ایک گلی کے موڑ پر ایک عام سے مکان کے باہر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر " جامعہ رضویہ مظہر اسلام، مہتمم ریحان رضا خان " لکھا ہوا تھا - اس جامعہ میں گنتی کے چار پانچ کمرے ہوں گے - جامعہ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک کھوئی مسقّف مسجد ہے جس کا صحن نہیں ہے کیونکہ اتنی گنجان آبادی میں بڑی مسجد تعمیر کرنی ممکن ہی نہیں تھی - اس مسجد سے قریب ہی ایک مکان کے اندر اعلیٰ حضرت فاضل بریلویؒ کا مزار ہے - اس مکان کے دروازے پر ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس پر یہ مصرع درج ہے:

بے ادب پامنہ ایں جا کہ عجب درگاہ ہست

دروازے پر ایک سبز رنگ کا پردہ لٹک رہا تھا - میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا - اس کمرے میں کئی قبریں ہیں - مولانا احمد رضا خانؒ کی قبر وسط میں تھی اور اس کے گرد ایک غلام گردش بنا ہوا ہے جسے ان کے معتقدین مطاف کے طور پر استعمال کرتے ہیں - اسی کمرے میں مولانا صاحب کے فرزند حامد رضا خان کی بھی قبر ہے اور ان کے لوحِ مزار پر اُن کے نام کے ساتھ " قامع بدعت محیِٔ سنت " کا لقب بھی کندہ تھا - اسی کمرے میں جیلانی میاں اور حسنین رضا کی بھی قبریں ہیں - ایک قبر اعلیٰ حضرت کے خادمِ خاص حاجی کفایت اللہ کی بھی ہے -

میں " دربارِ رضائیہ " سے باہر نکلا تو میری نظر ایک لمبے چوڑے بورڈ پر پڑی - اس پر " اعلیٰ حضرت ایک نظر میں " کے عنوان سے ولادت سے لے کر وفات تک ان کے حالات زندگی لکھے ہوئے تھے - مولانا صاحب کا رہائشی مکان " دیارِ رضا " بھی قریب ہی

ہے - اس کے دروازے پر " ادارہ تصنیفاتِ رضا بریلی " کا بورڈ آویزاں تھا -

میری خواہش پر ایک صاحب مجھے مولانا احمد رضا خانؒ کے مزار کی بالائی منزل پر لے گئے - وہاں بھی قبروں کے نشان تھے اور تیسری منزل پر چھوٹا سا قاش دار گنبد بنا ہوا تھا - مزار سے ملحقہ عمارت " رضوی افریقی دارالاقامہ " کے نام سے موسوم ہے - وہاں غالباً جامعہ مظہر اسلام کے طلبہ رہتے ہیں - مولانا صاحب نے فتاویٰ افریقیہ کے نام سے ایک مجموعۂ فتاویٰ چھاپا تھا - شاید اس دارالاقامہ کا نام بھی اسی مناسبت سے رکھا گیا ہو -

مولانا احمد رضا خانؒ کے مزار سے اندازاً ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلہ پر چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے نامور بزرگ شاہ نیاز احمد بریلویؒ (م ۱۸۳۴ء) کی خانقاہ ہے - وہاں شاہ صاحب کو ان کے نام سے کوئی نہیں جانتا - عوام انہیں قطب صاحب کے لقب سے جانتے ہیں - میں پُر پیچ گلیوں میں سے گزرتا ہوا خانقاہ نیازیہ پہنچا - اس روز وہاں حضرت محمد تقی کا عُرس ہو رہا تھا - درگاہ کے احاطے میں سماع خانہ کی عمارت بہت وسیع اور قابلِ دید ہے - اس عمارت کی پیشانی پر " قصرِ عالی خانقاہ نیازیہ " لکھا ہوا ہے - یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ درگاہ کے احاطے میں مسجد نہیں ہے - میں نے ایک شخص سے اس کا گلہ کیا تو اس نے جواب دیا کہ اس محلّے میں مسجد ہے جس نے نماز ادا کرنی ہوتی ہے وہ وہاں چلا جاتا ہے -

درگاہ کے احاطے میں ایک پُرتکلف اور خوشنما دالان میں حضرت شاہ نیاز احمد بریلویؒ، شاہ محی الدین احمد، شاہ نظام الدین اور شاہ محمد تقی کے مزارات ہیں - دالان کے اُوپر سنگِ مرمر کے تین خوشنما قاش دار گنبد بنے ہوئے ہیں جو قابلِ دید ہیں - درگاہ کے صحن میں جعفر میاں، مہدی میاں اور حسن میاں کی قبریں ہیں - حسن میاں کی قبر کو اُن کے معتقدین سجدے کر رہے تھے اور ایک شخص قبر کو لوبان کی دُھونی دے رہا تھا - یہ چیزیں میرے لئے تو عجیب تھیں لیکن اُن کے معتقدین کی گھٹی میں پڑی تھیں -

شاہ نیاز احمدؒ، حضرت مولانا فخر الدینؒ عرف فخرِ جہاں (م ۱۷۸۵ء) کے خلیفہ تھے - یہ دونوں بزرگ علی الاعلان تفضیلی عقیدے کا اظہار کیا کرتے تھے - اس عقیدے میں شاہ نیاز احمدؒ کے غلو کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار ایک شخص ان سے ملنے گیا - اس کے پاس شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیف ازالۃ الخفا، کا ایک نسخہ تھا، جو

اس نے کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا۔ شاہ صاحب نے باتوں باتوں میں اس سے کہا "مجھے فروج کی بو آرہی ہے سچ سچ بتاؤ اس کپڑے میں کیا چھپا رکھا ہے" اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ اس کے پاس ازالۃ الخفاء ہے۔

شاہ صاحب شعر و سخن کے قدر دان اور سماع کے دلدادہ تھے۔ ان کے انتقال کے بارے میں یہ روایت زبان زدِ خلائق ہے کہ ایک بار اُن کی خانقاہ میں سماع ہو رہی تھی۔ قوال نے جونہی یہ مصرع اٹھایا:

سجدہ گاہ عاشقاں میانِ دو اَبروئے علی

تو حضرت چونک پڑے اور قوال سے کہنے لگے "میاں کیا کہا، پھر سے کہنا"۔

اس نے دو تین بار یہ مصرع دہرایا تو حضرت بھی اس کے ساتھ اس مصرعے کی تکرار کرنے لگے اور اسی حالت میں ان کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

شاہ نیاز احمدؒ نے تصوّف کے مسائل کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے اشعار میں سمویا ہے۔ ان کا یہ شعر تو دل میں رکھ لینے کے لائق ہے:

بُوالہوس پاؤں نہ رکھیو کبھی اِس راہ کے بیچ
کوچۂ عشق ہے یہ ، رہگزرِ عام نہیں

خانقاہِ نیازیہ سے میں بریلی ہوٹل آیا اور اگلے رُوز بدایوں روانہ ہوا۔ بریلی سے بدایوں تک بس کا پونے دو گھنٹے کا سفر ہے۔ مقامی لوگ بدایوں کو مدینۃ الاولیاء کہتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ وہیں کے رہنے والے تھے۔ ان کے نانا اور دادا ماوراُالنہر سے آکر لاہور آباد ہوئے اور بعد ازاں بدایوں چلے گئے۔ پروفیسر آلِ احمد سُرور، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی اور طالب انصاری کا تعلق بھی اسی رُوحانی شہر سے ہے۔

سلطنتِ دہلی کے آغاز میں بدایوں کا ماحول بڑا پاکیزہ تھا۔ اس لئے خلوت پسند اور سکون کے متلاشی بزرگ اور اہلِ قلم دہلی کی بجائے بدایوں کی سکونت کو ترجیح دیتے تھے۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے بھی آسام جانے سے پہلے کچھ وقت وہاں گزارا تھا۔ اس دور میں ضیاء نخشبی (م ۱۳۵۰ء) نام کے ایک مصنف نے بدایوں میں بڑا نام پایا تھا۔ سلطان شمس الدین التمش نے تخت نشین ہونے سے پہلے کئی سال بدایوں میں بحیثیتِ گورنر گزارے تھے۔

شہر میں داخل ہوتے ہی محلہ جواہر پُوری میں نواب اخلاص خان کا مقبرہ دکھائی دیتا ہے۔ اس عمارت کے اندر جو بارہ دری کی طرز پر بنی ہوئی ہے، پانچ قبریں ہیں جن میں سے درمیانی قبر نواب موصوف کی ہے۔ مقبرے کے چاروں کونوں پر بُرجیاں بنی ہوئی ہیں اور درمیان میں ایک شاندار گنبد بنا ہوا ہے۔ مقبرے کی اندرونی سقف پر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر خطِ نستعلیق میں عبارتیں درج ہیں جو اب پڑھی نہیں جاتیں۔ مقبرے سے جانب مغرب ایک مسجد ہے جس کی دیواروں پر خطِ نستعلیق میں عبارتیں درج ہیں جو ماند پڑ گئی ہیں۔ مسجد کی دیواروں پر منقش ٹائلیں لگی ہوئی ہیں۔

جواہر پُوری کے کھیتوں میں جابجا ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ بدایوں کی شہر پناہ کے آثار بھی کئی جگہ موجود ہیں۔ ان کھنڈرات کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کسی زمانے میں بدایوں واقعی ایک عظیم شہر ہو گا۔

مولوی ٹولہ نامی محلّے میں شمس الدین التمش کی بنوائی ہوئی ایک وسیع و عریض مسجد ہے جو اپنے بانی کے نام کی مناسبت سے "شمسی مسجد" کہلاتی ہے۔ اس مسجد کی دیواریں کئی کئی فٹ چوڑی ہیں اس لئے گرمیوں کے موسم میں بھی دالان سرد رہتا ہے۔ مسجد کی دیواروں پر خطِ کوفی میں لکھی ہوئی عبارتیں موجود ہیں جنہیں پڑھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

ایک کتبے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر کے عہد (۱۵۵۶ء۔ ۱۶۰۵ء) میں قطب الدین خان نے اور پھر جہانگیر کے عہد (۱۶۰۵ء۔ ۱۶۲۷ء) میں ابراہیم خان نے اس مسجد کی مرمت کرائی تھی۔ میں نے ایک کتبے کی عبارت یُوں پڑھی ہے:

"در عہدِ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی ۹۸۳ ہزار و سیزدہ بنا کرد ایں مسجد قطب الدین خان چشتی عرف شیخ کوکہ خوبو ابو المظفر سلطان سلیم شاہ غازی ابن جلال الدین محمد اکبر بادشاہ باہتمام نواب ابراہیم ولد خان مذکور میرِ عمارت عبدالملک۔

اسی طرح ایک کتبے پر تین شعر کندہ ہیں جو میں نے یُوں پڑھے ہیں:

بنائی خان قطب الدین مرحوم
بشدہ محکم بحکمِ خان کشور

بقصدِ شیخ فیضِ اللہ چشتی
چو شد اتمام با صد زینت و فر
پئے تاریخ او گفتم سرِ دا
ز جان گو خالصاً اللہ اکبر

یہ مسجد دیکھ کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں اسے نہ دیکھتا تو عہدِ سلطنت کی ایک اہم اور قابلِ دید عمارت میری نظروں سے اوجھل رہتی۔ اس مسجد کا شمار پاک و ہند کی قدیم ترین مساجد میں ہوتا ہے۔ اس مسجد کے صدر دروازے سے باہر دائیں ہاتھ سلطان تاج الدین یلدز کی قبر ہے۔ وہ غزنی کا حاکم تھا۔ اس نے التمش کے عہدِ حکومت میں ۱۲۱۶ء میں برِ عظیم پر چڑھائی کی لیکن شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ التمش نے اسے بدایوں میں نظر بند رکھا اور اس کے مرنے کے بعد اسے شمسی مسجد کی مشرقی دیوار کے ساتھ دفن کر دیا۔

بدایوں کے ایک بازار میں دُور سے پیلے رنگ کی ایک خوبصورت عمارت نظر آتی ہے جس کا صدر دروازہ گھنٹہ گھر کی طرز پر بنا ہوا ہے۔ یہ مدرسہ شمس العلوم کی عمارت ہے۔ بدایوں جا کر معلوم ہوا کہ جس طرح بریلوی ایک مکتبِ فکر کا نام ہے اسی طرح بدایونی بھی باقاعدہ ایک مکتبِ فکر ہے۔ ان دونوں مذاہب میں کیا فرق ہے یہ تو کوئی بریلوی یا بدایونی ہی بتا سکتا ہے۔ سُنا ہے کہ آزادی سے قبل مولانا عبد الحامد بدایونی (م ۱۹۷۰ء) اسی مدرسے سے وابستہ تھے۔

بدایوں میں حضرت سلطان التارکین حمید الدین ناگوریؒ (م ۱۲۷۴ء) کے ایک مرید سلطان العارفین شمس الدینؒ کا مزار مرجعِ خلائق ہے۔ یہ بزرگ وہاں "بڑی سرکار" کے نام سے معروف ہیں۔ اسی طرح ایک درگاہ "چھوٹی سرکار" کے نام سے موسوم ہے۔ بدایوں میں ایک عمارت "پہلوان کے مقبرے" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے قریب ہی ایک مقبرہ ہے جسے "چینی کا روضہ" کہتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی اللہ کا بندہ محوِ خوابِ ابدی ہے۔ اس بزرگ کی قبر ایک تہ خانے میں ہے اور تہ خانے سے ایک سرنگ ایک کنوئیں میں جا نکلتی ہے۔ یہ سرنگ غالباً تہ خانے کو سرد رکھنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ لاہور میں ابوالحسن تربتی کے مقبرے میں بھی اس کا اہتمام کیا گیا تھا۔

بدایوں اگرچہ ضلع کا صدر مقام ہے لیکن بے رونق شہر ہے۔ آزادی کے بعد وہاں کے مُسلم باشندے یا تو پاکستان منتقل ہو گئے یا تلاشِ معاش میں بدایوں سے باہر چلے گئے۔ اس شہر کا محلِ وقوع بھی ایسا ہے کہ وہاں پہنچنے کے لئے بڑا تردد کرنا پڑتا ہے۔

بدایوں کی سیر کر کے میں بریلی واپس آیا اور ہوٹل سے اپنا سامان اٹھا کر شاہجہان پُور روانہ ہوا۔ وہاں میرے ایک دوست پروفیسر قاری محمد بشیر الدین پنڈت رہتے تھے۔ ان کے ساتھ میرے ۱۹۵۲ء سے دوستانہ مراسم ہیں۔ میں دوبار شاہجہان پُور جا کر ان سے مل چکا ہوں اور ایک بار علی گڑھ میں بھی ان سے ملاقات ہو چکی ہے۔ موصوف بھی دوبار پاکستان تشریف لا چکے ہیں۔

قاری صاحب سنسکرت زبان کے عالم ہیں اور اسی وجہ سے پنڈت کہلاتے ہیں۔ موصوف مولداً اور مذہباً بدایونی ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں جن میں "رسولِ شاہد و مشہود" اور "تاریخِ ہندی قرونِ وسطیٰ" خاص طور پر مشہور ہیں۔ انہوں نے بابا نانک کے بارے میں ایک کتابچہ تحریر کیا ہے اور اس میں ان کا نام عبدالمجید نانک لکھ کر انہیں مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری ذاتی لائبریری میں پنڈت جی کی کتابیں ان کے دستخطوں کے ساتھ موجود ہیں۔ پنڈت جی گاندھی فیضِ عام کالج شاہجہان پُور کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔

میں نے شاہجہان پُور میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں قیام کیا اور قاری صاحب سے ملنے گیا۔ مغرب کی نماز کے بعد میں ان کے ہاں پہنچا اور بڑی دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ اس سے پچھلے سفر میں انہوں نے مجھے سلاطینِ شرقی کے چند سکے "تحفتہً" دیے تھے جو میرے ذخیرۂ مسکوکات میں محفوظ ہیں۔ قاری صاحب کے بچے بھی مجھ سے مانوس ہو چکے ہیں اور ان کا ایک فرزند ظہیر الدین کوثر عائشہ باوانی کالج کراچی میں لیکچرار ہے۔

شاہجہانپور پٹھانوں کی بستی ہے اور کھنّوت اور گرّا نام کی دو ندیوں کے درمیان واقع ہے۔ اس شہر کی خاک سے کئی نامور عالم اور شاعر اٹھے ہیں۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری اور پیام شاہجہانپوری کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ قاری صاحب کے علاوہ وہاں میرا کوئی واقف نہ تھا اور میں صرف ان سے ملنے ہی گیا تھا اس لئے رات کے پچھلے پہر میں شاہجہان پور سے روانہ ہوا اور صبح دس بجے کے قریب لکھنؤ پہنچ گیا۔

عظیم آباد پٹنہ میں چار روز

میں ۲۳ اگست ۱۹۸۱ء کو نمازِ مغرب کے بعد پٹنہ پہنچا اور ریلوے اسٹیشن کے عقب میں کنکر باغ روڈ پر ہوٹل جسرین میں قیام کیا۔ اگلے روز صبح ۹ بجے کے قریب میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پہنچا۔ یہ لائبریری ریلوے اسٹیشن سے اندازاً دو میل کے فاصلہ پر پٹنہ یونیورسٹی کے قریب بانکی پور میں واقع ہے۔ اس لائبریری کا شمار بھارت کی پانچ بڑی لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ اس وقت اس لائبریری میں صرف مخطوطات کی تعداد پندرہ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ مطبوعات کا صحیح اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ اس لائبریری میں ایسے علمی و ادبی رسائل کی مکمل فائلیں موجود ہیں، جن کے نام سے بھی بہت سے لوگ ناواقف ہیں۔

اس لائبریری کے بانی جسٹس خدا بخش مرحوم کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا. انہوں نے اپنی عمر بھر کی کمائی کتابوں کے حصول پر صرف کر دی۔ حتیٰ کہ وہ آخری عمر میں بالکل کنگال ہو گئے تھے۔ جسٹس خدا بخش نے اپنی وفات سے قبل اپنی لائبریری وقف کر دی اور حکومتِ بہار اس کی نگران بن گئی۔ آزادی کے بعد بھارتی پارلیمنٹ نے ایک خاص بل کی منظوری کے بعد اس لائبریری کو مرکزی حکومت کی تحویل میں دے دیا. اب اس لائبریری کو ۱۰ لاکھ روپے سالانہ گرانٹ ملتی ہے جس سے خریدِ کتب کے علاوہ عمارت میں توسیع بھی کی جا رہی ہے۔

میں نے لائبریری میں داخل ہوتے ہی استقبالیہ پر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے بارے میں دریافت کیا۔ موصوف اُردو زبان و ادب کے نامور ادیب اور اس لائبریری کے ڈائریکٹر ہیں۔ استقبالیہ کے انچارج نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے کام کر رہے ہیں. ان کا گھر اور دفتر لائبریری کے احاطے ہی میں ہے۔ میں ان کے گھر پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی انہوں نے اندر بلا لیا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو فرمانے لگے۔

"دیکھیے اب مولانا اکبر آبادی کا نام نہ لیجئے گا۔ آپ کا نام ہی تعارف کے لئے کافی

ہے:

آغا صاحب نے چائے سے تواضع فرمائی اور میرے ساتھ لائبریری تک آئے۔ انہوں نے میرا تعارف ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن صاحب سے کرایا اور ان سے کہا کہ مجھے جس کتاب کی ضرورت ہو وہ فوراً مہیا کی جائے۔

میں نے لائبریری کے اوقات پوچھے تو عابد صاحب نے فرمایا کہ یوں تو صبح نو بجے سے شام چھ بجے تک لائبریری کھلی رہتی ہے لیکن میں جب تک وہاں بیٹھنا چاہوں لائبریری کھلی رہے گی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہ اپنے کام میں معروف ہو گئے۔

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن صاحب نے بہار کے شہرۂ آفاق محدث علامہ شوق نیموی (متوفی ۱۹۰۲ء) پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ نیمی پٹنہ سے دس گیارہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے اور علامہ مرحوم وہیں کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا تعارف لائبریری کے عملہ سے کرایا اور مجھے دارالمطالعہ میں بٹھا دیا۔ میری درخواست پر عملہ کے ایک رکن نے مجھے معارج الکمال کا ایک نادر مخطوطہ لا کر دیا۔

معارج الکمال اسماعیل بن شاہ عالم عبدالعزیز کی تصنیف ہے اور اس کا کوئی دوسرا نسخہ میرے علم میں نہیں ہے۔ فاضل مصنف اکبری اور جہانگیری عہد کے نامور امیر نواب مرتضیٰ خان فرید بخاریؒ (م ۱۰۲۵ء) کا مصاحب تھا۔ نواب موصوف کا حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ، حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے ساتھ بڑا قریبی تعلق تھا اور ان تینوں بزرگوں کی ان کے ساتھ خط و کتابت رہتی تھی۔

حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ نے جن درباری امراء کو اکبر کی بے دینی اور الحاد کا قلع قمع کرنے کے لئے تیار کیا تھا نواب مرتضیٰ خان اُن کے سرخیل تھے۔ معارج الکمال میں نوابِ موصوف کے بارے میں ایسی اہم معلومات ملتی ہیں جن کا ذکر مآثر الامراء اور ذخیرۃ الخوانین میں نہیں آیا۔ میں نے اس نادر مخطوطہ کی مدد سے نوابِ موصوف کی شخصیت اور کردار پر ایک مقالہ تیار کر کے ماہنامہ برہان دہلی میں چھپوایا ہے۔

اسی لائبریری میں "سیرتِ فیروز شاہی" کے عنوان سے ایک مخطوطہ محفوظ ہے۔ اس کا دوسرا نسخہ کسی لائبریری میں موجود نہیں۔ سیرتِ فیروز شاہی میں سلطان فیروز تغلق

کے علاوہ محمد بن تغلق کے بارے میں بھی بڑی اہم معلومات ملتی ہیں۔ مصنف لکھتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کو باز پالنے کا بڑا شوق تھا اور وہ باز دیکھ کر یہ بتا دیا کرتا تھا کہ وہ پہاڑی علاقے کا رہنے والا ہے یا جنگل کا۔ نیز اس کی پیدائش اونچے گھونسلے کی ہے یا کسی نشیبی علاقے کی۔ اس تصنیف سے سلطان فیروز شاہ تغلق کی اصلاحات اور غیر شرعی ٹیکسوں کی موقوفی کے بارے میں بڑی اہم معلومات ملتی ہیں۔

اس لائبریری میں "تاریخ حبیبی" کے عنوان سے ایک مخطوطہ محفوظ ہے۔ اس کا مصنف عبدالعزیز بن شیر ملک بن محمد واعظی خواجہ عزیز اللہ محمد حسینی کا صحبت یافتہ تھا۔ تاریخِ حبیبی کا سالِ تصنیف ۸۲۹ھ ہے اور اس میں حضرت بندہ نواز گیسو دراز اور ان کے فرزندوں اور خلفاء کے حالات درج ہیں۔ پروفیسر حسن عسکری نے راقم الحروف کو بتایا کہ تاریخِ حبیبی کا اصل نسخہ چھوٹی درگاہ پھلواری شریف میں تھا۔ یہ اس کی نقل ہے۔ اصل نسخہ گم ہو گیا ہے۔ اس لئے اس نقل کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔ دکن کے بہمنی سلاطین کو حضرت گیسو دراز اور ان کے جانشینوں کے ساتھ جو عقیدت تھی اس کا ذکر بار بار تاریخِ حبیبی میں آتا ہے۔

میری درخواست پر ڈاکٹر عابد صاحب نے مجھے حضرت عین الدین عبدالباری شطاری المشتہر بہ شاہ رکن الدین کے ملفوظات مطالعہ کے لئے دئے۔ صاحبِ ملفوظات اورنگ زیب عالمگیر کے ہمعصر تھے۔ ان کے جدِ امجد شاہ قاضن علاء شطاری کا شمار برِ عظیم پاک و ہند میں شطاریہ سلسلہ کے اساطین میں ہوتا ہے۔ شاہ قاضن کے فرزند حضرت ابوالفتح سرمست کو بہار میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہمایوں جب بہار آیا تو بڑی عقیدت کے ساتھ انہیں ملا اور ان کی پالکی کو کندھا دینے کی سعادت حاصل کی۔ ملفوظات کے اس مجموعہ میں اس عہد کے ایسے تاریخی واقعات آگئے ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتے۔ راقم الحروف نے ان ملفوظات کی اہمیت پر ایک مقالہ لکھا تھا جو ماہ نامہ المعارف لاہور میں چھپ چکا ہے۔

میں جس وقت لائبریری میں بیٹھا کام کر رہا تھا تو ایک مُسن بزرگ جن کی عمر اسی سال سے متجاوز تھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دارالمطالعہ میں داخل ہوئے اور میرے بالمقابل میز پر بیٹھ گئے۔ دارالمطالعہ کے انچارج نے ایک مخطوطہ لا کر ان کے سامنے رکھ

دیا اور وہ بزرگ اس کے مطالعہ میں محو ہو گئے۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ بزرگ پروفیسر حسن عسکری ہوں گے۔ میں نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان سے ان کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ وہ واقعی پروفیسر حسن عسکری ہیں۔ میں فوراً ان کے پاس گیا اور اپنا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ میں ان کے ایک شاگرد عباس بن عبدالقادر (م ۱۹۷۲ء) کا شاگرد ہوں۔ انہوں نے فوراً عباس صاحب کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے عرض کیا کہ انہیں ایک طالب علم نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے فوراً پوچھا کہ وہ مرتے وقت بھی قادیانی ہی تھا؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ عباس صاحب کی پھوپھی آنجہانی سارہ زوجہ مرزا بشیر الدین محمود (م ۱۹۶۵ء) مرزا رفیع احمد کی ماں تھی۔

پروفیسر حسن عسکری ہر روز لائبریری میں تشریف لاتے اور بڑی شفقت سے پیش آتے۔ ان کے توسط سے ایک آسٹریلوی نوجوان فادر پال جیکسن سے ملاقات ہوئی۔ یہ نوجوان پٹنہ کے ایک مشن سکول (سینٹ ژیویرز) میں پڑھاتا ہے اور اُردو بڑی روانی سے بولتا ہے۔ اس نے حضرت مخدوم شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کے "مکتوباتِ صدی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو امریکہ میں چھپا ہے۔ ان دنوں وہ مخدوم صاحب کے ملفوظات "خوانِ پُر نعمت" کا انگریزی میں ترجمہ کر رہا تھا۔ میں نے بھی اس مخطوطہ کی زیارت کی بلکہ ایک مطبوعہ نسخہ بھی مل گیا جو مطبع احمدی پٹنہ میں ۱۳۲۱ھ میں طبع ہوا تھا۔ اسی لائبریری میں مخدوم صاحب کے ملفوظات "معدن المعانی" کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی اہمیت پر ماہنامہ "الحق" میں میرا ایک مقالہ طبع ہو چکا ہے۔

خدا بخش لائبریری میں حضرت محی الدین چشتی قرشی المخلص بہ محمدی ساکن سنگو بن مضافاتِ راولپنڈی کے ملفوظات "احسن المجالس" کا ایک نادر مخطوطہ محفوظ ہے۔ نواحِ راولپنڈی کے کسی ریسرچ اسکالر کو اس تصنیف کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہیے۔

میں مطالعہ میں مصروف تھا کہ ایک صاحب چائے کا ایک گلاس لے کر آئے۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ یہ چائے ڈاکٹر عابد رضا صاحب نے بھیجی ہے۔ ساڑھے بارہ بجے عابد صاحب خود تشریف لائے اور دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھانے پر اصرار کیا۔ ڈیڑھ بجے میں ان کے ساتھ کھانے کے لئے گیا اور لائبریری کے ایک کمرے میں نمازِ

ظہر ادا کی اور دوبارہ مطالعہ میں معروف ہو گیا۔

چھ بجے لائبریری بند ہوئی تو میں اپنی قیام گاہ پر واپس آیا۔ نمازِ عصر کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا۔ مغرب کے وقت بارش شروع ہو گئی اس لئے میں باہر نہ جا سکا۔

اگلے روز صبح نو بجے لائبریری پہنچا۔ عابد صاحب سے مل کر دارالمطالعہ میں آیا اور شیخ پھول شطاری کی تصنیف "بحر الانوار" منگائی۔ یہ مختصر سا رسالہ شطاری سلوک پر ایک اہم تصنیف ہے۔ فاضل مصنف شیخ محمد غوث گوالیری کے بھائی اور ہمایوں بادشاہ کے مُرشد تھے۔ ہمایوں کے ایک باغی بھائی مرزا ہندال نے انہیں دعوت کے بہانے محل میں بلا کر قتل کرا دیا تھا۔

تاریخ بناکتی مصنفہ ابوسلیمان داؤد المعروف بہ فخر بناکتی، تاریخ ابوالخیر خانی مصنفہ حافظ البخاری، قصص بادشاہ نامہ از محمد طاہر آشنا اور صبح صادق مصنفہ صادق بن محمد صالح اصفہانی، کی زیارت لندن میں کی تھی۔ اب دوبارہ انہیں دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اخبار الاصفیاء کا مخطوطہ بھی انڈیا آفس لائبریری لندن میں دیکھا تھا۔ اب دوبارہ اس لائبریری میں اس کی زیارت کی۔

شیخ علی حزین (متوفی ۱۷۶۶ء) کی جتنی تصانیف خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہیں اتنی شاید ہی کہیں ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ان سے استفادہ کرتا۔

اس روز دوبارہ عابد صاحب نے اصرار کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھلایا۔ میں نے ان سے کہا کہ بہت تواضع ہو چکی ہے اب سہ بارہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

لائبریری کے عجائب خانہ میں چند اہم نوادرات نمائش کی غرض سے رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط بھارت کے آنجہانی صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کا ہے۔ یہ خط اُردو میں لکھا ہوا ہے۔ اس لئے یہاں اس کا پورا متن دے رہا ہوں۔

بمقام بھاگلپور ۱۸ مئی ۱۹۴۲ء

مکری تسلیم! اتحاد کا پرچہ ملا مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے میں کر رہا ہوں۔ اس وقت لوگوں میں ہمت لانے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایسے نظام کی جو اُن کے مصیبت کے وقت کام آوے۔ اس بنیاد پر میں زوروں سے دورہ کرکے لوگوں کو آمادہ

ہونے کو کہہ رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ سب لوگوں کا خیال مبذول ہو گا اور وقت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش میں سب کامیاب ہوں گے۔

نیاز مند: راجندر پرشاد

ڈاکٹر راجندر پرشاد کا خط منشیانہ تھا اور اس خط میں عربی و فارسی کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر نے بیجاپور جیل سے ایک غزل لکھ کر کسی دوست کو بھیجی تھی۔ یہ پوری غزل اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک شوکیس میں موجود ہے۔ اس غزل کا مطلع و مقطع یوں ہے۔

بے خوف غیر دل کی اگر ترجماں نہ ہو
بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو
جوہر اس ایک دل کے لئے اتنے مشغلے
کی ہے خدا کی چاہ تو عشقِ بتاں نہ ہو

ایک شوکیس میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ۲۵ دسمبر ۱۹۰۶ء کا تحریر کردہ ایک خط رکھا ہوا ہے۔ ان دنوں مولانا کسی اخبار کے عملہ میں شامل تھے۔ مولانا نے مالکِ اخبار سے ایک ماہ کی پیشگی تنخواہ کا مطالبہ کیا تھا۔ راقم کے پاس اس خط کا عکس موجود ہے۔

اگلے روز عابد صاحب نے لائبریری کے ہال میں نمازِ مغرب کے بعد "ملفوظات لٹریچر کی اہمیت" کے موضوع پر میرا لیکچر رکھ دیا۔ پٹنہ یونیورسٹی اور مدرسہ شمس الہدیٰ میں اس کی اطلاع کر دی۔ عابد صاحب کی فرمائش پر فادر پال جیکسن نے اس تقریب کی صدارت کی اور صدارتی خطبہ بھی دیا۔

لیکچر کے بعد عابد صاحب نے چیدہ چیدہ مہمانوں کو اپنے گھر چائے کی دعوت دی۔ اس لیکچر کا چرچا اگلے روز علمی حلقوں میں ہوا۔ میں لائبریری میں معروفِ مطالعہ تھا کہ پٹنہ یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر خواجہ افضل امام تشریف لائے اور اپنی ایک تالیف "دیوانِ فائز" عنایت کی۔ سید حسن پٹنہ یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے دیوانِ صاین ہروی مرتب کیا ہے۔ موصوف نے میرا لیکچر تو نہیں سنا لیکن

لوگوں سے اس کا چرچا ضرور سنا تو مبارک باد دینے آئے ۔ میرے پاس دیوانِ صاین کا ایک نسخہ موجود تھا جو مجھے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے عطا کیا تھا ۔ میں نے سیّد حسن صاحب سے ایک کاغذ پر دستخط کرا لئے اور لاہور آکر اسے اس دیوان پر چپکا دیا ۔

اگلے دن میں وقت نکال کر یونیورسٹی گیا ۔ شعبۂ تاریخ میں ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ ان کی تصنیف "ہندوستان میں وہابی تحریک" کراچی سے طبع ہو چکی ہے ۔ موصوف کا نسبی تعلق علماء صادق پور سے ہے جنھوں نے صدقِ دل کے ساتھ حضرت سیّد احمد بریلوی کا ساتھ دیا تھا ۔ اسی روز شام کے وقت مدرسہ شمس الہدیٰ میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا تھا ۔ اس مدرسہ میں قدیم اور جدید دونوں طرح کے علم پڑھائے جاتے ہیں ۔ عصر اور مغرب کی نمازیں مدرسے کی مسجد میں ادا کیں ۔ مسجد کے ایک گوشے میں جسٹس شمس الہدیٰ کی قبر ہے ۔ ایک استاد نے مجھے بتایا کہ جج صاحب ایک بار کسی گاؤں میں اپنے کسی عزیز کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی غرض سے گئے ۔ اتفاق سے وہاں کسی کو بھی نمازِ جنازہ یاد نہ تھی ۔ جج صاحب نے مسلمانوں کی دین سے غفلت دیکھ کر یہ مدرسہ قائم کیا تاکہ مسلمان طلبہ جدید علوم کے ساتھ علومِ اسلامیہ اور مسائلِ شریعت سے بھی واقفیت حاصل کر سکیں ۔ مدرسہ شمس الہدیٰ کا شمار بہار کے عظیم دینی مدارس میں ہوتا ہے ۔ ہمارے فاضل دوست پروفیسر مختار الدین احمد "آرزو" صاحب کے والد بزرگوار ملک العلماء ظفر الدین بہاری صاحب "صحیح بہاری" بھی اس مدرسہ کے پرنسپل رہ چکے ہیں ۔ آرزو صاحب نے راقم کو بتایا کہ ان کے ایک اُستاد مولانا عبدالشکور تو مظفر پوری بھی اس مدرسے میں پڑھاتے تھے ۔ ان کا یہ شعر بڑا مشہور ہے :

حسینوں سے محبت فرض ، واجب ہم نہیں کہتے
جوانی میں مگر ہاں مستحب معلوم ہوتی ہے

پٹنہ میں قیام کے آخری دن میں وقت نکال کر پھلواری شریف گیا ۔ یہ علمی اور رُوحانی بستی پٹنہ سے چار پانچ میل دُور ہوگی ۔ پٹنہ ریلوے اسٹیشن سے بسیں اور ٹیکے پھلواری تک جاتے آتے رہتے ہیں ۔

جس وقت میں پھلواری پہنچا تو ہر طرف کیچڑ ہو رہا تھا ۔ گلیوں اور بازاروں سے گزرنا مشکل تھا ۔ میں پوچھتے پوچھتے خانقاہِ سلیمانیہ پہنچا لیکن اب وہاں کون تھا ؟ شاہ غلام حسنین فوت ہو چکے تھے ۔ ان کے فرزند ریحان شاہ کراچی منتقل ہو چکے تھے ۔ شاہ غلام حسنین کی بیوہ اور ایک بیٹی اب تک وہیں ہیں ۔ شاہ سلیمان اور جعفر شاہ پھلواروی کی جمع کردہ کتابیں دیمک کی نذر ہو رہی ہیں ۔ پھلواری کے ہر پڑھے لکھے شخص کو ان کتابوں کی تلفی کا رنج تھا ۔

شاہ سلیمانؒ اور ان کے جانشین شاہ غلام حسنین بستی کے مشرقی کنارے پر سنگی مسجد کے صحن میں مدفون ہیں ۔ اس مسجد کو یہ شرف حاصل ہے کہ جب سیّد احمد بریلویؒ پھلواری تشریف لائے تو ان کا قیام اسی مسجد میں تھا ۔ مسجد کی دیواروں پر ایسے پتھر نصب ہیں جن پر آیاتِ قرآنی منقوش ہیں ۔

شاہ سلیمانؒ ۲۰ صفر ۱۳۵۴ھ بمطابق ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کو فوت ہوئے ۔ ان کا مزار ان کے ایک مرید ساکن جہلم نے تعمیر کرایا تھا ۔ شاہ غلام حسنین نے ان کے سوانحِ حیات "خاتمِ سلیمانی" کے عنوان سے قلم بند کئے تھے ۔ شاہ صاحب کو حضرت شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادیؒ (م ۱۸۹۵ء) سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۸۹۹ء) اور اپنے خسر شاہ محمد علی حبیب ابو نصر (م ۱۸۷۸ء) سے فیض ملا تھا ۔ ان کے اساتذہ میں میاں نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۹۰۲ء) جناب احمد علی سہارنپوری (م ۱۸۸۰ء) اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی (م ۱۸۸۶ء) جیسے بزرگ قابلِ ذکر ہیں ۔

پھلواری شریف کی شہرت خانقاہِ مجیبیہ کی وجہ سے ہے ۔ خانقاہ سے ملحق ایک مدرسہ بھی ہے جہاں مقامی اور بیرونی طلبہ تعلیم پاتے ہیں ۔ ایک پُرانی طرز کی مسجد اور اس سے ملحق ایک گنبد قابلِ دید ہیں ۔ اس گنبد میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک رکھا ہوا ہے جس کی خاص خاص موقعوں پر زیارت کرائی جاتی ہے ۔ خانقاہ مجیبیہ کی مسجد کے دروازے پر یہ عبارت کندہ ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعہد صد سال گشت چوں پختہ
مسجد خانقاہ بایں ترتیب

سال او گفت ہاتفی از حق
مسجد خانقاہ پیر مجیب

۱۲۳۹ھ

خانقاہ سے چند قدم کے فاصلہ پر شاہ محمد مجیبؒ (م ۱۷۷۷ء) کی درگاہ ہے۔ شاہ صاحب اور ان کی اہلیہ ایک گنبد کے نیچے محوِ خواب ابدی ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

منعم آنست کو نام و نشانم باقیست
گرچہ فانی شدہ ام شکر و بیانم باقیست

شاہ محمد مجیبؒ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہدِ حکومت میں ۱۰۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے سید محمد وارث رسول نما بنارسیؒ کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور رُوحانیت کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۱۹۱ھ میں ۹۳ برس کی عمر میں ہوا۔ شاہ محمد نورالحق مجیبی تپاں نے ان کی تاریخِ وفات کہی ہے جو درگاہ شریف کے ایک پتھر پر کندہ ہے:

نوشت از خطِ نور ایں دو کلمہ را رضوان
بسالِ رحلتِ شیخِ زمان بباب بہشت
ز بخت تیرہ شکایت مکن تپاں زنہار
کہ مہر روئے مجیب است آفتابِ بہشت

۱۱۹۱ھ

حضرت شاہ محمد مجیبؒ کی درگاہ سے متصل ایک دالان کے اندر کئی قبریں ہیں۔ ان میں سے شاہ محمد جعفر پھلواروی کے نانا ابو نصر محمد علی حبیبؒ (م ۱۸۶۸ء) ان کے فرزند شاہ محمد عبدالحق اور شاہ محمد شعیبؒ کی قبریں خاص طور نمایاں ہیں۔ ابونصر صاحب کی قبر کے سرہانے جو کتبہ نصب ہے وہ بدر الدین قادری صاحب کا نتیجۂ فکر ہے۔ اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

چوں بفردوس رفت مُرشدِ ما
از تپِ ہجر اُوست دل بریاں

سنِ میلاد و جانشینی و عمر
با وصالش کنم بحقق بیاں
شدہ شمس الضحیٰ سنِ میلاد
وارثِ ثانی جانشینی داں
وصلِ او شد بعینِ ذات نبی
عددِ عمر آں ولی برخواں

ابُونصر محمد علی حبیب کے فرزند شاہ عبدالحق کی قبر کے سرہانے دیوار پر ایک پتھر نصب ہے جس پر یہ اشعار کندہ ہیں:

عبدالحق ہست پُورِ محمد علی حبیب
خاکِ درش بروم چنانم آرزوست
آں عبدِ نیک ہر نفس از رُوح پاک نصر
گفتے کہ سیرِ گلشن عرفانم آرزوست
بعد از حصولِ علم چو شد سالکِ طریق
گفت از رسولؐ سایۂ دامانم آرزوست
آمد چو زیرِ سایۂ دامانِ مصطفیٰ
گفتار کہ وصلِ خالق ایمانم آرزوست
حیرت چو وقتِ وصلِ خدا شد قریب تر
میگفت از خدا کہ یک ارمانم آرزوست
آیند چار یار و رسولم بوقتِ نزع
از ابتدا بدیدۂ حیرانم آرزوست
حیرت عجب مکن کہ بقولِ جنابِ نصر
بہرِ وصال آنہمہ سامانم آرزوست

۱۳۰۲ھ

(نتیجۂ فکر مولوی کبیر احمد حیرت پھلواروی)

درگاہِ پیر مجیب سے نکل کر میں امارتِ شرعیہ صوبہ بہار کا دفتر دیکھنے گیا۔ وہاں

قاضی مجاہد الاسلام صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گزشتہ سال دیوبند کے جشن صد سالہ پر ان سے تعارف ہوا تھا۔ ان کے پاس "نقیب" کا ایک شمارہ پڑا تھا اس میں میرا بھی ایک مضمون تھا۔ قاضی صاحب نے مجھے رُکنے کو کہا۔ ان کی عدالت میں خلع کا ایک مقدمہ پیش ہونے والا تھا۔ قاضی صاحب نے مقدمہ کی کارروائی دیکھنے کے لئے کہا، مگر میں نے عدم فرصت کا عذر پیش کیا اور پٹنہ روانہ ہو گیا۔

پٹنہ، سکھوں کا بڑا مقدس مقام ہے اور وہ اسے احتراماً پٹنہ صاحب کہتے ہیں۔ سکھوں کے چار اکال تخت ہیں، ان میں سے ایک پٹنہ میں ہے۔ یہیں ۱۶۶۶ء میں سکھوں کے دسویں اور آخری گورو، گوبند سنگھ پیدا ہوئے تھے۔ ان کی جائے ولادت پر بہت بڑا گوردوارہ تعمیر کیا گیا ہے۔ پٹنہ کے پہلے سفر میں راقم نے یہ گوردوارہ دیکھا تھا۔ وہاں ایک کمرے میں بڑے احترام کے ساتھ گورو گوبند سنگھ کی کھڑاویں رکھی ہوئی ہیں۔ سکھ دُور دُور سے ان کے درشنوں کو آتے ہیں۔

عابد صاحب نے مجھے رخصت کرتے ہوئے خدا بخش لائبریری میں محفوظ عربی فارسی اور اُردو مخطوطات کی مکمل فہرست عنایت فرمائی اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے جرنل کا مکمل سیٹ بھی دیا۔ میں پٹنہ میں شاد عظیم آبادی کی قبر اور خانقاہ عمادیہ دیکھنا چاہتا تھا، لیکن بارش کی وجہ سے وہاں نہ جا سکا۔ ۲۷ اگست کی شام کو میں سون بھدرہ ایکسپریس میں سوار ہو کر اگلے روز صبح نو بجے علی گڑھ پہنچ گیا۔

لکھنؤ اور اُس کے اطراف

۲۸ اگست ۱۹۷۸ء کو نمازِ مغرب کے قریب میں شاہجہان پور پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ایک ہوٹل میں قیام کیا اور نہا دھو کر قاری محمد بشیر الدین پنڈت سے ملنے گیا۔ ان کے ساتھ میرے ۱۹۵۲ء سے دوستانہ مراسم ہیں۔ قاری صاحب گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور میں تاریخ کے پروفیسر اور بعد ازاں پرنسپل رہ چکے ہیں۔ انہوں نے "تاریخ ہندی قرونِ وسطیٰ" کے عنوان سے برِّعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کے ابتدائی دورِ حکومت پر ایک عالمانہ کتاب تحریر کی تھی جس پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دو عظیم اساتذہ پروفیسر محمد حبیب (م ۱۹۷۱ء) اور پروفیسر شیخ عبدالرشید (م ۱۹۹۳ء) نے بڑی فاضلانہ تقاریظ لکھی تھیں۔ قاری صاحب کو سنسکرت پر بڑا عبور حاصل ہے اور اسی بناء پر انہیں پنڈت کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی دو گھنٹے تک صحبت رہی اور چلتے وقت انہوں نے اپنی تصانیف کا ایک سیٹ عطا فرمایا۔

رات ہوٹل میں گذاری اور نمازِ فجر کے بعد میں لکھنؤ جانے والی ٹرین میں سوار ہوا۔ ۶۳ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے ٹرین ہردوئی جا کر رُکی اور بلگرام جانے والے مسافر ٹرین سے اتر گئے۔ بلگرام اودھ کا ایک تاریخی قصبہ ہے جس کی خاک سے علامہ زبیدی، نظام الدین مُدھ نائک اور آزاد بلگرامی جیسی صدہا ہستیاں اٹھیں۔

ہردوئی سے چل کر ہماری ٹرین ۴۴ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے بالمؤ جا کر رُکی۔ یہ ناردرن ریلوے کا مشہور جنکشن ہے اور یہاں سے ایک ریلوے لائن کانپور جاتی ہے۔ اسی ریلوے لائن پر ۴۳ کلو میٹر کے فاصلے پر گنج مراد آباد ہے جہاں حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی (م ۱۸۹۵ء) محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ مولانا محمد علی مونگیری (م ۱۹۲۷ء) بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ اور نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی (م ۱۹۵۰ء) کو ان سے شرفِ بیعت تھا۔ گنج مراد آباد سے اگلا ریلوے اسٹیشن بانگر مؤ ہے جسے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی (م ۱۹۵۷ء) کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

بالمؤ سے ۵۵ کلومیٹر کے فاصلے پر کاکوری واقع ہے جہاں قلندریہ سلسلے کی ایک قدیم خانقاہ ہے جس کی لائبریری میں بڑے نادر مخطوطات موجود ہیں ۔ یہ مشہور نعت گو شاعر محسن کاکوروی (م ۱۹۰۵ء) کا وطن ہے اور مفتی عنایت احمد کاکوروی (م ۱۸۶۳ء) بھی یہیں کے رہنے والے تھے ۔ کاکوری سے لکھنؤ کا فاصلہ صرف چودہ کلومیٹر ہے اور درمیان میں عالم نگر نام کا ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن پڑتا ہے ۔

جب میں لکھنؤ پہنچا تو اس وقت دس بج چکے تھے ۔ میں نے چار باغ اسٹیشن کے بالمقابل شرما ہوٹل میں قیام کیا ۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران میں راقم الحروف نے اواخر شعبان میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا تھا جس میں لکھنؤ آنے اور ندوۃ العلماء دیکھنے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی ۔ موصوف نے فوراً جواب سے سرفراز فرمایا اور ندوۃ العلماء کے مہمان خانے میں قیام کرنے کی دعوت دی ۔ لیکن میں نے ندوہ کے مہمان خانے میں قیام کرنے کی بجائے شہر میں رہنا پسند کیا ۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ لکھنؤ میں میرا پروگرام بڑا مختصر تھا اور ندوہ گومتی ندی کے پار دو پُلوں کے درمیان ایک ایسی جگہ واقع ہے جہاں سے سواری ملنی مشکل ہے اور سواری کے حصول کے لئے کافی چل کر کسی ایک پُل تک جاتے ہیں ۔

میں نے ہوٹل میں پہنچ کر غسل کیا اور لباس تبدیل کرکے لکھنؤ کی سیر کا پروگرام بنایا ۔ میں ۴۳ برس بعد لکھنؤ آیا تھا اس لئے اب بہت سی جگہوں کے نام بھی ذہن سے محو ہو چکے تھے ۔ میں نے ایک رکشا والے کو امین آباد چلنے کو کہا ۔ امین آباد لکھنؤ کا مرکزی کاروباری علاقہ ہے اور اسے لاہور کی انارکلی یا کراچی کے صدر کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں ۔ کسی زمانے میں چاروں طرف دکانیں تھیں اور درمیان میں ایک وسیع پارک تھا ۔ لیکن اب اس پارک میں بھی دکانیں اور مارکیٹیں بن چکی تھیں ۔ امین آباد میں مجھے مسلمان کتب فروشوں کی چند دکانیں نظر آئیں ۔ میں رکشا سے اتر کر ایک دکان پر پہنچا اور علیک سلیک کے بعد شاہ مینا کی درگاہ کا پتہ پوچھا ۔ دکاندار نے بتایا کہ ان کی درگاہ بڑی معروف ہے اور میڈیکل کالج کے چوک میں واقع ہے رکشا والے یہاں سے سوا روپیہ لے کر وہاں پہنچا دیتے ہیں ۔

میں امین آباد سے رکشا میں سوار ہوا اور گوئن روڈ ، گولہ گنج اور وزیر گنج ہوتے

ہوئے میڈیکل کالج کے چوک میں پہنچ گیا ۔ کالج کے مین گیٹ کے قریب ہی درگاہ کا صدر دروازہ تھا ۔ میں بڑے اشتیاق کے ساتھ شاہ مینا کے مزار پر حاضر ہوا ۔

شاہ مینا کا شمار عہدِ سلاطین کے نامور اولیاء اللہ میں ہوتا ہے ۔ موصوف ۱۳۹۸ء میں پیدا ہوئے اور چوراسی سال کی عمر میں (م ۱۴۷۹ء) میں راہئ ملکِ بقا ہوئے ۔ انہیں شیخ سارنگ (م ۱۴۵۱ء) سے فیض ملا تھا ۔ شیخ موصوف نے مخدوم جہانیاں سیّد جلال الدین جہاں گشت کے بھائی سیّد راجو قتال اور ان کے خلیفہ شیخ قوام الدین (م ۱۳۹۸ء) سے فیض اخذ کیا تھا ۔ شاہ مینا کے ملفوظات ، جو ان کے ایک مرید سیّد محی الدین رضوی ساکن ایٹھی نے جمع کئے تھے ، گذشتہ صدی کے اواخر میں ہردوئی سے طبع ہو چکے ہیں ، لیکن اب نایاب ہیں ۔ اس کا ایک نسخہ مجھے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں مل گیا تھا جس کا میں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا اور "احوال و آثارِ شاہ مینا لکھنوی" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھ کر اورینٹل کالج میگزین لاہور میں چھپوایا ۔

ملفوظات کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شاہ مینا ایک صوفی ہی نہ تھے بلکہ ایک جیّد عالم بھی تھے ۔ انہوں نے اپنی سعی و کاوش سے مروجہ تصوّف کو قرنِ اوّل کا احسان بنا دیا تھا ۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) سے الفاظ مستعار لے کر عرض کرتا ہوں کہ ان کا یہ قول تو دل میں رکھ لینے کے لائق ہے :

"ہرچہ ورائے فرض و واجب و سُنّت و مستحب و راحت اصحاب است ،
ہمان لایعنی است" ۔

ہمارے سرکاری مدارس میں جو نصابی کتب رائج ہیں ان میں طالب علموں کو یہی پڑھایا جاتا ہے کہ کششِ ثقل کا نظریہ مشہور برطانوی سائنسدان نیوٹن (م ۱۷۲۷ء) نے دریافت کیا تھا ۔ شاہ مینا ، نیوٹن کی ولادت سے دو صدیاں پہلے فرماتے ہیں کہ حرکت کی تین اقسام ہیں ۔ طبعی ، ارادی اور قسری ۔

۱ ۔ اما حرکتِ طبعی کہ بطبع خود بجنبد ۔ چنانچہ سنگے را از دست بگذارند البتہ بر زمین افتد ۔

۲ ۔ حرکتِ ارادی آنست بمرادِ خود حرکت کند بہر طرف کہ خواہد ۔

۳ ۔ حرکتِ قسری آنست کہ او را دیگرے در حرکت آرد چنانکہ مثلاً سنگے در ہوا

اندازد آنرا حرکت قسری گویند ۔ باز چوں قوت اُو کم شود ہر آئینہ بخاصیت خود بر زمین افتد ۔

میری ناقص رائے میں شاہ مینا نے جس انداز سے حرکت کی وضاحت کی ہے ، نیوٹن کا ذہن وہاں تک نہیں پہونچ سکا ۔

شاہ مینا کا روضہ ۱۹۷۷ء میں کندھی لال نامی ایک ہندو کی بیوہ نے چالیس ہزار روپے کی لاگت سے تعمیر کروایا ہے ۔ جو ایک غیر مسلم کی شاہ صاحب کے ساتھ عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔ میرے دل میں مدتوں سے ان کا مزار دیکھنے کی بڑی تمنا تھی جو خدا تعالیٰ نے ۱۵ اگست ۱۹۷۸ء کو پوری کر دی ۔

شاہ مینا کی درگاہ سے باہر نکلا تو وہی رکشا والا کسی سواری کا منتظر کھڑا تھا ۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ فرنگی محل جانتا ہے ؟ اس نے کہا کہ مدرسے چلیں گے ؟ میں نے اثبات میں جواب دیا اور تھوڑی دیر میں وہ مجھے محلہ پانا نالہ میں دارالمبلغین لے گیا ۔ میں نے کہا کہ میں نے تو تمہیں فرنگی محل چلنے کو کہا تھا ۔ اس نے کہا کہ اس نے مجھ سے پہلے ہی پوچھ لیا تھا کہ مدرسے چلیں گے ؟ میں نے کہا کہ وہ بھی مدرسہ ہے ۔ بہر حال اب جہاں آگیا ہوں تو لگے ہاتھوں اسے بھی دیکھتا چلوں ۔

میں رکشا والے کو رخصت کر کے دارالمبلغین میں داخل ہوا ۔ یہ ادارہ امام اہلسنت مولانا عبدالشکور مجددیؒ (م ۱۹۴۲ء) کی یادگار ہے ۔ مرحوم بڑے کامیاب مناظر اور مجلہ " النجم " کے مدیر تھے ۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے عبدالسلام اور عبدالسمیع اس ادارے کو چلاتے رہے ۔ ان دنوں اوّل الذکر کے صاحبزادے عبدالحی فاروقی اس خاندان کے سربراہ ہیں لیکن ان کا قیام تغلق آباد دہلی میں ہے جہاں موصوف ہمدرد کے ایک تحقیقی ادارے سے منسلک ہیں ۔ ۱۹۷۴ء میں میرا تغلق آباد میں چھبیس روز قیام رہا ۔ ان دنوں ان سے روزانہ ملاقات رہتی تھی ۔ موصوف نے ایم اے تک تعلیم پائی ہے اور اب پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کے ساتھ گاہے ماہے خط و کتابت ہوتی رہتی ہے ۔

جس وقت میں دارالمبلغین میں داخل ہوا اس وقت انتظامیہ میں دو صاحبان موجود تھے ۔ میں نے عبدالحی صاحب کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پندرہ

روز پہلے یہیں تھے ۔ ان سے ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس رہا ۔ میں نے " النجم " کے بارے میں استفسار کیا تو جواب ملا کہ ادارے میں بھی اس کی مکمل فائل موجود نہیں ہے ۔

۱۹۵۲ء میں جب میں پہلی بار لکھنؤ آیا تھا ان دنوں میرا قیام دارالمبلغین سے ملحق جناب صابر صدیقی کے مکان میں تھا ۔ اس زمانے میں مولانا عبدالشکور صاحب بقید حیات تھے اور نماز کے وقت ان کی زیارت ہو جایا کرتی تھی ۔

اسی محلّے میں ایک عمارت غسل خانہ کے نام سے موسوم ہے جہاں شیعہ حضرات اپنے مُردوں کو غسل دیتے ہیں ۔ میرے استفسار پر لوگوں نے بتایا کہ لکھنؤ کے شیعہ مُردوں کو اپنے گھروں میں غسل نہیں دیتے اور انہیں یہیں لا کر نہلاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس محلّے سے ہر آن جنازے نکلتے دکھائی دیتے ہیں ۔

میں پانا نالہ سے باہر نکلا تو ایک راہگیر نے میرے استفسار پر مجھے بتایا کہ میں فرنگی محل سے بالکل قریب ہوں اور سڑک کے پار جو مکان نظر آرہے ہیں ، فرنگی محل کی عمارت انہی مکانوں کے عقب میں ہے ۔

میں پُوچھتے پُوچھتے فرنگی محل پہنچا ۔ عمارت کا صدر دروازہ اندر سے بند تھا اور اس پر محمد رضا انصاری کا بورڈ آویزاں تھا ۔ اہلِ محلّہ نے بتایا کہ اب مدرسہ بند ہو چکا ہے ۔ یہ سن کر مجھے بڑا افسوس ہوا کہ علمائے فرنگی محل کی یہ عظیم یادگار اب ختم ہو گئی ہے ۔

فرنگی محل دراصل ایک فرانسیسی تاجر کی کوٹھی تھی جو مغل شہنشاہ اورنگ زیبؒ نے اُستاد الحلماء مولانا نظام الدین انصاری (م ۱۷۴۸ء) کے بھائی محمد سعید سہالوی کو مدرسہ کھولنے کے لئے عطا کی تھی ۔ ان کی سعی و کاوش سے فرنگی محل برِّعظیم میں علوم عقلی کا سب سے بڑا مرکز بن گیا ۔ موصوف کے بعد ان کے فرزندِ ارجمند علامہ عبدالعلی بحر العلوم (م ۱۸۲۰ء) نے بڑا نام پایا ۔ ان کے زمانے میں پاک و ہند کے علمی اور دینی حلقوں میں فرنگی محل کا سکّہ چلتا تھا ۔ آخری دور میں علی برادران کے پیرِ طریقت مولانا عبدالباری فرنگی محلی (م ۱۹۲۶ء) نے مسندِ درس کو زینت بخشی اور ان ہی کے فتویٰ پر تحریک ہجرت شروع ہوئی ۔ ان کے بعد جمال میاں نے اپنی علمیت کا لوہا منوایا ۔ موصوف فرنگی محل کے آخری بڑے اُستاد تھے جو قیامِ پاکستان کے بعد کراچی چلے آئے ۔

لکھنؤ کے مسلمانوں کو فرنگی محل کے بند ہونے کا بڑا افسوس تھا ۔ میں نے کہا کہ

اس کی ایک وجہ ندوۃ العلماء کی کشش اور روز افزوں ترقی بھی ہو سکتی ہے۔ بعض لوگوں نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔ مجھے فرنگی محل کا کتب خانہ دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا لیکن انصاری صاحب کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ لکھنؤ کے دوسرے سفر میں مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی اور خوب ہوئی۔

میں فرنگی محل سے دل برداشتہ ہو کر سڑک پر آیا تو سامنے شاہ مینا کی درگاہ نظر آئی میں دوبارہ وہاں پہنچا اور سجادہ نشین صابر میاں سے شیخ قوام الدین (م ۱۳۹۸ء) کے مزار کا پتہ پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ شیخ موصوف کا مزار میڈیکل کالج کے اندر نرسز ہوم کے قریب ایک احاطے میں واقع ہے۔ پھر ان کے دل میں خدا جانے کیا خیال آیا کہ وہ میرے ساتھ چل پڑے اور ہم تین چار منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔

شیخ قوام الدین کا مزار ایک وسیع احاطے میں واقع ہے اور اس کی صفائی کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ موصوف شاہ مینا کے دادا مرشد اور مخدوم جہانیاں کے خلیفہ تھے۔ شیخ قوام کا انتقال شاہ مینا کی ولادت سے چالیس روز پہلے ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق ان کی بیوہ نے نومولود کو اپنا دودھ پلایا۔ ملفوظات شاہ مینا کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے تصوّف کے موضوع پر کئی بلند پایہ کتابیں تصنیف کی تھیں۔ ملفوظات میں ان کے بارے میں مرقوم ہے کہ موصوف سُنّی ہونے کے باوجود فقہ جعفری پر عمل کیا کرتے تھے۔ یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ ایک سُنّی کس طرح فقہ جعفری پر عمل کر سکتا ہے۔

میں صابر میاں کے ساتھ احاطۂ مزار سے باہر آیا تو کالج کے عقب میں مینارے نظر آئے۔ میرے استفسار پر صابر میاں نے بتایا کہ وہ آصف الدولہ (م ۱۷۹۷ء) کا امام باڑہ ہے۔ میں نے وہاں جانے کا راستہ پوچھا تو کہنے لگے کہ اگر اسی سڑک پر چلتا جاؤں اور آگے جا کر بائیں ہاتھ گھوم جاؤں تو میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہوا آصف الدولہ کے امام باڑے پہنچ گیا۔ لکھنؤ والے اسے بڑا امام باڑہ کہتے ہیں۔

امام باڑے کے اندر کئی تعزیئے پڑے تھے۔ ان میں سے ایک تعزیہ بتاشے کا بنا ہوا تھا اور دوسرا رُوئی سے بنایا گیا تھا۔ ایک غالباً ابرک کا بنا ہوا تھا۔ ہال کے وسط میں

نواب مذکور کی قبر تھی جس پر سیاہ رنگ کی چادر چڑھی ہوئی تھی۔ ہال کی چھت پر بھول بھلیاں ہیں جنہیں دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا ہوتا ہے۔ میں گذشتہ سفر لکھنؤ کے دوران میں انہیں دیکھ چکا تھا اس لئے اس بار انہیں دیکھنے کو طبیعت نہ چاہی۔

امام باڑے کے اندر گومتی کے سیلاب کی متعدد تصاویر آویزاں ہیں۔ یُوں تو ۱۹۵۹ء کے سیلاب میں حضرت گنج میں ناؤ چلنے لگی تھیں لیکن ۱۹۲۳ء جیسا سیلاب پھر کبھی گومتی میں نہیں آیا۔ ہال میں زیادہ تر تصویریں اسی ریکارڈ سیلاب کی تھیں۔

امام باڑے سے باہر نکلا تو دائیں ہاتھ ایک بڑی وسیع لیکن ویران سی مسجد نظر آئی اور بائیں ہاتھ باؤلی کی عمارت تھی جو بڑی خستہ حالت میں تھی۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے ٹکٹ خریدنا ہوتا ہے۔ میں ٹکٹ لیکر اندر گیا اور خوب گھوم پھر کر اس عمارت کا جائزہ لیا۔

امام باڑے سے باہر رُومی گیٹ ایک قابلِ دید عمارت ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ رُومی گیٹ اور فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ (م ۱۷۷۵ء) کے مقبرے کا صدر دروازہ ایک ہی سیدھ میں ہیں، حالانکہ دونوں کے درمیان ساٹھ میل کا فاصلہ ہے۔

رُومی گیٹ سے گزر کر میں اَودھ آرٹ گیلری دیکھنے گیا۔ راستے میں گھنٹہ گھر بھی ایک قابلِ دید عمارت ہے۔ سقوطِ لکھنؤ کے بعد انگریزوں نے بڑے اور چھوٹے امام باڑے اور حسین گنج پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب شیعہ عمائدین کے اصرار پر انگریزوں نے گزشتہ صدی کے اواخر میں یہ عمارتیں واگزار کیں تو شیعوں نے شکریہ کے طور پر اودھ کے انگریز گورنر کی یاد تازہ رکھنے کے لئے یہ عمارت تعمیر کی۔ گھنٹہ گھر کے ایک کتبے پر اس کا ذکر موجود ہے۔

گھنٹہ گھر سے چند قدم کے فاصلے پر اَودھ آرٹ گیلری ہے جو حسین آباد ٹرسٹ کے زیر اہتمام چل رہی ہے۔ اس میں بھی داخلے کے لئے ٹکٹ خریدنا ہوتا ہے۔ گیلری میں اَودھ کے تمام حکمرانوں کی قدِ آدم تصویریں آویزاں ہیں۔ ایک گوشے میں حسین آباد ٹرسٹ کے سربراہوں کی تصویریں بھی لٹکائی ہوئی ہیں۔

اَودھ آرٹ گیلری سے نکل کر میں چھوٹا امام باڑہ دیکھنے گیا جو وہاں سے بمشکل دو سو گز دُور ہو گا۔ اس کا سنہری گنبد دُور سے زائرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

امام باڑے کی نسبت یہ چھوٹا امام باڑہ بہت خوب صورت ہے ۔ اس کے اندر اس کا بانی نواب امجد علی (م ۱۸۴۷ء) اور اس کی والدہ دفن ہیں ۔ ہال کے اندر جھاڑ فانوس بکثرت لگے ہوئے ہیں ۔ محرّم کے دنوں میں یہاں روشنی کرتے ہیں جنہیں دیکھنے کے لئے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں ۔ امام باڑے کے صحن میں ایک نہر ہے جس میں لکڑی کا ایک گھوڑا ہر وقت تیرتا رہتا ہے ۔ ایام محرّم میں اسے سجا کر شبیہ ذوالجناح بنا لیتے ہیں ۔ صحن کے ایک طرف نواب امجد علی کی بیٹی کا مقبرہ ہے اور اس کے مقابل ایک ویسی ہی عمارت ہے جو محض تقابل کے لئے بنائی گئی ہے ۔ صدر دروازے کے اندر پیتل کے دو بُت نصب ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں زنجیریں تھامی ہوئی ہیں ۔ ان بُتوں کے گھمانے سے زنجیر گھوم جاتی ہے اور صدر دروازہ خود بخود بند ہو جاتا ہے ۔ مجھے علی گڑھ واپس آنے پر ایک واقفِ حال نے بتایا کہ یہ تھیلر کریمینؒ کے بُت ہیں جو امام باڑے کی دربانی پر مامور ہیں۔ واللہ علم بالصواب۔

چھوٹے امام باڑے سے نکلتے ہی مجھے رکشا مل گیا اور میں پندرہ بیس منٹ میں ندوۃ العلماء پہنچ گیا ۔ جب میں ۲۳ برس قبل یہاں آیا تھا اس زمانے میں یہاں ایک سادہ سی مسجد تھی ۔ مولانا عمران خان (م ۱۹۸۶ء) نے اپنی نگرانی میں یہاں بڑی شاندار مسجد تعمیر کروائی اور پھر ویسی ہی مسجد دارالمصنفین اعظم گڑھ میں بنوائی ۔

ندوہ کی شاندار عمارت گومتی کے پار ڈالی باغ اور قیصر باغ کے ٹیلوں کے درمیان لکھنؤ یونیورسٹی کے پہلو میں ہے ۔

میں مین گیٹ سے سیدھا مولانا ابوالعرفان ندوی کی قیام گاہ پر پہنچا ۔ اتفاق سے موصوف اس وقت گھر میں موجود تھے ۔ میرے یوں اچانک وہاں پہنچ جانے سے انہیں بڑی مسرت ہوئی انہوں نے فوراً اچھی سی چائے لانے کا حکم دیا اور میں دیر تک ان کے پاس بیٹھا پرانی یادیں تازہ کرتا رہا ۔

مولانا ابوالعرفان ندوی سے مل کر میں لائبریری کی طرف روانہ ہو ۔ اتفاق دیکھیے کہ اس وقت سید صباح الدین عبدالرحمن (م ۱۹۸۷ء) مدیر" ماہنامہ معارف " اعظم گڑھ لائبریری سے باہر تشریف لا رہے تھے ۔ میں انہیں دیکھ کر ان کی طرف بڑھا ۔ موصوف بڑی محبت سے ملے اور کافی دیر تک ایک درخت کے نیچے کھڑے میری اور میرے احباب

کی خیر و عافیت دریافت فرماتے رہے ۔ انہوں نے میرے قیام کے بارے میں سوال کیا تو میں نے عرض کیا کہ میں چار باغ کے قریب ایک ہوٹل میں مقیم ہوں ۔ انہوں نے فوراً ندوۃ العلماء کے مہمان خانے میں قیام کرنے کی دعوت دی ، لیکن میں نے ہوٹل میں قیام کو ترجیح دی ۔ سیّد صاحب نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ اس وقت میرا پروگرام کیا ہے ؟ میں نے بتایا کہ میں لائبریری میں چند مخطوطات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں ۔ اس لئے وہ لائبریرین کے ساتھ میرا تعارف کروا دیں ۔ سیّد صاحب میرے ساتھ لائبریری تک آئے اور لائبریرین سے ایسے الفاظ میں میرا تعارف کروایا کہ مجھے فوراً تردید کرنا پڑی کہ میں ایسا عالم و فاضل نہیں ہوں جیسا کہ سیّد صاحب کہتے ہیں ۔ سیّد صاحب تھوڑی دیر تک وہاں رُکے اور جاتے وقت مجھے کہہ گئے کہ عصر کی نماز کے وقت مسجد میں ملاقات ہو گی ۔

ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیریؒ (م ۱۹۲۷ء) کی یادگار ہے ۔ موصوف یہ سمجھتے تھے کہ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ عموماً دین سے بیگانہ رہتے ہیں اور دارالعلوم دیو بند کے فضلاء دنیاوی اُمور سے ناواقف ہوتے ہیں ۔ اس لئے ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہیے جو علی گڑھ اور دیو بند کا سنگم ہو ۔ انہوں نے اپنے ہم خیال علماء کا ایک کنونشن طلب کیا اور اُنیسویں صدی کے آخر میں ندوہ کی بنیاد رکھ دی ۔ اب اس ادارے کا شمار ایشیاء کے عظیم علمی مراکز میں ہوتا ہے ۔ ندوہ کے موجودہ سربراہ مولانا ابوالحسن علی ندوی المعروف بہ مولانا علی میاں کے عہدِ نظامت میں اس ادارے نے بڑی ترقی کی ہے ۔ اب وہاں جدید طرز کے دو ہوسٹل تعمیر ہوئے ہیں اور لائبریری کی کئی منزلہ عمارت بن رہی ہے ۔ ندوہ کی مسجد بھی قابلِ دید ہے ۔ وہاں نماز پڑھ کر ایک عجیب روحانی سرور محسوس ہوتا ہے ۔

فی الحال لائبریری پُرانی عمارت میں ہے ۔ لائبریری کے ہال میں داخل ہوتے ہی ندوہ کے عظیم فرزندوں اور ان کے علمی کارناموں کی فہرستیں نظر آتی ہیں ۔ ندوہ کو سیّد سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) سیّد ابوالحسن علی ندوی ، مولانا مسعود عالم ندوی (م ۱۹۵۴ء) ، مولانا عبدالسلام ندوی (م ۱۹۵۶ء) ریاست علی ندوی (م ۱۹۷۶ء) مولانا عبد السلام قدوائی ، شاہ معین الدین احمد ندوی (م ۱۹۷۴ء) اور مولانا محمد حنیف ندوی (م ۱۹۸۷ء) پر بڑا فخر

ہے۔ اسی ہال میں ایک بورڈ آویزاں ہے جس پر ندوہ کے مقاصد اور اس کا مسلک تحریر ہے۔

میری درخواست پر لائبریرین صاحب نے مجھے "لطائفِ اشرفی" کے دو مخطوطے اور ایک مطبوعہ نسخہ فراہم کر دیئے۔ میں نے اس تصنیف کا بغور مطالعہ کیا اور نوٹس لئے۔ لطائفِ اشرفی، مخدوم جہانگیر اشرف سمنانی (م ۱۴۰۵ء) کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے ایک مرید حاجی نظام غریب یمنی نے مرتب کیا تھا۔ حضرت جہانگیر اشرف نے بڑی سیاحت کی تھی اور دورانِ سفر انہوں نے کچھ عرصہ شیراز میں لسان الغیب حافظ کے ساتھ بھی گزارا تھا۔ ملفوظات میں انہوں نے حافظ کو "یکے از مجذوبانِ درگاہ عالی و محبوبانِ بارگاہ متعالی" کے القاب سے یاد کیا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر آنجناب فرماتے ہیں کہ خواجہ حافظ اویسی تھے۔ ان کے دیوان جیسا کوئی دوسرا دیوان ان کی نظروں سے نہیں گزرا اور ان کے کلام کی قدر صرف ایک صوفی ہی پہچان سکتا ہے۔

میں ظہر کی نماز تک لطائفِ اشرفی کا مطالعہ کرتا رہا۔ نماز کے بعد سیّد صباح الدین سے ملاقات ہوئی اور وہ مجھے اپنے ساتھ مہمان خانے لے گئے۔ اس وقت مولانا علی میاں بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ سیّد صاحب نے میرا ان کے ساتھ تعارف کرانا چاہا تو مولانا نے فرمایا کہ اس سے قبل ہماری تین بار ملاقات ہو چکی ہے۔ یہاں ان کے حافظہ کی داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہو گی۔

تھوڑی دیر میں کھانا لگ گیا۔ دسترخوان پر بارہ تیرہ مہمان تھے۔ مولانا نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا "یہ طالب علمانہ کھانا ہے۔ اگر پہلے اپنی آمد کی اطلاع دی ہوتی تو آپ کے لئے بطورِ خاص کھانا تیار کرواتے"۔ میں نے عرض کیا کہ دسترخوان پر بہت کچھ ہے اور یہ میرے لئے تبرک ہے۔ جب کھانا کھا چکے تو مولانا نے ایک صاحب سے مٹھائی کا ڈبہ لانے کو کہا۔ ڈبہ کھولا گیا تو اس میں سے پیسٹریاں نکلیں۔ مولانا نے آدھی پیسٹری خود اپنے سامنے رکھ لی اور بقیہ آدھی مجھے عنایت فرمائی۔ سیّد صباح الدین نے ایک سالم پیسٹری میری پلیٹ میں رکھتے ہوئے فرمایا کہ اسے پنجابیوں کی طرح کھائیے۔ جب حاضرین پیسٹریاں کھا چکے تو مولانا علی میاں کی نظر مولانا ابوالعرفان پر پڑی۔ موصوف ذیابیطس کے مریض تھے اس لئے شیرینی سے پرہیز کرتے تھے۔ مولانا علی میاں

نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "بھئی عرفان صاحب! معاف فرمایئے۔ ہمیں آپ کا خیال نہیں رہا۔ ایسی چیزوں کا تو آپ سے پردہ کرانا چاہیے"۔ اس پر حاضرین بیساختہ ہنس دیئے۔

شام تک میں نے لائبریری میں کام کیا اور نمازِ عصر کے بعد مولوی انوار کا باغ دیکھنے گیا۔ یہ باغ دراصل علمائے فرنگی محل کا قبرستان ہے۔ یہ قبرستان آبادی کے اندر گھرا ہوا ہے۔ چار دیواری کے اندر سنگِ مرمر کی ایک چھتری کے نیچے مولانا عبدالباری محو خواب ابدی ہیں۔ چھتری کی چوکھٹ پر اکبر الہ آبادی کا یہ شعر کندہ ہے:

اے چرخ ہوائے شوق چلے، اے شاخِ گل گلباری کر
کچھ کام کریں، کچھ سعی کریں، ہر شیخ کو عبدالباری کر

مولانا عبدالباری کی چھتری سے ملحق ایک چھوٹے سے کمرے میں انوار میاں، رزاق میاں، عبدالوالی، عبدالحمید، عبدالغفار، احمد عبدالحق اور مولوی عبدالوہاب، آسودۂ خاک ہیں۔ یہ سب اسی خاندان کے افراد ہیں۔

مولانا عبدالباری کے مزار سے جانبِ جنوب چند گز کے فاصلے پر مولانا سیّد فضل الحسن حسرت موہانی (م ۱۹۵۱ء) کی قبر ہے۔ اس پر سوائے نام کے اور کوئی تحریر کندہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ سال وفات بھی درج نہیں ہے۔ حسرت موہانی مولانا عبدالوہاب کے مرید خاص تھے۔ اس لئے وہ آخری عمر میں فرنگی محل میں آبسے تھے۔ یہیں ان کا انتقال ہوا اور ان کے مرشد کے آستانے سے ہی ان کا جنازہ اٹھا اور انہی کے قدموں میں دفن ہوئے۔ انہوں نے اپنے ایک شعر میں اپنے مرشد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

کیا چیز تھی وہ مُرشدِ وہاب کی نگاہ
حسرت کو جس نے عارفِ کامل بنا دیا

قبرستان کی چار دیواری کے ساتھ مسجد کے عقب میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی (م ۱۸۸۷ء) کی قبر ہے۔ موصوف کی عمر تو زیادہ نہیں ہوئی لیکن تصانیف کے انبار لگ گئے ہیں۔ کسی بزرگ نے کیا خوب کہا ہے کہ ہم عمر میں طول کی بجائے عرض چاہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو مولانا عبدالحی جتنا عرض شاید ہی کسی کی عمر میں ہو۔ چار دیواری سے باہر ایک تھڑے پر مولانا نظام الدین فرنگی محلی کی قبر ہے۔ ان

کے ساتھ دو اور قبریں بھی ہیں ۔ ان قبروں پر کتبات نہیں ہیں ۔ وہاں آسیب زدہ مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے ۔ نوجوان لڑکیاں سر کے بال کھولے ' حال ' کھیل رہی تھیں ۔ میں جس وقت وہاں پہنچا اس وقت وہاں چالیس پینتالیس کے قریب مریض ڈیرہ ڈالے پڑے تھے ۔

علمائے فرنگی محل کا سلسلہ بیعت حضرت شاہ عبدالرزاق بانسوی (م ۱۷۲۴ء) سے ملتا ہے ۔ مولانا نظام الدین ان ہی سے بیعت تھے ۔ بانسہ شریف بارہ بنکی سے گیارہ بارہ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ۔ میں ۱۹۷۸ء میں وہاں حاضری دے آیا ہوں ۔ شاہ عبدالرزاق کے ملفوظات کے دو مجموعے ملفوظ رزاقی اور مناقب رزاقیہ کے نام سے چھپ چکے ہیں ۔ میں نے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ان دونوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے ۔

اگلے روز میں دوبارہ ندوۃ العلماء گیا اور نماز ظہر تک لائبریری میں مطالعہ کرتا رہا ۔

نماز کے بعد چند اساتذہ سے ملاقات ہوئی اور وہ کافی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے ۔ انہوں نے مجھے ندوہ کی قدیم اور جدید عمارتیں دکھائیں ۔ ایک ہاسٹل ان دنوں زیر تعمیر تھا ۔ غیر ملکی طلباء کے لئے ایک الگ ہاسٹل تھا ۔ گومتی کے کنارے اللہ والوں نے سارے شہر سے الگ ایک بستی بسائی ہوئی ہے جہاں ہر وقت قال اللہ اور قال الرسولؐ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں ۔

لائبریری پرانی عمارت میں ہے اور اس کے قریب ہی مولانا علی میاں کا کمرہ اور انتظامیہ کے دفاتر ہیں ۔ ہال کے باہر آٹھ دس فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ایک بورڈ آویزاں ہے جس پر معاندین کے شک و شبہات کے ازالہ کے لئے ندوۃ العلماء کا دینی مسلک جلی حروف میں لکھا ہوا ہے ۔

مولانا علی میاں سے ایک بار کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں ملاقات ہوئی تھی ، دوسری بار دہلی میں اور تیسری بار دیوبند میں ۔ انہوں نے میری تصانیف کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے ۔ جب میں نے " دین الٰہی اور اس کا پس منظر " ان کی خدمت میں ارسال کی تو انہوں نے مجھے خط لکھا کہ ان دنوں رائے بریلی آیا ہوا ہوں ۔ دین الٰہی کا مطالعہ کر

رہا ہوں اور آپ کے لئے میرے منہ سے دعائیں نکل رہی ہیں ۔ مولانا ابوالعرفان کے ساتھ میں نے ۱۹۷۳ء میں سرینگر میں تیرہ دن گزارے تھے ۔ گلمرگ ، ٹنگمرگ ، پہلگام ، اچھا بل اور کوکر ناگ کے سفر میں بھی ان کا ساتھ رہا ۔ دوسری بار ان کے ساتھ شیراز ہند جونپور کی قدیم عمارتیں اور بزرگوں کے مزارات دیکھنے کی سعادت ملی ۔ اب یہ باتیں خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہیں ۔

ندوہ کے بالمقابل گومتی کے پار ۱۸۵۷ء میں برٹش ریذیڈنسی کے معرکے میں شہید ہونے والوں کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ایک مینار بنایا گیا ہے ۔ اسی کے قریب آزادی کے بعد اودھ کی پہلی خاتون گورنر بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو (م ۱۹۴۹ء) کی سمادھ ہے ۔ موصوفہ انگریزی کی بڑی اچھی شاعرہ تھیں اور اردو ادب کا بھی ذوق رکھتی تھیں ۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ اپنے دور گورنری میں علی گڑھ آئیں تو سرکاری تقاریب کے اختتام پر ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب (م ۱۹۶۹ء) سے کہنے لگیں " ڈاکٹر صاحب یہ سب کچھ تو ہو چکا اب کچھ شعر و شاعری ہونی چاہیے " ۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی شب ڈنر کے بعد ان کے اعزاز میں ایک مشاعرے کا انتظام کیا ۔ جن لوگوں نے اس مشاعرے میں شرکت کی ہے ان کا یہ کہنا ہے کہ علی گڑھ میں اس طرح کے مشاعرے بہت کم ہوئے ہیں ۔

گومتی کے پار چھتر منزل کی عمارت نظر آ رہی تھی ۔ یہ دراصل امجد علی شاہ والیٔ اودھ (م ۱۸۴۷ء) کا محل تھا اور اب اس میں دواؤں کا سرکاری ادارہ قائم ہے ۔

میں ندوہ سے باہر نکلا تو ایک معتبر راہگیر مل گیا ۔ میں نے قیصر باغ کا پتہ پوچھا تو کہنے لگا کہ وہ سامنے قیصر باغ کی عمارت ہی نظر آ رہی ہے ۔ اتفاق سے وہ بھی وہیں جا رہا تھا ۔ راستے میں اس نے بتایا کہ اس کا نام تیواڑی ہے اور وہ مدتوں تک بلوچستان میں رہا ہے ۔ اس نے وہاں قیام کے دوران میں نصابی کتابیں بھی لکھی تھیں ۔

اس روز بھارت کا یوم آزادی تھا ۔ پاکستان کے مشہور شاعر فیض احمد فیض (م ۱۹۸۴ء) ان دنوں لکھنؤ میں تھے اور ان کے اعزاز میں قیصر باغ میں ایک رنگا رنگ پروگرام ترتیب دیا گیا تھا ۔ میں تیواڑی کی معیت میں وہاں پہنچا تو اس وقت ایک بڑے ہال میں ، جو بارہ دری کے نام سے موسوم ہے ، تقریب شروع ہو چکی تھی ۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر شبیہ الحسن ، فیض صاحب کی شاعری پر تقریر فرما

رہے تھے اور فیض صاحب اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ ان کے بعد فیض صاحب نے بھی مختصر سی تقریر کی۔

میرے استفسار پر ایک شخص نے بتایا کہ قیصر باغ دراصل واجد علی شاہ (م ۱۸۸۷ء) کی رہائش گاہ تھی۔ آج کل اس میں دو کالج قائم ہیں جن میں سے ایک موسیقی کی تعلیم کے لئے مخصوص ہے اور دوسرے میں ڈرامے کی تربیت دی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ ان کے لئے یہ مناسب جگہ ہے۔ واجد علی شاہ جیسے عیاش حکمران کے محل کا اس سے بہتر اور کیا مصرف ہو سکتا ہے۔ واجد علی شاہ خود بھی بارہ دری میں کرشن کنہیا بن کر ڈرامہ کھیلا کرتا تھا۔ قیصر باغ کے ایک کونے میں نواب سعادت علی خان (م ۱۸۱۴ء) کا مقبرہ ہے جو دیکھ بھال کے باوجود ویران پڑا ہے۔

قیصر باغ سے میں رکشا میں سوار ہو کر نخاس پہنچا۔ یہ قدیم لکھنؤ کا ایک یادگار چوک ہے۔ یہیں کبھی حکیم ننھے آغا اور منے آغا کا مطب تھا جن کی زباندانی کے بارے میں کئی لطیفے مشہور ہیں۔ اکبری دروازے سے گذر کر میں چوک بازار میں داخل ہوا۔ کسی زمانے میں یہ لکھنؤ کا بازارِ حسن تھا لیکن اب یہاں چکن کا کاروبار ہوتا ہے۔ بازار کے وسط میں مشہور عطر ساز اصغر علی محمد علی کی نئی بلڈنگ قابلِ دید ہے۔ مغرب کی نماز میں نے اونچی مسجد میں ادا کی اور ململ کی ایک دوپلی ٹوپی خرید کر واپس نخاس پہنچا۔ یہاں مسلمانوں کے کھانے کے کئی ریستوران ہیں لیکن وہ اتنے گندے تھے کہ ان میں داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی۔ میں نے دو مسلمان نوجوانوں سے کسی اچھے ریستوران کا پتہ پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہاں کئی اچھے ریستوران ہیں۔ میں نے کہا کہ میں انہیں دیکھ آیا ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ بہت عمدہ ریستوران قیصر باغ کے قریب ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ ایک رکشا والے کو بتا دیں وہ مجھے وہاں چھوڑ آئے گا۔ انہوں نے لکھنوی لہجے میں رکشا والے سے بات شروع کی وہ اس ریستوران سے واقف تھا۔ اس نے دو روپے کرایہ بتایا۔ انہوں نے کہا کہ ایک سواری ہے سوا روپیہ ملے گا انہیں بٹھا لو اور راستے بھر گنگناتے ہی جایو۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ رکشا میں تشریف رکھیے۔

وہ ریستوران واقعی بڑا صاف ستھرا تھا۔ میں نے لکھنوی کھانوں کا ذائقہ دیکھنے کے لئے بریانی اور قورمہ طلب کیا۔ کاغذ جیسی پتلی روٹیاں بھی چکھیں۔ واپسی پر تھوڑی دیر

کے لئے امین آباد میں رکا۔ وہاں قلفیوں کی ایک دکان پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میں نے لکھنؤ کی "قلفی" آزمائی اور پسند کی۔

امین آباد سے رکشا لے کر میں چار باغ پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن کے باہر باغ میں خوب رونق تھی۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا اور ریلوے اسٹیشن کی عمارت کو جی بھر کر دیکھا۔ اتنا خوب صورت ریلوے اسٹیشن پشاور سے لیکر ہوڑہ تک کہیں نظر نہیں آئے گا۔

میں دن بھر کا تھکا ماندہ تھا۔ اس لئے رات کو خوب نیند آئی۔ اگلی صبح میں نے دیوی شریف اور بانسہ شریف جانا تھا۔ میرے لئے یہ دونوں جگہیں نئی تھیں۔ صبح آٹھ بجے کے قریب میں بذریعہ ٹرین بارہ بنکی روانہ ہوا۔ یہ جگہ لکھنؤ سے ۲۹ کلو میٹر ہے۔ ایکسپریس ٹرین نے یہ فاصلہ جلد ہی طے کر لیا۔ ریلوے اسٹیشن سے رکشا لے کر میں لاری اڈے پہنچا اور ایک شخص سے پوچھا کہ میں پہلے دیوی جاؤں یا بانسہ۔ اس نے دیوی جانے کا مشورہ دیا۔ قریباً ایک گھنٹہ انتظار کے بعد فتح پور ہسوہ جانے والی بس مل گئی اور میں پلٹا ہوتے ہوئے نصف گھنٹے میں دیوی پہنچ گیا۔

یہ ایک مختصر سی آبادی ہے۔ جس جگہ میں بس سے اترا وہیں سے ایک سڑک حاجی وارث علی شاہ (م ۱۹۰۵ء) کے مزار کی طرف جاتی ہے۔ اس کا نام بھی آستانہ روڈ ہے۔ بس اسٹاپ سے حاجی صاحب کا مزار بمشکل ایک فرلانگ ہو گا۔ راستے میں کمہاروں کی دکانیں ہیں جہاں وہ مخصوص وضع کے برتن بناتے اور فروخت کرتے ہیں۔ درگاہ کے صدر دروازے کے باہر گل فروشوں اور شیرینی بیچنے والوں کی دکانیں ہیں۔ ان دکانوں پر حاجی صاحب اور ان کے خاص خاص مریدوں کی، جنہیں وارثیوں کی اصطلاح میں "شاہی فقیر" کہتے ہیں، تصویریں دستیاب ہیں۔ ایسے کیلنڈر بھی نظر آئے جن پر حاجی صاحب کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔

صدر دروازے سے خانقاہ میں داخل ہوا تو چاروں طرف حجرے اور ان کے آگے برآمدے نظر آئے۔ حاجی صاحب کی خانقاہ بڑے قاعدے سے بنی ہوئی ہے اور یہ قرونِ وسطیٰ کی ایک خانقاہ کا صحیح نمونہ پیش کرتی ہے۔ ان حجروں میں زرد احرام میں ملبوس چند وارثی فقرا قیام پذیر تھے۔ ایک حصے میں مدرسہ وارثیہ کے نام سے ایک پرائمری اسکول قائم ہے جو انجمن تعلیمات دین ضلع بارہ بنکی کے زیر اہتمام چل رہا ہے۔ مغرب

کی سمت ایک چھوٹی سی مسجد بھی نظر آئی۔ خانقاہ کے عین وسط میں ایک بلند چبوترے پر حاجی وارث علی شاہ کا روضہ ہے جس کا سبز گنبد دور سے نظر آتا ہے۔ روضے کے صدر دروازے پر "آستانۂ اشرف الخلقین" کندہ ہے۔ روضے کے اندر گنبد کے عین نیچے ایک چھتری بنی ہوئی ہے جس کے نیچے حاجی صاحب کا مزار ہے۔ مزار کے گرداگرد ایک غلام گردش ہے جس میں وارثی فقراء محوِ طواف رہتے ہیں۔ روضے کے شرقی دروازے کی پیشانی پر یہ اشعار لکھے ہوئے ہیں:

ہے حُسن کی سرکار محبت کا خزینہ
انگشتری دستِ سلیماں کا نگینہ
واللہ یہ ہے روضۂ وارث کی حقیقت
کعبہ مدنی کا ہے تو مکّی کا مدینہ

خانقاہ کے وسط میں چند معتقدین کی قبریں ہیں ورنہ وارثی فقراء کو یہاں دفن نہیں کرتے۔ حاجی صاحب کے روضے سے اندازاً دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک جگہ بزیلا کے نام سے موسوم ہے جہاں ان کے والد سیّد قربان علی شاہ دفن ہیں۔ وارثیوں کا کہنا ہے کہ حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ بزیلا میں دفن ہونا ایسا ہی ہے جیسا ان کے مزار کے احاطے میں دفن ہونا۔ اس لئے وارثی فقراء کو عموماً بزیلا میں دفن کرتے ہیں۔

آستانۂ وارث سے نکل کر میں بزیلا کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں سیّد قربان علی شاہ کے مزار کے دائیں جانب ایک عام قبرستان میں مشہور صوفی شاعر بیدم وارثی دفن ہیں۔ ان کا مزار ان کے ایک معتقد ریلوے گارڈ نے بنوایا تھا۔ لوحِ مزار پر سب سے اوپر "یا وارث" اور اس کے نیچے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کندہ ہے۔ تیسری سطر میں "مخزنِ انوار" منقوش ہے اور اس کے نیچے یہ شعر کندہ ہے:

بیدم تم آفتابِ وفا ہو خدا گواہ
ناقص ہے جس کو شک ہے تمہارے کمال میں

لوحِ مزار پر ان کی تاریخِ وفات ۲۲ نومبر ۱۹۳۶ء / ۹ رمضان ۱۳۵۵ھ کندہ ہے۔
سنگِ مرمر کے تعویذ پر سراج الشعراء امام اولیاء مخدوم اصفیاء پیر طریقت مُرشدِ برحق بیدم شاہ کندہ ہے۔

بیدم وارثی حاجی وارث علی شاہ کے بڑے غالی مرید تھے۔ انہوں نے حاجی صاحب کی منقبت لکھی تھی جس کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

ہر نام نام ان کا، ہر جا مقام ان کا
کیا پوچھتے ہو مجھ سے نام و نشانِ وارث
بلبل تری صدا سے، ہوتا ہے درد دل میں
تو لے اڑی کہاں سے طرزِ بیانِ وارث
زاہد کو ہوں مبارک بیت الحرم کے سجدے
بیدم ہمارا سر ہو اور آستانِ وارث

بیدم کا کلام "مصحفِ بیدم" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک نسخہ راقم الحروف کی ذاتی لائبریری میں محفوظ ہے۔

بیدم شاہ کے مزار کے آس پاس اور بھی کئی وارثی فقراء کی قبریں ہیں جن کے حالات سے میں واقف نہیں ہوں۔

دیوئ شریف اور اس کے گرد و نواح میں بسنے والے کیا ہندو اور کیا مسلمان، سبھی حاجی صاحب کے معتقد ہیں۔ حاجی صاحب کی تصاویر گھروں اور دکانوں میں نظر آتی ہیں یہاں تک کہ سرکاری بسوں میں بھی ان کی تصویر آویزاں نظر آتی ہے۔

بزیلا سے میں بس اسٹاپ کی طرف لوٹا۔ میں بس کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اتنے میں مجھے ایک ویگن مل گئی اور اس نے مجھے جلد ہی بارہ بنکی پہنچا دیا۔ یہاں سے میرے سفر کا دوسرا اور مشکل مرحلہ شروع ہوا۔ بانسہ شریف جانے کے لئے بڑے گاؤں کے چوراہے تک بس میں سفر کرنا تھا۔ اس روٹ پر بہت کم بسیں چلتی ہیں۔ تقریباً دو گھنٹے انتظار کرنے کے بعد مجھے گونڈہ جانے والی بس ملی۔ بارہ بنکی سے بڑے گاؤں کا چوراہا کوئی دس میل ہو گا۔ میں نے اثنائے سفر مسافروں سے اگلے سفر کے لئے معلومات حاصل کیں۔ چوراہے سے بڑا گاؤں ایک میل دُور ہے۔ مجھے بس سے اترتے ہی ایک کھوکھوا مل گیا اور میں پیدل چلنے سے بچ گیا۔ نمازِ عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ گاؤں کے باہر ایک قدیم وضع کی مسجد تھی۔ میں نے وہاں نماز ادا کی۔ مسجد سے ملحق ایک وسیع احاطے میں پیر شہاب الدین کا مزار ہے۔ مقامی روایت کے مطابق وہ گذشتہ چھ سو برس

ہے وہاں محو خواب ابدی ہیں۔ ان کے مزار کے اردگرد گاؤں کے مالک قدوائیوں کی بہت سی قبریں ہیں۔

میں قبریں دیکھ کر گاؤں کی طرف آیا تو ایک وضع دار معمّر بزرگ جاتے دکھائی دیئے۔ میں ان کی طرف لپکا اور علیک سلیک کے بعد اپنی آمد کا مقصد ظاہر کیا۔ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے ان کی ولایتی کھاد کی ایجنسی تک پہنچ گئے۔ بڑے گاؤں سے بانسہ شریف تین میل ہے لیکن سواری کی بڑی دقت ہے۔ دن میں دو تین بار بس جاتی ہے۔ لوگ عموماً کھڑکھوے پر سفر کرتے ہیں اور وہ بھی شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ مجھے بڑے گاؤں میں قریباً دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔

جس بزرگ کا میں نے ذکر کیا ان کا نام حمایت علی قدوائی ہے۔ وہ گاؤں کے بڑے زمیندار ہیں۔ اب زمینداریاں تو ختم ہو گئی ہیں تاہم ان کے پاس گزارے کے لائق زمین ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس نواح میں قدوائیوں کے چار گاؤں، مسولی، بھیرہ، اچھا گاؤں اور بڑا گاؤں واقع ہیں۔ قدوائی ان کے علاوہ اور کسی گاؤں کا باشندہ نہیں ہو سکتا۔ مسولی وہاں سے گونڈہ جانے والی سڑک پر اندازاً دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ بھارت کے مشہور کانگریسی راہنما اور نہرو کابینہ میں وزیر خوراک رفیع احمد قدوائی (م ۱۹۵۴ء) وہیں کے رہنے والے تھے۔ مسولی کے تین فرزند مصطفےٰ کامل، مدحت کامل اور وراثت علی مختلف ممالک میں بھارت کے سفیر رہ چکے ہیں۔

حمایت علی صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جب فیض آباد جاؤں تو اجودھیا ضرور جاؤں۔ وہاں مغلیہ خاندان کے بانی بابر کی تعمیر کردہ مسجد، اس کے قریب سیتا رسوئی کے نام سے موسوم مندر اور ان کے جدِ امجد قدوۃ الدین المعروف بہ قاضی قُدوہ کا مزار ضرور دیکھوں۔

حمایت علی صاحب سے مجھے بڑی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مسولی سے تین میل کے فاصلے پر اودھ کا مشہور قصبہ سہالی ہے۔ مولانا قطب الدین شہید سہالویؒ (م ۱۶۹۲ء) ان کے قابلِ فخر فرزند مولانا نظام الدین فرنگی محلیؒ (م ۱۷۴۸ء) اور ان کے صاحبزادے علّامہ عبدالعلی بحر العلوم (م ۱۸۲۰ء) وہیں کے رہنے والے تھے۔ وہاں جانے کے لئے نہر کے کنارے کنارے جاتے ہیں۔ بسا اوقات کوئی سائیکل

سوار مل جاتا ہے اور وہ کرایہ لے کر سائیکل کے پیچھے سواری بٹھا لیتا ہے۔

دو گھنٹے شدید انتظار کے بعد بانسہ جانے والا کھڑکھڑا نظر آیا۔ حمایت علی صاحب کے اشارے پر کوچوان نے کھڑکھڑا روکا اور مجھے اس پر بٹھا لیا۔ میرے علاوہ کئی دوسرے مسافر بھی اس پر سوار تھے اور اناج کی بوریاں بھی کھڑکھڑے پر لدی ہوئی تھیں۔ تین چار مسافروں کا رُخ پچھلی جانب تھا۔ درمیان میں بوریوں پر بھی مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اگلی طرف منہ کرکے بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ کھڑکھڑا کیا ہے، بس یوں سمجھئے کہ ہمارے ہاں کا ریڑہ اس کے مقابلے میں گڑوی کوچ ہے۔ بڑے گاؤں سے بانسہ شریف تک تین میل لمبی سڑک پر کنکر بچھائے ہوئے تھے اور برسات کی وجہ سے ان کے اوپر سے مٹی بہہ گئی تھی۔ "پختہ" سڑک کی بجائے کچا راستہ زیادہ آرام دہ تھا۔

اس سفر میں کئی بار میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اپنے بیٹے ژفر کو علی گڑھ چھوڑ آیا ہوں۔ اگر اسے ساتھ لے آتا تو وہ یہ تاریخی جگہیں دیکھ لیتا۔ شاید اسی طرح اس کے دل میں مطالعہ کا شوق پیدا ہوتا۔ بانسہ کے سفر میں میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں نے بڑی عقلمندی کی کہ اسے علی گڑھ چھوڑ آیا ورنہ وہ کہاں کھڑکھڑے پر مارا مارا پھرتا۔

نمازِ عصر کے وقت خدا خدا کرکے بانسہ شریف پہنچا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ مکان زیادہ تر پھوس کے بنے ہوئے ہیں۔ صرف سجادہ نشین اور ان کے رشتہ داروں کے مکانات پختہ ہیں۔ گاؤں کے آخری حصے میں شاہ عبدالرزاق بانسویؒ (م ۱۷۲۴ء) کی درگاہ ہے۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور کے ایک سابق رکن شاہد حسین رزاقی ان کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کی زبانی بارہا شاہ صاحب کا تذکرہ سنا تھا۔

شاہ عبدالرزاق کے مزار پر ایک قاش دار گنبد بنا ہوا ہے اور اس کے نیچے شاہ صاحب، ان کے فرزند غلام دوست اور پوتے غلام علی محو خواب ابدی ہیں۔ درگاہ کے احاطے میں ان کے معتقدین کی متعدد قبریں ہیں۔ احاطے میں قبلہ رُخ ایک مسافر خانہ بنا ہوا ہے جس میں زائرین ٹھہرتے ہیں۔ سجادہ نشین احمد میاں نے مجھے بتایا کہ ہندو بھی بکثرت ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

درگاہ کے قریب ہی ایک مسجد ہے جہاں میں نے عصر کی نماز ادا کی۔ شاہ عبدالرزاق بڑے صاحب کرامت بزرگ ہوئے ہیں۔ موصوف اُمّی محض تھے لیکن بڑے

بڑے علماء کو لاجواب کر دیتے تھے ۔ ایک بار مولانا نظام الدین فرنگی محلیؒ ان کا امتحان لینے آئے اور آتے ہی ان سے سوال کیا کہ اگر کوئی نمازی پہلی رکعت میں سورۂ والناس پڑھ لے تو پھر دوسری رکعت میں کیا پڑھے؟ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ پھر یہی سورت پڑھے ۔ مولانا نے دوسرا سوال کیا کہ تیمم کرتے وقت صرف ہاتھوں پر مسح کرنا چاہیے یا کہنیوں تک؟ شاہ صاحب نے کہا اگر کہنیوں تک بھی کرلے تو کوئی حرج نہیں ۔ مولانا نظام الدین نے اپنی طرف سے فقہ کے دو بڑے مشکل مسئلے دریافت کئے تھے لیکن شاہ صاحب نے اُمّی ہونے کے باوجود نہ صرف انہیں لاجواب کر دیا بلکہ ان سے کہا کہ امام ابُوحنیفہؒ کی رُوح یہاں موجود ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی اور مسئلہ پوچھنا ہو تو جلدی کیجیئے ، انہیں واپس جانا ہے ۔

مولانا نظام الدینؒ نے اسی وقت شاہ عبدالرّزاقؒ کی بیعت کرلی ۔ بانیٔ فرنگی محل کے مُرشد ہونے کی بناء پر علمائے فرنگی محل شاہ صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے اور اسی وجہ سے ان کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ۔

شاہ صاحب کے ملفوظات پر میں نے ایک الگ مضمون لکھا ہے ۔ ان کے ملفوظات میں رام چندر ، لچھمن اور کرشن چندر کے ساتھ ان کی ملاقات کے کئی واقعات درج ہیں ۔ میں نے ندوۃ العلماء کے ایک عالم سے اس پر روشنی ڈالنے کو کہا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ اسے قوتِ متخیّلہ سے زیادہ وقعت نہیں دیتے ۔

نمازِ عصر کے بعد مجھے لکھنؤ جانے والی بس مل گئی اور میں مغرب کے وقت لکھنؤ پہنچ گیا ۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے غسل کیا تو دن بھر کی تکان دُور ہو گئی ۔ ایک قریبی ہوٹل سے ویجیٹیرین کھانا کھایا اور وہیں سے ایک رکشا میں سوار ہو کر امین آباد پہنچا ۔ امین آباد سے کئی سڑکیں نکلتی ہیں ۔ جن میں سے ایک نظیر آباد کہلاتی ہے ۔ اسی سڑک پر اندازاً ایک فرلانگ چلنے کے بعد دائیں ہاتھ ایک گلی مڑتی ہے جس پر نیا گاؤں مغربی کا بورڈ آویزاں ہے ۔ اس گلی میں آخری مکان مولانا محمد منظور نُعمانی صاحب کا ہے ۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو ان کے چھوٹے صاحبزادے باہر نکلے ۔ میں نے مولانا کے بارے میں استفسار کیا تو فرمانے لگے کہ گھر پر موجود ہیں ۔ میں نے کہا میں علی گڑھ سے ان کی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں ۔ وہ اندر گئے اور خواتین کو پردے میں بٹھا کر مجھے اندر

لے گئے ۔ مولانا اس وقت صحن میں لیٹے ہوئے تھے میں بھی ان کے قریب بیٹھ گیا ۔ تھوڑی دیر میں موصوف مجھے پہچان گئے ۔ ان سے پہلی ملاقات ۱۹۷۹ء میں دیو بند میں مجلس شوریٰ کے اجلاس کے موقع پر ہوئی تھی ۔ ان کے صاحبزادے عتیق الرحمٰن سنبھلی ، جو ان دنوں انگلستان میں مقیم ہیں ، اس زمانے میں ماہنامہ الفرقان کے مدیر تھے ۔ میری ان سے خط و کتابت رہتی تھی اور میرے مضامین بھی الفرقان میں چھپتے رہتے تھے ۔ ایک بار عتیق الرحمٰن نے مجھے لکھا کہ انہیں معلوم ہوا ہے کہ میں ان کا ہم عمر ہوں ، بس اس ہم عمری نے کام خراب کیا ورنہ وہ میری تحریریں پڑھ کر " بیعت " ہونے کے بارے میں سوچ رہے تھے ۔ دیو بند میں مولانا نُعمانی صاحب نے مجھے لکھنؤ چلنے کو کہا تو میں نے عرض کیا کہ میں نے عتیق الرحمٰن سے وعدہ کیا تھا کہ میں کبھی لکھنؤ آؤں گا ۔ لیکن اب آپ سے ملاقات ہو گئی ہے ، اس لئے لکھنؤ جانے کا ارادہ منسوخ کرتا ہوں پھر کبھی دیکھا جائے گا ۔ اس کے بعد عتیق میاں انگلستان چلے گئے اور میں بھی اس طرف نہ جا سکا ۔

مولانا نُعمانی صاحب نے چائے کا پوچھا تو میں نے معذرت پیش کی ۔ انہوں نے مدینہ منوّرہ کی کھجوروں کا پیکٹ ، مولانا نسیم احمد فریدی (م ۱۹۸۸ء) کی تصنیف خواجہ باقی باللہ اور الفرقان کے دو پرچے مرحمت فرمائے ۔

جناب سیّد نفیس رقم صاحب ان کے برادرِ طریقت ہیں ۔ مولانا نے ان کی شائع کردہ مکاتیب سیّد احمد بریلویؒ کا ذکر کیا اور اس پر میں نے جو پیش لفظ لکھا تھا ، اس کی بھی تعریف فرمائی ۔

میں قریباً ایک گھنٹہ ان کی خدمت میں حاضر رہا ۔ جب میں نے اجازت چاہی تو بستر سے نیچے اترنے لگے ۔ میں نے رُوکنا چاہا تو فرمانے لگے " جب آپ آئے تھے تو میں نے پہچانا نہیں تھا ۔ پہلے آپ کچھ اور تھے اور اب کچھ اور ہیں " ۔ موصوف نے بڑی شفقت کا اظہار فرمایا اور مجھ سے بغلگیر ہوئے اور اپنی دُعاؤں کے ساتھ رُخصت کیا ۔

میں نے راستے میں چکن کلا سے چند کرتے خریدے اور ہوٹل جا کر سو رہا ۔ میں چونکہ دن بھر کا تھکا ہوا تھا اس لئے رات کو خوب نیند آئی ۔

اگلے رَوز میں ترکاری منڈی میں آغا باقر کا امام باڑہ دیکھنے گیا ۔ امام باڑے کی عمارت تو کوئی خاص نہیں لیکن باہر صحن میں ایک دیوار کے ساتھ مرزا محمد رفیع سودا (م ۱۷۸۲ء) کی قبر ہے اور اس پر ایک چھتری بنی ہوئی ہے ۔ اس امام باڑے کے قریب ہی غفران مآب کا امام باڑہ ہے جو مولوی کلب حسین کی طرف منسوب ہے ۔ مجھے کسی نے بتایا کہ میر تقی میر وہیں مدفون ہیں ۔ لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ان کی قبر وہاں نہیں ہے ۔ اہل لکھنؤ کی یہ تحقیق ہے کہ میر کا مزار اب شاہ جِتّن کے نام سے مشہور ہو گیا ہے اور لوگ اسے ایک ولی اللہ کا مزار سمجھ کر وہاں جاتے ہیں ۔ یہ اطلاع مجھے بعد میں ملی اس لئے میں باوجود تلاش کے میر کی قبر نہ دیکھ سکا۔

امام باڑہ غفران مآب سے میں نخاس کی طرف آیا اور پُوچھتے پُوچھتے سر کٹا نالہ پہنچا۔ جہاں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد مجاہدین کے سر اڑائے جاتے تھے ۔ بدیں وجہ یہ نالہ "سر کٹا نالہ" کے نام سے مشہور ہو گیا ۔ نالہ کے برابر والی گلی "کوچہ میر انیس" کے نام سے موسوم ہے ۔ میں اس گلی میں چلتے چلتے میر انیس کے گھر تک پہنچ گیا۔ اب ان کے اخلاف وہاں مقیم ہیں ۔ تھوڑی دور آگے ایک بڑے طویلے کے اندر ایک بارہ دری میں میر انیس کی قبر ہے ۔ بارہ دری کی پیشانی پر عبارت کندہ ہے:

چیست ایں ایوان عالی و نفیس
خواب گاہ شاعر اعظم انیس

بارہ دری میں قبر کا نشان موجود ہے لیکن تعویذ اور لوحِ مزار نہیں ہیں ۔ اس کی جگہ پتھر کی ایک سل لگی ہوئی ہے جس پر انیس کا یہ شعر منقوش ہے:

خود نویدِ زندگی لائی قضا میرے لئے
شمعِ کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

اس کے بعد

"شاعر اعظم میر ببر علی انیس علیہ الرحمۃ تاریخِ وفات ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء کندہ ہے" ۔ اس کے نیچے دبیر کا یہ شعر درج ہے:

آسمان بے ماہِ کامل ، سدرہ بے رُوح الامین
طورِ سینا بے کلیم اللہ ، و منبر بے انیس

یہ احاطۂ مزار محلہ چوبداری میں واقع ہے ۔ میں میر انیس کی قبر دیکھ کر چوک میں آنکلا ۔ پچھلے وقتوں میں یہ لکھنؤ کا بازار حسن تھا لیکن جب سے عصمت فروشی پر پابندی لگی ہے ، یہاں چکن (کپڑے کی ایک قسم) کی مارکیٹ بن گئی ہے ۔ اسی بازار میں اصغر علی محمد علی سوداگرانِ عطر کی رہائش گاہ حنا بلڈنگ ہے ۔ اس کے عقب میں لکھنؤ کا مشہور علمی ادارہ مدرسۂ فرقانیہ ہے جو قرأت کی تعلیم کے لئے پاک و ہند کے تمام مدارس میں سرِفہرست ہے ۔ مدرسہ کی عمارت بڑی خستہ حالت میں ہے بلکہ اس کا عقبی حصہ زمین بوس ہو چکا ہے ۔ مدرسہ کے وسط میں ایک چبوترے پر چند قبریں ہیں جن میں بانیٔ مدرسہ مولانا عین القضاۃؒ (م ۱۹۲۵ء) کی قبر نمایاں ہے ۔ لوحِ مزار پر طغریٰ آمیز ثُلث میں ۔ تاریخ وصال کنز الفقہاء اعلم العلماء شیخ المشائخ زبدۃ العارفین مولانا الحاج محمد عین القضاۃ قدس سرہٗ کندہ ہے ۔ اس کے نیچے خطِ نستعلیق میں مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے یہ اشعار درج ہیں:

عین قضاۃ و بحرِ کرامت
قلزمِ علم و چشمۂ حکمت
صوفیٔ صافی مُرشدِ کامل
فاضلِ فاصل عالمِ عامل
عین الاعیان راسِ اکابر
فردِ زمان مولائے مفاخر
مہرِ سپہرِ فضل و شرافت
پایۂ فراز علم و فضیلت
پردہ کشائے رازِ حقیقت
صدر نشینِ محفلِ خبرت
کوہ تمکین آیتِ تقویٰ
نورِ نگین ملتِ بیضا
مفتخر از وے علمِ عقلی
روشن از وے بزمِ نقلی

سجدہ چکیدہ از پیشانی
رفت بہ بست از دارِ فانی
ھذا قول حسن ۔ محکم
موت العالم موت العالم
گل از باغِ عرفان چیدہ
گوشہ خلوت را بگزیدہ
چوں غم او تا چرخ رسیدہ
جامعہ بہ غم نیل کشیدہ
گفت عزیز ایں سالِ رحلت
زیر زمین شد مہر ملت
۱۳۴۴ھ

(نتیجۂ فکر مرزا ہادی عزیز لکھنوی)

حضرت عین القضاۃؒ کی قبر کے ساتھ سید حامد حسن کی قبر ہے جس پر عربی میں طویل منقبت منقوش ہے ۔ ان بزرگوں کے پائنتی ایک دوسرے تھڑے پر چھ قبریں ہیں، جن پر نام اور تاریخ وفات درج ہے ۔

اس وقت مدرسہ کے ناظم اپنے دفتر میں تشریف رکھتے تھے ۔ مجھے یوں گھومتے دیکھ کر اشارہ کیا تو میں ان کی خدمت میں جا بیٹھا اور مدرسہ کے بارے میں گفتگو کرتا رہا ۔ چوک سے میں امین آباد پارک گیا اور وہاں تھوڑی دیر رک، کر اپنی قیام گاہ پر پہنچ گیا ۔

اسی شام سید صباح الدین عبدالرحمٰن بنارس پسنجر ٹرین سے اعظم گڑھ تشریف لے جا رہے تھے ۔ میں رات نو بجے انہیں الوداع کہنے گیا اور "معارف" میں طباعت کے لئے ایک مضمون ان کے حوالے کیا ۔ چار باغ اسٹیشن دیکھنے کے لائق ہے ۔ پاک و ہند میں اس جیسا خوشنما ریلوے اسٹیشن نہیں ہے ۔ بقول ح خ کراروی یہ اسٹیشن کسی نواب کا محل معلوم ہوتا ہے ۔ اسٹیشن کے باہر رات کو بڑی رونق رہتی ہے ۔ میں کافی دیر تک ایک وسیع لان میں بیٹھا رہا ۔

اگلے روز ناشتہ سے فارغ ہو کر میں دوبارہ ندوۃ العلماء گیا ۔ اس روز میں نے

مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے ملفوظات "معدن المعانی" کا مطالعہ کیا ۔ یہ مجموعۂ ملفوظات ان کے ایک مرید زین بدر عربی نے مرتب کیا تھا ۔ معدن المعانی ۱۸۸۴ء میں بہار شریف سے طبع ہو چکی ہے، لیکن اب نایاب ہے ۔ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے ملفوظات کے کئی مجموعے ملتے ہیں، جن میں معدن المعانی کے علاوہ "مخ المعانی"، "ارشاد السالکین" اور "خوانِ پُر نعمت" خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ چودھویں صدی میں برعظیم کی سیاسی، سماجی اور دینی تاریخ کے مطالعہ کے لئے مخدوم صاحبؒ کے ملفوظات کا مطالعہ ناگزیر ہے ۔

میں نے ایک ہی نشست میں "معدن المعانی" اور "ارشاد السالکین" ختم کر ڈالیں ۔ نماز ظہر کے بعد میں نے حسب سابق مولانا علی میاں کے ساتھ کھانا کھایا ۔ دسترخوان پر مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی ۔ ندوۃ سے فارغ ہو کر میں قیصر باغ کے بس اسٹینڈ پر آیا اور سیتا پور جانے والی بس میں خیر آباد کا ٹکٹ لے کر سوار ہو گیا ۔

خیر آباد لکھنؤ سے اندازاً اسی کلو میٹر کے فاصلے پر ہے ۔ ریلوے اسٹیشن سے قریب ہی بس اسٹاپ ہے ۔ میں نے وہاں سے رکشا لیا اور رکشا ڈرائیور کو درگاہ پر چلنے کو کہا ۔ وہ مجھے حضرت شیخ سعد بن بڈھنؒ (م ۷۶۱ھ) کے مزار پر لے گیا ۔ شیخ سعدؒ، مخدوم شاہ مینا کے خلیفہ تھے ۔ رضا لائبریری رام پور میں "تحفۃ السعداء" کے عنوان سے ایک بڑا نادر مخطوطہ محفوظ ہے جس میں ان کے ایک مرید خواجہ جمال نے ان کے ملفوظات جمع کئے تھے ۔ میں رام پور میں قیام کے دوران میں اس مخطوطے سے استفادہ کر چکا تھا، اب صرف ان کا مزار دیکھنے کی تمنا تھی ۔

حضرت سعدؒ کا مزار ایک وسیع احاطے کے اندر ایک گنبد کے نیچے ہے ۔ قبر کے سرہانے کی جانب ایک دیوار پر ایک فریم میں ملک الشعرا فیضی کا یہ قطعہ تاریخ آویزاں ہے:

حیف آں شاہِ ولایت شیخ سعد
گشت در فردوس اعلیٰ جاگیر
بد چو مخدومِ کبیر او را لقب

لاجرم شد سال ۔ مخدوم کبیر

۹۷۲ھ فیضی

مخدوم صاحب کے روضہ کا سفید رنگ کا گنبد دُور سے نظر آتا ہے ۔ گنبد سے قریب ہی ایک مسجد ہے ۔ میں نے وہاں نمازِ عصر ادا کرنے کی سعادت حاصل کی ۔ گنبد کے مغربی جانب چند قبریں ہیں ، جن میں سے ایک قبر مولانا فضل امام خیر آبادی (م ۱۸۲۹ء) کی اور دوسری قبر مولانا عبدالحق خیر آبادی (م ۱۸۹۹ء) کی ہے ۔ ان بزرگوں کی وجہ سے خیر آباد اکنافِ عالم میں مشہور ہے ۔ اسی خاندان کے ایک مایۂ ناز عالم اور مجاہد مولانا فضل حق خیر آبادی (م ۱۸۶۱ء) کو ، جنھوں نے اسد اللہ خاں کو غالب بنایا تھا ، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں کالے پانی کی سزا ہوئی تھی ۔ موصوف وہیں (م ۱۸۶۱ء) میں فوت ہوئے تھے ۔ خیر آباد کی ایک بڑی سڑک ، جو قصبے کو مین روڈ کے ساتھ ملاتی ہے ، انہی کے نام سے منسوب ہے ۔

خیر آباد کا ایک محلّہ قعتیارہ کے نام سے موسوم ہے ۔ اس محلّہ میں ریاض خیر آبادی کا لکھوری اینٹوں سے بنا ہوا مکان بڑی خستہ حالت میں ہے ۔ اب وہاں حکیم مُنّے صاحب رہتے ہیں ۔ اس مکان کے عقب میں ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جو شہداء کے قبرستان کے نام سے موسوم ہے ۔ اسی قبرستان میں حضرت ریاض (م ۱۹۳۴ء) کی قبر ہے ۔ میں ان کی قبر پر گیا اور ان کی مغفرت کے لئے دعا کی ۔ شعراء کے اکثر تذکروں میں ان کی تصویر موجود ہے ۔ چہرے پر سفید داڑھی عجب بہار دکھاتی ہے ۔ اسی مقدس داڑھی کے بارے میں انہوں نے یہ فرمایا تھا:

حنا لگا کے پہنچتے ہیں گل رُخوں میں ریاض
کچھ ان کی ریشِ مبارک کا اعتبار نہیں

اسی سفر کے دوران میں عابد رضا بیدار صاحب نے مجھے خدا بخش لائبریری کے جرنل کے متعدد شمارے عنایت فرمائے ۔ ان میں سے ایک شمارے میں انہوں نے اس صدی کے اوائل میں الہ آباد سے چھپنے والے ماہنامہ ادیب کے مضامین اور تصاویر کا انتخاب چھاپا ہے ۔ ان تصاویر میں حضرت ریاض کی تصویر بھی ہے ۔ ان کی داڑھی صفا چٹ نظر آتی ہے لیکن مونچھیں رخساروں کو ڈھانپتی ہوئی گردن تک چلی گئی ہیں:

یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جوان تھا

جب انہوں نے مونچھیں ترشوا کر داڑھی بڑھالی تو ادیب ہیں " ریاض مرحوم " کے عنوان سے ایک مضمون ان کے جیتے جی چھپا ۔

خیر آباد کی آبادی بیس پچیس ہزار کے درمیان ہے اور وہاں اب بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے ۔ کھیتوں میں جا بجا پُرانے زمانے کی مسجدیں نظر آتی ہیں جو اب بے چراغ ہو چکی ہیں ۔ خیر آباد کی سب سے خوبصورت عمارت نیازیہ جونیئر ہائی سکول ہے جو ایک مقامی رئیس منشی نیاز احمد کی علم دوستی کا بیّن ثبوت ہے ۔ حضرت سعدؔ کی درگاہ کے جوار میں ان کا ایک پختہ باغ بھی موجود ہے ، جو اب تباہ ہو رہا ہے ۔ قلعے کی طرف جاتے ہوئے ایک درگاہ پر زائرین کا ہجوم نظر آیا ۔ میرے استفسار پر لوگوں نے بتایا کہ یہ شاہ مقبول کی درگاہ ہے ۔

مفتی نجم الحسن رضوی مدرسہ عربیہ قدیمہ خیر آباد میں مدرّس ہیں ۔ انہوں نے " خیر آباد کی ایک جھلک " کے عنوان سے یکصد صفحات کا ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں اس قصبے کی بنیاد سے لے کر موجودہ دَور تک کی تاریخ درج ہے ۔ مفتی صاحب نے خیر آباد کے عربی ، فارسی اور اُردو شعراء کی ایک طویل فہرست بھی دی ہے اور بطورِ نمونہ ان کے چیدہ چیدہ اشعار بھی دیئے ہیں ۔ راقم بطورِ خاص ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا ۔ ان کے برادرِ اصغر ریاض الحسن بھی گھر پر موجود تھے ۔ مفتی صاحب نے راقم کی چائے اور بسکٹ کے ساتھ تواضع کی اور " المقدمۃ السنیہ " کی نقل مجھے عنایت فرمائی ۔ نمازِ عصر ان کے ساتھ ان کے مکان سے ملحقہ مسجد میں ادا کی ۔ مفتی صاحب نے ایک خادم کو میرے ساتھ بھیجا اور اسے ہدایت کی کہ وہ ٹمپو کا کرایہ ادا کرکے مجھے اس میں بٹھا دے ۔ اب ایسے وضع دار بزرگ ڈھونڈے سے نہیں ملتے ۔ سیتا پور سے لکھنؤ جانے والی بس عموماً بھری ہوئی آتی ہے اور وہ خیر آباد میں نہیں رُکتی ۔ مجبوراً مجھے سیتا پور جانا پڑا اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر براستہ خیر آباد لکھنؤ پہنچا ۔ اس وقت رات ہو چکی تھی ، اس لئے میں کھانا کھا کر ہوٹل چلا گیا ۔

اگلی صبح میں سہ بارہ ندوۃ العلماء گیا ۔ مولانا ابوالعرفان لکھنؤ سے باہر جا چکے تھے اس لئے ان کے ساتھ ملاقات نہ ہو سکی ۔ میں ندوہ سے لکھنؤ یونیورسٹی گیا ۔ نوابی دَور

میں یہاں ایک خوبصورت باغ تھا۔ ابھی تک بارہ دریاں اور نہریں موجود ہیں۔ یونیورسٹی کی عمارت بھی اسلامی فنِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ نوابی دَور کے ایک محل کو سُبھاش ہوسٹل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ چلتے چلتے میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے اور اب پھٹ کر زخم بن گئے تھے۔ یونیورسٹی کی ڈسپنسری میں پاؤں پر پٹی کروائی اور یونیورسٹی لائبریری دیکھنے گیا۔ کیٹلاگ دیکھ کر معلوم ہوا کہ نقاشِ فطرت میاں ایم اسلم کی ۷۰ کتابیں لائبریری میں موجود ہیں۔ فارسی اور عربی مخطوطات کی فہرست دیکھی لیکن اس میں کوئی قابلِ ذکر مخطوطہ نظر نہ آیا۔ شعبۂ اقتصادیات کے صدر ڈاکٹر سری واستوا صاحب کیمبرج میں میرے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ ان کے ساتھ مدتوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ موصوف بڑے تپاک سے ملے اور دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

سری واستوا سے مل کر میں شعبۂ اردو کی طرف گیا لیکن وہاں تالے پڑے ہوئے تھے۔ میرے استفسار پر ایک چوکیدار نے بتایا کہ اس شعبہ کے اساتذہ اور کلرک ایک بجے سے پہلے نہیں آتے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ لکھنؤ کی نزاکت اور قدیم روایات اس شعبہ کی حد تک ضرور باقی ہیں۔ میں صدرِ شعبہ شبیہ الحسن صاحب سے مل کر اردو کے نامور شعراء کی قبروں کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

یونیورسٹی سے نکل کر میں قیصر باغ کی طرف جا رہا تھا کہ قیصر باغ کے پل پر ایک موٹر سائیکل میرے رکشا سے ٹکرا گئی۔ رکشا اُلٹ گیا اور میرا دوسرا پاؤں بھی زخمی ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا چشمہ بچ گیا اور زیادہ چوٹ نہ آئی۔

قیصر باغ کی بارہ دری اب تقریبات کے لئے مخصوص ہے۔ نوابانِ اودھ کے مقبرے ویران پڑے ہیں۔ قیصر باغ میں بھٹ کھانڈے سکول آف انڈین میوزک کی عمارت پر نظر پڑی۔ اسی باغ کی بارہ دری میں کبھی اندر سبھا کے ڈرامے ہوا کرتے تھے اور واجد علی (م ۱۸۸۸ء) خود کنہیاجی کا رول ادا کیا کرتے تھے۔ اب اس کے قریب ہی کتھک سکھانے کا ادارہ ہے۔

قیصر باغ کے قریب ہی پکھری روڈ پر "صدقِ جدید" کا دفتر اور حکیم عبدالقوی صاحب کا مطب ہے۔ موصوف کے ساتھ میری ملاقات دیو بند کے صد سالہ جشن پر

دیو بند میں ہو چکی تھی۔ ان کے توسط سے بمبئی کے حکیم عمر مختار اور عبدالرحمن پرواز اصلاحی صاحب سے بھی تعارف ہوا تھا۔ اصلاحی صاحب بعد میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے منسلک ہو گئے تھے۔ مطب پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ حکیم صاحب دریا باد گئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس رہے گا۔ حکیم عبدالقوی جیسے مخلص انسان اب ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ افسوس کہ ۱۹۹۲ء میں بزمِ ماجد کا یہ چراغ بھی بجھ گیا۔
میں دن کا باقی حصہ لکھنؤ کے بازاروں اور گلی کوچوں میں گھومتا رہا اور بار بار یہ شعر گنگناتا رہا:

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پر غنیمت ہے
نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے

شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ملفوظات میں مرقوم ہے کہ لکھنؤ کا اصل نام لچھنو تھا۔ اجودھیا کے راجہ رام چندر جی نے جب یہ علاقہ اپنے بھائی لچھمن کو بطور جاگیر عطا کیا تو انہوں نے یہاں اپنے نام کی رعایت سے لچھنو کے نام سے ایک شہر کی بنیاد رکھی۔ کثرتِ استعمال سے لچھنو 'لکھنؤ' بن گیا۔

نوابانِ اودھ نے جب ریاست اودھ کی بنیاد رکھی تو ان کا دارالحکومت فیض آباد تھا۔ نواب شجاع الدولہ (م ۱۷۷۵ء) اور ان کی اہلیہ بہو بیگم (م ۱۸۱۶ء) اور والدہ موتی بیگم وہیں دفن ہیں۔ نواب آصف الدولہ (م ۱۷۹۷ء) نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا اور وہاں کئی شاندار عمارتیں بنوائیں۔ ان کے بعد قریب قریب ہر نواب نے وہاں تعمیرات کرائیں اور لکھنؤ کو برِ عظیم میں تہذیب و ثقافت کا ایک اہم مرکز بنا دیا۔ آتش، دبیر، میر، سودا، رنگین، انشاء اور انیس نے لکھنؤ کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ نولکشور نے یہاں چھاپہ خانہ لگا کر تشنگانِ علم کو سیراب کیا۔ خود ہمارے زمانے میں ارم، صفی اور عزیز کی نغمہ سنجیوں نے لکھنؤ کو رشکِ دہلی بنا دیا۔

۲۲ اگست کی صبح میں لکھنؤ سے رائے بریلی جانے کے لئے بس میں سوار ہوا اور کوئی دو سوا دو گھنٹے میں رائے بریلی پہنچ گیا۔

رودولی سے اعظم گڑھ تک

۱۷ اگست ۱۹۷۸ء کو میں سوا آٹھ بجے صبح لکھنؤ سے فیض آباد جانے والی ٹرین میں سوار ہوا۔ یہ ٹرین بارہ بنکی ہوتی ہوئی دریا باد پہنچی۔ پلیٹ فارم پر اتر کر میں نے مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ کے لئے دعائے مغفرت کی اور انہیں یاد کرتے ہوئے ٹرین میں سوار ہو گیا۔ دس بجے ہماری ٹرین رودولی جا کر رکی۔ یہ مقام لکھنؤ سے نوّے کلو میٹر کے فاصلے پر ہے اور اس کی شہرت سلسلۂ چشتیہ کے نامور بزرگ حضرت شیخ احمد عبدالحق رودولویؒ (م ۱۴۳۳ء) کی وجہ سے ہے۔ بعض اہل علم رودولی کی املاء رُدولی کرتے ہیں، جو صحیح نہیں۔ حضرت احمد عبدالحق صاحب توشہ، حضرت جلال الدین کبیرالاولیاء پانی پتی کے خلیفہ تھے۔ ان سے چشتیۂ صابریہ سلسلے کی خوب اشاعت ہوئی۔ ان کے فرزند اور جانشین شیخ محمد عارفؒ کے اخلاق کی سوانح نگاروں نے بڑی تعریف کی ہے۔ ان کے فرزند اور جانشین شیخ محمدؒ، حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے شیخِ طریقت تھے۔

میں اپنا سامان لے کر اسٹیشن سے باہر نکلا تو وہاں متعدد یکّے کھڑے تھے۔ میں ایک یکّے پر سوار ہو کر شہر کی جانب روانہ ہوا تو راستے میں بڑے زور کی بارش شروع ہو گئی۔ یکّہ چونکہ بغیر چھت کے تھا، اس لئے اس سے اتر کر ایک دوکان کے سائبان کے نیچے پناہ لی۔ میں نے بیس منٹ تک بارش رکنے کا انتظار کیا لیکن بارش تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ مجبوراً میں نے یکّے والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا اور ایک چھت والے یکّے میں سوار ہو کر شہر کی جانب روانہ ہوا۔ جب یکّہ روانہ ہوا تو معلوم ہوا کہ چھت کا عدم اور وجود دونوں برابر ہیں۔

ریلوے اسٹیشن سے شہر کا فاصلہ ایک میل کے لگ بھگ ہے۔ راستے میں بائیں ہاتھ ایک سفید چوکھنڈی نظر آئی۔ اس میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ (م ۱۵۳۷ء) کے والد بزرگوار شیخ اسمٰعیلؒ اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ تھوڑی دور چل کر بازار شروع ہوا۔ بارش کی وجہ سے آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔

بازار کے اختتام پر حضرت احمد عبدالحق رودولویؒ کی درگاہ ہے۔ درگاہ کے بالمقابل ایک پرانی سی مسجد ہے۔ میں سامان اٹھا کر مسجد میں داخل ہوا۔ وضو کے لئے کوئی مسقّف جگہ نہ تھی اور ہنوز بارش جاری تھی۔ میں وضو کرتے کرتے اچھی طرح بھیگ گیا۔

وضو سے فارغ ہو کر میں درگاہ کے احاطے میں داخل ہوا۔ صحن کے وسط میں ایک چبوترے پر ٹین کی چھتری کے نیچے حضرت احمد عبدالحق، ان کی اہلیہ مکرّمہ اور ان کے صاحبزادے شیخ محمد عارفؒ آسودۂ خاک ہیں۔ چھتری سے باہر حضرت محمد عارفؒ کے صاحبزادے اور شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مُرشد شیخ محمدؒ کا مزار ہے۔ اعظم گڑھ جا کر مجھے معلوم ہوا کہ مشہور مؤرخ اور مدیر ماہنامہ "معارف" شاہ معین الدین احمد ندوی (م ۱۹۷۴ء) بھی وہیں چوہدری خلیل احمد کی مسجد کے صحن میں دفن ہیں۔

مجھے دیکھتے ہی درگاہ کے کئی مجاور وہاں جمع ہو گئے۔ میں ان کے سوالوں سے بچنا چاہتا تھا۔ اتنے میں چند ہندو نوجوان جلیبیاں لے کر وہاں آ گئے اور مجاور ان کے گرد اکٹھے ہو گئے اور میں اطمینان کے ساتھ فاتحہ پڑھ کر درگاہ سے باہر نکل آیا۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے "انوار العیون" کے عنوان سے حضرت احمد عبدالحق کے ملفوظات جمع کئے تھے اور ان کا اُردو ترجمہ بھی بہاولپور سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ان بزرگوں میں دو پُشتوں کا فاصلہ ہے، اس لئے یہ ملفوظات سُنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں۔ اسی طرح مولانا آزاد لائبریری مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "ملفوظاتِ احمد عبدالحق رودولویؒ" کے عنوان سے ایک مخطوطہ موجود ہے، جس کے مرتب حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ بتائے جاتے ہیں۔ اس مخطوطہ کی صحت بھی مشتبہ ہے۔

درگاہ سے باہر نکلتے ہی مجھے ایک یکّہ مل گیا اور میں اس میں سوار ہو کر بھیلسر پہنچا۔ یہ جگہ درگاہ سے قریباً دو کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ لکھنؤ۔ فیض آباد روڈ پر واقع ہے اور وہاں گنتی کی چند دوکانیں ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو فیض آباد جانے والی بس تیار کھڑی تھی۔ بھیلسر سے فیض آباد کا فاصلہ چالیس کلو میٹر ہے اور بس پون گھنٹہ میں وہاں پہنچا دیتی ہے۔

فیض آباد کے بس اسٹینڈ کے قریب دو بڑے عالیشان ہوٹل تھے لیکن وہ دونوں فُل تھے۔ مجبوراً مجھے رکاب گنج میں ایک تیسرے درجے کے ہوٹل میں جگہ ملی۔ ہوٹل کا

مالک ایک بوڑھا سکھ تھا اور جب میں نے اس کے ساتھ پنجابی زبان میں گفتگو کی تو وہ "نہال" ہو گیا۔ اس نے میرا سامان اٹھا کر کمرے میں پہنچایا اور میرے نہانے کے لئے پانی بھی فراہم کر دیا۔ میں نہا دھو کر ہوٹل سے باہر آیا تو قریب ہی ایک حکیم صاحب کو اپنے مطب میں تلاوت میں مشغول پایا۔ میں ان کی جانب بڑھا اور علیک سلیک کے بعد ان سے بابری مسجد کا پتہ پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ بابری مسجد تو اجودھیا میں ہے اور وہاں پولیس کا پہرہ ہے۔ مسلمانوں کو مسجد میں داخل ہونے کی ممانعت ہے اس لئے دور ہی سے اسے دیکھنا ممکن ہے۔ ظہر کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے حکیم صاحب سے کسی قریبی مسجد کا پتہ پوچھا تو انہوں نے کہا کہ نماز پڑھنی ہے تو یہیں پڑھ لیجئے۔ میں نے کہا کہ میرا وضو نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہیں پانی کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ میں چونکہ لوٹے سے وضو کرنے کا عادی نہیں ہوں اس لئے مسجد میں نماز ادا کرنے کو ترجیح دی۔ میں مطب سے نکلا تو سامنے ایک عالیشان مسجد نظر آئی۔ میں نے مڑ کر کہا کہ مسجد تو سامنے نظر آ رہی ہے۔ حکیم صاحب نے ایک بار پھر مطب پر ہی نماز ادا کرنے پر اصرار کیا لیکن میں نہ مانا اور مسجد میں پہنچ کر ہی دم لیا۔

یہ مسجد نواب حسن رضا خان کی تعمیر کردہ ہے اور شہر کے عین وسط میں ترپولیہ دروازے کے قریب واقع ہے۔ مسجد کے نیچے چاروں طرف دوکانیں ہیں جن کے کرایہ سے کافی آمدنی ہو جاتی ہے۔ مسجد کے ساتھ ایک لائبریری بھی موجود ہے جس سے ہر شخص استفادہ کر سکتا ہے۔ میں مسجد میں داخل ہوا تو وضو کے لئے پچیس تیس ٹونٹیاں لگی ہوئی تھی لیکن ان میں تین یا چار ٹونٹیاں چالو حالت میں تھیں۔ اتنی بڑی مسجد میں وضو کے اس ناقص انتظام پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں اسی حیرانی میں مسجد کے دالان میں داخل ہوا تو وہاں ایک شخص سویا ہوا تھا اور ایک شخص ہاتھ چھوڑ کر نماز ادا کر رہا تھا۔ منبر کے قریب لکڑی کے ایک بکس میں چھوٹی چھوٹی تختیاں پڑی تھیں جنہیں اہل تشیع نماز ادا کرتے وقت سجدہ کی جگہ رکھ لیتے ہیں۔ میں نماز ادا کئے بغیر مسجد سے باہر نکلا تو اس وقت مجھے خیال آیا کہ حکیم صاحب اپنے مطب پر نماز ادا کرنے پر جو اصرار کر رہے تھے وہ بلا وجہ نہ تھا۔

مسجد کے نیچے میں نے ایک ریستوران میں چائے پی اور ہوٹل کے مالک سے کسی

دوسری مسجد کا پتہ پوچھا۔ اس نے بتایا کہ قریب ہی گلی میں ٹاٹ شاہ کی مسجد ہے اور وہی شہر کی جامع مسجد ہے۔ میں نے ظہر کی نماز ٹاٹ شاہ کی مسجد میں ادا کی۔ یہ مسجد بڑی خوبصورت اور قابل دید ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نواب شجاع الدولہ (م ۱۷۸۵ء) کا مقبرہ دیکھنے گیا۔ یہ مقبرہ وہاں "گلاب باڑی" کے نام سے موسوم ہے اور مرکز شہر سے بمشکل ایک فرلانگ دور تھا۔

میں ایک خوش وضع سہ درہ سے گذر کر باغ میں داخل ہوا، اس میں مختلف رنگوں کے گلاب کے پھولوں کے تختے نظر آئے جن کی مناسبت سے یہ جگہ گلاب باڑی کہلاتی ہے۔ تھوڑی دور چل کر ایک اور سہ درہ آتا ہے جس سے گذر کر دوسرے باغ میں داخل ہوتے ہیں۔ باغ کے عین وسط میں اشوک کی لاٹ کا ایک شئ نصب ہے جو اس ماحول میں نہیں جچتا۔ اس کے بعد ایک اور سہ درہ آتا ہے اور اس سے گذر کر مقبرہ تک پہنچتے ہیں۔

مقبرہ کی سہ منزلہ عمارت بیس دری کی طرز پر تعمیر ہوئی ہے جس کے چاروں طرف غلام گردش بنے ہوئے ہیں۔ مقبرے کے اوپر ایک رعب دار گنبد بنا ہوا ہے۔ جس وقت میں وہاں پہنچا تو مقبرے کا دروازہ بند تھا۔ میرا اشتیاق دیکھ کر چوکیدار نے قفل کھول دیا مقبرے کے اندر دو قبریں ہیں جن میں سے ایک نواب شجاع الدولہ کی قبر ہے اور دوسری ان کی والدہ موتی بیگم کی، تیسری قبر کا نشان موجود ہے لیکن وہاں کوئی شخص دفن نہیں۔ میرے استفسار پر چوکیدار نے بتایا کہ اس جگہ نواب صفدر جنگ (م ۱۷۵۴ء) کو عارضی طور پر دفن کیا گیا تھا بعد ازاں ان کی وصیت کے مطابق میت دہلی پہنچا دی گئی۔

مقامی طور پر یہ روایت مشہور ہے کہ نواب شجاع الدولہ کے مقبرے کا صدر دروازہ اور لکھنؤ کا رُومی دروازہ بالکل ایک سیدھ میں واقع ہیں۔ مقبرے کے ایک کونے میں ایک بلند کرسی پر ایک مسجد واقع ہے لیکن اب وہ بالکل ویران پڑی ہے اور کبوتروں کو اندر جانے سے روکنے کے لئے جالیاں لگا دی گئی ہیں۔ مسجد کے نیچے حجروں میں مالی سکونت پذیر ہیں۔

شجاع الدولہ کے مقبرے کے ارد گرد لاہور کے شالا مار باغ کی طرز پر مضبوط چار

دیواری بنی ہوئی ہے۔ مقبرے کے احاطے میں جو سہ درے بنے ہوئے ہیں، وہ اسلامی فن تعمیر کا نمونہ ہیں۔ مقبرے کا گنبد بھی اپنی وضع قطع کے اعتبار سے ہمارے ہاں کے گنبدوں سے مختلف ہے۔

نواب شجاع الدولہ نے ۱۷۵۴ء سے ۱۷۷۵ء تک اودھ پر حکومت کی تھی۔ سیاسی اعتبار سے یہ بڑا اہم دَور تھا۔ اس نے شاہ عالم ثانی (م ۱۸۰۶ء) اور میر قاسم کے ساتھ مل کر بکسر کی لڑائی میں انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی دعوت پر ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ مل کر مرہٹوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا۔ منشی ہرچرن داس نے اپنی مشہور تصنیف "چہار گلزار شجاعی" نواب شجاع الدولہ کے نام منسوب کی تھی۔ یہ اودھ کی عمومی تاریخ ہے اور ایک طبقہ میں بڑی معتبر سمجھی جاتی ہے۔

مجھے مقبرے کے چوکیدار نے بتایا کہ میں نواب شجاع الدولہ کی اہلیہ اُمتہ الزہرا المعروف بہ بہو بیگم کا مقبرہ ضرور دیکھوں۔ یہ مقبرہ نواب موصوف کے مقبرے سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ گلاب باڑی سے نکلتے ہی مجھے رکشا مل گیا اور میں فیض آباد کے بازاروں سے گذرتا ہوا تھوڑی دیر میں بہو بیگم کے مقبرے پہنچ گیا۔

بہو بیگم نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد چالیس برس تک زندہ رہیں۔ ان کا انتقال ۱۸۱۵ء میں ہوا اور انہوں نے اپنی حیات ہی میں اپنا مقبرہ تعمیر کروا لیا تھا۔ یہاں بھی سہ درہ سے گذر کر ایک باغ میں داخل ہوتے ہیں۔ سہ درہ میں ان دنوں کچہری سے متعلقہ دفاتر قائم ہیں۔ باغ کے سرے پر ایک بلند دروازہ آتا ہے جس سے گذر کر ایک دوسرے باغ میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں بھی اسپیل پام بڑے قرینے کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔

مقبرے کی عمارت چار منزلہ ہے۔ بہو بیگم کی قبر سطح زمین کے برابر ہے۔ میں نے یہاں ہندو عورتوں کو ماتھا ٹیکتے ہوئے بھی دیکھا۔ قبر کے گرد دوہرا غلام گردش بنا ہوا ہے۔ دوسری منزل پر ایک بڑا دالان ہے جس میں پرانے زمانے کے تعزیے رکھے ہوئے ہیں۔ اس دالا ں ماہِ محرم میں مجالس عزا برپا ہوتی ہیں۔ اس دالان کے اوپر ایک گنبد بنا ہوا ہے اور چاروں طرف سے سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں۔ اس گنبد کو دیواروں

نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے اور ان دیواروں کے اوپر پھر ایک گنبد اٹھایا گیا ہے۔ اس گنبد کو بھی دیواروں نے چاروں طرف سے ڈھانپ رکھا ہے اور ان دیواروں کے اوپر پھر ایک گنبد بنا ہوا ہے۔ میں نے ایسا فن تعمیر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اسے دیکھ کر طبیعت بے حد مسرور ہوئی۔ آخری منزل پر چڑھ کر پورا شہر اور میلوں تک کا علاقہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر میں یہ عمارت نہ دیکھتا تو مجھے زندگی بھر افسوس رہتا۔

بہو بیگم کا مقبرہ دیکھ کر میں شہر واپس آیا اور اجودھیا جانے کے لئے اس ریستوران کے مالک سے ہدایات لیں۔ میری درخواست پر اس نے ایک رکشا والے کے ساتھ کرایہ ٹھہرا کر مجھے اس میں سوار کرا دیا۔ مرکز شہر سے اجودھیا کا فاصلہ تین میل ہے اور سارے راستے میں مسجدیں اور قبرستان ہی نظر آتے ہیں یہ تمام مساجد اور قبرستان "جی بوا" کے قائم کردہ وقف کی نگرانی میں ہیں۔

اس روز اجودھیا جانے والی سڑک پر غیر معمولی رش تھا۔ میرے استفسار پر رکشا ڈرائیور نے بتایا کہ پورنماشی کا موقع ہے اس لئے لاکھوں کی تعداد میں یاتری اجودھیا جا رہے ہیں۔ میں قریباً پون گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔ اجودھیا شری رام چندر جی کی جنم بھومی ہے اور وہاں سوا سو کے قریب مندر ہیں جو اس بزرگ کی زندگی کے مختلف مراحل کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک شاندار عمارت عین اس جگہ بنی ہوئی ہے جہاں رام چندر جی کے پتا راجہ دسرتھ کا محل تھا۔ اسی طرح ایک شاندار مندر دُودا راجا کی طرف منسوب ہے اور ایک قلعہ نما مندر، جو ہنومان گڑھی کے نام سے مشہور ہے، ہنومان سے منسوب ہے۔ اس مندر میں بندر کافی بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ میں ان مندروں کے درمیان سے گزرتا اور یاتریوں سے "سیتا رسوئی" کا راستہ معلوم کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ یاتریوں کا ایک ہجوم ریلے کی صورت میں اسی طرف جا رہا تھا۔

مندر کی ڈیوڑھی سے گزر کر میں ایک وسیع صحن میں داخل ہوا۔ سامنے چند پُجاری بتوں کی پرستش میں مشغول تھے اور ہجوم صحن کے داہنی جانب ایک بڑے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کمرے کا کچھ حصہ سطح زمین سے اندازاً فٹ بھر نیچا تھا اور اس میں سرخ پتھر کے بنے ہوئے دو چولہے موجود تھے جن پر لوگ نقدی کی صورت میں بھینٹ چڑھا رہے تھے۔ ان چولہوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ان پر سیتا جی کھانا پکایا

کرتی تھیں ۔ اسی وجہ سے یہ مندر "سیتا رسوئی" کے نام سے مشہور ہے ۔ مجھے بڑے گاؤں (ضلع بارہ بنکی) کے ایک زمیندار جناب حمایت علی قدوائی نے یہ جگہ دیکھنے کی ہدایت کی تھی ۔

میں سیتا رسوئی سے باہر نکلا تو چند قدم کے فاصلے پر بابری مسجد نظر آئی ۔ مسجد کے گرد ایک آہنی جنگلہ لگا دیا گیا ہے اور مسجد کے دالان میں مسلح پولیس گارد متعین تھی فرقہ وارانہ فساد کے خوف سے مسلمانوں کو مسجد کے قریب جانے سے بھی منع کر دیا گیا ہے ۔ میں چونکہ بوشرٹ اور پتلون میں ملبوس تھا اس لئے مجھے وہاں کوئی نہ پہچان سکا ۔

مسجد کے منبر پر کسی دیوی کا مجسمہ نصب تھا ۔ مسجد کے دالان میں بھی پولیس بیٹھی ہوئی تھی ۔ صحن مسجد کے ایک جانب ایک کاؤنٹر بنا ہوا تھا جہاں پانی بطورِ پرشاد تقسیم ہو رہا تھا ۔ یہ مسجد مغلیہ خاندان کے بانی ظہیر الدین محمد بابر (م ۱۵۳۰ء) کے عہد میں اس کے ایک امیر میرباقی نے ۱۵۲۸ء میں تعمیر کرائی تھی ۔ مسجد کے اوپر تین گنبد ابھی تک قائم ہیں اور دیواروں پر جگہ جگہ اسم ذات (اللہ) کندہ ہے ۔ اس مسجد پر قبضہ کرنے کے لئے یہ مشہور کیا گیا کہ بابر نے یہ مسجد عین اس جگہ تعمیر کی تھی جہاں رام چندر جی پیدا ہوئے تھے ۔ اب یہ جگہ جنم بھومی کے نام سے مشہور ہے ۔

ہندو یاتری مسجد کے باہر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے ۔ ایک یاتری نے تلخ لہجہ میں دوسرے یاتری سے کہا کہ مسلمانوں نے اپنے زمانے میں اس مندر کو مسجد میں تبدیل کر لیا تھا ۔ ایک اور یاتری بولا کہ مسلمان اپنے وقت میں ایسا ہی کیا کرتے تھے اور انہوں نے متھرا اور کاشی (بنارس موجودہ وارانسی) میں بھی یہی کچھ کیا تھا ۔ ایک اور بھدر پرش گویا ہوا کہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ مندر ہے اور ذرا اس کے کنگورے تو دیکھئے بالکل مندروں جیسے ہیں ۔ میں خاموشی کے ساتھ ان کی گفتگو سنتا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا ۔ افسوس کہ یہ مسجد ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو جنونی ہندوؤں نے شہید کر دی ۔

اس مسجد کے عقب میں تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک قبرستان ہے جس میں قدوائیوں کے مُورثِ اعلیٰ قاضی قدوۃُ الدین المعروف بہ قاضی قُدوہ مدفون ہیں ۔

قاضی قُدوہ کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ ان کے ستر بیٹے تھے اور سلطان وقت نے ستر گاؤں انہیں بطور جاگیر عطا کئے تھے ۔ یہیں سے اُردو زبان میں یہ

محاورہ مشہور ہوا:

قاضی قُدوہ آدھے بابا آدم

میں بابری مسجد دیکھ کر واپس لوٹ رہا تھا کہ مجھے ایک رکشا مل گیا ۔ میں نے رکشا ڈرائیور کو دریا کی طرف چلنے کو کہا ۔ اجودھیا دراصل دریائے سرجو کے کنارے آباد ہے ۔ فارسی ادب میں اس دریا کا نام "سرو" بھی پڑھنے میں آیا ہے ۔ دریا کے ساتھ ساتھ بہت سے مندر بنے ہوئے ہیں جن کی سیڑھیاں پانی میں اترتی ہیں ۔ رکشا والا مجھے گولہ گھاٹ لے گیا ۔ میں نے دیکھا کہ ہندو یاتری ڈنڈوت کرتے ہوئے ان مندروں کی طرف جا رہے تھے ۔ میں نے رکشا ہی میں اشاروں کے ساتھ عصر کی نماز ادا کی ۔

دریائے سرجو ان دنوں طغیانی پر تھا اور اس کا پاٹ نصف میل کے لگ بھگ تھا ۔ یہ ایک تاریخی دریا ہے ۔ سلطان بلبن کے فرزند بُغرا خان حاکم بنگال اور اس کے بیٹے سلطان کیقباد کی ملاقات اسی دریا کے کنارے ہوئی تھی ۔ جس کا آنکھوں دیکھا حال حضرت امیر خسروؒ نے "قرانُ السعدین" کے نام سے منظوم کیا ہے ۔ اسی طرح حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ملفوظات "لطائفِ قدوسی" میں بھی اس دریا کا ذکر آتا ہے ۔ جامع ملفوظات شیخ رکن الدین تحریر فرماتے ہیں کہ ۱۵۲۶ء میں جب بابر نے پانی پت کی تاریخی جنگ میں افغانوں کو شکست دی تو وہ مغلوں کے خوف سے بہار و بنگال کی طرف بھاگے ۔ ان کے دلوں میں اتنا خوف تھا کہ دریائے سرجو کے گھاٹ پر وہ بڑی تعداد میں کشتیوں میں سوار ہو جاتے اور ان کی حماقت سے کشتیاں دریا میں ڈوب جاتی تھیں ۔

میں کافی دیر تک گولہ گھاٹ پر کھڑا دریا کی جولانی اور روانی کا نظارہ کرتا رہا ۔ گولہ گھاٹ سے میں رکشا میں سوار ہو کر فیض آباد روڈ کی طرف روانہ ہوا تو ہندوؤں کی اس مقدس بستی میں کئی مسجدیں نظر آئیں جن پر لاؤڈ اسپیکر نصب تھے ۔ یہیں ابراہیم قلندر نامی ایک بزرگ کا مزار ہے جہاں جمعرات کو کافی رونق ہو جاتی ہے ۔ میں نے رکشا والے سے پوچھا کہ یہاں کتنے مسلمان بستے ہیں ؟ اس نے فخریہ لہجے میں کہا کہ پہلے تو بہت مسلمان یہاں آباد تھے ۔ اب سب بھگا دیئے ہیں بلکہ جنم بھومی پر بھی کبجا (قبضہ) کر لیا ہے ۔ میں نے چوک میں آکر رکشا چھوڑ دیا اور وہاں ایک سبزی فروش مسلمان سے اجودھیا میں مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں سوال کیا تو اس نے بتایا کہ اب بھی

کوئی ڈھائی ہزار کے قریب مسلمان وہاں آباد ہیں۔

اجودھیا کے بازاروں میں زیادہ تر مالائیں، گُلال، پُوجا پاٹ کا سامان، قشقہ کھینچنے کے رنگ اور مذہبی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ مندروں میں بڑے تن و توش کے پروہت زناریں باندھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو ہندو دھرم کی صحیح جھلک دیکھنی ہو تو وہ اجودھیا جا کر دیکھے۔ میں نے بنارس بھی دیکھا ہے لیکن اجودھیا کی بات ہی دوسری ہے۔

میں اجودھیا کی دل بھر کر سیر کر چکا تھا اور مغرب کا وقت بھی قریب ہو رہا تھا، اس لئے فیض آباد جانے کے لئے رکشا پر سوار ہوا اور اشاروں کے ساتھ نماز ادا کی۔ سڑک سے ڈھائی تین فرلانگ کے فاصلے پر اجودھیا کا ریلوے اسٹیشن دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے عقب میں ایک جگہ منی پربت کے نام سے مشہور ہے جہاں حضرت شیث علیہ السلام کی قبر بتائی جاتی ہے۔ میں نے رکشا والے سے اس طرف چلنے کو کہا لیکن اندھیرا اور راستہ خراب ہونے کی وجہ سے اس نے انکار کر دیا۔ بادلِ نخواستہ میں فیض آباد کی طرف روانہ ہوا اور پَون گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔ عشاء کی نماز ثابت شاہ کی مسجد میں ادا کی اور ہوٹل جا کر سو رہا۔ اگلی صبح میں سامان اٹھا کر بس اسٹینڈ پہنچا۔ وہاں جا کر ناشتہ کیا اور اعظم گڑھ جانے والی بس میں بسکھاری کا ٹکٹ لے کر سوار ہو گیا۔

مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ انگریزی میں سید امین اشرف نام کے ایک فاضل اُستاد ہیں جن کے مضامین ششماہی "نقد و نظر" میں چھپتے رہتے ہیں۔ موصوف کچھوچھہ شریف کے رہنے والے ہیں۔ میں نے ان سے کچھوچھہ شریف جانے کا راستہ دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ فیض آباد سے بذریعہ ٹرین اکبرپور جاتے ہیں اور وہاں سے بسکھاری تک پندرہ میل کی مسافت بس کے ذریعے طے کرتے ہیں۔ بسکھاری سے کچھوچھہ شریف جانے کے لئے رکشا مل جاتا ہے۔ میں نے ان سے یہ تفصیل سن کر کہا کہ ایسا سفر میرے بس کی بات نہیں ہے۔

اتفاق دیکھئے کہ فیض آباد میں جب میں حکیم صاحب سے ملا تو انہوں نے بتایا کہ بسکھاری تک براہِ راست بس مل جاتی ہے۔ یوں میری ایک بڑی مشکل حل ہو گئی اور میں تین گھنٹے میں بس کے ذریعے بسکھاری پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ لب

سڑک چائے اور کھانے کے تیسرے بلکہ چوتھے درجے کے ریستوران ہیں اور گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کا ایک معمولی سا دفتر ہے۔ میں نے وہاں چائے نوش کی اور گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے دفتر میں اپنا سامان رکھ کر کچھوچھہ شریف جانے کے لئے رکشا میں سوار ہوا۔

بسکھاری سے کچھوچھہ شریف قریباً ڈیڑھ میل ہے اور وہاں تک پختہ سڑک جاتی ہے۔ دونوں طرف تاحدِ نظر دھان کے کھیت اور آم و جامن کے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ راستے میں بارش شروع ہو گئی اور میں بُری طرح سے بھیگ گیا۔

درگاہ شریف ایک چھوٹی سی بستی میں واقع ہے۔ اصل گاؤں وہاں سے میل بھر دُور ہو گا جہاں سجادہ نشینوں کی رہائش ہے۔ درگاہ شریف گھوروں کے جھنڈ میں واقع ہے اور اس طرف جو راستہ جاتا ہے وہ کچا ہونے کی وجہ سے خراب ہو رہا تھا۔ راستے میں دونوں طرف مکان ہیں جن کی چھتیں ڈھلوان ہیں۔ درگاہ کے قریب چند دکانیں ہیں جن پر پھلیاں، بتاشے، الائچی دانہ اور اگربتیاں فروخت ہوتی ہیں۔ درگاہ ایک ٹیلے پر واقع ہے اور گنبد کے اندر دو مزار ہیں، جن میں سے ایک حضرت اشرف جہانگیر سمنانی (م ۱۴۰۵ء) کا ہے اور دوسرا ان کے فرزند کا۔ گنبد کے اندر جگہ جگہ "اللہ اکبر" منقوش ہے۔ گنبد سے باہر ایک احاطے میں متعدد قبریں ہیں جن میں سے پانچ قبریں حضرت اشرف جہانگیر کے جانشینوں کی ہیں۔ درگاہ سے ملحق ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس میں بمشکل چالیس آدمی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ درگاہ کے عقب میں ایک بڑی مسجد ہے جہاں زیادہ نمازیوں کے لئے گنجائش ہے۔ ان دونوں مسجدوں میں وضو کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ درگاہ کے قریب ایک جوہڑ ہے جس میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے اور اسی جوہڑ کو لوگ وہ ذر وہ کچھتے ہوئے اس کے پانی سے وضو کر لیتے ہیں۔ میں نے حاضرین سے وضو کی جگہ پوچھی تو انہوں نے جوہڑ کی طرف اشارہ کیا۔ جوہڑ کا پانی سبزی مائل ہو رہا تھا اور اس میں سے ہلکی سی بُو بھی آرہی تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا اس پانی سے وضو کرنے سے تو میں بے وضو ہی اچھا۔ چنانچہ میں بغیر وضو کئے وہاں سے لوٹا اور مخدوم صاحب کے مزار پر حاضری دی۔ فاتحہ خوانی کے بعد میں نے مراقبہ کیا تو مخدوم صاحب کی توجہ محسوس کی جس کا میرے قلب و رُوح پر بڑا اچھا اثر ظاہر ہوا۔

مخدوم اشرف جہانگیر سیر و سیاحت کرتے ہوئے برِ عظیم میں وارد ہوئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے ۔ ان کے ملفوظات ان کے ایک مرید "نظام حاجی غریب یمنی" نے لطائفِ اشرفی کے عنوان سے جمع کئے تھے جو ۱۲۹۹ھ میں نصرت المطابع دہلی سے طبع ہو چکے ہیں ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے چودھویں صدی عیسوی کے اسلامی ہندوستان کی تاریخ، تہذیب اور سماج کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات ملتی ہیں ۔ مخدوم صاحب نے برِ عظیم کے علاوہ ماوراء النہر، افغانستان، ایران، عراق، شام، حجاز اور یمن کی بھی سیاحت کی تھی اس لئے ان ملکوں کے بارے میں بھی لطائفِ اشرفی میں کافی مواد موجود ہے ۔

درگاہ سے اندازاً سو گز کے فاصلہ پر ایک نیا تعمیر شدہ گنبد ہے جس میں اشرف ثانی نام کے ایک بزرگ محوِ خوابِ ابدی ہیں ۔ درگاہ کے قریب ہی "مخدوم اشرف اورینٹل کالج" کے نام سے چند کمروں پر مشتمل ایک دینی مدرسہ ہے ۔ اس کے ساتھ ایک دارالاقامہ بھی ہے، جو حال ہی میں تعمیر ہوا ہے ۔

یہ ساری بستی اللہ والوں کی بستی معلوم ہوتی ہے ۔ گزشتہ چھ سو سال میں یہاں بڑے بڑے بزرگوں نے زندگیاں گزاری ہیں جن کے نفوسِ قدسیہ کی مہک آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے ۔

کچھوچھہ شریف ضلع فیض آباد کی تحصیل ٹانڈہ میں واقع ہے اور اسے پُورب کا رُوحانی مرکز سمجھنا چاہیے (ایک پاکستانی "اسکالر" نے اپنے ایک عالمانہ مقالے میں اسے گجرات کا قصبہ لکھا ہے) ۔ مخدوم اشرف جہانگیر سے راقم الحروف کا ایک تعلق یہ بھی ہے کہ ان کے مُرشد حضرت علاء الدین علاء الحق (م ۱۳۹۸ء) شیخ اسعد کے فرزند تھے جو لاہور کے رہنے والے تھے ۔

کچھوچھہ شریف سے میں رکشا میں سوار ہو کر بسکھاری آیا اور وہاں ڈیڑھ گھنٹہ بس کا انتظار کیا ۔ شدید انتظار کے بعد جب بس آئی تو اس میں کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہ تھی تاہم میں اس میں سوار ہو کر ڈیڑھ گھنٹے میں شاہ گنج ہوتے ہوئے اعظم گڑھ پہنچ گیا ۔

اعظم گڑھ کے بس اسٹینڈ سے میں رکشا میں سوار ہو کر دارالمصنفین پہنچا ۔ اتفاق سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن ان دنوں پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے ۔ ان کے

صاحبزادے احتشام الدین، جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم ہیں، وہاں موجود تھے ۔ ایک ملازم نے میرا سامان اٹھا کر مہمان خانے میں پہنچا دیا ۔ مہمان خانے کے چبوترے پر مولانا عبدالسلام قدوائی کھڑے تھے ۔ میں نے اپنا نام اور پتہ بتایا تو انہوں نے فرمایا کہ ماہنامہ "برہان" دہلی میں وہ میرے بارے میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تحریریں پڑھ چکے ہیں ۔ ان دنوں "برہان" میں مولانا صاحب کا سفر نامۂ پاکستان قسط وار چھپ رہا تھا اور اس میں بار بار میرا ذکر آ رہا تھا ۔ قدوائی صاحب بڑے تپاک سے ملے۔

نمازِ عصر کا وقت ہو رہا تھا اس لئے ہم دونوں مسجد کی طرف چل پڑے ۔ وہیں احتشام الدین اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی بھی پہنچ گئے ۔ سبز رنگ کی یہ مسجد بڑی خوبصورت ہے اور ندوۃ العلماء کی مسجد سے ملتی جلتی ہے ۔ یہ دونوں مساجد مولانا عمران خان کی تعمیر کردہ ہیں اس لئے ان میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے ۔

نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلے تو صدر دروازے کے قریب ہی مولانا شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) اور ان کے فرزند حامد مرحوم (م ۱۹۴۲ء) کی قبریں نظر آئیں ۔ مولانا شبلی کے لوحِ مزار پر "محبۃ الملۃ و الدین علامہ شبلی نعمانی، ولادت مئی ۱۸۵۷ء، وفات نومبر ۱۹۱۴ء" کے علاوہ ان کے یہ دو شعر بھی کندہ ہیں:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتمؐ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

دارالمصنفین دراصل مولانا شبلی کی یادگار ہے ۔ مرحوم علی گڑھ سے قطع تعلق کرکے ندوۃ العلماء چلے گئے تھے اور جب وہاں سے بھی سبکدوش ہوئے تو انہوں نے اعظم گڑھ آکر اپنے خاندانی باغ میں دارالمصنفین قائم کیا ۔ ان کی وفات کے بعد مولانا مسعود علی ندوی (م ۱۹۶۷ء) نے اپنی نگرانی میں دارالمصنفین کی شاندار عمارت تعمیر کروائی ۔

مولانا شبلی کے مزار سے چند گز کے فاصلے پر احاطے کی دیوار کے ساتھ مولانا عبدالسلام ندوی (م ۱۹۵۶ء) مولانا مسعود علی ندوی اور ان کی اہلیہ محوِ خوابِ ابدی ہیں ۔ (اب ان کے ساتھ سید صباح الدین عبدالرحمٰن (م ۱۹۸۷ء) کی قبر بن گئی ہے) ۔ ان کے

مزارات کی پائینتی چند گز کے فاصلہ پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی رہائش گاہ ہے ۔ ان کے مکان کے ساتھ ہی مہمان خانہ ہے اور سید صاحب کے مکان کے بالمقابل مولانا عبدالسلام قدوائی (م ۱۹۷۹ء) رہتے تھے ۔ جس مکان میں کبھی مولانا عبدالسلام ندوی رہتے تھے وہاں اب ضیاء الدین اصلاحی سکونت پذیر ہیں ۔

جن حضرات نے دارالمصنفین نہیں دیکھا ، وہ اس کے ماحول کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے ۔ ایک قلعہ نما باغ کے وسط میں دارالمصنفین کی خوبصورت عمارت ہے ۔ اس کے عقب میں اور جنوبی سمت رہائشی مکانات ہیں ۔ مغرب کی جانب پریس اور سٹور کی عمارتیں ہیں ۔ شمالی سمت مسجد اور رفقائے قدیم کے مزارات ہیں ۔ جن حضرات نے اپنی زندگیاں اس کارِ خیر کے لئے وقف کی ہیں وہ وہیں رہتے ہیں اور مر کر بھی وہیں دفن ہوتے ہیں ۔

جس وقت میں وہاں پہنچا اس وقت دفتر بند ہو چکا تھا تاہم مولانا قدوائی نے دفتر کھلوایا ۔ ہر کمرے میں کتابوں کی الماریاں ہیں جن میں کتابیں موضوعات کے اعتبار سے رکھی گئی ہیں ۔ مولانا شبلی کی ذاتی کتابیں اور ان پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ ایک الگ الماری میں رکھی گئی ہیں ۔

سید سلیمان ندوی مرحوم (م ۱۹۵۳ء) کی میز اور اس پر ان کے استعمال کی چیزیں جوں کی توں رکھی ہوئی ہیں ۔ ان پر سفید رنگ کی چادر ڈال دی گئی ہے ، ان کی کرسی پر بھی کوئی شخص نہیں بیٹھا ۔ دارالمصنفین کے رفقاء نے شاہ معین الدین احمد ندوی سے کہا تھا کہ وہ اس میز اور کرسی کو استعمال کیا کریں ۔ لیکن انہوں نے سید صاحب کے احترام میں ایسا کرنے سے معذرت چاہی ۔ شاہ صاحب کی وفات کے بعد احباب نے سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے یہی درخواست کی لیکن انہوں نے بھی معذرت کر دی ۔ اب یہ ایک روایت بن گئی ہے ۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن لاہور میں میرے غریب خانے پر عید کے رُوز قدم رنجہ فرما چکے ہیں ۔ ایک بار شاہ محمد جعفر پھلواروی کے دولت کدے پر ان سے ملاقات ہوئی ۔ ایک بار علی گڑھ یونیورسٹی کے سیمینار میں ہم اکٹھے تھے ۔ ایک بار لکھنؤ میں ان سے ملاقات ہوئی اور آخری ملاقات کراچی میں ان کی صاحبزادی کے دولت کدے پر ماڈل

کالونی میں ہوئی تھی ۔ ہماری خط و کتابت بھی رہتی تھی ان کی کئی کتابیں ان کے دستخطوں کے ساتھ میری ذاتی لائبریری میں موجود ہیں ۔

ایک شوکیس میں مولانا شبلی کی مصنوعی ٹانگ ، ان کے پہننے کا ایک جُبّہ ، شیروانی ، جُوتے اور چند کپڑے رکھے ہوئے ہیں ۔ ایک کمرہ مخطوطات کے لئے وقف ہے ۔ ایک الماری میں سیرت النبیؐ کا اصل مسوّدہ ، مشاہیر کے خطوط اور خاص طور پر علامہ اقبال (م ۱۹۳۸ء) مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی (م ۱۹۵۱ء) اور مولانا ابُوالکلام آزاد (م ۱۹۵۸ء) کے خطوط بڑے اہتمام کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں ۔ ایک الماری میں مشاہیر کے گروپ فوٹو محفوظ ہیں ۔ ان میں خاص طور پر وفد حجاز کی ایک فوٹو قابلِ دید ہے جس میں مولانا عبدالقادر قصوری (م ۱۹۴۲ء) سید سلیمان ندوی اور عبدالماجد بدایونی تشریف فرما ہیں ۔ اسی طرح ایک اور فوٹو قابلِ توجہ ہے جس میں سید سلیمان ندوی ، پنڈت جواہر لعل نہرو (م ۱۹۶۴ء) اور مولانا مسعود علی ندوی بیٹھے ہوئے ہیں ۔ دارالمصنفین کے تمام رفقاء کو مطالعہ اور کام کے لئے الگ الگ کمرے ملے ہوئے ہیں ۔ باہر سے آنے والے ریسرچ اسکالرز کے لئے مطالعہ کا ایک الگ کمرہ ہے ۔ مجھے یہ ماحول بڑا پسند آیا ۔ اگر یہ ادارہ پاکستان میں ہوتا تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں چلا جاتا ۔

دارالمصنفین کے قیام اور تعمیر میں مولانا مسعود علی ندوی کا بڑا ہاتھ ہے ۔ موصوف انتظامی اُمور کے بڑے ماہر تھے اور یاروں کے یار تھے ۔ پنڈت مُوتی لعل نہرو اور ان کے بعد جواہر لعل نہرو جب بھی اعظم گڑھ آتے تو وہ دارالمصنفین ہی میں قیام کرتے ۔ مولانا مسعود علی سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی ۔ ایک بار جواہر لعل نہرو اپنی وزارت عظمیٰ کے دور میں وہاں آئے تو دو ، دو سیڑھیاں پھلانگ کر اُوپر چڑھنے لگے ۔ انہوں نے مولانا مسعود علی ندوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "دیکھو مسعود! میں اس عمر میں بھی دو ، دو سیڑھیاں پھلانگ کر اُوپر چڑھتا ہوں " ۔ مولانا نے جواب دیا " پنڈت جی! مجھے وزیر بنا دیجئے ، میں تین تین سیڑھیاں پھلانگ کر اُوپر چڑھا کروں گا " ۔

پنڈت مُوتی لعل نہرو دارالمصنفین میں قیام کرتے تو سید سلیمان ندوی ایک روز ان کی بڑی پُر تکلف دعوت کرتے اور دستر خوان پر طرح طرح کے کھانے چُنتے ۔ پنڈت جی مُرغِ مسلّم کو دیکھ کر کہتے ۔ " سید صاحب ! اس پلیٹ کا تو میں بلا شرکتِ غیرے

مالک ہوں "۔ اس کے بعد موصوف بڑی رغبت کے ساتھ پورا مُرغ چٹ کر جاتے ۔

ایک بار پنڈت مُوتی لعل اور پنڈت مدن موہن مالوی (م ۱۹۴۶ء) دونوں دارالمصنفین میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ مالوی جی کھانے پینے کے معاملے میں بڑے سخت تھے ۔ گوشت تو دُور کی بات ہے وہ لہسن اور پیاز سے بھی مکمل اجتناب کرتے تھے ۔ سیّد صباح الدین سے روایت ہے کہ ایک ہندو کوری ہنڈیا میں سجاؤ دہی ڈالے اور کیلے کے پتے سے اسے ڈھانپے ہوئے پنڈت مُوتی لعل کے پاس لایا ۔ انہوں نے پتہ سرکا کر ہنڈیا میں نظر ڈالی تو انہیں جھرجھری سی آگئی ۔ پھر وہ مسکرا کر کہنے لگے کہ اسے مالوی جی کے پاس لے جاؤ ، یہ ان کے کام کی چیز ہے ۔

مولانا مسعود علی ندوی اکثر ترنگ میں آکر یہ کہا کرتے تھے کہ جواہر لعل اور اس کے باپ کے پیٹ میں " ہمارا میتوں آتا ہے "۔

دارالمصنفین کے عقب میں شبلی کالج کی شاندار عمارت ہے اور مہمان خانے کی کھڑکیاں کالج کی گراؤنڈ میں کھلتی ہیں ۔ مولانا عبدالسلام قدوائی اور احتشام الدین نے ایک دو روز اعظم گڑھ میں رُکنے پر اصرار کیا لیکن مجھے جو کچھ دیکھنا تھا ، وہ میں دیکھ چکا تھا اور میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ وہاں مزید قیام کرتا ۔ اس لئے دارالمصنفین کے رفقاء کو الوداع کہہ کر بس اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوا ۔ یہ میری مولانا عبدالسلام قدوائی سے پہلی اور آخری ملاقات تھی ۔ اس ملاقات کے ایک سال بعد ۲۳ اگست ۱۹۷۹ء کو اس پیکرِ اخلاص و مروّت کا اپنے وطن تھلینڈی (ضلع رائے بریلی) میں ، جہاں وہ عید الفطر منانے گئے تھے ، اچانک ہی انتقال ہو گیا ۔

میں نے مغرب کی نماز بس اسٹینڈ پر ادا کی اور جونپور جانے والی بس میں سوار ہو کر قریباً تین سوا تین گھنٹے میں جونپور پہنچ گیا ۔

لکھنؤ سے بنارس تک

تعالی اللہ بنارس چشمِ بد دُور
بہشت خرّم و فردوس معمور
(غالب)

۲۲ اگست ۱۹۸۱ء کی ایک سہانی صبح میں لکھنؤ سے بذریعہ بس رائے بریلی روانہ ہوا لکھنؤ سے رائے بریلی کا فاصلہ ۷۷ کلو میٹر ہے اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ جاتے ہیں ۔ بس اسٹینڈ پر مجھے ایک مسلمان رکشا ڈرائیور مل گیا ۔ میں نے اس سے " تکیہ " کا اتہ پتہ پوچھا تو اس نے کہا " آپ مولانا علی میاں کے ہاں جائیے گا ؟ " میں نے اثبات میں جواب دیا اور بے فکر ہو کر رکشا پر سوار ہو گیا ۔

بس اسٹینڈ سے " تکیہ " کا فاصلہ تین کلو میٹر کے لگ بھگ ہے ۔ مقامی لوگ اسے بڑا تکیہ کہہ کر پکارتے ہیں ۔ میونسپل کمیٹی رائے بریلی نے مولانا علی میاں کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے قلعہ بازار سے تکیہ تک جانے والی سڑک کا نام " مولانا سیّد ابوالحسن ندوی عرف علی میاں مارگ " رکھ دیا ہے ۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رائے بریلی کے غیر مسلم بھی مولانا صاحب کا احترام کرتے ہیں ۔

یہ سڑک سرسبز و شاداب کھیتوں سے گزرتی ہوئی تکیہ کی طرف جاتی ہے ۔ سڑک کے دونوں طرف اَمرود کے پیڑ اور دھان کے کھیت نظر آتے ہیں ۔ تکیہ سے ذرا پہلے میدان پُور نام کی ایک مختصر سی آبادی آتی ہے ۔ وہاں ضیاء العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم ہے جسے ندوۃ العلماء کے منتظمین چلا رہے ہیں ۔

تکیہ میں گنتی کے چار پانچ مکان ہیں اور ان میں سب سے نمایاں مکان مولانا علی میاں کا ہے ۔ موصوف خود زیادہ وقت لکھنؤ میں گزارتے ہیں اور جہاں ان کی اہلیہ محترمہ رہتی ہیں ۔ ان کے گھر سے متصل ان کے برادرِ بزرگ ڈاکٹر حکیم عبدالعلی مرحوم (م ۱۹۶۱ء) کا مکان ہے جہاں ان دنوں ان کے پوتے قیام پذیر ہیں ۔

اسی بابرکت تکیہ میں ۱۷۸۶ء میں حضرت سیّد احمد بریلوی رحمۃ اللہ پیدا ہوئے تھے اور یہیں ان کا بچپن گزرا تھا۔ جس مکان میں سیّد صاحب پیدا ہوئے تھے وہ اب موجود نہیں اور اب وہاں ایک نیا مکان بن گیا ہے۔ اتفاق سے مجھے ڈاکٹر عبدالعلی کا ایک پوتا مل گیا اور اس نے مجھے تکیہ کی تمام اہم جگہیں دکھائیں۔

ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم کے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر لکھوری اینٹوں کی ایک مختصر سی چار دیواری ہے جس کے اندر دس بارہ قبروں کے نشان نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کوئی قبر بھی نصف بالشت سے اونچی نہیں ہے۔ اسی چار دیواری کے اندر حضرت مجدّد الفِ ثانی کے خلیفۂ اعظم حضرت آدم بنوریؒ (م ۱۰۵۳ھ) کے مرید و مجاز شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ (م ۱۰۹۶ھ) محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی (م ۱۹۵۷ء) سے روایت ہے کہ جیسے انوار اس چار دیواری کے اندر نظر آتے ہیں ویسے انوار صرف ”تھانہ بھون“ میں اس حجرہ کے اندر دکھائی دیتے ہیں جس میں سیّد الطائفہ میاں جیو نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ (م ۱۲۵۹ھ) رہا کرتے تھے۔ یہ بڑی بابرکت جگہ ہے۔ سیّد آدم بنوریؒ سے جو سلسلۂ احسنیہ چلا ہے یہ دائرہ اسی نسبت کے انوار کا مظہر ہے۔

دائرہ شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ کے بالمقابل پرانے وقتوں کی ایک مسجد ہے جس میں بڑے بڑے بزرگوں نے اپنے ربّ کے حضور میں سجدے کئے ہیں۔ سیّد احمد بریلوی رحمۃ اللہ بھی اس مسجد میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔ راقم الحروف نے حصولِ برکت کے لئے وہاں دوگانہ ادا کیا اور دائرہ میں مدفون حضرات کے لئے دعائے مغفرت کی۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک ندی بہتی ہے جسے ”سئی“ کہتے ہیں۔ اسی ندی کے پانی سے سیّد احمد بریلویؒ وضو کیا کرتے تھے۔

میں مسجد سے نکل کر مولانا علی میاں کے مکان کی طرف آیا۔ ان کے مکان کے سامنے مہمان خانہ ہے جہاں اس وقت چار پانچ حضرات تشریف فرما تھے۔ ایک نوجوان نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میرا جواب سن کر اس نے کہا! ”مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے بھی آپ کا تعلق ہے؟“ میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کہا کہ اس نے مولانا ابو العرفان ندوی سے میری تصنیف ”سرمایۂ عمر“ لے کر پڑھی ہے اور ماہنامہ بیّنات کراچی میں جشنِ دیو بند کے بارے میں میرے تاثرات بھی پڑھے ہیں۔ اس نوجوان نے

چائے کی پیش کش کی لیکن میں اس وقت عُجلت میں تھا اس لئے اس کی دعوت قبول نہ کر سکا۔

رائے بریلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب برابر ہے۔ شہر میں جا بجا پرانی مسجدیں موجود ہیں۔ قلعہ بازار کی مسجد خاص طور پر قابلِ دید ہے۔ شہر میں آثارِ قدیمہ بھی موجود ہیں اور بزرگوں کے مقبرے بھی۔ وہاں کی فضا پر سیّد صاحب کے انفاسِ طیبہ کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

رائے بریلی سے میں بذریعہ ٹرین امیٹھی روانہ ہوا۔ دونوں شہروں کے درمیان ۵۱ کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ رائے بریلی کے بعد تیسرا ریلوے اسٹیشن جائس ہے جو ملک محمد جائسی صاحب پدماوت کی وجہ سے مشہور ہے۔ جائس کے بعد چوتھا اسٹیشن امیٹھی ہے۔ میں اسٹیشن سے باہر نکلا تو وہاں دو تین رکشے کھڑے تھے۔ میں ایک رکشا ڈرائیور کو مسلمان سمجھ کر اس کے رکشا میں سوار ہو گیا۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہندو ہے) میں نے اسے درگاہ پر چلنے کو کہا۔ اس نے جواب دیا کہ امیٹھی میں کوئی درگاہ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ یہاں حضرت نظام الدین امیٹھی والے کی درگاہ ہے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے اسے شہر کی طرف چلنے کو کہا۔ جب ہم بازار پہنچے تو اس وقت ظہر کی نماز ہو چکی تھی اور نمازی جامع مسجد سے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے کہا کہ وہ ان سے دریافت کرے کہ حضرت نظام الدین کی درگاہ کہاں ہے؟ جب نمازیوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو میں نے کہا کہ اکبر کے عہد میں حضرت نظام الدین امیٹھی والے بہت بڑے بزرگ ہو گزرے ہیں اور اورنگ زیب عالمگیر کے اُستاد مُلّا احمد جیون ان کی اولاد سے تھے۔ تعجب ہے کہ آپ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟

اس پر ایک نمازی نے ذرا سوچ کر کہا کہ میں کہیں بندگی نظام الدینؒ کا مزار تو تلاش نہیں کر رہا؟ میرے اثبات میں جواب دینے پر اس نے کہا کہ میں غلط جگہ پر آگیا ہوں۔ جس امیٹھی میں ان کی درگاہ ہے وہ ضلع لکھنؤ میں ہے اور یہ امیٹھی جہاں میں آگیا ہوں ضلع سلطان پور میں ہے۔ ایک نمازی نے کہا کہ وہاں سے چار کلو میٹر کے فاصلہ پر رام نگر میں ملک محمد جائسی کی درگاہ ہے اور وہاں تک پختہ سڑک جاتی ہے۔ یہ انکشاف میرے لئے باعثِ مسرّت تھا۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے بات کی تو اس نے کہا کہ وہ

ایک روپیہ فی کلو میٹر لے گا۔ رام نگر کے راستے میں ہمیں بارش نے آلیا۔ لیکن اس کے باوجود سفر جاری رہا اور ہم جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔

رام نگر اسی نام کی ایک ریاست کی راجدھانی تھی۔ وہاں اب تک راؤ مادھو سنگھ کا محل اس ریاست کی گزشتہ عظمت یاد دلانے کو موجود ہے اس کے قریب ہی ایک مندر ہے جو کسی ستی ہونے والی رانی کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔

اب رام نگر ایک معمولی سا گاؤں نظر آتا ہے۔ آبادی کے آخری کنارے پر مسلمانوں کے چند گھر آباد ہیں اور وہاں ایک مسجد بھی موجود ہے۔ جہاں آبادی ختم ہوتی ہے وہیں ایک وسیع و عریض احاطے کے اندر ملک محمد جائسی (م ۱۵۴۲ء) کا مزار ہے۔ چار دیواری میں داخل ہونے کے لئے ایک عالیشان دروازے سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس دروازے کی پیشانی پر جلی حروف میں دیوناگری رسم الخط میں "سمادھ مہاکوی شری محمد جائسی رام نگر" لکھا ہوا ہے۔

احاطے کے وسط میں ایک بلند و بالا چبوترہ ہے اور اس کے وسط میں ایک اور چبوترہ بنایا گیا ہے۔ اس چبوترے پر محمد جائسی کی قبر ہے۔ جس وقت میں وہاں پہنچا اس وقت قبر پر سرخ رنگ کی چادر پڑی تھی اور اس پر یا اللہ اور یا محمدؐ کڑھا ہوا تھا۔ قبر کے اوپر ایک چھتری بنی ہوئی ہے جسے چھ ستون تھامے ہوئے ہیں۔

احاطے کی جنوبی سمت مسافروں کے قیام کے لئے ایک وسیع دالان تعمیر کیا گیا ہے اور اس دالان کی پیشانی پر جو کتبہ لگایا گیا ہے اس پر یہ غلط سلط عبارت منقوش ہے۔

"حضرت ملک محمد جائسی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر بارہ دری کا قیام عوام سے ۱۹۷۸ء میں پائے تکمیل کو پہنچا۔" (عوام اور سے کے درمیان "چندہ سے" بڑھا دینے سے عبارت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ پائے کو پایہ پڑھیں تو املاء درست ہو جاتی ہے)۔

درگاہ کے ایک خادم سے معلوم ہوا کہ وہاں ۴ رجب کو ملک صاحب کا عرس منایا جاتا ہے اور قرب و جوار کے دیہات سے ان کے معتقدین وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔

رام نگر سے میں امیٹھی واپس آیا۔ اس وقت نمازِ عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے جامع مسجد میں نماز ادا کی۔ یہ مسجد واقعی بڑی خوشنما ہے۔ جامع مسجد سے رکشا میں سوار ہو کر میں اسٹیشن پہنچا تو بنارس جانے والی پسنجر ٹرین تیار کھڑی تھی۔

امیٹھی سے بنارس کا فاصلہ ۱۴۳ کلو میٹر ہے۔ میں عصر کے وقت امیٹھی سے روانہ ہو کر رات بارہ بجے کے قریب بنارس پہنچا۔ اسٹیشن کے قریب کسی ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہ تھا۔ ایک رکشا والے نے میری مدد کی اور وہ مجھے شہر کے ایک صاف ستھرے علاقے میں ایک نو تعمیر شدہ ہوٹل میں لے گیا۔ میں نے رات وہاں گزاری اور اگلی صبح ایک رکشا میں سوار ہو کر سمرا گھاٹ پہنچا۔ بنارس میں گنگا کے ۸۰ گھاٹ ہیں اور سمرا سب سے زیادہ مقدس مانا جاتا ہے۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ گنگا میں نہانے سے گناہ دُھل جاتے ہیں۔

اس رُوز اتفاق سے جنم اشٹمی (کرشن چندر کا جنم دن) کا تہوار تھا اس لئے وہاں خوب رونق تھی۔ اہل ہنود بڑی عقیدت کے ساتھ گنگا میں اشنان کر رہے تھے۔ شیخ علی حزیں نے ایسا ہی منظر دیکھ کر کہا تھا:

پری رُخانِ بنارس بصد کرشمہ و ناز
پئے پرستش مہدیو چوں کنند آہنگ
بہ گنگ غسل کنند و بہ سنگ پا مالند
زہی شرافتِ سنگ و زہی لطافتِ گنگ

سمرا گھاٹ سے میں اورنگ زیب عالمگیر کی مسجد دیکھنے گیا۔ یہ مسجد مندروں کے وسط میں ایک مندر کی بنیادوں پر ہی تعمیر کی گئی ہے۔ اس مسمار شدہ مندر کے آثار اب بھی مسجد کی عقبی دیوار میں دیکھے جا سکتے ہیں اور ہندو انہیں دیکھ کر اورنگ زیب کو کوستے ہیں۔ ادبی حلقوں میں یہ روایت زبان زدِ خلائق ہے کہ جب یہ مسجد تعمیر ہوئی تو سابقہ مندر کے پروہت نے اورنگ زیب کو یہ شعر لکھ کر بھیجا:

ببیں کرامتِ بُت خانۂ مرا اے شیخ
کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

مسجد کو جانے والا معروف راستہ اَن داتا کے مندر میں سے ہو کر گزرتا ہے اور جب میں مندر کی طرف جانے والی گلی میں داخل ہوا تو ایک ہندو دکاندار نے مجھے جوتے اتارنے کو کہا میں نے وہاں جوتے اتار دئے۔ لیکن اس نے اصرار کیا کہ میں مندر میں

چڑھانے کے لئے پھول ضرور خریدوں ۔ میرے انکار پر اس نے مجھے آگے جانے سے روک دیا ۔

میں ۱۹۵۵ء کے اوائل میں بنارس آچکا تھا ۔ اس لئے مجھے معلوم تھا کہ مسجد کی طرف جانے کا ایک راستہ اور بھی ہے ۔ میں نے پیچھے پلٹ کر وہ راستہ تلاش کرنا شروع کیا اور تھوڑی دیر میں مسجد تک پہنچ گیا ۔ مسجد کے صحن میں ہر وقت پولیس گارد موجود رہتی ہے ۔ یہ گارد میں نے ۱۹۵۵ء میں بھی دیکھی تھی ۔ مسجد چونکہ چاروں طرف سے مندروں میں گھری ہوئی ہے اس لئے وہاں ہمیشہ فساد کا خطرہ رہتا ہے ۔

یہ مسجد بڑی خوشنما اور قابلِ دید ہے ۔ مسجد کے دالان میں داخل ہونے کے لئے گیارہ دروازے بنائے گئے ہیں ۔ ان دروازوں پر لوہے کی گرل لگا دی گئی ہے اور فرش پر سفید چاندنیاں بچھا دی گئی ہیں ۔ وہاں پنج وقتہ نماز کے علاوہ جمعہ بھی ہوتا ہے ۔ مسجد کے ساتھ دو خوشنما مینار بھی تعمیر کئے گئے ہیں جو دُور سے نظر آتے ہیں ۔

بنارس ہندوؤں کا بہت بڑا تیرتھ ہے ۔ لیکن اس کے باوجود وہاں مسلمانوں کی کافی آبادی ہے ۔ اورنگ پُورہ ، بلہ پورہ اور ہنگ پورہ مسلمانوں کے مشہور محلے ہیں ۔ میں نے ان محلوں میں " بڑا گوشت " کھلے بندوں فروخت ہوتے دیکھا ہے ۔ ریوڑی تالاب پر اہلِ حدیث کا ایک بڑا مدرسہ ہے جو " جامعہ محمدیہ " کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ مدرسہ بھارت میں اہلِ حدیث کی سب سے بڑی درس گاہ ہے ۔ نامور اہلِ حدیث عالم مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری اسی ادارے سے وابستہ ہیں ۔

میرے لئے بنارس میں ایک اور بھی کشش کی جگہ تھی جسے میں پہلے سفر میں نہیں دیکھ سکا تھا ۔ بنارس روانہ ہونے سے پہلے میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے اُستاد ڈاکٹر امیر حسن عابدی سے ملا تھا اور ان سے شیخ علی حزیں (م ۱۷۶۶ء) کے مزار کے بارے میں استفسار کیا تھا ۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ بنارس میں فاطمان نام کا ایک امام باڑہ ہے اور وہیں علی حزیں مدفون ہے ۔

میں نے یکے بعد دیگرے کئی رکشا والوں سے فاطمان چلنے کو کہا ۔ لیکن وہ اس جگہ سے ناواقف تھے ۔ کوئی مسلمان رکشا والا مل نہیں رہا تھا جو میری راہنمائی کرتا ۔ سیرا گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے نئی سڑک پر ایک جگہ فاران ہوٹل کا نام پڑھا

تھا ۔ اس لئے میں اس ہوٹل کی طرف چل دیا ۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے اس کے مالک سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو اس نے کہا کہ اس نام کا امام باڑہ بلہ پورہ میں موجود ہے ۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی رکشا والے کو اس کا اتہ پتہ بتا دے جو مجھے وہاں پہنچا دے ۔ اس بھلے مانس نے ایک رکشا والے کو فاطمان کا محلِ وقوع سمجھا دیا اور وہ مجھے وہاں لے گیا ۔

یہ امام باڑہ ایک قبرستان میں واقع ہے اور شیعہ سُنّی فساد کو روکنے کے لئے وہاں پولیس متعین رہتی ہے ۔ میں نے ایک سپاہی سے حزیں کی قبر کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے کہا کہ وہ اس سے واقف نہیں ہے ۔ البتہ وہاں کے خدام میری راہنمائی کر سکتے ہیں ۔ اتنے میں ایک خادم اُدھر سے گزرا تو میں نے علی حزیں کی قبر کے بارے میں سوال کیا ۔ اس نے سوچ کر کہا ۔ " آپ شیخ محبین کی قبر کا پتہ پوچھتے ہیں ؟ " میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ مجھے شیخ کی قبر پر لے گیا ۔

حزیں کی قبر سنگِ مرمر کے ایک چبوترے پر ہے اور تعویذ پر یہ عبارت کندہ ہے :

العبدالراجی

رحمتہ ربہ محمد المدعو بعلی بن ابی طالب اللاهیجی

حزیں از پای رہ پیما بسی سرگشتگی دیدم
سرِ شوریدہ بر بالینِ آسائش رسید ایں جا
زبان دانِ محبت بودہ ام دیگر نمیدانم
ہمیں دانم کہ گوش از دوست پیغامی رسید ایں جا
رُوشن شد از وصالِ تو شبِ تنگ بار
صبحِ قیامت چراغِ مزارِ ما

قبر کے سرہانے ایک سل نصب ہے جس پر یہ عبارت منقوش ہے :

" شیخ علی حزیں وفات ۱۱ جمادی الاوّل ۱۱۸۰ھ "

علی حزیں کی قبر پر پتھروں کو کھود کر پرندوں کے پانی پینے کا انتظام بھی کیا گیا ہے اور وہاں اگر بتیاں جلنے کے آثار بھی موجود تھے ۔ قبر کے سرہانے ایک چراغ دان بھی بنا ہوا ہے ۔

حزیں کی قبر سے چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی مسجد بھی موجود ہے جس میں نماز کے وقت دو صفیں ہو سکتی ہیں۔ میں ابھی مزار پر ہی تھا کہ بارش شروع ہو گئی میں نے اسی مسجد میں پناہ لی اور بارش تھمنے کا انتظار کرتا رہا۔ مسجد کے محراب کی پیشانی پر یہ قطعۂ تاریخ مرقوم ہے:

آں محمد جعفر عینِ نفس
بانیٔ مسجد شد از لطفِ کریم
مصرعِ تاریخ باشد حسبِ حال
حکمت نیک است ایں فعلِ کریم

۱۲۴۰ھ

اسی قبرستان میں ایک چار دیواری کے اندر حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی قبر بنا رکھی ہے اور ایک گوشے میں ثانی الزہرا بی بی زینبؓ کا مزار بنایا ہوا ہے۔ شاید اسی وجہ سے یہ امام باڑہ "فاطمان" کہلاتا ہے۔ ایک گنبد کے نیچے حضرت علیؓ کو خواب ابدی دکھائے گئے ہیں۔

حزیں کی قبر سے جانب شمال چند میٹر کے فاصلہ پر ایک چھتری کے نیچے حضرت عباس علمدار کی قبر کی شبیہ بنائی ہوئی ہے۔ اسی طرح ایک تہ خانے میں حضرت حسینؓ کا مزار بھی بنایا ہوا ہے۔

آدم بر سر مطلب آ علی حزیں فارسی زبان کا بہت بڑا شاعر تھا اور وہ اپنے مقابلے میں ہندوستان کے شاعروں کو "پوچ گویانِ ہند" کہا کرتا تھا۔ مولانا حبیب الرحمن شروانی نواب صدر یار جنگ (م ۱۹۵۰ء) نے اس کی قبر کو "فارسی غزل کا مدفن" قرار دیا ہے۔ ان کی یہ رائے ہے کہ حزیں کے بعد پھر اس پائے کا فارسی غزل گو شاعر پاک و ہند میں پیدا نہیں ہوا۔

حزیں کو بنارس کے ساتھ والہانہ عشق تھا۔ وہ ۱۷۳۳ء میں یہاں آیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ بنارس کے بارے میں اس کا یہ شعر زبان زد خلائق ہے:

از بنارس نروم کہ معبد عام است ایں جا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است ایں جا

بعض تذکروں میں بچہ کی جگہ پسرے بھی دیکھنے میں آیا ہے لیکن اہلِ ذوق بچہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

حزیں سے پہلے ملا طغرئ مشہدی (م ۱۰۷۸ھ - ۱۶۶۷ء) نے بھی بنارس کے ہندوانہ ماحول کو موضوعِ سخن بنایا تھا۔ اس کا ایک شعر ہے:

طغرئ بعشور خانۂ دہلی چو راہ نیست
سیرِ کرشمہ زارِ بنارس غنیمت است

محمد یوسف نگہت بہاپوری المعروف بہ مخمور خان نے بھی بنارس میں کچھ وقت گزارا تھا۔ وہ بھی بنارس کے ماحول سے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اہلِ بنارس کے بارے میں اس نے کیا خوب کہا ہے:

بنارس زادگان شوخ اند بسیار
ہم گستاخ و چشمک باز عیار

بنارس عہدِ عتیق ہی سے ہندوؤں کے علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ اس شہر میں بارہ سو کے قریب مندر اور پاٹھ شالائیں ہیں۔ مشہور مصلح بھگت کبیر (م ۱۵۱۸ء) بھی بنارس کا رہنے والا تھا اور یہیں سے اس نے اپنے مشن کا آغاز کیا تھا۔ عہدِ اسلامی میں بڑے نامی گرامی مسلمان علماء و ادبا یہاں رہتے تھے۔ عہدِ جہانگیری میں ملا سعد اللہ پانی پتی یہاں مقیم تھا۔ وہ بڑا اچھا شاعر تھا۔ دارا شکوہ کا منشی، بنواری داس ولی، جو فارسی کا انشا پرداز تھا، بنارس ہی کا باشندہ تھا۔ دارا شکوہ نے یہاں کافی وقت گزارا اور یہیں اس نے پنڈتوں کی مدد سے ہندوؤں کی مقدس کتاب اُپنشد کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرایا تھا۔ اُپنشد کا فارسی ترجمہ سرِ اکبر کے نام سے مشہور ہے۔ بنارس میں قیام کے دوران دارا شکوہ نے مجمع البحرین لکھ کر ہندومت اور اسلام کے درمیان ایک درمیانی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ دارا شکوہ کا ہندومت کی طرف رجحان اور ملحدانہ عقائد کے پیشِ نظر علامہ اقبال نے خوب کہا ہے:

تخمِ الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرتِ دارا دمید

بنارس کے بارہ صد منادر میں ایک مندر "بھارت ماتا کا مندر" کے نام سے

موسوم ہے۔ ۱۹۵۵ء میں بنارس کے سفر میں صدیق مکرم پروفیسر سعید الدین احمد ڈار بھی میرے ہم سفر تھے۔ بنارس پہنچ کر جب ہم نے اس مندر کا شہرہ سُنا تو اسے دیکھنے گئے۔ ایک بڑے ہال میں ایک تالاب میں اغلباً پلاسٹر آف پیرس سے بھارت کا نقشہ بنایا ہوا ہے جس میں پاکستان اور بنگلہ دیش بھی شامل ہیں۔ اس نقشے پر عقیدتمندوں نے پھول بھی چڑھائے ہوئے تھے۔ ہندو وہاں آتے تو دونوں ہاتھ جوڑ کر اور سرجھکا کر بھارت ماتا کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔

۱۹۵۵ء کے سفر بنارس میں میرا ارادہ سمیرا گھاٹ پر اشنان کرنے کا تھا میں نے متعدد بار اپنی خواہش کا اظہار کیا اور ہر بار ڈار صاحب نے میری مخالفت کی۔ میں سمیرا گھاٹ پر گنگا میں اشنان کرنے پر مُصر تھا۔ جب ہم سمیرا گھاٹ پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ایک ہندو کھڑے ہو کر ایک نالی میں پیشاب کر رہا ہے اور وہ نالی سمیرا گھاٹ کی سیڑھیوں سے قریب ہی گنگا میں گرتی تھی۔ پانی کا بہاؤ نیچے کی جانب تھا اس لئے اس نالی کا اور اس جیسی صدہا نالیوں کا غلیظ پانی گنگا میں گرتا تھا۔ یہ پانی سمیرا گھاٹ سے مَس ہو کر آگے جاتا تھا۔ ڈار صاحب نے مجھے اس ہندو کو نالی میں پیشاب کرتے ہوئے دکھایا اور پُوچھا کہ اس گھاٹ پر کہاں اشنان کرو گے؟ میں نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا اور ہندو تھے کہ اس گھاٹ پر اشنان کرنا باعث نجات اُخروی سمجھتے تھے اور گنگا جل تبرّک کے طور پر اپنے گھروں کو لے جاتے تھے۔

میں اور ڈار صاحب بنارس سے کلکتہ جا رہے تھے۔ ہماری گاڑی کے ڈبّے میں تین چار پنڈت بھی بنارس سے سوار ہو گئے۔ وہ گنگا کے گھاٹوں پر یاتریوں کو پُوجا پاٹ کرواتے اور ان کے فوت شدہ لواحقین کے "ایصالِ ثواب" کے لئے ہَوَن کرواتے تھے۔ جب ٹرین بنارس سے روانہ ہوئی تو مغرب کا وقت قریب تھا مغل سرائے پہنچ کر پنڈتوں نے ڈائننگ کار سے کھانا منگوایا۔ ہم نے دیکھا کہ انہیں پینے کے لئے جو پانی فراہم کیا گیا تھا اس میں گلاب کی پتیاں تیر رہی تھیں۔ ہم نے دل ہی دل میں یہ خیال کیا کہ یہ ضرور گنگا جل ہوگا جو اس قدر اہتمام کے ساتھ پینے کے لئے فراہم کیا جا رہا ہے۔

ہم نے ان پنڈتوں سے پوچھا کہ ہَوَن کرانے پر کتنا خرچ آتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو "مَن مرضی کا سودا" ہے، چاہے تو ایک روپے میں کروالیں چاہیں تو دس روپے

میں کروالیں، لیکن جتنا گُڑ ڈالیں گے اتنا ہی زیادہ میٹھا ہوگا۔

بنارس میں ہندو یُونیورسٹی بھی لائق دید ہے۔ یہ یُونیورسٹی پنڈت مدن موہن مالویہ (م ۱۹۴۶ء) نے علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کے مقابلے میں قائم کی تھی۔ یُونیورسٹی کی عمارات ایک وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یُونیورسٹی کے اندر ریلوے لائن بچھائی ہوئی ہے جس پر چھوٹی سی ریل گاڑی چلتی ہے۔ یہ ریل تمام شعبوں کے قریب سے گزرتی ہے۔ یُونیورسٹی کا شعبۂ انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

یُونیورسٹی میں عربی کا شعبہ بھی موجود ہے۔ ایک زمانے میں یہاں "مولوی" مہیش پرشاد صدرِ شعبہ تھے۔ ماہنامہ نقوش لاہور کے مکاتیب نمبر میں "مولوی صاحب" کے متعدد خط شائع ہوئے ہیں۔ وہ اپنے اُردو خطوں میں بڑی روانی کے ساتھ واللہ ا و کفیٰ باللہ شہیداً، جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جب میں یُونیورسٹی دیکھنے گیا تو شعبۂ عربی کے سربراہ زیدی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی مسلمان لیکچررز اس شعبے سے منسلک ہیں۔ زیدی صاحب سے ایک بار علی گڑھ کے ایک سیمینار میں بھی ملاقات ہوئی تھی۔

ان دنوں شعبۂ اُردو کے سربراہ ڈاکٹر حکم چند نیّر تھے۔ وہ کوٹ مٹھن کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے راقم کو بتایا کہ خواجہ غلام فریدؒ (م ۱۹۰۱ء) کے عُرس کے موقع پر ان کے مزار پر چڑھانے کے لئے جو چادر تیار کی جاتی تھی، وہ ان کے ہاں تیار ہوتی تھی اور چادر کا جلوس ان کے گھر سے روانہ ہوتا تھا۔

ڈاکٹر حکم چند نیّر بڑے عالم و فاضل تھے اور وہ راقم کے غریب خانے پر بھی ڈاکٹر امیر حسن عابدی اور ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے ساتھ قدم رنجہ فرما چکے تھے۔ افسوس کہ ۱۹۹۲ء میں آگرہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ہندو یُونیورسٹی بنارس کا شعبۂ فارسی بھی قابل ذکر ہے۔ جن دنوں راقم بنارس گیا تو ان دنوں پروفیسر امرت لعل عشرت اس شعبہ کے سربراہ تھے۔ بھارت کے ایران کے ساتھ خصوصی تعلقات ہیں۔ اس لئے اس شعبے پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ افسوس کہ ۱۸ مئی ۱۹۸۹ء کو عشرت صاحب بھی رام جی کو پیارے ہو گئے۔

میں نے "صبحِ بنارس"، "شامِ اودھ" اور "شبِ مالوہ" کی اصطلاحات سُنی ہوئی

تھیں۔ بنارس جا کر صبحِ بنارس کی حقیقت معلوم ہوئی۔ پورا شہر ہمارے حساب سے اذانِ فجر سے پہلے بیدار ہو جاتا ہے۔ ہندو مرد اپنے احباب کے ساتھ گنگا پر اشنان کرنے جاتے ہیں اور عورتیں ٹولیوں کی شکل میں بھجن گاتی ہوئی گنگا کے گھاٹوں کی طرف جاتی ہیں۔ انہوں نے پنڈلیوں پر کئی کئی کلو وزنی چاندی کے زیورات پہنے ہوئے ہوتے ہیں جو چلتے وقت سازوں کی طرح بجتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک برتن میں گنگا جل ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری۔ شہریوں نے اپنے مکانات کی دیواروں میں طاقچے بنا کر بت رکھے ہوئے ہیں۔ وہ بھجن گاتے ہوئے آتی ہیں اور گنگا جل چلو میں لے کر بت پر ڈالتی ہیں اور دو تین پھول چڑھا کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ بنارس کے بارہ صد مندروں میں گھنٹیاں اور ناقوس بجنے لگتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں "صبحِ بنارس"۔

بنارس سے چھ کلو میٹر کے فاصلہ پر سارناتھ ہے جو بُدھوں کا متبرک مقام ہے۔ ۱۹۵۵ء کے سفر میں راقم نے سارناتھ دیکھا تھا۔ اس لئے اس بار وہاں نہیں گیا۔ سارناتھ میں مہاتما بدھ نے پہلا وعظ کر کے چند افراد کو بُدھ مت میں داخل کیا تھا۔ وہاں سری لنکا اور جبت کے بُدھوں نے مندر تعمیر کئے ہیں۔ جہاں بھکشو رہتے ہیں۔ وہاں ایک عجائب گھر بھی ہے۔ اشوک کی لاٹھ بھی وہاں موجود ہے۔ اس پر منقوش چکر بھارت کے قومی پرچم پر لگایا گیا ہے۔ وہاں ایک سٹوپے کے اوپر مغل فرمانروا اکبر نے ایک لوح نصب کرائی تھی جس پر یہ مرقوم ہے کہ ہمایوں جب شیر شاہ کے مقابلے کے لئے اُدھر سے گزرا تو اس نے اس مقام پر آرام کیا تھا۔

علی حزین کی قبر دیکھ کر میں سیدھا ہوٹل پہنچا اور اپنا سامان اٹھا کر ریلوے اسٹیشن چلا گیا۔ دو بجے کے قریب مجھے پٹنہ جانے والی ٹرین مل گئی اور میں شام کے ساڑھے سات بجے وہاں پہنچ گیا۔

سہارنپور، اَنبَیٹھہ، گنگوہ اور نانوتہ

سہارنپور پہنچ کر میں نے گھنٹہ گھر کے قریب راج دوت ہوٹل میں قیام کیا اور بارہ بجے کے قریب بس اسٹینڈ پہنچ گیا۔ وہاں جا کر میں نے انبیٹھ جانے والی بس کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ ضلع سہارنپور میں اس نام کے دو قصبے ہیں۔ ان میں سے ایک قصبہ انبیٹھہ مرزاپور کے نام سے موسوم ہے اور یہ تحصیل دیو بند میں ہے اور دوسرا قصبہ تحصیل نکوڑ میں ہے اور وہ انبیٹھہ پیر زادگان کہلاتا ہے۔ مجھے موخرالذکر قصبے میں جانا تھا۔

سہارنپور سے انبیٹھہ کا فاصلہ بیس میل اور کرایہ ساڑھے تین روپے ہے۔ بس قریباً ایک گھنٹے میں وہاں پہنچا دیتی ہے۔ اس قصبے کی آبادی دس ہزار سے زائد ہے۔ جس میں چھ ہزار سے زیادہ مسلمان ہیں۔ اس وقت قصبے میں ۲۹ مسجدیں ہیں۔ جو سب آباد ہیں۔ اس قصبے کو حضرت شاہ ابُوالمعالیؒ (م ۱۷۰۰ء) کی وجہ سے شہرت ملی۔ ہمارے زمانے میں مولانا خلیل احمدؒ صاحب (م ۱۹۲۷ء) بذل المجہود نے اسے پورے ملک میں متعارف کرایا۔

مجھے حضرت شاہ ابُوالمعالیؒ (م ۱۷۰۳ء) کی کشش انبیٹھہ کھینچ لے گئی۔ موصوف بھاشا زبان کے مشہور شاعر اور صوفی سید میراں بھیک المعروف بہ شیخ بھیکاؒ (م ۱۷۱۹ء) کے مُرشد تھے۔ شاہ ابُوالمعالی۔ حضرت داؤد گنگوہیؒ (م ۱۶۸۳ء) کے مرید تھے اور موخرالذکر کو حضرت محمد صادق گنگوہیؒ سے خلافت ملی تھی۔ حضرت محمد صادق (م ۱۶۳۸ء) شاہ ابُوسعید گنگوہیؒ (م ۱۶۳۹ء) کے خلیفہ تھے اور وہ حضرت نظام الدین بلخیؒ (م ۱۶۳۱ء) کے دامنِ ارادت سے وابستہ تھے۔ حضرت بلخیؒ کو خرقۂ خلافت حضرت جلال الدین تھانیسریؒ (م ۱۵۸۲ء) نے پہنایا تھا اور وہ حضرت قطب العالم شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ (م ۱۵۳۷ء) کے خلیفۂ اعظم تھے۔

میں درگاہ کے قریب ہی بس سے اُترا اور ایک ہندو مسافر کی راہنمائی میں وہاں پہنچ

گیا ۔ حضرت شاہ ابُوالمعالی کا مزار ایک وسیع احاطے کے اندر ایک بلند چبوترے پر ہے اور اس پر شاہجہانی طرز کا ایک خوبصورت مقبرہ بنا ہوا ہے ۔ مقبرے کا سفید گردن دار گنبد اور چاروں کونوں پر خوشنما برجیاں عجب منظر پیش کرتی ہیں ۔ گنبد کے سنہری کلس پر تو نظر نہیں ٹکتی ۔ یہ عمارت حضرت میراں بھیکؒ کے ایک غالی مُرید نواب روشن الدولہ نے تعمیر کرائی تھی ۔ یہی وہ نواب روشن الدولہ (م ۱۷۳۶ء) ہیں جن کے فرزند ہیکھاری خان (م ۱۷۵۵ء) نے لاہور کی سنہری مسجد تعمیر کروائی تھی ۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے نواب موصوف کی قبر قدم شریف دہلی میں دیکھی تھی ۔ اس پر سبز رنگ کی چادر چڑھی رہتی تھی جس پر اللہ ، محمد ، بھیکہ ، منقش تھا ۔ راقم کو قدم شریف میں ان کی قبر نہیں ملی ۔ ہندو اور سکھ شرنارتھیوں نے اس علاقے میں قبروں کو صاف کرکے مکانات بنالئے ہیں۔

مزار کا دروازہ مقفل رہتا ہے لیکن دروازے کے قریب ہی چابی لٹکی رہتی ہے ۔ میں تالا کھول کر اندر داخل ہوا ۔ مقبرے میں حضرت کے مزار کے علاوہ چھ قبریں اور بھی ہیں جن میں سے چار جانب مشرق اور دو جانب مغرب ہیں ۔

مزارات کے اوپر چھت گیری معلق تھی اور مقبرے کے اندر بڑا روحانی ماحول تھا میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھا اور چند سورتیں پڑھ کر اصحاب قبور کی روح کو ایصال ثواب کیا، مقبرے کی شمالی دیوار پر ایک کتبہ نصب تھا لیکن روشنی کم ہونے کی وجہ سے میں اسے پڑھ نہ سکا ۔

مقبرے کے جانب شمال مشرق ایک پرانی طرز کی مسجد ہے ۔ مسجد میں ایک وسیع صحن ، برآمدہ اور دالان ہیں ۔ نماز ظہر کا وقت ہونے والا تھا ۔ میں نے جماعت کے ساتھ نماز ادا کی اور بعد نماز مسجد میں معتکف ایک بزرگ پیرجی ظفر علی سے ملاقات کی ۔ یہ بزرگ حضرت شاہ ابُوالمعالی کی اولاد میں سے ہیں اور سب کچھ تیاگ کر مسجد میں آپڑے ہیں ۔ ان سے معلوم ہوا کہ حضرت کا عرس سال میں دوبار ۲۸ تا ۳۰ صفر اور ۸ تا ۱۰ رجب کو ہوتا ہے اور ان موقعوں پر اردگرد کے دیہات سے زائرین بڑی تعداد میں وہاں آجاتے ہیں ۔ مسجد کے اندر بہت سے تبلیغی قطعات آویزاں تھے جو پاکستان کے چھپے ہوئے تھے ۔

میری درخواست پر پیرجی ظفر علی نے رفیق احمد نامی ایک نوجوان کو میرے ساتھ کیا ۔ وہ مجھے محلہ چھتہ میں مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ کے مکان پر لے گیا ۔ اب یہ مُقتاب کا نشیمن زاغ کے تصرف میں آچکا ہے ۔ یہ پُر نور مکان ہیرا نامی ایک کنجڑے کی ملک ہے۔ وہ خود تو فوت ہو چکا ہے اور اب اس کی بیوہ وہاں مقیم ہے ۔ اس نیک بخت نے مجھے مکان دیکھنے کی اجازت دی ۔ میں ڈیوڑھی سے گزر کر صحن میں داخل ہوا ۔ صحن کے آگے تین دروں کا ایک برآمدہ ہے اور اس کے پیچھے دو کمرے ہیں ۔ ان میں سے دائیں ہاتھ کا کمرہ مولانا مرحوم نے عبادت کے لئے مختص کر لیا تھا ۔ اب یہ بابرکت کمرہ سٹور کا کام دیتا ہے ۔ مکان کی چھت پر چڑھنے کے لئے بائیں ہاتھ ایک پختہ زینہ ہے ۔ صحن کے ایک کونے میں ہینڈ پمپ نصب تھا ۔ میں نے مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ کے بابرکت گھر کا پانی پیا اور رفیق کے ساتھ واپس لوٹا ۔ راستے میں محلہ سرائے چون میں پیرزادوں کی راجپوتی طرز کی خوش وضع حویلیاں دیکھیں ۔ ایسا فنِ تعمیر اس سفر کے دوران میں اور کہیں نظر نہیں آیا ۔

درگاہ کے قریب ہی مجھے گنگوہ شریف جانے والی ویگن مل گئی ۔ انبیٹھہ سے گنگوہ کا فاصلہ چھ میل اور کرایہ ڈیڑھ روپیہ ہے ۔ ویگن پندرہ بیس منٹ میں گنگوہ پہنچا دیتی ہے۔ گنگوہ کی آبادی ۳۵ ہزار ہے اور وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ۔ قصبے کی سیادت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے اور الیکشن میں بھی وہی کامیاب ہوتے ہیں ۔ مقامی ہندو حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے بڑے معتقد ہیں اور ان کے مزار پر بڑی باقاعدگی کے ساتھ حاضری دیتے ہیں ۔ بلکہ بعض ہندو تو سجادہ نشین کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت ہیں ۔

ویگن اسٹینڈ کے قریب ہی مدرسہ اشرف العلوم کی شاندار عمارت ہے ۔ میں پانچ سال بعد گنگوہ آیا تھا ۔ اس کے دارالحدیث کی عمارت زیر تعمیر تھی ۔ اب یہ عمارت مکمل ہو چکی ہے ۔ یہ گنگوہ کی سب سے زیادہ خوشنما عمارت ہے ۔ مدرسہ اشرف العلوم سے لکھنوتی جانے والی سڑک پر اندازاً دو فرلانگ کے فاصلے پر کھیتوں میں ایک مختصر سے باغ کے اندر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ محوِ خواب ابدی ہیں ۔ میں ایک رکشا لے کر وہاں پہنچا اور مزار سے ملحقہ مسجد میں دو نفل ادا کئے ۔ مسجد میں ایک ہینڈ پمپ نصب ہے ۔ میں نے تبرکاً اس کا پانی نوش کیا اور حضرت اقدس کے مزار پر حاضر ہوا ۔

میں نے چاروں قل پڑھ کر ان کی روحِ پُر فتوح کو ایصالِ ثواب کیا اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے بارگاہِ لم یزل میں دعا کی۔ حضرتِ والا کی قبر کچی ہے اور زمین کی سطح سے بالشت بھر اونچی ہے۔ قبر کے سرہانے ایک کتبہ نصب ہے جس پر یہ عبارت درج ہے:

وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ

۱۳۲۳ھ

فخر المحدثین راس الفقہاء قطب الارشاد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی

قدس اللہ سرہٗ العزیز

تاریخِ وصال ۸ جمادی الآخریٰ ۱۳۲۳ھ۔ ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء یومِ جمعہ

حضرتِ اقدس کے مزارِ پُر انوار کے قریب ہی حضرتِ والا کی اہلیہ مرحومہ، حکیم مسعود احمد اور صاحبزادی نصرت کی قبریں ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مزار سے حضرت قطب العالم شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی درگاہ کا فاصلہ ڈیڑھ فرلانگ کے قریب ہے۔ جب ۱۹۷۸ء میں راقم الحروف پہلی بار یہاں آیا تھا تو اس وقت حضرت کا مقبرہ بڑی خستہ حالت میں تھا۔ اب سجادہ نشین شاہ محی الدین قدوسی نے اس کی مرمت کرا دی ہے اور گنبد پر چینی کے برتنوں کے ٹکڑے لگا دئے ہیں۔ جس سے گنبد کے حُسن میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے درگاہ کی مسجد میں نوافل ادا کئے اور اس کے بعد مزار پر حاضر ہوا۔ گنبد کے نیچے نو قبریں ہیں۔ جن کی ترتیب یوں ہے:

(۱) حضرت عبدالقدوسؒ۔ (۲) اہلیہ حضرت عبدالقدوسؒ۔ (۳) شیخ حمید الدینؒ ابن عبدالقدوسؒ۔ (۴) شاہ عبدالصمد ابن شیخ حمید الدینؒ۔ (۵) شاہ فتح اللہ ابن شاہ عبدالصمد۔ (۶) حضرت رکن الدینؒ۔ (۷) شیخ احمدؒ۔ (۸) شاہ فیض اللہ ابن رکن الدینؒ۔ (۹) شیخ عزیز اللہ ابنِ فیض اللہ۔

گنبد سے باہر تین قبریں ہیں ان کی ترتیب یوں ہے:

شیخ عبدالسلامؒ ابن عبدالقدوسؒ۔ شیخ محمد محدثؒ ابنِ عبدالقدوسؒ۔ شاہ محمد امتیاز جہاں سجادہ نشین۔

درگاہ سے نکل کر میں شاہ محی الدین قدوسی صاحب سے ملنے گیا۔ موصوف سے میری پہلی ملاقات ندوۃ المصنفین دہلی میں دو سال قبل ہوئی تھی۔ انہوں نے چائے اور پان سے میری تواضع کی اور بڑی دیر تک مصروفِ گفتگو رہے۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ گنگوہ شریف میں حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لئے ایک اکیڈمی قائم کریں اور ایک علمی مجلہ جاری کریں۔ اس اکیڈمی میں ہر ماہ ایک علمی نشست ہو جس میں تحقیقی مقالے پڑھے جائیں۔

شاہ صاحب نے اس پر صاد فرمایا اور مجھے کہا کہ میں اس کام کی تفصیل لکھ کر انہیں بھیجوں۔ وہ جلد ہی اس پر کام شروع کر دیں گے۔

شاہ صاحب نے ایک رات قیام کرنے پر اصرار فرمایا۔ میں نے معذرت کی اور رُخصت چاہی۔ انہوں نے ایک خوبصورت چادر مجھے عنایت کی۔ یہ چادر مدتوں حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مزارِ پُر انوار پر پڑی رہی۔ افسوس کہ شاہ محی الدین قدوسی کا جلد بعد انتقال ہو گیا۔ ان دنوں ان کے فرزندِ ارجمند شاہ محمد مہتاب عالم قدوسی سجادہ نشین ہیں۔

حضرت گنگوہیؒ کا عرس ۲۳ جمادی الثانی کو ہوتا ہے۔ اس روز حضرت کا جُبۂ مبارک درگاہ تک جلوس کی صورت میں لایا جاتا ہے۔ پچھلے وقتوں میں اسے ہاتھی کی پشت پر رکھ کر درگاہ تک لایا کرتے تھے۔ اب بچا قریش حضرت گنگوہیؒ کا جُبّہ پہن کر ایک بس کی چھت پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ بس زائرین کے ہجوم میں درگاہ تک آتی ہے۔

حضرت گنگوہیؒ نے سکندر لودھی، ابراہیم لودھی، بابر اور ہمایوں کا زمانہ پایا ہے۔ ان کا وصال ۱۵۳۷ء میں ہوا تھا۔ ان کے صاحبزادے حضرت رکن الدینؒ نے ان کے ملفوظات "لطائفِ قدوسی" کے عنوان سے جمع کئے تھے۔ حضرت رکنِ الدینؒ سے حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ کے والدِ ماجد مخدوم عبدالاحد نے فیض حاصل کیا تھا۔ حضرت گنگوہیؒ کے رقعات کا مجموعہ "مکتوباتِ قدوسیہ" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے اپنے پردادا مرشد حضرت احمد عبدالحق رودولوی (م ۱۴۳۴ء) کے ملفوظات جمع کئے تھے جو "انوار العیون" کے نام سے طبع ہو چکے ہیں۔ ان تصانیف سے اس عہد کی معاشرت پر

خوب روشنی پڑتی ہے۔

میری استدعا پر شاہ محی الدین نے ایک رہبر میرے ساتھ کیا۔ میں اس کی رہنمائی میں شیخ ابوسعید گنگوہیؒ (م ۱۶۳۰ء) کے مزار پر حاضر ہوا۔ ان کا مزار حضرت عبدالقدوسؒ کی درگاہ سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ ان کے مقبرہ کی عمارت چوکور ہے لیکن اس پر گنبد نہیں ہے۔ حضرت ابوسعیدؒ کو اپنے مرید شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ (م ۱۶۴۸ء) کی وجہ سے بڑی شہرت ملی ہے۔ موخرالذکر بزرگ کو وحدت الوجود میں غلو کی بناء پر ابن عربی ثانی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں میرے ایک ساتھی عبدالرحمن الداعی نے، جو ان دنوں نائیجیریا میں علوم اسلامیہ کے اُستاد ہیں، پروفیسر آربری کی نگرانی میں شاہ محب اللہ پر ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ لکھا تھا۔ قارئین کرام کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ (۱۸۴۳ء) کے شجرۂ طریقت میں شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ کا نام آتا ہے۔

شاہ ابوسعیدؒ کی درگاہ سے میں شاہ محمد صادق گنگوہیؒ (م ۱۶۴۸ء) کی درگاہ پر پہنچا۔ ان کے مقبرہ کی پیشانی پر یہ عبارت درج ہے۔

۷۸۶

الله ہوالقدوس محمد

مزارِ پُرانوار حضرت شیخ محمد صادق محبوب الہیٰ علیہ الرحمۃ الغفار

حضرت محمد صادق کے مقبرے کا گنبد بڑا خوش منظر ہے۔ گنبد کے نیچے حضرتِ والا کے علاوہ ان کے فرزند حضرت داؤدؒ بھی محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ اسی بزرگ سے حضرت شاہ ابوالمعالیؒ نے فیض اخذ کیا تھا۔ حضرتِ داؤدؒ کے حالات ان کے نواسے غلام عبدالقدوسؒ نے "صدائقِ داؤدی" میں قلم بند کئے ہیں۔ اس تصنیفِ دلپذیر کا ایک کرم خوردہ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ حضرت محمد صادق کے مزار کے جانبِ مشرق ان کے دوسرے فرزند شیخ محمد کا مزار ہے۔ یہ تینوں مزارات ایک چبوترے پر ہیں۔ ان کے گرد سنگِ مرمر کا ایک خوبصورت کٹہرہ لگا ہوا ہے۔ یہ کٹہرہ ان حضرات کے ایک ہندو معتقد لالہ بشمبر داس انبالوی کا نذر کردہ ہے۔ گنبد کے اندر جھاڑ

فانوس بہت ہیں۔ درگاہ میں بجلی لالہ بُدھ پرکاش انبالوی نے لگوائی تھی۔ ان دونوں معتقدین کے نام پتھروں پر کندہ ہیں۔

درگاہ کے احاطے میں ایک مدرسہ اور مسجد بھی ہے۔ درگاہ کے قریب ہی سجادہ نشین حکیم محمد سعید قدوسی کی شاندار حویلی ہے۔ جس پر جابجا اشعار منقوش ہیں۔ حویلی کی پیشانی پر عشرہ مبشرہ کے اسمائے مبارک منقوش ہیں اور حویلی کا نام "قصر الفضل" کندہ ہے۔

"الٰہی ایں خانۂ مبارک باشد" ۔ "رضی اللہ عن سکانہ (۱۳۳۳ھ)" اور "خانہ آباد و دولت زیادہ بحق صاد" سے تاریخ بنا ۱۳۳۳ھ برآمد ہوتی ہے۔ دیوان خانے کی پیشانی پر یہ عبارت درج ہے:

دیوان خانہ

عالیجناب حکیم محمد اسمٰعیل صاحب

ابوالعیال صادقی قدوسی

۱۹۱۳ء

دیوان خانے کی دیوار جانبِ راست پر یہ ابیات منقوش ہیں:

یاد آری کہ وقتِ زادنِ تو
ہمہ خنداں بُدند و تو گریاں
آنچناں زی کہ وقتِ مُردنِ تو
ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

جانبِ چپ یہ اشعار کندہ ہیں:

زبان بار دار اے مرد ہشیار
اگر وقتِ ولادت مار زاید
ازاں بہتر بنزدیکِ خرومند
کہ فرزندانِ ناہموار زاید

میری دانست میں ایک سجادہ نشین کے گھر پر اس سے بہتر شعر نہیں لکھا جا سکتا۔

"قصر الفضل" سے میں نے اپنے رہبر سے اجازت چاہی اور نانوتہ جانے کے لئے

بس سٹینڈ پر پہنچ گیا - بس کی روانگی میں ابھی کچھ دیر تھی - اس لئے ایک چبوترے پر نماز عصر ادا کی اور بس میں سوار ہو کر نانوتہ روانہ ہو گیا -

گنگوہ شریف سے نانوتہ کا فاصلہ دس میل ہے اور بس والے دو روپے کرایہ وصول کرتے ہیں - میں کوئی نصف گھنٹے میں نانوتہ پہنچ گیا - نانوتہ میں سہارنپور جانے والی سڑک پر بڑے چوک سے اندازاً دو فرلانگ کے فاصلے پر سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک چار دیواری کے اندر دارالعلوم دیو بند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوبؒ ابن مولانا مملوک العلیؒ اور مہتمم دارالعلوم دیو بند مولانا محمد منیرؒ کے علاوہ ان کے اعزاء کی بھی قبریں ہیں - میں نے ان قبروں کے کتبے نقل کر کے ماہنامہ بینات کراچی میں شائع کراوئے ہیں (بابت ماہ اپریل ۱۹۸۳ء)۔

ان مزارات پر حاضری دے کر میں قصبے میں آیا اور جامع مسجد میں مغرب کی نماز ادا کی۔ امام صاحب مولوی عبدالجلیل فاضل دیو بند نے مجھے پہچان لیا - انہوں نے مجھے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ، مولانا مملوک العلیؒ ، مولانا محمد احسنؒ ، مولانا محمد منیرؒ اور مولانا محمد مظہر حسنؒ بانیٔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے مکانات دکھائے - انہوں نے مجھے مسجد کا وہ حصہ بھی دکھایا جہاں پہلے مولانا محمد قاسمؒ کا حجرہ ہوا کرتا تھا - امام صاحب اصرار کر کے مجھے اپنے مکان پر لے گئے اور چند احباب کو بھی وہاں مدعو کیا - انہوں نے بڑی پُر تکلف چائے پلائی اور دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی - امام صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ نانوتہ کی آبادی پندرہ ہزار ہے اور وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے - قصبے میں سات مساجد ہیں ، جو خوب آباد ہیں -

امام صاحب سے اجازت لے کر میں بڑے چوک میں آیا اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر عشاء کے وقت سہارنپور پہنچ گیا -

جشنِ صد سالہ دیو بند میں شرکت

۲۰ مارچ ۱۹۸۰ء کو بعد دوپہر میں نے پاک بھارت سرحد عبور کی اور قریباً چار بجے سہ پہر امرتسر پہنچ گیا - ریلوے اسٹیشن پر مسافروں کا بڑا ہجوم تھا ، اس لئے ٹکٹ خریدنے میں پون گھنٹہ ضائع ہو گیا - پونے پانچ بجے مجھے دیو بند کا ٹکٹ ملا اور میں جنتا ایکسپریس میں سوار ہو گیا - ریلوے حکام کی مہربانی سے مجھے آرام کے لئے ایک برتھ مل گئی لیکن شوق کے مارے میں سو نہ سکا - میں ہر بڑے اسٹیشن سے چائے اور سنگترے خریدتا رہا اور رات کے سوا تین بجے دیو بند پہنچ گیا - دیو بند جانے والے زیادہ تر مسافر قاسم پور کے عارضی ریلوے ہالٹ پر اتر گئے جو جلسہ گاہ سے ملحق تھا - میں پرانے اور اصلی ریلوے اسٹیشن پر اترا - وہاں دارالعلوم اور جلسہ گاہ جانے والی لاریاں موجود تھیں اور مدرسہ کی طرف سے چند رضا کار بھی موجود تھے - میں ایک لاری میں سوار ہو کر دارالعلوم پہنچا - ایک رضا کار نے میرا سامان اٹھا لیا اور ہم مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کی تلاش میں مہمان خانے پہنچے - مہمان خانہ کے انچارج مولوی نسیم احمد صاحب کو بے وقت نیند سے جگایا تو انہوں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا کہ مہمان خانہ تو عرب مہمانوں کے لئے مختص ہے اور مولانا صاحب ناظم تعلیمات کے دفتر میں ٹھہرے ہوئے ہیں - میں ناظم تعلیمات کے دفتر میں پہنچا ، دروازہ کھٹکھٹایا تو مولانا صاحب نے ہی دروازہ کھولا - میرے لئے انہوں نے ایک چار پائی کا انتظام کر رکھا تھا اور اس وقت مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیا - اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے اور فجر کی اذان ہونے والی تھی - میں بستر پر دراز ہوا تو اتنے میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کمرے میں داخل ہوئے - موصوف دفتر اہتمام سے وضو کر کے واپس لوٹے تھے - ان سے ملاقات ہوئی - موصوف نوافل میں مشغول ہو گئے اور میں دوبارہ بستر پر لیٹ گیا - ساڑھے چار بجے فجر کی اذان ہوئی تو سبھی حضرات اُٹھ بیٹھے -

یہ کمرہ ، جس میں میرا قیام تھا ، شوریٰ کے اراکین کے لئے مختص تھا - اس میں

مذکورہ بالا بزرگوں کے علاوہ مولانا عبدالعلیم صاحب خلیفۂ شاہ وصی اللہ فتحپوری، حکیم محمد زمان صاحب حسینی، جناب مرغوب الرحمٰن صاحب، مولانا منت اللہ رحمانی اور قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی قیام پذیر تھے۔ ان سب حضرات سے ملاقات ہوئی۔

مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اس لئے فجر کی نماز کمرے میں قاضی زین العابدین صاحب کی اقتداء میں ادا کی۔ نماز کے بعد دفترِ اہتمام سے چائے آگئی۔ میں چائے پی کر لیٹ گیا لیکن نیند نہ آئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد دفترِ اہتمام سے ناشتہ کے لئے بلاوا آگیا اور ہم لوگ دفتر میں چلے گئے وہاں قاری محمد طیب صاحب بھی موجود تھے۔ مفتی صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا تو فوراً پہچان گئے۔

ناشتہ کے بعد غسل سے فارغ ہو کر دارالعلوم دیکھنے نکلا۔ مولسری کے احاطہ میں کنوئیں پر چاہِ زمزم کی طرح ہجوم تھا۔ صدر دروازے سے باہر نکلا تو حکیم اسلام اللہ خان صاحب مل گئے۔ موصوف علی گڑھ طبیہ کالج کے نامور طبیب حکیم افہام اللہ خان کے بھائی ہیں۔ ان کے توسط سے بہت سے ایسے اصحاب سے ملاقات ہوئی جنہیں میں نہیں جانتا تھا۔

اسی ہجوم میں حکیم عبدالقوی دریابادی مدیر "صدق جدید" لکھنؤ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے از راہِ عنایت صدق کے چند پرچے مرحمت فرمائے اور کچھ پرچے لاہور میں مشہور ناول نگار ایم اسلم صاحب کو پہنچانے کے لئے عطا فرمائے۔ حکیم صاحب سے دیوبند میں تین چار بار ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ بمبئی کے حکیم عمر مختار اصلاحی اور ایک فاضل عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی بھی تھے۔ اتفاق دیکھئے کہ پرواز صاحب شیخ وجیہ الدین گجراتی (م ۱۵۹۰ء) پر ایک کتابچہ شائع کر کے دیوبند آئے تھے اور ادھر میں بھی شیخ موصوف پر ۳۲ صفحات کا ایک مضمون اورینٹل کالج میگزین میں چھپوا کر دیوبند گیا تھا۔ پرواز صاحب کے ساتھ اس موضوع پر بڑی مفید گفتگو ہوئی۔ انہوں نے شیخ علی مہائمی (م ۸۳۲ھ) پر بھی ایک جامع کتاب تصنیف کی ہے، جو میرے ذاتی کتابخانے میں موجود ہے۔

دارالعلوم سے نکل کر میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی قیام گاہ دیکھتا ہوا قبرستان قاسمی پہنچا۔ وہاں اکابر کے مزارات پر حاضری دی۔ قبرستان کے ایک کونے میں

میرے کرمفرما مولانا سید محمد محبوب رضوی آسودۂ خاک ہیں۔ گزشتہ سال ۲۵ مارچ کو ان کا اچانک ہی انتقال ہو گیا تھا۔ میں کافی دیر تک ان کی قبر پر بیٹھا ان کی مغفرت کے لئے دعا کرتا رہا۔ قبرستان سے نکلا تو سید نفیس رقم صاحب مل گئے۔ میں انہیں ساتھ لئے ہوئے جامعۂ طبیہ پہنچا۔ مجلس شوریٰ کے اراکین اس وقت وہاں پہنچ چکے تھے۔ میں نے سید صاحب کو ان سے ملایا۔ اتنے میں مولانا سمیع الحق مدیر "الحق" بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی اور خوب ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد دو کاریں وہاں آکر رکیں۔ حاضرین مہمانوں کے استقبال کو آگے بڑھے۔ ایک کار سے حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ دہلی، ان کے برادرِ عزیز حکیم محمد سعید، چیرمین ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان اور قاضی سجاد حسین کرتپوری شارحِ مثنوی مولانا روم اترے۔ حکیم محمد سعید مجھے وہاں دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئے پھر مسرت کا اظہار کیا۔ میں کچھ دیر بعد وہاں سے چلا آیا۔

جامعۂ طبیہ سے باہر مولانا حبیب اللہ فاضل جالندھری سے شرفِ نیاز حاصل ہوا، موصوف سے دو روز پہلے جامعۂ اشرفیہ لاہور میں بڑی طویل ملاقات ہوئی تھی۔ ان سے کچھ دیر گفتگو رہی اور پھر میں اسلام اللہ خان کے ساتھ رجسٹریشن کے لئے چلا گیا۔ میں نے دفتر میں اپنی آمد کی باقاعدہ اطلاع دی۔ میں چونکہ خصوصی دعوت پر دیوبند گیا تھا، اس لئے مجھے مندوب کا بیج اور کھانے کے کوپن مل گئے۔

رجسٹریشن سے فارغ ہو کر میں اپنی قیام گاہ کی طرف لوٹ رہا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ڈاکٹر اقبال انصاری، صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ برآمدے سے گزر رہے ہیں۔ میں جلدی سے آگے بڑھا تو میرا قیافہ درست ثابت ہوا۔ انصاری صاحب سے خیریت دریافت کرنے کے بعد قیام کے بارے میں سوال کیا تو فرمانے لگے کہ ان کا سامان برآمدے میں پڑا ہے اور ابھی تک رہنے کو جگہ نہیں ملی۔ میں انہیں اپنے ساتھ لے آیا اور مولانا اکبرآبادی صاحب نے ان کے لئے ایک چارپائی کا انتظام کر دیا۔ اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے سربراہ ڈاکٹر رضوان اللہ، جنہوں نے مولانا محمد انور شاہ کشمیری پر تحقیقی مقالہ لکھ کر علی گڑھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ لی ہے، مل گئے۔ انہیں بھی ابھی تک قیام کے لئے کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔ اس لئے میں انہیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ یوں ہماری قیام گاہ، جو ایک

بڑے ہال اور دو چھوٹے کمروں پر مشتمل تھی۔ "ندوۃ العلماء" بن گئی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر میں اور اسلام اللہ خان نمازِ جمعہ کے لئے جلسہ گاہ کی طرف چل پڑے۔ تقریباً میل بھر کی مسافت طے کرکے ہم پاکستانی کیمپ تک پہنچے۔ نماز کا وقت قریب تھا اور لوگ صفیں بنا رہے تھے۔ ہمیں جہاں جگہ ملی اس کے قریب ہی قاضی مظہر حسین صاحب چکوال والے اور قاضی عبداللطیف صاحب جہلم والے ڈیرے ڈالے پڑے تھے اور "حق چار یار" کا کیلنڈر ایک نمایاں جگہ پر آویزاں تھا۔ خطبہ کے بعد نماز ہوئی تو میرے استفسار پر لوگوں نے بتایا کہ امام صاحب اس جگہ سے کوئی میل بھر دور ہوں گے۔ تقریباً اتنے ہی لوگ ہمارے عقب میں تھے۔ عرفات کے بعد ایسا منظر کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ دارالعلوم سے جلسہ گاہ کی طرف جو سڑک جاتی تھی اس پر ایسا ہی ہجوم تھا جیسا عرفات سے مزدلفہ جانے والوں کا ہوتا ہے۔

جس وقت مسلمان نماز جمعہ ادا کر رہے تھے تو غیر مسلم بڑی حیرت کے ساتھ انہیں دیکھ رہے تھے کہ ایک امام کی آواز پر لاکھوں انسان رکوع و سجود کر رہے ہیں۔ غیر مسلم بھی کافی بڑی تعداد میں دیوبند آئے ہوئے تھے اور ان کے لئے دارالعلوم کی طرف سے دیجیٹیرین کھانے کا انتظام تھا۔ دیوبند کے غیر مسلموں نے اس موقعہ پر اتنا تعاون کیا کہ جس کے گھر کے چار پانچ کمرے تھے اس نے دو تین کمرے زائرین کے قیام کے لئے کھول دیئے۔

بھارت کے ہر صوبے کے زائرین کے لئے الگ الگ کیمپ تھے۔ ہر کیمپ میں تقریباً دس ہزار افراد کے رہنے کی گنجائش تھی۔ دیوبند کے قرب و جوار کے اضلاع مثلاً میرٹھ، مظفر نگر اور سہارنپور کے کیمپ کسی صوبائی کیمپ سے کم نہ تھے۔ میلوں تک انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا تھا۔ جلسہ گاہ میں چار سو ہینڈ پمپ نصب تھے اور اس کے علاوہ پانی کے نل بھی بچھائے گئے تھے۔ فائر بریگیڈ کا بھی انتظام تھا۔ ڈاکٹروں، حکیموں، اور روٹری کلب والوں نے علاج معالجے کے لئے فری ڈسپنسریاں کھولی ہوئی تھیں۔ کھانے پینے کے ہوٹل بھی سیکڑوں کی تعداد میں جلسہ گاہ میں موجود تھے۔

لاؤڈ اسپیکروں کا اتنا عمدہ انتظام تھا کہ ہر کیمپ میں جلسہ کی کارروائی سنائی دیتی تھی۔ سڑکوں کے کنارے بھی لاؤڈ اسپیکر نصب تھے۔ نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر ہم

پنڈال کی طرف روانہ ہوئے۔ اتفاقاً حکیم عبدالقوی اور ان کے رفقاء راستے میں مل گئے۔ ان کے ساتھ ہم راستہ بناتے ہوئے بمشکل پنڈال میں داخل ہوئے اور اسٹیج کے بائیں جانب جو جگہ مندوبین کے لئے مخصوص تھی، وہاں جا کر بیٹھ گئے۔

جلسہ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے مجلس شوریٰ کے اراکین، مہتمم صاحب اور مہمانانِ گرامی دوسرے راستے سے وہاں پہنچ گئے۔ اسٹیج پر سیکڑوں کرسیوں کا انتظام تھا۔ جلسہ کی کارروائی کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید سے ہوا اور اس کے بعد قاری محمد طیب صاحب نے افتتاحی تقریر کی۔ یہ بالکل غلط ہے کہ جلسہ کا افتتاح مسز اندرا گاندھی نے کیا تھا۔ معاندین نے اس مفروضے کو بڑی ہوا دی ہے کہ اس دینی جلسے کا افتتاح مسز اندرا گاندھی نے کیا تھا۔

وہ اس جلسہ میں وزیر اعظم کی حیثیت سے مدعو تھیں اور انہوں نے اپنی تقریر میں اس بات کا برملا اعتراف کیا کہ انہوں نے اس سے قبل اتنا بڑا اجتماع کبھی نہیں دیکھا۔ کانگرس کے بڑے سے بڑے جلسہ میں بھی اتنا بڑا پنڈال کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں دارالعلوم کی خدمات اور تحریکِ آزادی میں اکابر دیوبند کے کردار کو سراہا۔ اگلے روز حزبِ مخالف کے رہنما جگجیون رام نے جو تقریر کی اسے حاضرین نے بڑا پسند کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ مقررین بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ اکابر دیوبند نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا، یہ تو بالکل معمولی بات ہے۔ ان لوگوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حیوانوں کو انسان اور انسانوں کو انسانِ کامل بنایا ہے۔ مسلمانوں کا برِ عظیم پر یہ احسان ہے کہ انہوں نے یہاں آکر ذات پات کی تقسیم اور اونچ نیچ کو ختم کرکے تمام انسانوں کو ایک برادری میں شامل کر دیا۔

غیر مسلم رہنما دیوبند میں ۲۰ تا ۲۵ لاکھ مسلمانوں کا یہ عظیم الشان اجتماع دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور تین چار دن بعد ہی بھارتی پارلیمنٹ نے ایک بل منظور کرکے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال کر دیا۔

اس موقعہ پر رُوس سے بھی علماء کا ایک وفد دیوبند آیا ہوا تھا۔ یہ وفد اپنے ساتھ مجلس شوریٰ کے اراکین کے لئے تحائف بھی لایا تھا۔ اراکینِ شوریٰ نے تحائف قبول کرنے سے معذرت چاہی اور رُوسی وفد سے صاف صاف کہہ دیا کہ رُوس نے چونکہ

افغانستان میں جارحیت کا ارتکاب کیا ہے اس لئے ان حالات میں وہ اس وفد سے تحفے قبول نہیں کر سکتے۔ وفد نے دفترِ اہتمام کے لئے بخارا کا بنا ہوا ایک خوبصورت قالین اور امام بخاریؒ کی الصحیح کا ایک خوبصورت سیٹ پیش کیا جو مہتمم صاحب نے مجلس شوریٰ کے مشورہ سے قبول کر لیا۔ اس موقعہ پر ایک صاحب نے وفد کے قائد سے یہ بھی کہا کہ بخاری شریف کو چھاپنے کی بجائے دل پر نقش کرنا زیادہ مناسب ہے۔

جلسہ کی دوسری نشست رات کو عشاء کے بعد شروع ہوئی۔ جو نصف شب تک جاری رہی۔ میں چونکہ گزشتہ چھتیس گھنٹوں سے برابر جاگ رہا تھا۔ اس لئے اس اجلاس میں شرکت سے محروم رہا۔ رات کا کھانا اسلام اللہ خان اور مولانا اکبر آبادی صاحب کے ساتھ لنگر میں کھایا اور اپنی قیام گاہ پر واپس آکر سونے کی کوشش کی لیکن نصف شب تک نیند نہ آئی۔

فجر کی نماز دفترِ اہتمام میں مولانا منت اللہ رحمانیؒ (م ۱۹۹۱ء) نے پڑھائی۔ مولانا شاہ فضل اللہ مونگیریؒ کی وفات پر راقم الحروف نے "رفتید ولے نہ از دلِ ما" کے عنوان سے ان کے بارے میں اپنے تاثرات شائع کئے تھے۔ میں ان صفحات کا عکس اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اُن کے چچا مولانا منت اللہ رحمانی کی نذر کیا اور ان سے استدعا کی کہ اسے دیوبند سے مونگیر جاتے ہوئے ٹرین میں اطمینان کے ساتھ پڑھیں۔ میں نے اس مضمون میں ان سے شاہ صاحب کی شرح ترمذی کے مسوّدات کی حفاظت اور طباعت کی درخواست کی تھی جو پاکستان میں بعض حضرات کے پاس موجود ہیں۔

نمازِ فجر کے بعد چائے کا دور شروع ہوا۔ مولانا عبدالحق صاحب پیشار چائے بنا کر حاضرین کو پیش کرتے رہے۔ چائے سے فارغ ہو کر میں اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب، اُستاد شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو منتظر پایا۔ انہوں نے جمال الدین الاسنویؒ کی "طبقات الشافعیہ" پر ایک تعارفی کتاب شائع کی تھی وہ انہوں نے راقم الحروف کو مرحمت فرمائی۔ اسی سفر میں علی گڑھ میں قیام کے دوران میں ان کے ہاں السنن ابی داؤد کا ایک قدیم مطبوعہ نسخہ دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ نسخہ حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ (م ۱۸۹۵ء) کے مطالعہ میں رہ چکا تھا۔ انہوں نے اس پر اپنے ہاتھ سے اعراب لگائے تھے اور جا بجا حاشیے بھی تحریر کئے تھے۔ آخر میں انہوں

نے اپنا نام فضل رحمٰن ملانوی تحریر کیا ہے۔ السنن کا یہ نسخہ شاہ فضل رحمٰنؒ نے مولانا محمد علی مونگیریؒ (م ۱۹۲۷ء) کو عطا فرمایا تھا اور اُن سے یہ نسخہ ان کے پوتے شاہ فضل اللہ مرحوم تک پہنچا تھا۔ شاہ صاحب نے اپنی وفات سے قبل یہ امانت ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کے سپرد کر دی۔ میں دیر تک شاہ فضل رحمٰنؒ کے دستخط اور خط کی پختگی دیکھ کر اپنی آنکھیں منوّر کرتا رہا۔

میں نے اسی روز ناشتہ کے بعد منگلور اور کلیرؔ شریف جانے کا پروگرام بنایا لیکن بس اسٹینڈ پر جا کر دیکھا تو بسوں کی چھتوں پر بھی بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ میں ناچار بس اسٹینڈ سے دفترِ اہتمام پہنچا تو وہاں میر واعظ مولوی محمد فاروق (م ۱۹۹۰ء) تشریف فرما تھے۔ میں نے سلام عرض کیا تو اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور مجھے گلے سے لگایا۔ مولوی صاحب فرمانے لگے کہ انہوں نے مجھے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے مگر اب یاد نہیں آ رہا۔ میں نے عرض کیا کہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی جب سرینگر گئے تھے تو میں ان کے ہمرکاب تھا اور ہم دونوں ان کی قیام گاہ پر میر واعظ محمد یوسف مرحوم (م ۱۹۶۸ء) کی تعزیت کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے ہمیں گلمرگ کی سیر کروائی تھی اور ایک شب چشمۂ شاہی پر ٹھہرایا تھا۔ مولوی صاحب فرمانے لگے کہ ہاں اب کچھ یاد پڑتا ہے۔

میر واعظ نے اس موقعہ پر گیارہ ہزار روپے چندہ میں دیئے۔ اس پر مجلس شوریٰ کے بعض اراکین نے از رو تفنّن ان سے پوچھا کہ اس کا گیارھویں شریف سے تو کوئی تعلق نہیں؟ مولوی صاحب ہنسے اور فرمانے لگے کہ ایسا نہیں ہے۔ دس ہزار روپے انجمن نصرۃ الاسلام کی طرف سے ہیں اور ایک ہزار ان کی طرف سے ہے اس لئے بلا خطر یہ رقم قبول کر لیجئے۔

دفترِ اہتمام سے میں اپنی قیام گاہ پر آیا تو تھوڑی دیر بعد جناب ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی، سابق صدر شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی تشریف لے آئے۔ موصوف کی عمر چوراسی برس کے لگ بھگ ہے۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا۔

ڈاکٹر صاحب دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت شیخ الہندؒ کے مرید ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس وقت پورے بھارت میں ان کے علاوہ شیخ الہندؒ کا کوئی مُرید زندہ نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ پاکستان میں مولانا عزیر گُل ہنوز بقید حیات ہیں۔ وہ حضرت شیخ

الہندؒ کے ساتھ مالٹا میں اسیر رہ چکے ہیں۔ موصوف دارالعلوم میں کتاب خانہ کی نچلی منزل میں قیام پذیر تھے۔ میں اگلے روز ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے اپنی سند مجھے دکھائی جو ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۸ء میں انہیں ملی تھی۔

تمام عبارت عربی میں جلی قلم سے لکھی ہوئی تھی اور اس پر ان کے اساتذہ میں سے محمد حسن صاحب، محمد احمد صاحب، مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مفتی عزیز الرحمن عثمانی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، جناب احمد امین، مولانا شبیر احمد عثمانی، شیخ الادب محمد اعزاز علی، مولانا احمد شیر، مولانا سراج احمد رشیدی، مولانا سید اصغر حسین، مولانا غلام رسول، مولانا نبیہ حسن، مولانا رسول خان، مولانا محمد تفضل، مولانا گل محمد خان، اور مولانا ابراہیم بلیاوی رحمہم اللہ کے دستخط ثبت تھے۔ میں نے ایسی بابرکت سند پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو اس پر فخر ہے کہ وہ تمام اکابر دیوبند کے شاگرد ہیں۔

سند کے بعد انہوں نے اپنے اٹیچی کیس میں سے اپنی دستار فضیلت نکالی۔ اس پر سفید دھاگے سے ۱۳۳۶ھ کاڑھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انہیں مسجد میں کھڑا کرکے یہ دستار ان کے سر پر مفتی عزیز الرحمنؒ اور مولانا انور شاہ کشمیری نے باندھی تھی:

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی صاحب، مشہور نعت گو شاعر حضرت محسن کاکوروی (م ۱۹۰۵ء) کے پوتے ہیں۔ بھارتی حکومت نے عربی زبان و ادب کے لئے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں ۱۹۵۹ء میں صدارتی ایوارڈ سے نوازا۔ میں نے ان سے حضرت شیخ الہندؒ کے بارے میں استفسار کیا تو موصوف نے فرمایا کہ انہوں نے ترمذی شریف کا درس حضرت شیخ الہندؒ سے لیا تھا اور قرات علی الشیخ ان کے ذمہ تھی۔ شیخ الہندؒ عموماً نیلا تہبند باندھتے اور گاڑھے کا کرتا زیب تن فرماتے تھے۔ ان کے سر پر دو پلی ٹوپی ہوا کرتی تھی۔ ان کے ایک ہاتھ میں سونٹا اور دوسرے ہاتھ میں ٹین کی بنی ہوئی پانوں کی ڈبیہ اور ایک میلا سا چھالیہ کا بٹوہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت والا کا قد پست تھا اور موصوف طبعاً بڑے متواضع تھے۔ ان کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ قربانی کے جانور خود

چرانے لے جاتے اور عید کے روز اپنے ہاتھ سے ذبح کرتے۔

ڈاکٹر صاحب کو وہ منظر اب بھی یاد تھا جب جنگِ بلقان کے دوران میں ترکی کی امداد کے لئے حضرت شیخ الہندؒ نے اپنا جبّہ چندہ میں دے دیا تھا اور احاطہ مولسری میں اس کی نیلامی ہوئی تو انیس احمد نے اسے ڈیڑھ سو روپے میں خرید لیا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اسی زمانے میں عید گاہ میں ایک جلسہ ہوا حضرت شیخ الہندؒ نے اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ پڑھ کر تقریر شروع کی اور جب ترکی کی امداد کے لئے حاضرین سے چندے کی اپیل کی تو لوگوں نے سب کچھ لٹا دیا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ مالٹا سے واپسی پر حضرت شیخ الہندؒ لکھنؤ آئے تو فرنگی محل میں قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ حضرت والا نذرانہ قبول نہیں کرتے اس لئے لکھنوی طرز کی ایک چوگوشیہ ٹوپی ساتھ لے گئے جو شیخ الہندؒ نے قبول کرلی۔ ڈاکٹر صاحب نے "قائد بدر و احد" کے عنوان سے سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بحیثیت سپہ سالار تصنیف کی ہے۔ حضرت نے ازراہِ ذرہ نوازی اس کا ایک نسخہ هدیة الى السامی محمد اسلم صانہ اللہ من الوجز لکھ کر اپنے دستخطوں کے ساتھ راقم الحروف کو عنایت فرمایا۔ افسوس کہ اگلے سال ان کا انتقال ہو گیا۔ کاکوری کے سفر میں راقم ان کی قبر پر گیا اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کی۔ میں نے اسی سفر میں مفتی عتیق الرحمن عثمانی سے حضرت شیخ الہند کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ انہوں نے حضرتِ والا کو خوب دیکھا ہے۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک بار علی گڑھ سے نوجوانوں کا وفد شیخ الہندؒ کی خدمت میں دیوبند حاضر ہوا۔ حضرتِ والا ان دنوں علیل تھے اور باوجودِ علالت کے انہیں ملنے تشریف لے گئے۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ جن دنوں شیخ الہندؒ مالٹا میں اسیر تھے ان دنوں یوپی کا گورنر مسٹر مسٹن دیوبند ہوتے ہوئے میرٹھ پہنچا۔ دیوبند کے چند علماء جن میں مفتی صاحب کے والدِ بزرگوار مفتی عزیز الرحمنؒ بھی شامل تھے، میرٹھ جا کر مسٹر مسٹن سے ملے اور اس سے کہا کہ شیخ الہندؒ تو پڑھنے پڑھانے والے بزرگ ہیں اس لئے ان سے برطانوی حکومت کو کیا نقصان پہنچ گا، وہ اگر کوشش کرے تو موصوف رہا ہو سکتے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد مسٹر مسٹن کا سیکریٹری انگلستان جاتے ہوئے مالٹا میں شیخ الہندؒ سے ملا تو انہیں وفد کے بارے میں علم ہوا ۔ حضرت والا نے اپنے داماد قاضی مسعود احمد کو خط لکھا کہ اور لوگ تو گورنر سے ملنے گئے ، مفتی عزیز الرحمٰن کیوں گئے ؟ انہیں اس پر تعجب ہے آخر میں حضرت والا نے سورۃ النساء کی یہ آیت لکھی : و ترجون من اللہ مالا یرجون ۔

میں نے مفتی صاحب سے امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے متعلق کوئی واقعہ سنانے کی فرمائش کی ۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے جب " ندوۃ المصنفین " قرول باغ میں تھا ۔ ایک دن مولانا سندھیؒ ان سے ملنے آئے تو ان کے پاس سو روپے کا نوٹ تھا جو انہیں مرزا عبداللطیف کرچوری نے دیا تھا ۔ مولانا سندھیؒ ، مفتی صاحب سے کہنے لگے کہ وہ نوٹ اپنے پاس رکھ لیں اور انہیں جب ضرورت ہوا کرے گی اس میں سے کچھ رقم لے لیا کریں گے ۔ مولانا سندھیؒ دوسرے تیسرے دن آتے اور کچھ رقم لے جاتے ۔ بقول مفتی صاحب انہوں نے چند ہی روز میں تمام رقم برابر کر دی ۔ مولانا سندھیؒ کو یاد بھی نہ رہا کہ وہ کتنے روپے لے چکے ہیں ، اس لئے وہ سو روپے سے کہیں زیادہ رقم لے گئے ۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۹۳۳ء میں جب وہ حج بیت اللہ کو گئے تو مولانا سندھیؒ سے بھی ملے ۔ ان دنوں مولانا کا قیام باب الزیارۃ میں تھا ۔ انہیں معلوم ہوا کہ ان کی مالی حالت اچھی نہیں اور وہ اکثر فاقہ سے ہوتے تھے اور اگر کبھی قرض وہ قرض مل جاتے تو مسور کی دال اُبال کر پی لیتے تھے ۔ ان حالات میں بھی اگر کبھی زیادہ بڑی رقم ہاتھ لگ جاتی تو اسے غریبوں میں بانٹ دیتے تھے ۔

مفتی صاحب جب رخصت ہونے آئے تو حضرت سندھیؒ فرمانے لگے کہ انہیں نقد دینے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں ہے ، البتہ یہ دو تین کتابیں ہیں ، یہ لیتے جائیں ۔ ان میں سے ایک ابن قطلوبغا کی تصحیح القدوری کا نسخہ تھا اور دوسرا القیر الکثیر کا مخطوطہ تھا ۔ مفتی صاحب نے یہی مخطوطہ مجلسِ اسلامی ڈابھیل کے حوالے کیا جو بعد میں طبع ہوا ۔ اس موقعہ پر مولانا سندھیؒ نے شاہ ولی اللہ کی شرح مؤطا " المسویٰ " کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی مفتی صاحب کو دیا جس پر مولانا موصوف نے اپنے ہاتھ سے جابجا حواشی لکھے ہوئے تھے ۔ افسوس کہ مولانا سندھیؒ کے یہ تبرکات ۱۹۴۷ء میں دہلی کے فسادات میں ضائع ہو

گئے ۔

دیوبند میں قیام کے آخری دن میں کتابخانے میں مفتی ظفیر الدین مفتاحی سے ملنے گیا ۔ اس وقت کتابخانے میں زائرین کا ہجوم تھا ۔ مولانا ظفیر الدین آخری کمرے میں چند احباب کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ میں نے سلام عرض کیا تو بڑے تپاک سے ملے اور مجھے بھی وہیں بٹھا لیا ۔ ان کے پاس جامعہ کالج جامعہ ملّیہ دہلی کے پرنسپل ضیاء الحسن فاروقی بھی تشریف فرما تھے جنہیں میں نہ پہچان سکا ، حالانکہ میری ان سے ۱۹۶۲ء میں جامعہ ملّیہ میں ملاقات ہو چکی تھی ۔ مفتی صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں پہچانتے ہیں ؟ یہ ضیاء الحسن فاروقی ہیں ۔ میں نے بیساختہ کہا کہ میں انہی کا ستایا ہوا یہاں بیٹھا ہوں ۔ اس پر زور کا قہقہہ لگا ۔ بات یوں ہوئی کہ جب میں نے ۔ دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر ۔ کے عنوان سے اکبر کے دینِ الٰہی پر کتاب لکھی تو سوشلسٹوں اور سیکولرازم کے حامیوں پر بجلی گر گئی ۔ انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ اکبر نے برِعظیم میں سیکولر ریاست کی بنیاد رکھی تھی جس میں تمام مذاہب کو مساوی درجہ دیا گیا تھا ۔ پاکستان میں بسنے والے سیکولرازم کی قدر کیا جانیں ؟ ان بیدین عناصر کی ترجمانی آنجہانی مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی نام کے ایک بہائی مبلغ نے کی اور میری کتاب کے مقابلے میں ایک کتاب لکھ ماری جس میں ابوالفضل اور اکبر جیسے ملحدوں کو " رحمۃ اللہ علیہ " لکھا ہوا تھا ۔ آنجہانی شہاب نے راقم الحروف کو مجدد الف ثانیؒ کی حمایت کرنے کے " جرم " میں خوب کوسنے دیئے ۔

جب میں ۱۹۷۳ء میں دہلی گیا تو مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مجھے اس کتاب کا ایک نسخہ مرحمت فرمایا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ یہ کتاب اس قابل نہیں کہ اس کا جواب لکھا جائے ۔ میں خاموش رہا ۔ چند روز بعد جب میں جامعہ ملّیہ گیا تو ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے مجھے اس کتاب کے دو نسخے عنایت فرمائے ۔ اس کتاب کا دیباچہ فاروقی صاحب نے لکھا تھا ۔ موصوف بڑے پکّے نیشنلسٹ ہیں اس لئے انہوں نے دیباچہ میں حضرت مجدد الفِ ثانیؒ اور اُن کی تحریکِ احیائے دین اور میرے بارے میں بڑے سخت الفاظ استعمال کئے تھے ۔ اس واقعہ کے بعد ہماری دوستی ہو گئی اور جب موصوف پاکستان آئے تو میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور ماحضر تناول فرمایا ۔

اس پس منظر میں جب میں نے یہ کہا کہ میں انہی کا ستایا ہوا یہاں بیٹھا ہوں تو اس پر زور کا قہقہہ پڑا اور خود فاروقی صاحب بھی لطف اندوز ہوئے۔

لائبریری میں تمام اکابر دیوبند کی تصانیف چند مخصوص شیلفوں میں بڑے قرینے کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اپنے اکابر کی علمی خدمات کا قائل ہونا پڑا۔

لائبریری سے اٹھ کر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زیارت کو گیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا لیکن اژدہام کی وجہ سے حضرت مجھے پہچان نہ سکے۔ میں نے ان سے بھی ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی کی تصنیف ۔ قائم بدر و اُحدؓ ۔ پر دستخط کروائے۔ میں ان سے اجازت لے کر واپس آیا تو میرے آنے کے بعد انہوں نے سید نفیس رقم صاحب سے میرے بارے میں استفسار کیا۔ سید صاحب نے تعارف کرایا تو علی میاں ان سے کہنے لگے کہ وہ مجھے اس وقت پہچان نہیں سکے۔ خدا جانے میں کیا تاثر لے کر گیا ہوں گا۔ بعد میں سید صاحب نے مجھ سے ذکر کیا کہ علی میاں اس پر بڑے متاسف تھے۔

مولانا علی میاں سے رُخصت ہو کر میں مولوی انظر شاہ سے ملنے گیا۔ میں اس سے پہلے دوبار دیوبند جا چکا تھا لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اس وقت اور بھی کئی ملنے والے وہاں موجود تھے۔ چائے کا دَور چل رہا تھا۔ مولانا سرفراز خاں صاحب خطیب گکھڑ بھی وہاں موجود تھے اور انظر شاہ انہیں "شیر بیشۂ توحید" کہہ کر احباب سے متعارف کروا رہے تھے۔ ایک صاحب نے میرا تعارف کرایا تو انظر شاہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: "اچھا تو وہ آپ تھے جنہوں نے میری تصنیف "نقش دوام" پر "برہان" میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس میں حنفیت بھر دی ہے"۔ میں نے کہا کہ میرے پاس یہ کتاب نہیں ہے۔ میں نے بازار میں بھی تلاش کی ہے وہاں بھی دستیاب نہیں۔ میں اسے قیمتاً خریدنا چاہتا ہوں۔ انظر شاہ نے کہا کہ وہ یہ کتاب مجھے ہدیتہً دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایک نسخہ میرے لئے اور ایک مولانا محمد اشرف صاحب، صدر شعبۂ عربی، پشاور یونیورسٹی کے لئے عنایت فرمایا۔

ان سے پتہ پوچھ کر میں محلہ خانقاہ میں ان کے برادر بزرگ مولانا ازہر شاہ قیصر سے ملنے گیا۔ ان کے ہاں بھی ملاقاتیوں کا ہجوم تھا۔ انہوں نے گلہ کیا کہ بینات میں ۔ دیوبند میں دو روز ۔ کے عنوان سے میرا جو مضمون چھپا تھا اس میں ان کا ذکر فقط ایک

ہی سطر میں کیوں کیا؟ میرے پاس اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہ تھا۔ ان کے ساتھ کافی دیر تک نشست رہی انہوں نے میرے استفسار پر مولانا سندھیؒ (م ۱۹۴۴ء) کا ایک واقعہ سنایا۔ قیصر صاحب دیوبند سے لدھیانہ جا رہے تھے کہ ریلوے اسٹیشن پر مولانا سندھیؒ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ننگے سر کندھے پر تنبو ڈالے کھڑے تھے۔ انہوں نے ان سے لدھیانہ تک کا کرایہ مانگا اور ٹکٹ خرید کر گاڑی میں سوار ہو گئے۔ سہارنپور پہنچ کر اخبار اور چائے کی فرمائش کی اور راستہ بھر ان سے کوئی بات نہ کی۔ ٹرین لدھیانہ پہنچی تو وہاں مشہور کانگرسی خواجہ محمد اعظم (م ۱۹۷۷ء) موجود تھے جو اسی ٹرین سے براستہ لاہور کراچی جانے والے تھے۔ انہوں نے تین صد روپے مولانا سندھیؒ کی خدمت میں پیش کئے اور خود ان سے اجازت لے کر ٹرین میں سوار ہو گئے۔ مولانا سندھیؒ اور قیصر صاحب تانگے میں سوار ہو کر مفتی محمد نعیم صاحب (م ۱۹۶۰ء) کے ہاں پہنچے۔ مولانا نے پانچ روپے تانگے والے کو دیئے اور وہ دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا۔ بقیہ رقم قیصر صاحب کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ "اماں" کو دے دینا۔

قیصر صاحب نے مجھے "حیات الانور" کا ایک نسخہ مرحمت فرمایا وہ اس کی قیمت نہیں لینا چاہتے تھے لیکن میں نے بطور نذر کچھ رقم ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس طرح میرا ضمیر بھی مطمئن ہو گیا۔ ان سے اجازت لے کر میں محلہ خانقاہ کی مسجد دیکھنے چلا گیا۔ مولانا محمد انور شاہ اسی مسجد میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔ دیوبند جانے سے ایک رُوز پہلے سید رشید میاں ابن مولانا سید حامد میاں صاحبؒ نے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا دارالعلوم دیوبند کے بارے میں ایک کتابچہ راقم کو دیا تھا۔ اس میں اس مسجد کا بھی ذکر تھا۔ یہ مسجد اکبر کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی اور اس کے وسطی دروازے پر سرخ پتھر کا ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس میں خطِ ثُلث میں سنِ تعمیر اور بانیٔ مسجد کا نام کندہ ہے۔ مسجد دیکھتے ہوئے میں اپنی قیام گاہ پر واپس آیا اور دوپہر کا کھانا لنگر کی بجائے ایک ہوٹل میں کھایا۔ صدر دروازے پر دارالعلوم کی مطبوعات فروخت ہو رہی تھیں۔ اس میں مولانا محمد محبوب رضوی کی مرتب کردہ "مثنوی فروغ" بھی تھی۔ اس کا ایک نسخہ خریدا اور واپس آکر علی گڑھ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ دیوبند سے واپسی کوئی آسان کام نہ تھا ریل گاڑیوں اور بسوں کی چھتوں پر بھی بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ اتفاق سے علی گڑھ کے

احباب ایک اسپیشل بس اپنے ساتھ لائے ہوئے تھے ۔ جناب حکیم اسلام اللہ خان صاحب نے فرمایا کہ اگر اس بس میں مزید کسی مسافر کی گنجائش نہ ہو تو وہ خود دیوبند میں رُک جائیں گے لیکن مجھے اس میں ضرور سوار کرا دیں گے ۔

اتفاق سے ہم دونوں کو بس میں جگہ مل گئی ۔ ادھر مولانا اکبر آبادی اور ڈاکٹر اقبال انصاری بذریعہ ویگن میرٹھ چلے گئے اور وہاں سے انہیں سنگم ایکسپریس مل گئی اور یہ دونوں حضرات مجھ سے قریباً نصف گھنٹہ پہلے علی گڑھ پہنچ گئے ۔ میں رات کو کوئی ایک بجے علی گڑھ پہنچا اور اگلی صبح وہاں کے احباب سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔

دیوبند اور اس کے اطراف

مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۷۸ء کو میں صبح سات بجے شملہ سے بذریعہ بس انبالہ روانہ ہوا۔ پہاڑی علاقے میں سفر کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہو گئی اور سولن پہنچ کر مجھے قے آنے لگی ۔ میں آنکھیں بند کرکے بس میں بیٹھا رہا اور خدا خدا کرکے کالکا پہنچا ۔ وہاں تھوڑی دیر کے لئے بس رُکی ۔ پہاڑی سفر ختم ہو چکا تھا اس لئے جلد ہی میری طبیعت سنبھل گئی ۔ ہماری بس مغل گارڈن پنجور کے مین گیٹ کے سامنے سے گذرتی ہوئی قریباً ایک گھنٹے میں چنڈی گڑھ پہنچ گئی ۔ یہ شہر پنجاب اور ہریانہ دونوں ریاستوں کا مشترکہ دارالحکومت ہے ۔ یہاں حال ہی میں ایک بڑی عالیشان مسجد تعمیر ہوئی ہے جسے دیکھنے کے لئے دُور دُور سے لوگ آتے ہیں ۔

چنڈی گڑھ میں نصف گھنٹہ قیام کے بعد بس آگے روانہ ہوئی اور انبالہ جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی ۔ قریباً گھنٹے سوا گھنٹے میں بس انبالہ پہنچ گئی ۔ میں نے دوپہر کا کھانا ایک ویجیٹیرین ہوٹل میں تناول کیا ۔ ہندوستان روانہ ہونے سے قبل میں نے سائیں توکّل شاہ صاحب نقشبندی انبالوی پر نُور احمد کی تصنیف "تذکرۂ توکلیہ" اور خواجہ محبوب عالم شاہ کی تالیف "ذکرِ خیر" معروف بہ "صحیفۂ محبوب" کا بڑے اشتیاق کے ساتھ مطالعہ کیا تھا ۔ میرے دل میں ان کا مزار دیکھنے کی بڑی آرزو تھی اس لئے میں نے ایک رکشا والے سے غلّہ منڈی چلنے کو کہا ۔ سائیں صاحب کا مزار غلّہ منڈی انبالہ شہر میں ہے ، لیکن رکشا والا مجھے غلّہ منڈی انبالہ چھاؤنی لے گیا ۔ جب مجھے اس صورت حال کا علم ہوا تو میں نے اسے واپس بس اسٹینڈ چلنے کو کہا ۔ غلّہ منڈی تک جانے اور واپس آنے میں بڑا وقت ضائع ہوا تھا اور میرے پاس مزید وقت نہ تھا ۔ اس لئے بڑے افسوس کے ساتھ سائیں صاحب کے مزار پر جانے کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا ۔

ظہر کی نماز بس اسٹینڈ پر ادا کی اور ساڑھے تین بجے سہ پہر مجھے سہارنپور جانے والی بس مل گئی ۔ قریباً دو گھنٹے میں یہ مسافت طے ہوئی ۔ سہارنپور سے میں دیوبند

جانے والی بس میں سوار ہوا اور قریباً سوا گھنٹے میں دیو بند پہنچ گیا۔ بس سے اتر کر میں ایک رکشا میں سوار ہوا اور ڈرائیور سے دارالعلوم چلنے کو کہا۔ مہمان خانے کے دروازے پر میں نے رکشا رکوایا اور سامان اٹھا کر مہمان خانے میں داخل ہوا۔

حسنِ اتفاق سے ان دنوں مجلس شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا اور شوریٰ کے ارکان جلسے کی کارروائی ختم کر کے مہمان خانے کے صحن میں چائے نوش کر رہے تھے۔ میں نے صحن میں قدم رکھا تو اس وقت میرے خسر محترم مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایک صاحب سے میرا ہی ذکر فرما رہے تھے۔ میں نے اپنا نام سنتے ہی کہا۔ "حضرت! میں آگیا ہوں"۔ میں نے اپنا سامان وہیں رکھا اور مولانا سے لپٹ گیا۔ مجھے ہندوستان میں آئے ہوئے بیس روز ہو گئے تھے لیکن ان سے ابھی تک ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ ان کے اہل و عیال ان دنوں علی گڑھ میں مقیم تھے اور موصوف خود جنوبی ہند میں کالی کٹ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے بحیثیتِ پروفیسر منسلک تھے۔ مولانا اکبر آبادی کافی عرصے سے "سیرتِ عثمان غنیؓ" پر کام کر رہے ہیں اور ان کا کام قریب الاختتام تھا۔ میرا خیال ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کے ساتھ خود سنیوں نے بھی انصاف نہیں کیا۔ انشاء اللہ ان کی یہ تصنیف ہماری بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دے گی۔

اتنے میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی چائے کی پیالی میز پر رکھ کر آگے بڑھے اور مجھے گلے لگا لیا۔ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی بھی چائے نوش فرما رہے تھے ان سے بھی ایک عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔

اسی اثناء میں مغرب کی اذان سنائی دی۔ حاضرین نماز ادا کرنے مسجد میں جانے لگے۔ میں نے ان سے کپڑے تبدیل کرنے کے لئے چند منٹ کی مہلت مانگی۔ مہمان خانہ کے نگران مولوی شمیم صاحب نے میرا سامان اٹھا کر مولانا اکبر آبادی کے کمرہ میں رکھدیا اور میں قمیص شلوار لے کر نہانے چلا گیا۔ دن بھر کے طویل سفر کے بعد نہایا تو گویا جسم میں نئی جان پڑ گئی۔ میں جس وقت مسجد میں داخل ہوا اس وقت نمازی مسجد سے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے نو سال بعد اس بابرکت مسجد میں نماز ادا کرنے کی دوبارہ سعادت حاصل کی تھی۔ جب میں سجدہ ریز ہوا تو میرے دل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ وہ مسجد ہے جس کے فرش پر قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا

ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن دیو بندی، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا میاں اصغر حسین دیو بندیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیرِ مالٹا، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علی دیو بندیؒ، مولانا ابراہیم بلیاویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، شاہ عبدالرحیم رائپوریؒ، مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور حضرت عبدالقادر رائپوریؒ، جن کے زہد و ورع نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ کر دی تھی، نے اپنی پیشانیاں اپنے خالق کے حضور میں جھکائی تھیں۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے اس مقام پر سجدہ کرنے کی سعادت مل رہی ہے جہاں برِ عظیم کے نامور علماء اور اولیاء نے اپنے سجدوں کے نشان چھوڑے ہیں۔

میں نماز ختم کر کے مسجد سے نکلا اور سیدھا مولانا اکبر آبادی کے کمرہ میں پہنچا۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی بھی اسی کمرے میں مقیم تھے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ مولوی شمیم صاحب چائے لے آئے۔ نہانے کے بعد بھی جسم میں جو تھوڑی بہت تھکاوٹ باقی رہ گئی تھی وہ چائے پینے سے جاتی رہی۔

چائے نوشی کے دوران میں مجھے علم ہوا کہ برابر والے کمرہ میں امیرِ شریعت بہار مولانا منت اللہ رحمانی قیام پذیر ہیں۔ میں چائے ختم کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے کمرہ میں ہماری اساتذہ اور طلباء کا ہجوم تھا۔ اتفاق سے دارالعلوم کے کتب خانہ کے ناظم مولانا ظفیر الدین مفتاحی بھی وہاں موجود تھے۔ موصوف میرے پرانے کرمفرما ہیں۔ انہوں نے مولانا منت اللہ سے میرا تعارف کرایا۔ موصوف نے بڑی شفقت کا اظہار فرمایا۔

مولانا منت اللہ، ندوۃ العلماء لکھنو کے بانی مولانا محمد علی مونگیریؒ کے صاحبزادے ہیں، ان کے بھتیجے شاہ فضل اللہ، جو عمر میں اپنے چچا سے کافی بڑے تھے، ان دنوں علی گڑھ میں مقیم تھے، میں شملہ جانے سے پہلے بارہ روز علی گڑھ میں ٹھہرا تھا۔ شاہ صاحب کی رہائش گاہ میری قیام گاہ سے بالکل قریب تھی اور نمازِ عصر کے وقت انوار الہدیٰ کمپاؤنڈ کی مسجد میں بلاناغہ ہماری ملاقات رہتی تھی۔ شاہ صاحب نے امام بخاریؒ کی ادب

المفرد کی شرح "فضل اللہ الصمد" کے عنوان سے لکھی ہے۔ موصوف مولانا مناظر احسن گیلانی کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں صدر شعبۂ دینیات بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی صاحبزادی حنیفہ رضی صاحبہ نے مولانا اکبر آبادی کی نگرانی میں "حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے۔ میں نے ان کی اس تحقیقی کاوش کو ۱۹۷۱ء میں ندوۃ المصنفین لاہور کی طرف سے شائع کیا ہے۔ شاہ صاحب کے احباب ان کی لائق و فائق بیٹی کے نام کی مناسبت سے انہیں "ابو حنیفہ" کہتے ہیں۔ ان کی دوسری صاحبزادی ڈاکٹر رؤفہ اقبال نے "عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا" کے عنوان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کی سند لی ہے۔ یہ کتاب علی گڑھ سے شائع ہو چکی ہے اور راقم کے ذاتی کتابخانے میں موجود ہے۔

میں نے مولانا منت اللہ سے ذکر کیا کہ ایک روز شاہ فضل اللہ فرمانے لگے کہ جب آپ ابھی دودھ پیتے بچے تھے تو وہ سن بلوغ کو پہنچ چکے تھے۔ وہ آپ کو چچا کہہ کر آواز دیتے تو آپ دودھ چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو جاتے اور آپ کی والدۂ ماجدہ شاہ صاحب پر خفگی کا اظہار کرنے لگتیں۔ مولانا منت اللہ مسکرا کر فرمانے لگے کہ اگرچہ شاہ فضل اللہ ان سے عمر میں کافی بڑے ہیں لیکن جب بھی وہ ان سے ملتے ہیں تو چچا ہونے کے ناتے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ اس پر تمام حاضرین ہنسنے لگے۔

مولانا منت اللہ نے مجھے مونگیر آنے کی دعوت دی۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے مکین سے غرض ہے مکان سے نہیں، وہاں ان ہی کی زیارت کرنا تھی، وہ بفضلِ خدا یہیں ہو گئی ہے۔ مولانا فرمانے لگے کہ مونگیر آیئے اور دیکھئے کہ انہوں نے اپنے بزرگوں کی یادگاروں کو کس طرح سنبھال سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ جب بھی موقع ملا میں خانقاہِ رحمانیہ دیکھنے مونگیر آؤں گا۔

عشاء کی نماز مسجد میں باجماعت ادا کی۔ نماز کے بعد دسترخوان بچھا جس پر تمام اکابر موجود تھے۔ قاری محمد طیب صاحب اور ان کے صاحبزادے مولانا محمد سالم غیر ملکی دورے پر گئے ہوئے تھے اس لئے ان کی کمی بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی گئی۔ گزشتہ سفرِ دیو بند میں ان کے ساتھ بڑی طویل اور مفید ملاقاتیں رہی تھیں۔ کھانے کے دوران

مولانا اکبر آبادی اور مفتی صاحب میری سیاحت کے واقعات حاضرین کو سناتے رہے۔ مولوی شمیم صاحب نے مولانا منت اللہ کے ساتھ والا کمرہ مجھے الاٹ کر دیا اور میں نے رات وہیں گزاری۔

نمازِ فجر میں نے مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کی۔ نماز کے بعد میں اور مولانا زین العابدین سجاد ٹہلنے نکلے۔ ان سے میں نو سال پہلے بھی دیو بند میں شوریٰ کے اجلاس کے موقعہ پر مل چکا تھا اور دیو بند سے میرٹھ تک سفر میں بھی شریک رہ چکا تھا اس لئے ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ تھے۔ ہم دونوں مسجد سے نکلے اور ٹہلتے ہوئے مدنی مسجد پہنچے۔ جدید طرز کی یہ مسجد حال ہی میں مولانا اسعد مدنی کی سعی و کوشش سے پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔ ان دنوں اسعد میاں اقتصادیات کے کسی موضوع پر سیمینار کرا رہے تھے اس لئے وہاں کافی رونق تھی۔ میں نے اس روز پہلی بار اسعد میاں کو دیکھا۔ میں ان کے والدِ بزرگوار کی زیارت سے محروم رہا ہوں۔ کئی احباب سے ان کی تصویر کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ ان کی تصویر کسی رسالے میں طبع ہو چکی ہے۔ میں نے اسعد میاں کو اس ارادے سے دیکھا کہ انہیں دیکھ کر ان کے والدِ بزرگوار کے حلیے کا ہیولا سا میرے ذہن میں نقش ہو جائے گا۔

مدنی مسجد کے سامنے سے گزر کر ہم قبرستان قاسمی کی طرف مڑے۔ اس وقت لوگ بڑی تعداد میں اس طرف جا رہے تھے۔ قبرستان میں داخل ہونے سے قبل ہم نے جوتے اُتارے اور السلام علیکم یا اہل القبور کہتے ہوئے اس بقعۂ مبارک میں داخل ہوئے۔ دہلی میں مہندیوں کے قبرستان میں خاندان ولی اللہی کی قبور کے علاوہ پورے برِ عظیم میں ایسا کوئی مقام نہیں جہاں علم و تقویٰ کا اتنا بڑا خزانہ دفن ہو۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى کے فرمانِ خداوندی کے مطابق یہ شرف دیو بند کے اس چھوٹے سے خطے کو، جسے عرف عام میں "خطۂ صالحین" کہتے ہیں، حاصل ہے کہ اس کی خاکِ پاک سے ایسی عظیم ہستیوں کا خمیر اٹھایا گیا جن کی صدائے قال اللہ و قال الرسولؐ سے برِ عظیم کے علاوہ عرب و عجم بھی گونج اٹھے:

یک بار نالہ کردہ ام از دردِ اشتیاق

از شش جہت ہنوز صدا میتواں شنید

ان بزرگوں کی کچی قبریں بالشت بھر سے اُونچی اور تین فٹ سے زیادہ طویل نہیں ہیں۔ یہاں نہ عُرس ہوتا ہے اور نہ چراغ و اگربتی جلانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہاں قبروں کو دُھو کر پینے، اُن پر چادریں چڑھانے، سہرے باندھنے، نذریں پیش کرنے اور مشرکانہ نعرے لگانے کی ریت نہیں۔ اسی روز میں نے نماز ظہر کے بعد مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی کی معیت میں اکابر دیوبند کے مزارات پر حاضری دی۔ اس موقع کو غنیمت جان کر میں نے مزارات کے کتبے نقل کرلئے اور اب انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ پاکستان کے بیشتر اہلِ علم ان کی وفات کے سنین سے واقف نہیں ہیں اور تصنیف و تالیف کے سلسلے میں اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

دارالعلوم سے خطۂ صالحین کی طرف جاتے ہوئے راستے میں طبیّہ کالج کے صدر دروازے کے باہر ایک پختہ قبر نظر آتی ہے۔ میں کئی بار اس کے قریب سے گزرا ہوں لیکن کتبے پر نظر ڈالنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس بار جب غور سے کتبہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس قبر میں قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمۃ کے والدِ بزرگوار محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کے مزار پر جو کتبہ نصب ہے، اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

مزار اقدس

حضرت شیخ اسد علی رحمۃ اللہ علیہ

والدِ ماجد

حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ

المتوفیٰ ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء

خطۂ صالحین میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب دو قبریں بڑی نمایاں ہیں۔ ان میں سے ایک قبر مولانا اعزاز علی مرحوم شارح دیوان الحماسہ کی ہے اور دوسری علامہ محمد ابراہیم بلیاوی کی، یہ دونوں بزرگ میرے دادا اُستاد ہیں۔ مولانا اعزاز علی مرحوم کے

لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

مرقدِ مبارک

اُستاذُ العلماء

و شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی اعلی اللہ مقامہٗ

۱۹۵۵ء

شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

المتوفیٰ مورخہ ۱۳ رجب ۱۳۷۴ھ

علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ کی قبر کے کتبے پر یہ عبارت مرقوم ہے:

۷۸۶

مرقدِ مبارک

امین علوم اکابر جامع معقول و منقول

حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی

چشتی قادری نقشبندی سہروردی (قدس اللہ سرہٗ)

صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

متوفی ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ

مطابق ۲۷ دسمبر ۱۹۶۷ء

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مزارِ پُرانوار سے جانبِ قبلہ اندازاً دو میٹر کے فاصلے پر مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پوتے اور دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم قاری محمد طیب صاحب محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کی قبر پر لوہے کی ایک تختی نصب ہے جس پر یہ عبارت درج ہے:

مرقدِ مبارک

حکیم الاسلام حضرتِ اقدس مولانا محمد طیب صاحب

نوّر اللہ مرقدہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

المتوفیٰ ۶ شوال ۱۳۰۳ھ

۱۷ جولائی ۱۹۴۳ء

قاری صاحب کی آخری آرامگاہ سے چند قدم کے فاصلے پر مائل بجنوب مغرب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی قبر ہے۔ مرحوم مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے صاحبزادے اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے برادرِ بزرگ تھے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

۷۸۶

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

مہتمم خامس

دارالعلوم دیوبند

المتوفیٰ

۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مزار کے پائتی جانب ان کے نامور شاگرد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا (م ۱۹۲۰ء) محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ بعض کم علم حضرات ان کا نام محمود الحسن لکھتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے۔ ان کا نام بغیر "ال" سے لکھا جاتا ہے۔ موصوف دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

شیخُ الھند

حضرت مولانا محمود حسن

قدس اللہ سرہٗ العزیز

توفی ۱۳۳۹ھ

شیخ الہند کے مزار سے متصل جانبِ قبلہ ان کے شاگرد اور صاحبُ الحین حضرت مولانا حسین احمد مدنی (م ۱۹۵۷ء) کی ابدی آرامگاہ ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے:

شیخُ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

چشتی نقشبندی قادری سہروردی

شیخ الحدیث دارالعلوم

صدر جمیعتہ علماء ہند

قدس اللہ سرہٗ العزیز

توفی ۱۲ جمادی الاولیٰ ۷۷ھ ۳

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۱۸۸۰ء) کی مزار کے سرہانے مولانا سید فخرالحسن مرحوم کی قبر ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرقد مبارک

فخر الاماثل اُستاذ الاساتذہ مفسر عظیم محدث کبیر

متکلم جلیل معمارِ مدارسِ اسلامیہ

حضرت مولانا سید فخرالحسن صاحب

نوّر اللہ مرقدہٗ

صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

المتوفی ۷ ذی قعدہ ۱۴۰۰ھ

مطابق ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ء

شب پنج شنبہ

حضرت قاسم العلوم کے مزارِ پُر انوار سے اندازاً چار میٹر جانب مشرق مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے والد بزرگوار مفتی اعظم دیوبند مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی (م ۱۹۲۸ء) محو خوابِ ابدی ہیں۔ مفتی صاحب سلسلۂ نقشبندیہ میں حضرت رفیع الدین علیہ الرحمہ کے مرید اور خلیفہ تھے اور مؤخر الذکر بزرگ کو سند المحدثین حضرت شاہ عبد الغنی مجددی قدس سرہٗ العزیز (م ۱۸۷۸ء) سے خلافت ملی تھی۔ مفتی صاحب کے خلیفہ مولوی محمد اسحٰق میرٹھی سے مولانا بدرِ عالم میرٹھی کو خرقۂ خلافت ملا تھا۔ مفتی صاحب کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

مرقدِ مبارک

قدوۃ السالکین مفتیٔ اسلام حضرت مولانا شاہ عزیز الرحمٰن صاحب

رحمۃ اللہ علیہ

عثمانی نقشبندی مجددی دیو بندی

المتوفیٰ ۱۷ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ

یوم شنبہ

مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کے مزارِ اقدس کے پائنتی جانب اندازاً پانچ میٹر کے فاصلے پر مولانا مبارک علی مرحوم کا مزار ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے

۷۸۶

حضرت مولانا سید مبارک علی صاحب رحمۃ اللہ

نائب مہتمم دارالعلوم

۱۳۲۹ تا ۱۳۸۸ھ

وفات جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ

خلیفۂ خاص

شیخ الہند و مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ

سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند

۱۳۳۰ھ تا ۱۳۳۰ء

و

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب

سبحان اللہ! کیا نسبتیں پائی ہیں:

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

سید مبارک علی مرحوم و مغفور کے پائنتی جانب مولانا عبدالحق مرحوم کی آخری آرامگاہ ہے۔ ان کے لوح پر یہ عبارت مرقوم ہے:

۷۸۶

شیخ التفسیر والحدیث والادب

حضرت مولانا عبدالحق المدنی العثمانی

مہتمم جامعۂ قاسمیہ مدرسۂ شاہی مراد آباد

رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیو بند

المتوفیٰ ۳۰ ذی قعدہ ۱۳۷۴ھ

مطابق ۲۳ جولائی ۱۹۵۵ء

مولانا عبدالحق مدنی کے مزار کے پائنتی مائل بہ شرق قاری محمد حفظ الرحمٰن آسودۂ خاک ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

مرقدِ مبارک

استاذ القراء

حضرت مولانا قاری حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ

تاریخِ وفات

۲۴ شوال ۱۳۸۸ھ

۱۴ جنوری ۱۹۶۹ء

قاری حفظ الرحمٰن مرحوم کی قبر سے دو میٹر جانب جنوب مشرق مولانا شریف حسن صاحب استراحت فرما رہے ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

ورفعنالک ذکرک

۱۳۹۷ھ

مرقدِ مبارک

محدثِ وقت حضرت مولانا شریف حسن صاحب

شیخ الحدیث دارالعلوم دیو بند

مطابق ۲ جون ۱۹۷۷ء

شیخ الادب مولانا اعزاز علی مرحوم کی قبر کے برابر جانبِ مشرق مولانا سید رشید الدین مہتمم مدرسہ شاہی مراد آباد کے والدِ بزرگوار سید حمید الدین کی قبر ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

۷۸۶

مزارِ مبارک

حضرت الحاج مولانا سید حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ
شیخ الحدیث مدرسۂ عالیہ کلکتہ
ممبر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
و سابق شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند
۱۵ نومبر ۱۹۶۷ء کو دہلی سے دیوبند آتے ہوئے کار کے حادثہ میں شہادت پائی۔

اکابرین کے مزارات سے ذرا ہٹ کر جانبِ مشرق مورخ دیوبند مولانا محبوب رضوی صاحبؒ کی قبر ہے۔ ان کے ساتھ میرے بڑے اچھے تعلقات تھے اور ان کی تصنیف "مکتوباتِ نبویؐ" ان کے دستخطوں کے ساتھ میری ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے:

مرقدِ محبوب

دارالعلوم دیوبند کے دیرینہ خادم
مشہور انشاء پرداز مقالہ نگار
اور تاریخِ دارالعلوم کے مصنف مرتب
الحاج مولانا سید محبوب احمد صاحب رضوی
اللهم اغفرلہ ورحمہ والحقہ بالرفیق الاعلیٰ
تاریخِ پیدائش ۱۳ اگست ۱۹۱۱ء اتوار
تاریخِ وفات ۲۵ مارچ ۱۹۷۹ء بروز اتوار

منجانب اہلیۂ مرحوم جمیلہ پنہاں

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا شاہ فضل الرحمٰن عثمانیؒ کی قبروں پر کتبے نصب نہیں ہیں۔ مولانا محمد قاسمؒ کے فرزند ارجمند مولانا محمد احمد کا مزار مدراس میں ہے۔

خطۂ صالحین سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک اور چھوٹا سا قبرستان ہے۔ اس قبرستان میں سب سے نمایاں قبر مولانا حاجی محمد عابد حسینؒ کی ہے۔ موصوف دارالعلوم دیوبند کے بانی مبانی تھے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

مزارِ پُر انوار

راس الاتقیاء، سرتاجِ اولیاء، عارف باللہ مجدد الملت والدین
حضرت الحاج السید محمد عابد حسین صاحب
قدس سرۂ العزیز
بانی دارالعلوم دیوبند
مؤسس جامع مسجد دیوبند ۱۲۸۳ھ
متوفی ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ

ہم دونوں "خطۂ صالحین" سے نکل کر عید گاہ کی طرف بڑھے۔ عید گاہ کے جنوب مشرقی گوشے میں برِّعظیم کے نامور محدث علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کا مزار ہے۔ جب میں نو سال پہلے دیوبند آیا تھا اس وقت ان کی قبر ایک کھلے میدان میں تھی۔ اب ان کے لواحقین نے اس کے گرد چار دیواری بنا کر اسے اپنا خاندانی قبرستان بنا لیا ہے۔ مفتی عتیق الدین مفتاحی اور میں چار دیواری کے اندر داخل ہوئے۔ شاہ صاحب، ان کی اہلیہ، ان کے ایک نو عمر فرزند اور مولوی انظر شاہ کی رفیقۂ حیات قریب قریب دفن ہیں۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا مزار خطۂ صالحین سے کافی فاصلے پر عید گاہ کے قریب ایک چار دیواری کے اندر ہے۔ مولانا انور شاہ کے نام سے پہلے انجان قسم کے تذکرہ نگار "سید" لکھ دیتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ موصوف نسلاً جاٹ تھے اور ان کا شجرۂ نسب امام اعظم ابوحنیفہؒ کے جدِ امجد ذُوطی سے جا ملتا ہے۔ ذُوطی، جاٹ ہی کا معرّب ہے۔ مولانا انور شاہ نے کبھی بھی اپنے نام سے پہلے "سید" نہیں لکھا لیکن ان کے فرزند اور پوتے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اپنے نام سے پہلے "سید" لکھتے ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

حضرت رئیس الحکماء و المتکلمین خاتم الفقہا والمحدثین
شیخ الاسلام مولانا محمد انور شاہ قدس سرہٗ
بتاریخ ۳ صفر ۱۳۵۲ھ بوقت نصف شب
از دار الفنا بسوئے دار البقاء رحلت فرمود

ہم وہاں فاتحہ پڑھ کر دارالعلوم کی طرف واپس چلے تو میں شاہ صاحب کے بارے میں سوچنے لگا ۔ اب تو ہمارے ہاں ہر ملائے مسجد اپنے نام سے پہلے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ۔ علامہ ۔ لکھنے لگا ہے اور اگر میری بات کا یقین نہ آئے تو عید کے روز اخبارات میں ۔ نماز عید کے اوقات ۔ کے کالم میں پڑھ لیجئے کہ فلاں فلاں علامہ صاحب کون کون سی مسجد میں امامت فرمائیں گے ۔ ایک ایسے ہی اشتہاری علامہ کے بارے میں لوگوں نے پاکستان کے دورہ پر آئے ہوئے سعودی عرب کے ایک عالم سے استفسار کیا تو اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا مَا وَجَدْتُ فِيهِ شَيْئًا اِلَّا اَنَا ۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات میں مرقوم ہے کہ انہوں نے ایک مجلس میں فرمایا ۔ "ہم نے اپنے اکابر کو دیکھا ہے ان کے نام کے ساتھ مولوی ، زیادہ ہوا تو مولانا لکھا ہوتا تھا ۔ اب اس زمانے میں چار چار سطروں میں مولویوں کے القاب پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ گویا اپنے زمانے کے سب کچھ یہی ہیں ، لیکن یاد رکھیے کہ یہ لوگ ان القاب کے نیچے اپنی جہالت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں ۔" میں نے دیوبند کے ابنائے قدیم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ علامہ کا لقب حضرت انور شاہ کشمیریؒ کے بعد کسی کے نام کے ساتھ زیب نہیں دیتا ۔

مولوی انظر شاہ نے اپنے والدِ بزرگوار کے سوانح حیات ۔ نقشِ دوام ۔ کے عنوان سے ترتیب دیئے ہیں ۔ مصنف نے مولانا اکبر آبادی کو جو نسخہ ہدیۃً بھیجا تھا ، میں علی گڑھ میں قیام کے دوران میں اس کا بغور مطالعہ کر چکا تھا ۔ اس سے قبل مولوی ازہر شاہ قیصر کی مرتب کردہ ۔ حیات الانور ۔ اور ڈاکٹر قاری رضوان اللہ کی تصنیف مولانا انور شاہ کشمیری ، حیات اور علمی کارنامے ، بھی پڑھ چکا تھا ۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی ۔ نفحۃ العنبر ۔ پڑھنے کا ہنوز موقع نہیں ملا ۔ میرے دل میں مولانا انور شاہ کا بڑا احترام ہے ۔ میری اہلیہ کے والدین کا نکاح بھی مولانا مرحوم نے پڑھایا تھا جس کا ذکرِ خیر مولانا اکبر

آبادی نے اپنے ایک مضمون بعنوان ۔ اسے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم ۔ میں بتفصیل کیا ہے ۔ مولانا اکبر آبادی شاہ صاحب کے بڑے چہیتے شاگرد تھے ۔ موصوف نے ایک بار مجھ سے کہا کہ اگر وہ مولانا انور شاہ سے نہ ملتے تو وہ کبھی یہ باور نہ کرتے کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کو لاکھوں حدیثیں حفظ تھیں ۔ اگر متأخرین میں شاہ صاحب کو لاکھوں حدیثیں ازبر ہو سکتی ہیں تو متقدمین کے کیا کہنے ؟

میں اگلے روز صبح حجامت اور غسل سے فارغ ہوا تو ناشتہ تیار تھا ۔ مجلس شوریٰ کے اراکین تو ناشتہ سے فارغ ہو کر اجلاس میں شرکت کے لئے چلے گئے اور میں ریکارڈ آفس میں سید محبوب رضویؒ مورخ دیوبند سے ملنے چلا گیا ۔ ان سے پرانی یاد اللہ ہے ۔ (وہ دیوبند کے اس سفر میں بقیدِ حیات تھے) ۔ انہوں نے میری استدعا پر بانیٔ دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا وصیت نامہ فائل سے نکال کر دکھایا ۔ اس میں یہ مرقوم ہے کہ مدرسے کے لئے حکومت سے کسی بھی قسم کی امداد قبول نہ کی جائے اور زمینداروں اور جاگیرداروں سے مستقلاً کوئی رقم وصول نہ کی جائے ۔ اس مدرسے کو محض توکل علی اللہ چلایا جائے ۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دارالعلوم کو حکومت اور جاگیرداروں کے اثر سے آزاد رکھنا چاہتے تھے ۔ جس وقت انہوں نے اس مدرسے کی بنیاد رکھی تو ان کے سامنے عظیم مقاصد تھے ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ فرمایا کرتے تھے ، "دیوبند کا مدرسہ اُستاد علیہ الرحمۃ نے محض تعلیم کے لئے تھوڑا ہی قائم کیا تھا ۔ نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ناکامی کی تلافی کے لئے قائم کیا تھا ۔"

سید محبوب رضوی صاحب کی عنایت سے مجھے دارالعلوم کے سب سے پہلے اُستاد مولانا محمودؒ کا تقرر نامہ بھی دیکھنے کا موقع ملا ۔ اس پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ، شیخ الہند محمود حسینؒ کے والدِ محترم مولانا ذوالفقار علی اور شاہ فضل الرحمٰن عثمانیؒ کے دستخط ثبت ہیں ۔ اس زمانے میں عالی مرتبت اُستاد کا ماہانہ مشاہرہ پانچ روپے مقرر ہوا تھا ۔

سید محبوب رضوی نے اپنی تازہ تصنیف ۔ مکتوباتِ نبویؐ ۔ مرحمت فرمائی ۔ اس کتاب میں انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کے نامہ ہائے مبارک کے عکس بھی شائع کئے ہیں ۔ مقوقس اور منذر بن ساوی کے نام حضورؐ کے مکاتیبِ گرامی کے عکس تو

عام دستیاب ہیں۔ لیکن خسرو پرویز کسریٰ ایران کے نام حضورؐ کے نامۂ مبارک کا عکس پہلی بار باصرہ نواز ہوا۔ اس سنک مزاج حکمران نے حضورؐ کا نامۂ مبارک چاک کر ڈالا تھا۔ عکس میں اس کا نشان صاف طور پر نمایاں ہے۔ مکاتیب نبویؐ کے علاوہ انہوں نے مکاتیب حجاز اور آسان حج کے نسخے بھی مرحمت فرمائے۔ موصوف ان دنوں "مثنویٔ فروغ" ایڈٹ کر رہے تھے۔ اس مثنوی میں اکابر دیوبند کے منظوم حالات ملتے ہیں۔ انہوں نے اس نادر کتاب کا تعارف اپنے ایک قاسلسلہ مضمون میں کرایا ہے جو ماہنامہ "برہان" دہلی کے اکتوبر ۱۹۷۸ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ دیوبند کے دوسرے سفر میں مجھے مثنوی فروغ کا مطبوعہ نسخہ مل گیا۔

مولانا محبوب رضوی سے مل کر میں دارالتفسیر اور دارالحدیث کی عمارت دیکھنے گیا۔ یہی وہ مقدس عمارت ہے جس میں گزشتہ ڈیڑھ صدی سے قال اللہ اور قال رسولؐ کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا انور شاہؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے بزرگوں نے اپنے نفس ہائے گرم سے اس عمارت کو آباد رکھا۔ اب یہ عمارت ان اکابر کی یادگار ہے۔ میں دارالعلوم میں پھرتا پھراتا صدر دروازے سے باہر نکلا اور چھتہ والی مسجد کی طرف چل پڑا۔ اس مسجد کی ان دنوں تعمیرِ جدید اور توسیع ہو رہی تھی۔ اس مسجد کے صحن میں انار کا ایک پیڑ ہر زائر کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اسی پیڑ کے سایہ تلے دارالعلوم کے پہلے اُستاد مولانا محمودؒ نے مدرسے کے سب سے پہلے طالب علم شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کو درس دیکر علوم اسلامیہ کی اس عظیم درسگاہ کی نیو رکھی تھی، جہاں اب تین ہزار طلباء زیر تعلیم ہیں۔ دیوبند اس وقت دنیا بھر میں حنفی فقہ کے درس و تدریس کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

چھتہ مسجد سے نکلتے ہی مجھے رکشا مل گیا اور میں چند منٹوں میں بس اسٹینڈ پہنچ گیا۔ گنگوہ شریف جانے والی بس تیار کھڑی تھی۔ دیوبند سے گنگوہ شریف کا فاصلہ قریباً چھتیس میل ہے لیکن بس یہ مسافت دو گھنٹے میں طے کرتی ہے۔ راستے میں نانوتہ آتا ہے جہاں بس کافی دیر رکتی ہے اور مسافر چائے پینے کے لئے بس سے اتر جاتے ہیں۔ مجھے دیوبند واپس آکر معلوم ہوا کہ بس اسٹینڈ کے قریب ہی ایک باغ میں سرسید احمد خانؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے استاد مولانا مملوک العلیؒ کے فرزند اور دارالعلوم دیوبند کے پہلے

صدر مدرّس مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ دفن ہیں۔ گنگوہ اور نانوتہ کے دوسرے سفر میں راقم کو ان کی قبر دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

دیوبند سے نانوتہ کا فاصلہ ۱۰ میل ہے۔ نانوتہ سے ایک سڑک تھانہ بھون اور جلال آباد کی طرف جاتی ہے اور ایک سڑک گنگوہ ہوتی ہوئی لکھنوتی چلی جاتی ہے۔ یہیں سے ایک سڑک سہارنپور کی طرف جاتی ہے۔ سہارنپور کی طرف جانے والی سڑک پر بڑے چوک سے اندازاً دو فرلانگ کے فاصلے پر سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک چار دیواری کے اندر پانچ قبریں ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں قبر حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (م ۱۸۸۴ء) فرزند رشید مولانا مملوک العلیؒ (م ۱۸۵۸ء) کی ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے:

۷۸۶

مزار

حضرتِ اقدس عارفِ ربانی قطبِ صمدانی

مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ

صدر مدرّس دارالعلوم دیوبند

یہ صوفی کہ تھے خدمت حق میں مرد

ہیبت میں یکتا، محبت میں فرد

وفات ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ

مولانا محمد یعقوبؒ کی قبر سے جانبِ مشرق مولانا محمد منیرؒ محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

مزار

حضرت مولانا محمد منیر صاحب

قدس اللہ سرہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

(لوح پر تاریخ وفات درج نہیں ہے)

اسی چار دیواری کے اندر مولانا محمد منیرؒ کی قبر کی پائنتی جانب حافظ محبوب الرحمٰن کی قبر ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

۷۸۶

مزار

حافظ محبوب الرحمٰن رحمتہ اللہ علیہ

صاحبزادے مولانا محمد منیر صاحب

وفات

۱۱ فروری ۱۹۴۳ء

مولانا محمد یعقوبؒ کی قبر کی پائنتی جانب حکیم معین الدین کی ابدی آرامگاہ ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

مزار

حکیم معین الدین صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ

صاحبزادے مولانا محمد یعقوب

وفات

۷ نومبر ۱۹۲۳ء

چار دیواری کے باہر بھی چند قبریں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

حافظ محمد اسحاقؒ

نبیرۂ

مولوی محمد یعقوب صاحب

وفات ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۹ء

(قارئین کرام کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جملہ اکابر دیوبند کی قبریں کچی ہیں۔ کسی بھی قبر کی اونچائی ایک بالشت سے زائد نہیں۔ زائرین کی سہولت کے لئے ان

قبروں کے سرہانے کتبے نصب کر دیئے گئے ہیں)۔ نانوتہ صدیقی شیوخ کی بستی ہے اور یہاں سے گنگوہ شریف اندازاً دس گیارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ تھانہ بھون کا بھی کم و بیش اتنا ہی فاصلہ ہوگا۔

بس میں دیوبند کے تین طلباء بھی سوار تھے اور دورانِ سفر ان سے میرا تعارف ہو گیا تھا۔ ان کی رفاقت میرے لئے بڑی سُود مند ثابت ہوئی۔ وہ مجھے ایک مدرسے میں لے گئے وہاں انہوں نے ایک بنگالی طالب علم کو ساتھ لیا اور وہ ہمیں قطبِ ارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مزار پر لے گیا۔ ان کا مزار کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹے سے باغیچے میں گھنے پیڑوں تلے ہے۔ اکابرِ دیوبند کی طرح ان کی قبر بھی بالکل کچی اور زمین سے بمشکل بالشت بھر اونچی ہوگی۔ لوحِ مزار پر فخر المحدثین راس الفقہا قطبِ ارشاد امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ان کی تاریخِ وصال ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء کندہ ہے۔ میں نے اسی سفر کے دوران میرٹھ میں قاضی زین العابدین سجاد کے ہاں حضرت گنگوہیؒ کا تحریر فرمودہ ایک خط دیکھا ہے۔ کسی سائل نے تین مسائل حضرت سے دریافت کئے تھے جن میں سے ایک اُردو زبان میں خطبہ کے بارے میں تھا۔ حضرت اس کے جواب میں لکھتے ہیں "اب میں آنکھوں سے مجبور ہوں اور کوئی لکھنے والا موجود ہوتا تو لکھا دیتا۔ آپ کے سوالوں کا مختصر جواب لکھا جاتا ہے۔ خطبہ عربی زبان میں ہونا چاہیے۔ غیر عربی زبان میں خطبہ پڑھنا مکروہ ہے۔ غیر عربی زبان میں خطبہ پڑھنا کہیں ثابت نہیں"۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر طلباء کی معیت میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی درگاہ دیکھنے گیا۔ ایک وسیع چار دیواری کے اندر چھوٹی سی ایک مسجد، گنبد دار مقبرہ اور چند حجرے موجود ہیں۔ میں نے مسجد میں دو نفل ادا کئے اور طلباء کے ساتھ روضے میں داخل ہوا۔ روضے کے اندر ایک چبوترے پر نو قبریں ہیں۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ، ان کی اہلیہ اور بڑے صاحبزادے شیخ حمید الدین کی قبریں ساتھ ساتھ ہیں۔ شیخ علیہ الرحمۃ کا روضہ ایک روایت کے مطابق ہمایوں کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ روضے سے باہر دو قبریں ہیں جن میں سے دائیں ہاتھ والی قبر حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے صاحبزادے شیخ رکن الدینؒ کی ہے۔ ان کا مزار دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے والد بزرگوار مخدوم عبدالاحدؒ (م ۱۵۹۹ء) انہی کے صحبت

یافتہ اور خلیفۂ مجاز تھے۔ اس لئے بھی میرے دل میں ان کا بڑا احترام تھا۔

اسی چار دیواری کے اندر وہ حجرہ بھی تھا جس میں قطب الارشاد مولانا رشید احمدؒ رہا کرتے تھے۔ اسی حجرہ میں شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ عبادت کیا کرتے تھے۔ لیکن امتدادِ زمانہ اور مجاوروں کی نالائقی اور غفلت سے اس حجرہ پر دھوبیوں نے قبضہ کر لیا اور وہ اپنے گدھے وہاں باندھنے لگے۔ مولانا رشید احمدؒ نے اس حجرے کی صفائی کرائی اور اپنے مقدس ہاتھوں سے اس کے فرش کی ناپاک مٹی اٹھا کر وہاں صاف مٹی ڈالی اور اس میں سکونت اختیار کی۔ اسی جگہ وہ حجرہ بھی ہے جس میں شیخ عبدالقدوسؒ کے پوتے شیخ ابوسعید گنگوہیؒ رہا کرتے تھے۔

حضرت گنگوہیؒ کی درگاہ سے نکلے تو کچھ فاصلے پر بغیر گنبد کے ایک مقبرہ دکھائی دیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ حضرت ابوسعید گنگوہیؒ (م ۱۶۴۰ء) کا مدفن ہے۔ انہیں اپنے نامور مرید شیخ محبّ اللہ الہ آبادیؒ (م ۱۶۴۰ء) کی وجہ سے بڑی شہرت ملی ہے۔ ان کے مداح انہیں ابن عربی ثانی کہتے ہیں۔ داراشکوہ ان کا بے حد معتقد تھا اور ان کی خط و کتابت طبع ہو چکی ہے جو ان کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے۔ میں اسی سفر میں الہ آباد میں ان کے مزار کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکا ہوں۔

ہم حضرت ابوسعید گنگوہیؒ کے مزار سے نکلے تو گلیوں اور بازاروں سے گذرتے ہوئے بس اسٹینڈ پر پہنچے۔ یہاں میں نے طلبہ کو بصد شکریہ رخصت کیا اور خود جلال آباد جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ جلال آباد سہارنپور سے براستہ مظفر نگر، شاملی اور کاندھلہ، دہلی جانے والی سڑک پر گنگوہ سے اندازاً سولہ میل دُور ہے۔ جلال آباد میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ جناب مسیح اللہ خان شروانی سکونت پذیر تھے۔ میری بدقسمتی سے موصوف ان دنوں پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے، اس لئے میں ان کی زیارت سے محروم رہا (افسوس کہ ۱۰ نومبر ۱۹۹۲ء کو ان کا انتقال ہو گیا)۔ جلال آباد کے گرد و نواح میں پیاز بکثرت پیدا ہوتا ہے اور سڑک کے کنارے کھیتوں میں دُور دُور تک پیاز کے ذخیرے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ جلال آباد کا قلعہ بھی شکستہ حال میں موجود ہے۔ سکھوں نے جب اٹھارہویں صدی کے آغاز میں اضلاعِ سہارنپور، میرٹھ اور مظفر نگر پر یورش کی تھی تو انہوں نے جلال آباد کا محاصرہ کر لیا تھا۔ لیکن وہ اسے فتح نہ کر سکے۔

یہاں سکھوں کو عبرتناک شکست ہوئی تھی۔ "مثنوئ فروغ" میں شاہ میر جلال آبادیؒ کا ذکر بھی آیا ہے۔ میں ان سے متعارف نہ تھا۔

جلال آباد سے تھانہ بھون دو میل ہے۔ میں رکشا کے ذریعے تھانہ بھون پہنچا۔ میں بس سے اُترا تو سامنے مدرسہ اشرف العلوم نظر آیا۔ ظہر کی اذان ہو چکی تھی لیکن جماعت میں ابھی دیر تھی۔ میں نے وہاں قصر نماز ادا کی اور خانقاہِ امدادیہ کا پتہ پوچھا۔ ایک دوکاندار نے بتایا کہ میں بجلی کی تاروں کو دیکھ کر چلتا جاؤں تو کسی سے پوچھے بغیر وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں تاروں کے ساتھ ساتھ بازار اور گلیوں سے گذرتے ہوئے خانقاہِ امدادیہ پہنچا۔ وہاں ظہر کی جماعت تیار تھی۔ میں نے جماعت کے ساتھ دوبارہ نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر ایک طالب علم سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ اس نے مسجد کی بغل میں تکونا حجرہ دکھایا۔ یہ حجرہ اتنا تنگ ہے کہ اس میں چارپائی نہیں ڈالی جا سکتی۔ یہ قطب العالم حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا حجرۂ عبادت تھا۔ میں نے وہاں نوافل ادا کئے اور اپنے لئے اور حاجی صاحبؒ کے لئے دعا مانگی۔ اس حجرے کے برابر ہی شیخ محمد تھانویؒ اور حافظ ضامن شہیدؒ کا حجرۂ عبادت تھا۔ اس کی ہیئت بھی حاجی صاحبؒ والے حجرہ جیسی ہی تھی۔ اس میں بھی نوافل ادا کئے اور دُعا مانگی۔ صحنِ مسجد کے بائیں جانب وہ سہ درہ تھا جس میں حکیمُ الاُمّت مولانا اشرف علی تھانویؒ درس دیا کرتے تھے۔ خانقاہِ امدادیہ، جسے مولانا تھانویؒ "دکانِ عشق" کہا کرتے تھے، آج بھی اسی حالت میں ہے جس حالت میں ۱۹۲۸ء میں اسے "حکیمُ الاُمّت" کے فاضل مصنف مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے دیکھا تھا۔ مسجد اور خانقاہِ امدادیہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں حاجی صاحب قبلہؒ کے زمانے میں بھی یہ اسی حالت میں ہو گی۔ حاجی صاحبؒ نے ہجرت سے قبل اس خانقاہ میں اپنی زندگی کے ۴۴ برس گزارے تھے۔ اللہ اللہ اس زمانے میں یہ کیسی رُوح پرور جگہ ہو گی۔ اب بھی اس مسجد کے در و دیوار سے ان بزرگوں کے انفاسِ طیبہ کی مہک آتی ہے۔ خانقاہ میں مقیم طلباء کے چہروں پر طمانیت، آنکھوں میں توکل کی جھلک اور پیشانیوں پر سجدوں کے نشانات دکھائی دیتے تھے گویا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ کی صحیح تصویر نظر آتی تھی۔

میں نے اسی سفر کے دوران میں قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کے ہاں حاجی

صاحب قبلہؒ کے ایک خط کی زیارت کی۔ یہ خط ہلکے سبز رنگ کے کاغذ پر اواخر ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ کا تحریر فرمودہ ہے۔ قاضی صاحب کے والدِ بزرگوار مولوی بشیر الدین کے رشتہ کے ایک ماموں محمد صادق نے حاجی صاحب کو ان کے پیر بھائی شیخ محمد تھانویؒ کی وفات کی اطلاع دی تھی، اس کے جواب میں حاجی صاحب نے یہ خط تحریر فرمایا تھا۔ اس خط میں حاجی صاحب کے ٹوٹے ہوئے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی تھی۔ قاضی صاحب کی عنایت ہی سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دو خطوں کی زیارت کی۔ یہ خط انہوں نے قاضی صاحب کے نام ہی تحریر فرمائے تھے۔

میری درخواست پر مسجد کے ایک سینیئر طالب علم نے ایک جونیئر طالب علم کو میرے ساتھ کیا۔ مجھے راستے میں معلوم ہوا کہ وہ جناب ظہور الحسنؒ خلیفۂ حضرت تھانویؒ کا بیٹا تھا۔ میری بدقسمتی ملاحظہ فرمایئے کہ میرے تھانہ بھون آنے سے پانچ روز پہلے "بزمِ اشرف" کا یہ چراغ بھی بجھ چکا تھا۔ رہے نام اللہ کا۔ میں نے اس بچے کی ہمراہی میں حافظ ضامن شہیدؒ کے مزار پر حاضری دی۔ یہاں مجھے حافظ صاحب کا وہ مشہور قول یاد آیا کہ جب کوئی اجنبی انہیں ملنے آتا تو آپ اسے فرماتے کہ اگر کوئی مسئلہ پوچھنا ہے تو شیخ محمد سے جا کر پوچھ لو، اگر تعویذ لینا ہے یا مرید ہونا ہے تو حاجی امداد اللہ کے پاس چلے جاؤ اور اگر حقہ پینا ہے تو ہمارے پاس بیٹھ جاؤ۔

۱۸۵۷ء میں برِعظیم میں جنگِ آزادی شروع ہوئی تو میانجیو نور محمد جھنجھانویؒ (م ۱۸۴۳ء) کے مریدین اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (م ۱۸۹۹ء) کے متوسلین تھانہ بھون میں جمع ہوئے اور انہوں نے باہمی صلاح و مشورہ کے بعد انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ ان مجاہدین کی وفاداریاں مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی بجائے حاجی امداد اللہ کے ساتھ تھیں اور انہی کے ہاتھ پر مجاہدین نے جہاد کی بیعت تھی۔ حافظ محمد ضامنؒ (م ۱۸۵۷ء) لشکر کے علمبردار اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (م ۱۸۸۰ء) امیر لشکر مقرر ہوئے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۹۰۵ء) تقریروں کے ذریعے مجاہدین میں جوش اور ہمت پیدا کرنے پر مامور ہوئے۔ شاملی کے مقام پر انگریزوں کے ساتھ مجاہدین کا مقابلہ ہوا۔ اس معرکے میں مولانا محمد قاسم کی شمشیر زنی نے قرنِ اول کے مجاہدوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ اس معرکے میں حافظ محمد ضامنؒ پیٹ میں ناف کے

قریب گولی لگنے سے شہید ہوئے۔ مقامی روایت کے مطابق قطبُ الارشاد رشید احمد گنگوہیؒ ان کی میت رات کے اندھیرے میں اپنے کندھے پر اٹھا کر تھانہ بھون لائے تھے۔ تھانہ بھون میں یہ بھی مشہور ہے کہ ایک بار ان کے کسی عقیدتمند نے ان کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ اگلی رات اس نے خواب میں حافظ صاحب کو دیکھا کہ اسے مخاطب کرکے فرما رہے ہیں "فاتحہ تو مُردوں کی قبروں پر پڑھتے ہیں، ہم تو زندہ ہیں"۔ اس کے بعد انہوں نے یہ آیت پڑھی وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ۔

حافظ صاحب کے مزار سے چند قدم کے فاصلے پر ایک باغیچے میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کے مزار کی پائنتی جانب ان کے بھائی اور بائیں جانب ان کی اہلیہ کی قبریں ہیں۔ پیرانی صاحبہ کے مزار سے اندازاً تین گز کے فاصلے پر جناب ظہور الحسنؒ کو جگہ ملی ہے:

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اسی قبرستان میں وصل بلگرامیؒ (م ۱۹۳۲ء) اور حکیم محمد مصطفیٰ بجنوریؒ کی قبریں ہیں۔ یہ دونوں بزرگ حضرت تھانویؒ کے چہیتے مرید تھے اور ان کی حیات ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ حضرت تھانویؒ اس قبرستان کو "قبرستانِ عشقبازاں" کہا کرتے تھے۔

مجھے حضرت تھانویؒ سے خصوصی لگاؤ ہے۔ میں نے رمضان ۱۳۹۷ھ میں خواب میں دیکھا کہ ایک مکان کے سامنے برآمدے میں ایک بغلی کمرہ کے دروازے پر چق پڑی ہے۔ معاً وہ چق اٹھی اور حضرت تھانویؒ باہر تشریف لائے۔ مکان کے صحن میں ایک تانگہ کھڑا تھا۔ حضرت اس کی عقبی نشست پر بیٹھ گئے۔ ان کی اچکن کے بٹن کھلے تھے اور ہاتھ میں چھڑی تھی۔ میں نے سلام کیا تو حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا "تم ہمارے ہو"۔ میں نے اس خواب کا ذکر کراچی میں ان کے خلیفہ ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ (م ۱۹۸۶ء) سے کیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ ابھی دیکھئے اور انتظار کیجئے۔ مجھے ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۲ء تک انتظار کرنا پڑا اور اسی روز حضرت شاہ ابرار الحق حقی دامت برکاتہم نے مجھے چاروں سلاسلِ تصوف میں بیعت کر لیا۔

میں "قبرستانِ عشقبازاں" سے باہر نکلا تو جانبِ جنوب اندازاً سو گز کے فاصلے پر

ایک سفید چار دیواری نظر آئی ۔ میں نے اپنے رہبر سے اس کے متعلق استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ اس کے اندر شیخ محمد تھانویؒ (م ۱۸۷۹ء) دفن ہیں ۔ میں فوراً اس جانب لپکا ۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے والدِ بزرگوار ڈاکٹر ابرار حسین ، اُردو کے نامور شاعر حضرت اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی انہی کے سلسلے میں بیعت تھے ۔ یہ تینوں حضرات قاضی عبدالغنی منگوریؒ کے مرید تھے اور ان کے والد اور مُرشد حضرت اسمٰعیل منگوریؒ ، شیخ محمد تھانویؒ کے خلیفہ تھے ۔ قاضی صاحب جلالی طبیعت رکھتے تھے اور ان کی بُود و باش یوپی کے رُوساء جیسی تھی ۔ موصوف شکار کے شوقین تھے اور اُن کے کندھے پر اکثر بندوق لٹکی رہتی تھی ۔

ڈاکٹر ابرار حسین مرحوم کا آبائی وطن تو بکھرائیوں تھا لیکن وہ آگرہ میں پریکٹس کرتے تھے ۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور علمائے دیوبند کے ساتھ ان کے مُخلصانہ تعلقات تھے ۔ ایک روز موصوف طاعون کے ایک مریض کو دیکھ کر گھر لوٹے تو ان کی اکلوتی بچی دوڑتی ہوئی آئی اور ان سے لپٹ گئی ۔ اگلے روز بچی پر طاعون کا اثر ظاہر ہوا اور وہ چند گھنٹوں میں اللہ کو پیاری ہو گئی ۔ بچی کی وفات کے بعد ڈاکٹر صاحب کئی سال تک اولاد سے محروم رہے ۔ ان حالات میں وہ دنیا سے اتنے بد دل ہو گئے کہ انہوں نے ہندوستان سے ہجرت کا ارادہ کر لیا ۔ قاضی عبدالغنیؒ نے انہیں اس ارادے سے باز رکھا اور ڈاکٹر صاحب کو تسلّی دیتے ہوئے فرمایا کہ خدا تعالےٰ انہیں فرزندِ سعید عطاء کرے گا ۔ جب ان کی دُعاؤں کے طفیل مولانا اکبر آبادی پیدا ہوئے تو اسی بشارت کی مناسبت سے ڈاکٹر صاحب نے ان کا نام سعید احمد رکھا ۔

جن دنوں مولانا اکبر آبادی دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو کاندھلہ میں شادی کی ایک تقریب پر قاضی عبدالغنی منگوریؒ سے ملاقات ہوئی ۔ قاضی صاحب فرمانے لگے "سعید ! تمہارے ابّا ہمارے مُرید ہیں ، تم نے ابھی تک ہماری بیعت نہیں کی" ۔ مولانا نے کہا ۔ "حضرت ان کی سمجھ میں آپ کی بزرگی آگئی ہے ، میری سمجھ میں ابھی نہیں آئی" ۔ قاضی صاحب یہ جواب سُنکر کہنے لگے ۔ "تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے" ۔ بعد ازاں قاضی صاحب خوب ہنسے ۔ اب جگر مراد آبادی کا ذکر آیا ہے تو ایک دو باتیں ان کے بارے میں بھی ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ۔ اسی سفر کے دوران میں مجھے ڈاکٹر یُوسُف

حسین خاں کی تصنیفِ دل پذیر "یادوں کی دنیا" پڑھنے کا اتفاق ہوا ۔ ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ایک زمانے میں جگر رندِ بلا نوش تھے اور شراب کے بغیر انہیں ایک پل چین نہیں آتا تھا ۔ جب حضرت اصغر گونڈوی سے ان کے روابط بڑھے تو ان کی صحبت کیمیا اثر نے اپنا رنگ دکھایا اور جگر نے جام و سُبو توڑ کر شراب نوشی سے توبہ کر لی ۔ جب جوش ملیح آبادی کو ان کی توبہ کی اطلاع ملی تو اس نے کہا:

یاد ہے جب جگر چڑھاتے تھے
کیا الف ہو کے ہنہناتے تھے

جگر نے اس کا جواب شریفانہ انداز میں دیا ، اس لئے کہ جوش کی سطح پر وہ کبھی آ ہی نہیں سکتے تھے ۔ جگر نے جوش کو مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر کہا:

تو جہاں پر تھا بہت پہلے ، وہیں آج بھی ہے
دیکھ رندانِ خوش انفاس کہاں تک پہنچے

مولانا اکبر آبادی نے مدت ہوئی اپنے ایک مضمون میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ موصوف اپنے والدِ بزرگوار کے مُرشد قاضی عبدالغنی منگوریؒ کے ساتھ ان کے تعلق کی بناء پر جگر مُراد آبادی کو "چچا" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے اور وہ بھی ان سے بھتیجوں جیسا ہی سلوک کیا کرتے تھے ۔

شیخ محمد تھانویؒ کے مزار سے میں سیدھا خانقاہ امدادیہ پہنچا ۔ میری استدعا پر میرا رہبر مجھے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مکان پر لے گیا ۔ حضرت نے اپنی زندگی ہی میں یہ مکان مدرسہ کے لئے وقف کر دیا تھا اور اب وہاں کوئی کرایہ دار مقیم تھا ۔ یہ لکھوری اینٹوں کا پرانی وضع کا مکان تھا جہاں اللہ کے اس نیک بندے نے اپنی ساری زندگی گزاری تھی ۔ اس مکان سے قریب ہی ان کی دوسری اہلیہ کا مکان تھا ۔ اس کی حالت بھی پہلے مکان جیسی ہی تھی ۔ یہیں سے میں نے اپنے رہبر کو رُخصت کیا اور ایک قریبی مسجد دیکھنے چلا گیا ۔ میں وہ مسجد دیکھ رہا تھا کہ دو راہگیر مجھے دیکھ کر رُک گئے ۔ میں نے مسجد کے بارے میں سوالات کئے انہوں نے بڑی متانت سے جواب دیئے اور مجھے مسافر جان کر چائے کی دعوت دی ۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت چاہی اور بس اسٹینڈ کی طرف چل دیا ۔ تھوڑی دیر میں سہارنپور جانے والی بس آگئی اور میں

اس میں سوار ہو کر نانوتہ پہنچا۔ عصر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ بس اسٹینڈ کے قریب ہی ایک مسجد تھی وہاں نماز ادا کی۔ تقریباً نصف گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد گنگوہ سے دیو بند جانے والی بس آئی اور میں اس میں سوار ہو کر غروبِ آفتاب سے قبل دیو بند پہنچ گیا۔

نمازِ مغرب کے بعد میں نے دن بھر کی روداد سنائی تو مولانا اکبر آبادی فرمانے لگے کہ زمانۂ طالب علمی میں وہ کئی سال دیو بند میں رہے ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں یہ جگہیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ میں بہت دُور سے آیا ہوں، روز رُوز ایسے مواقع کہاں ملتے ہیں؟ اس لئے میں نے فرصت کو غنیمت جانتے ہوئے یہ تاریخی جگہیں دیکھ لیں۔ آپ کسی وقت بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آگرہ میں سنا ہے کہ ایسے بہت سے لوگ بستے ہیں جنہوں نے تاج محل نہیں دیکھا، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب چاہیں گے اسے دیکھ لیں گے، اتنی جلدی بھی کیا ہے۔

تھوڑی دیر میں مہمان خانے کے صحن میں رونق آگئی۔ سید محبوب رضوی، مولانا ظفیر الدین مفتاحی، اَزہر شاہ قیصر، عبدالحق پیشکار، دیو بند کے عربی مجلہ "الداعی" کے نوجوان مدیر اور مولانا ابراہیم بلیاوی کے صاحبزادے، جن کا نام دمِ تحریر ذہن میں محفوظ نہیں رہا، تشریف لے آئے۔ نمازِ عشاء تک علمی و ادبی محفل جاری رہی۔

دیو بند میں شاہد حسین صاحب سے ہنوز ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ موصوف دارالعلوم میں پڑھاتے ہیں اور گزشتہ سال لاہور میں کئی بار ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ موصوف میری محافلِ فضائلِ صحابہ کرامؓ میں بڑی باقاعدگی کے ساتھ تشریف لایا کرتے تھے۔ اتفاق سے جس رُوز میں دیو بند پہنچا اسی رُوز شام کو ان کی ہمشیرہ کی شادی تھی۔ مفتی عتیق الرحمن عثمانی نے نکاح پڑھایا تھا۔ میں نے ان کا ذکر کیا تو مفتی صاحب نے بتایا کہ کل ان کی ہمشیرہ کی شادی تھی اور آج وہ انہیں لینے منگلور گئے تھے۔ شادی کے ہنگامے میں انہیں یہاں آنے کی فرصت نہیں ملی ہو گی۔ میں مولانا اکبر آبادی کے فرزند خورشید احمد کو ساتھ لے کر جامع مسجد پہنچا۔ خورشید دارالعلوم کا ناظمِ تعمیرات ہے اور اب وہ دیو بند سے بخوبی واقف ہو چکا ہے۔ جامع مسجد کے قریب جا کر ہم نے شاہد صاحب کا پتہ پوچھا اور ان کے گھر پہنچ گئے۔ اتفاق سے وہ اس وقت گھر میں تھے۔ انہوں نے ہمیں اندر بلا لیا اور دیو بند کے مشہور حلوائی موتس کے ہاں سے کھیر منگوا کر کھلائی۔

مجھے اگلی صبح نمازِ فجر سے پہلے غازی آباد جانے والی ٹرین پکڑنی تھی۔ صبح منہ اندھیرے اٹھا اور نہا دھو کر سامان اٹھایا۔ رات ایک رکشا والے سے بات طے کر لی تھی۔ دارالعلوم سے ریلوے اسٹیشن ڈیڑھ میل سے کچھ ہی کم ہو گا۔ اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ جس ٹرین سے میں نے سفر کرنا تھا اس کی آمد کی تو ابھی کوئی اطلاع نہیں، البتہ جنتا ایکسپریس تین گھنٹے لیٹ ہے اور وہ عنقریب ہی آنے والی ہے۔ میں نے ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر جا کر نمازِ فجر ادا کی۔ میں جنتا ایکسپریس میں سوار ہو کر دس بجے کے قریب غازی آباد پہنچا۔ وہاں ریلوے اسٹیشن پر ناشتہ کیا اور ساڑھے دس بجے مجھے علیگڑھ جانے والی گاڑی مل گئی۔ میں بارہ بجے کے قریب علیگڑھ پہنچ گیا۔ اسی شام مولانا اکبر آبادی بھی شوریٰ کے اجلاس سے فارغ ہو کر علیگڑھ پہنچ گئے۔ موصوف میرے ہمراہ ساتھ پانچ رُوز ٹھہرے اور ۳ اگست کو کالی کٹ روانہ ہو گئے۔ میں نے ان کی غیر موجودگی میں ان کی لائبریری سے جی بھر کر استفادہ کیا اور اہلِ علم سے خوب صحبتیں رہیں۔



مغلیہ فنِ تعمیر کے زوال کا مظہر مقبرہ صفدر جنگ دہلی۔ صفدر جنگ نے مغلوں کے دورِ زوال میں اودھ میں آزاد و خود مختار ریاست قائم کر لی تھی۔

سرہند شریف

پاکستان سے ہر سال ماہِ صفر کے آخری ہفتے میں زائرین کا ایک قافلہ حضرت مجدّد الف ثانی کے عرس کی تقریبات میں شرکت کے لئے سرہند شریف جایا کرتا تھا۔ اب چند سالوں سے بھارتی پنجاب میں سکھ عزیمت پسندوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ راقم کئی سال تک مسلسل سرہند شریف جاتا رہا ہے۔ جب پاکستان اور بھارت کے باہمی تعلقات خوشگوار تھے تو قافلے کے علاوہ بھی سال میں دو بار مجھے سرہند شریف میں حاضری کا موقع مل جاتا تھا۔

پہلی بار راقم آثم ۱۹۵۰ء میں زائرین کے قافلے میں شامل ہو کر سرہند شریف پہنچا۔ کہنے کو تو لاہور سے سرہند شریف کا فاصلہ صرف ۱۵۵ میل ہے لیکن پاک بھارت سرحد پر امیگریشن اور کسٹم کی کارروائی مکمل ہونے میں شام ہو گئی۔ ہم نے مغرب کی نماز امرتسر پولیس لائن کی گراؤنڈ میں ادا کی اور رات کو بارہ بجے کے قریب ہماری بسیں سرہند شریف پہنچیں۔ ہمارے قیام کے لئے خلیفہ مقبول احمد سجادہ نشین درگاہ عالیہ نے پہلے سے متعدد کمرے مختص کر دیئے تھے۔ ہم اپنا سامان ان کمروں میں رکھ کر نمازِ عشاء ادا کرنے چلے گئے۔

حضرت مجدّد الفِ ثانی کی درگاہ کی مسجد میں نماز ادا کر کے بڑا رُوحانی سکون ملا۔ نماز کے بعد میں ایک واقف کار بزرگ کی معیت میں بہشتی گلی میں سے گزر کر حضرت مجدّد الفِ ثانی کے روضۂ مبارک میں داخل ہوا۔ گنبد کے اندر تین مزارات ہیں۔ قبلہ رُخ حضرت مجدّد الفِ ثانی آرام فرما ہیں اور ان کے مزارِ مبارک سے جانبِ مشرق ان کے سب سے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادق (م ۱۶۱۶ء) کا مزار ہے اور ان کے مزار سے جانبِ مشرق ان کے برادرِ اصغر خواجہ محمد سعیدؒ (م ۱۶۶۰ء) کی ابدی آرام گاہ ہے۔ ان مزاروں پر فاتحہ خوانی کے بعد کچھ دیر تک مراقبہ کیا جس سے بڑا سکون حاصل ہوا۔

خواجہ محمد صادق کا انتقال جہانگیر کے عہد میں طاعون کے مرض سے ہوا تھا۔

اس وقت وہ بالکل جوان تھے۔ ان کے مکاتیب کا ایک چھوٹا سا مجموعہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ ان کی تدفین کے وقت حضرت مجدّد صاحب نے یہ وصیت کی تھی کہ جب ان کا انتقال ہو، تو انہیں ان کے لختِ جگر خواجہ محمد صادق کے پہلو میں سپردِ خاک کیا جائے۔

حضرت مجدّد الفِ ثانی (م ۱۶۲۴ء) نے اکبر اور جہانگیر کا زمانہ پایا تھا۔ انہوں نے اکبر کی بیدینی اور الحاد کے خلاف آواز اٹھائی اور اسلام کی سربلندی اور اسلامی شعائر کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ انہوں نے اکبر کی بیدینی کے علاوہ علماء سو، صوفیاء خام، بھگتی تحریک، بڑھتے ہوئے ایرانی اثرات اور ہندوؤں کی چیرہ دستیوں کے خلاف محاذ قائم کیا۔ اس سلسلے میں انہیں جہانگیر کے عہد میں قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کرنا پڑی لیکن ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ حضرت مجدّد الفِ ثانی شاہی دربار میں اپنے ہم خیال امراء کا ایک پریشر گروپ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جنہوں نے احیائے دین کے لئے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔

حضرت مجدّد الفِ ثانی کی وفات کے بعد ان کے فرزندوں خواجہ محمد سعیدؒ، خواجہ محمد معصومؒ اور خواجہ محمد یحییٰ نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا۔

حضرت مجدّد الفِ ثانی کے مزارِ مبارک کی موجودہ عمارت ۱۹۲۲ء میں بمبئی کے ایک سیٹھ نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کا سنگِ مرمر کا قاش دار گنبد بڑا ہی دلکش ہے۔ حضرت کے روضۂ مبارک کے گرد ایک غلام گردش بنا ہوا ہے جس میں نقشبندی مجدّدی سلسلۂ تصوف کے صوفیاء کرام مراقبہ کرتے ہیں۔ اسی غلام گردش میں حضرت کی قبرِ مبارک سے جانبِ قبلہ کابل کے حکمران ایوب شاہ کی قبر ہے۔ وہ ۱۸۱۷ء سے ۱۸۲۹ء تک افغانستان کا حکمران رہا ہے۔ ایوب شاہ کی قبر سے ملحق حضرت مجدّد الفِ ثانی کے فرزندِ ارجمند خواجہ محمد یحییٰ (م ۱۶۸۵ء) کا مزار ہے۔ ان کی اولاد سے بھوپال کے عوام اب تک فیضیاب ہو رہے ہیں۔ روضۂ مبارک سے باہر، مسجد کے مشرقی جانب افغانستان کے ایک اور حکمران شاہ شجاع کا مقبرہ ہے۔ وہ چار بار افغانستان کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے مخالفین سے بچنے کے لئے رنجیت سنگھ کے دربار میں پناہ لی اور پھر لدھیانہ جا کر انگریزوں کا مہمان بن گیا۔ اس کی اولاد قیامِ پاکستان تک لدھیانہ میں مقیم تھی۔

مسجد کے صحن میں ایک جگہ بڑی مقدس مانی جاتی ہے۔ زائرین وہاں نوافل ادا کرتے ہیں۔ اس جگہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہاں حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ نے "حقیقتِ کعبہ" دیکھی تھی۔ اس سے قریب ہی حضرت مجدد صاحبؒ کے پوتے خواجہ عبدالاحد وحدت المعروف بہ گل (م ۱۷۱۴ء) کی ابدی آرام گاہ ہے۔ موصوف حضرت شاہ گلشن مجددی دہلویؒ (م ۱۷۳۱ء) کے مرشد تھے۔

حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ کے والدِ ماجد مخدوم عبدالاحدؒ کا سالانہ ختم شریف ۲۷ صفر کی شام کو نمازِ مغرب کے بعد ہوتا ہے اور حضرت مجدد صاحبؒ کا سالانہ ختم مبارک ۲۸ صفر کی صبح کو چاشت کے وقت۔ ان موقعوں پر صرف قرآن خوانی ہوتی ہے اور بس۔ ختم کے وقت قرآن خوانی کی سعادت مدرسۂ فرقانیہ لکھنؤ کے طلبہ اور اساتذہ کو حاصل ہوتی ہے۔ ختم کے بعد حاضرین میں لڈو تقسیم کئے جاتے ہیں۔ سرہند شریف میں اسی کا نام "عرس" ہے۔ وہاں قوالی یا نعت خوانی بھی نہیں ہوتی اور درگاہ کے احاطے میں لوگ اونچی آواز سے بات بھی نہیں کرتے اور نہ ہی وہاں کوئی شخص ننگے سر نظر آتا ہے۔ حضرت کے روضۂ مبارک کے اندر اگر سو سوا سو افراد موجود ہوں تو بھی وہاں اتنی خاموشی ہوتی ہے کہ اگر زمین پر سوئی گرا دیں تو اس کی آواز بھی سنائی دی۔

حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ کے روضہ شریف کے دروازے کے باہر غلام گردش میں خلیفہ محمد حسین محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کی سجادہ نشینی کے زمانے میں روضہ شریف کی جدید عمارت تعمیر ہوئی اور بہت سے کام ہوئے۔ مرحوم ہمارے فاضل دوست سیّد امجد الطاف کے نانا کے حقیقی بھائی تھے۔ خلیفہ محمد حسین کی وفات کے بعد ان کے نواسے خلیفہ مقبول احمد سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے زمانے میں، قیامِ پاکستان کے بعد، افغانستان کے شاہی خاندان کی حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ کے ساتھ عقیدت کی بنا پر ہی ان کی درگاہ مشرقی پنجاب میں بلوائیوں کے ہاتھوں محفوظ رہی۔

حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ کے روضۂ مبارک کی جدید عمارت کی سیڑھیوں کے ساتھ دائیں ہاتھ بسی کے رئیسِ اعظم حافظ محمد حلیم کی ابدی آرام گاہ ہے۔ بسی سرہند شریف سے میل بھر دور ہوگی۔ وہاں حافظ صاحب کی محل نما کوٹھی تاحال موجود ہے جس میں اب سرکاری دفاتر بن گئے ہیں۔ حافظ صاحب نے کانپور جا کر ایک ٹینری قائم کی تھی جو

تاحال موجود ہے۔ انہوں نے اس کاروبار میں خوب منافع کمایا۔ راقم نے کانپور میں ان کا قائم کردہ ایک انٹر کالج اور یتیم خانہ دیکھے ہیں۔

درگاہ کے احاطے میں کئی کمپاؤنڈ ہیں۔ مسجد کے مشرق کی جانب جو احاطہ ہے اس میں حضرت خواجہ سیف الدینؒ (م ۱۶۸۵ء) کا مزار ہے۔ گنبد کے وسط میں ان کی قبر ہے اور اس کے دائیں بائیں ان کے فرزندوں اور قریبی رشتے داروں کی قبریں ہیں۔ خواجہ سیف الدینؒ، خواجہ محمد معصومؒ کے فرزند اور حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ کے پوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نگرانی میں مغل فرمانروا اورنگ زیب عالمگیرؒ (م ۱۷۰۷ء) کو منازلِ سلوک طے کروائی تھیں۔ اس کا ذکر اورنگ زیبؒ کے عہد میں لکھی جانے والی تاریخوں میں موجود ہے۔ خواجہ سیف الدینؒ کے خطوط ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب، سابق صدر شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی جام شورو نے "مکتوباتِ سیفیہ" کے عنوان سے شایع کر دیئے ہیں۔

خواجہ سیف الدینؒ کے خلیفہ حضرت نُور محمد بدایونیؒ (م ۱۷۲۳ء) سے حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ (م ۱۷۸۰ء) نے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ مرزا صاحب کے خلیفۂ اعظم حضرت شاہ غلام علیؒ (م ۱۸۲۴ء) نے حضرت احمد سعیدؒ (م ۱۸۶۱ء) کی رُوحانی تربیت کی تھی۔ حضرت احمد سعید سے رام پور میں سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کی ترویج ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ عرس کے موقع پر رام پور کے زائرین خواجہ سیف الدینؒ کی درگاہ سے ملحقہ حجروں میں قیام کرتے ہیں۔ یہیں راقم کی ملاقات حضرت محمد اللہ خاں صاحب عنایتی سے ہوئی تھی، جو خانقاہ عنایتیہ رام پُور کے سجادہ نشین ہیں۔

درگاہ شریف کے ایک کمپاؤنڈ میں نارنگیوں اور امرودوں کا باغ ہے۔ یہ کمپاؤنڈ حضرت خواجہ سیف الدینؒ کے کمپاؤنڈ کے عین بالمقابل ہے۔ اس کمپاؤنڈ میں خواجہ محمد معصومؒ کے پڑپوتے اور حضرت محمد نقشبندؒ (م ۱۷۰۲ء) کے پوتے حضرت محمد زبیرؒ کا روضۂ مبارک ہے۔ موصوف خانوادۂ مجددیہ کے آخری بڑے شیخ تھے۔ ان کا وصال محمد شاہ کے عہد میں ۱۷۳۸ء میں ہوا۔ موصوف شاہ گلشنؒ کے ہم عصر تھے۔ انہی کی پالکی پر انوار کی بارش دیکھ کر شاہ گلشنؒ نے اپنی گلیم یہ کہتے ہوئے زمین پر دے ماری تھی کہ جو انوار اس پالکی پر نظر آتے ہیں، وہ اس گلیم میں نظر نہیں آتے، حالانکہ میں نے یہ گلیم اوڑھ کر

تیس برس تہجد کی نماز ادا کی ہے۔ خواجہ محمد زبیرؒ کے مزار کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جہاں عُرس کے زمانے میں زائرین قیام کرتے ہیں۔ میرے زمانے میں پلاوانی منڈی سے حضرت مجدّد صاحب کے احفاد میں سے لعل بادشاہ فاروقی آکر اس مسجد میں قیام کیا کرتے تھے۔

خواجہ محمد زبیرؒ کے احاطۂ مزار کے بعد ایک اور بڑا احاطہ ہے۔ جہاں خواجہ محمد معصومؒ (م ۱۶۶۸ء) کا روضۂ شریف ہے۔ موصوف حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے تیسرے فرزند اور رُوحانیت میں ان کے سب سے بڑے جانشین تھے۔ اورنگ زیب اور اس کی بہن شہزادی روشن آراء بیگم (م ۱۶۷۱ء) ان کے مخلص مرید تھے۔ خواجہ صاحب کے مریدوں کی تعداد نو لاکھ بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے ستّر ہزار کے قریب درجۂ کمال تک پہنچے اور سات ہزار کے قریب خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ناصر علی سرہندی ان کا مریدِ اخلاص سرشت تھا۔ اس نے ان کے بارے میں فرمایا تھا:

چراغِ ہفت کشور خواجہ معصوم
منوّر از فروغش ہند تا رُوم

خواجہ صاحب کے مکاتیب "مکتوباتِ معصومیہ" کے عنوان سے تین جلدوں میں طبع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں اپنے والدِ بزرگوار کے بعض مکتوبات کی تشریح کی ہے۔ انہوں نے ایک جگہ اپنے قلب کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

چونے کی سی کانکری جب چھڑکوں حب آگ

خواجہ محمد معصومؒ کا روضۂ مبارک شہزادی روشن آراء بیگم نے تعمیر کروایا تھا۔ خواجہ صاحب کے مزار مبارک کے دائیں بائیں اور قدموں میں ان کے بیٹے اور پوتے مدفون ہیں۔ روضۂ مبارک کے باہر دو چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں۔ ان میں سے ایک میں حضرت محمد پارسا محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ مقامی روایت کے مطابق خواجہ محمد معصومؒ کے احاطۂ مزار میں ان کے سات سو کے لگ بھگ خلفاء مدفون تھے۔ ان کی قبروں کے نشان ۱۷۰۹ء میں بندہ بیراگی کی تاخت و تاراج میں مٹ گئے۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی درگاہ کے صدر دروازے پر ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر "درگاہِ عالیہ حضرت ابوالبرکات بدر الدین شیخ احمد فاروقی سرہندی کابلی نقشبندی حنفی

ماتریدیؒ" رقم تھا۔ اس وقت مجھے ان نسبتوں کا علم نہ تھا۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو معلوم ہوا کہ شوافع فقہ میں امام شافعیؒ (م ۸۱۹ء) کے مقلد ہیں اور عقائد میں وہ امام ابوالحسن اشعریؒ (م ۹۳۵ء) کی تقلید کرتے ہیں۔ اسی طرح احناف فقہ میں امامِ اعظم ابوحنیفہؒ (م ۷۶۷ء) کی تقلید کرتے ہیں اور عقائد میں وہ امام ابو منصور ماتریدیؒ (م ۹۴۴ء) کے مقلد ہیں۔ ماترید، سمرقند کا ایک محلّہ ہے اور امام ابو منصور اسی محلّے کے رہنے والے تھے۔ حضرت مجدّدؒ کے بزرگوں کا تعلق کابل سے تھا، اس لئے وہ اپنے نام کے بعد کابلی لکھتے تھے۔ موصوف نسباً فاروقی اور مشرباً نقشبندی تھے۔

درگاہِ عالیہ سے بسی جاتے ہوئے دائیں ہاتھ ایک گنبد نظر آتا ہے۔ اس میں خواجہ محمد معصومؒ کے جانشین خواجہ محمد نقشبندؒ (م ۱۷۰۲ء) محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کا گنبد گو حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے گنبد سے چھوٹا ہے لیکن بالکل اس جیسا ہی ہے۔ خواجہ صاحب اورنگ زیب کے ہمعصر تھے۔ ان کے جانشین ان کے پوتے خواجہ محمد زبیرؒ ابنِ حضرت ابوالعلاءؒ ہوئے تھے۔

خواجہ محمد نقشبندؒ کے مزارِ مبارک سے تھوڑی دور آگے بائیں ہاتھ سڑک سے ذرا ہٹ کر کھیتوں میں ایک چار دیواری نظر آتی ہے۔ اس چار دیواری کے اندر حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے والدِ محترم مخدوم عبدالاحد فاروقیؒ محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ موصوف حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے فرزند حضرت رکن الدینؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ خواجہ باقی باللہؒ کے مرید بننے سے پہلے حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے مخدوم صاحبؒ کی نگرانی میں ہی منازلِ سلوک طے کی تھیں۔ اسے ان کی کرامت ہی سمجھنا چاہئے کہ سکھوں کے مرکز میں کھیتوں کے درمیان ان کا مزار تاحال موجود اور محفوظ ہے۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی درگاہ سے اندازاً تین فرلانگ کے فاصلے پر حضرت بندگی اسمٰعیلؒ کی درگاہ ہے۔ راقم زائرین کے ساتھ وہاں پہنچا تو مزار سے ملحقہ مسجد میں ایک کُتیا کے چھوٹے چھوٹے بچے لوٹیں لگا رہے تھے۔ ان کی ماں خوراک کی تلاش میں باہر گئی ہوئی تھی۔ قریبی کھیتوں میں چند افراد کام میں مشغول تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سرگودھا کے کسی نواحی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ وہاں سکھوں کی اکثریت تھی۔ جب سکھ پاکستان سے بھارت آئے تو یہ بھی ان کے ساتھ ہی یہاں چلے آئے۔ ان کا حلیہ بھی

بالکل سکھوں جیسا ہی تھا۔ زائرین نے مزار کی صفائی کی اور مسجد سے پتے باہر پھینکے۔ حال ہی میں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے سابق صدر شعبۂ تاریخ ڈاکٹر فوجا سنگھ نے سرہند کے بارے میں ایک کتابچہ شائع کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ مزار افغان عہد کے ایک امیر اسلام خان کا ہے جسے لوگوں نے بندگی اسمٰعیل کا روضہ سمجھ لیا ہے۔

بندگی اسمٰعیل کے مزار سے ایک کچا راستہ ریلوے لائن کی طرف جاتا ہے۔ اگر اسی راستے پر چلیں تو ریلوے لائن سے قریب ایک چار دیواری میں چند قبریں نظر آتی ہیں۔ ان میں سب سے اونچی قبر امام رفیع الدینؒ کی ہے۔ موصوف سرہند کے بانی اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے جدِ ششم تھے۔ انہوں نے سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ء۔ ۱۳۸۸ء) کے عہد میں سرہند کی بنیاد رکھی تھی۔ ان دنوں اسے سہرند لکھتے تھے۔ جہانگیر نے بھی اپنی تزک میں سہرند ہی لکھا ہے۔ بعد ازاں کثرتِ استعمال سے یہ سرہند ہو گیا۔

امام رفیع الدینؒ کے مزار سے قریب ہی ریلوے لائن کے پار سدھنے قصائی کی مسجد ہے۔ یہ مسجد ابھی زیر تعمیر ہی تھی کہ سدھنے کا انتقال ہو گیا اور مسجد نامکمل رہ گئی۔ اب بھی اس کے بڑے گنبد میں بہت بڑا سوراخ ہے۔ اس کے باوجود گنبد اپنی جگہ پر قائم ہے۔

سدھنے قصائی کی مسجد سے فتح گڑھ ریلوے اسٹیشن کی جانب چلیں تو اسٹیشن سے قریب ہی ایک دو منزلہ مسجد ہے جو لال مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ آزادی سے چند ماہ قبل خان زین خان ساکن بسی نے اس کی مرمت کروائی تھی۔ حسنِ اتفاق سے وہ بھی اس سفر میں ہمارے ساتھ تھے۔ سرہند کے ایک سفر میں راقم نے دیکھا کہ اس مسجد میں ایک سکول کھل گیا ہے۔ اس سکول سے قریب ہی حال ہی میں ماتا گوجری گرلز کالج تعمیر ہوا ہے۔ موصوفہ سکھوں کے دسویں اور آخری گورو، گوبند سنگھ کی والدہ تھی۔ یہ کالج اس کی یاد میں قائم کیا گیا ہے۔ یہاں اس کالج کے قیام کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سکھوں کی روایت کے مطابق مغلوں نے ماتا گوجری کو اس کے دو پوتوں، فتح سنگھ اور زور آور سنگھ کے ہمراہ گرفتار کر کے قلعۂ سرہند کے ٹھنڈے برج میں نظر بند کر دیا تھا۔ مغلوں نے فتح سنگھ اور زور آور سنگھ سے کہا کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو ان کی جان بخشی ہو سکتی ہے۔ ان بچوں نے اسلام قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تو سرہند کے

گورنر نے انہیں دیوار میں زندہ چنوا دیا۔ ان کی دادی اسی صدمے سے مر گئی۔ اس کالج سے تین فرلانگ کے فاصلے پر ایک گوردوارہ ہے جو "جیوتی سروپ" کے نام سے موسوم ہے۔ سکھوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ گوردوارہ اس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں ماتا گوجری کے جسدِ خاکی کو سپردِ آتش کیا گیا تھا۔

ماتا گوجری کالج کے سامنے سرہند کا تاریخی قلعہ ہے۔ اب یہ قلعہ گوردوارے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اسے گوردوارہ فتح گڑھ صاحب کہتے ہیں۔ درگاہ شریف کے سجادہ نشین خلیفہ مقبول احمد کے مشورے پر تمام زائرین وفد کی صورت میں گوردوارے گئے۔ خلیفہ صاحب کا یہ کہنا تھا کہ زائرین کو خیر سگالی کے طور پر وہاں ضرور جانا چاہیے تاکہ سکھوں کے ساتھ ان کے تعلقات بہتر ہو جائیں اور وہ درگاہ شریف کو نقصان نہ پہنچائیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس وقت شبد کیرتن ہو رہا تھا۔ ہم نے کچھ دیر شبد کیرتن سنا اور امیر قافلہ نے چند روپے بطور نذرانہ پیش کیے۔ گوردوارے کے منتظمین نے ہمیں وہ جگہ دکھائی جہاں بقول ان کے فتح سنگھ اور زور آور سنگھ کو دیوار میں چنوایا گیا تھا۔ ایک تھڑے کے اوپر زربفت کی چادر ڈال کر اس کے اوپر دو تلواریں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ تھڑا ایک کمرے کے اندر تھا اور اس پر ایک چھت گیری معلق تھی۔ ایک دیوار پر ایک تصویر آویزاں تھی جس میں معماروں کو ان بچوں کو دیوار میں چنتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ سرہند کا گورنر ان کے پاس کھڑا تھا اور قاضی صاحب انہیں کلمہ پڑھنے کی تلقین کر رہے تھے۔ دیوار ان کی گردنوں تک اٹھائی جا چکی تھی اور ان کے چہرے پُرسکون تھے۔ ان کے قریب مالیر کوٹلہ کا سردار شیر علی خان گھوڑے پر سوار دکھایا گیا تھا۔ اس نے اس "ظلم" کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ سکھوں کا یہ کہنا ہے کہ جب اس سانحہ کی اطلاع گورو گوبند سنگھ کو دی گئی تو انہوں نے دریافت کیا کہ اتنا بڑا ظلم ہوا ہے کیا کسی شخص نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ مالیر کوٹلہ کے حاکم شیر علی خان نے "ہا" کا نعرہ بلند کیا تھا تو گورو جی نے دعائیہ انداز میں کہا "کوٹلے والیا! تیری سدا بادشاہی"۔ یہ اسی دعا کا اثر تھا کہ تقسیمِ ہند کے موقع پر پورے مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا انخلا ہوا لیکن مالیر کوٹلہ میں اب تک مسلمان موجود ہیں بلکہ اگر مسلمانوں کا کوئی قافلہ مالیر کوٹلہ کی حدود میں داخل ہو گیا تو سکھوں نے اس کا تعاقب ختم کر دیا۔

اب چند سال ہوئے سکھوں نے اس گوردوارے کا صدر دروازہ تعمیر کیا ہے اور اس کا نام "بندہ بہادر گیٹ" رکھا ہے۔ بندہ بیراگی نے اورنگ زیب کے جانشین شاہ عالم بہادر شاہ اول (م ۱۷۱۲ء) کے عہد میں ۱۷۱۰ء میں سرہند فتح کرکے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس نے ماتا گوجری، فتح سنگھ اور زور آور سنگھ کے قتل کا بدلہ سرہند کے بیگناہ مسلم شہریوں سے لیا اور سرہند کے گورنر وزیر خان کی لاش کے ٹکڑے کرکے سرہند کے دروازوں پر لٹکا دیئے۔ ان بچوں کے قاتل لشال بیگ اور ششال بیگ سامانہ میں رہتے تھے۔ بندہ بیراگی نے سامانہ کے دس ہزار مسلمان تہ تیغ کر ڈالے۔ سرہند کے کھیتوں میں اس زمانے کے کھنڈرات موجود ہیں اور کٹر قسم کے سکھ جب وہاں سے گزرتے ہیں تو ان کھنڈروں کی ایک اینٹ اکھاڑ کر "ثواب دارین" حاصل کرتے ہیں۔ وہ علی الصبح سرہند کا نام لینا معیوب سمجھتے ہیں اور اسے "گوراں ماری" کہتے ہیں۔

بندہ بیراگی کے حملے کے وقت حضرت مجددِ الف ثانیؒ کی اولاد سرہند کی سکونت ترک کرکے کابل، رام پور اور سندھ چلی گئی۔ کابل میں ملّا صاحب شور بازار فضل عمر، ان کے فرزندِ ارجمند حضرت فضل عثمان مجددی اور افغانستان کے سابق صدر صبغتہ اللہ مجددی انہی مہاجروں کی اولاد ہیں۔

سلطان بہلول لودھی (۱۴۵۱ء - ۱۴۸۸ء) دہلی کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے سرہند میں گورنر کے عہدے پر فائز تھا۔ اس زمانے میں اس کی ایک بیٹی فوت ہو گئی تھی۔ بہلول نے اپنی بیٹی کا مقبرہ تعمیر کروایا تھا جو تاحال خستہ حالت میں موجود ہے۔ اسی طرح وہاں دو مقبرے ہیں جو اُستاد اور شاگرد کے مقبروں کے نام سے موسوم ہیں۔ مقامی روایت کے مطابق ایک مقبرے کی عمارت اُستاد نے تعمیر کی تھی اور دوسرے کی شاگرد نے۔ یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ کس کا تعمیر کردہ مقبرہ زیادہ خوشنما ہے؟

درگاہِ عالیہ اور گوردوارہ جیوتی سروپ کے درمیان مغلیہ عہد کا ایک باغ تاحال موجود ہے جو "عام خاص کا باغ" کہلاتا ہے۔ مغلیہ عہد کے نظامِ آب پاشی میں دلچسپی رکھنے والوں کو اس باغ کا کنواں دیکھنا چاہیے۔ اس کنوئیں پر بیک وقت متعدد رہٹ چل سکتے تھے۔ مغل حکمران دہلی سے کابل، لاہور اور کشمیر جاتے وقت اسی باغ میں قیام کیا کرتے تھے۔

سرہند سے روپڑ جاتے ہوئے راستے میں ایک ریلوے اسٹیشن بانانوالہ آتا ہے۔ اس کے قریب ایک گاؤں ہے جسے "براس" کہتے ہیں۔ وہاں ایک قلعے کے آثار بھی موجود ہیں۔ اس قلعے سے باہر ایک چار دیواری موجود ہے لیکن اس کے اندر قبروں کے نشان موجود نہیں ہیں۔ حضرت مجددِ الف ثانیؒ نے اپنے کشف سے بتایا تھا کہ وہاں چند انبیاء کرام مدفون ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے یہ انبیاء ایک قریبی گاؤں سنگھول میں مبعوث ہوئے تھے۔ جب وہاں کے لوگوں نے انہیں تنگ کیا تو وہ ترک وطن کرکے براس آگئے اور ان کے سنگھول سے جانے کے فوراً بعد اس گاؤں پر عذابِ الٰہی نازل ہوا۔ میرے فاضل دوست مولانا نُور الحسن راشد کاندھلوی چند سال پہلے براس تشریف لے گئے تھے۔ انہوں نے اس چار دیواری کی زیارت کی تھی۔

برِعظیم پاک و ہند میں انبیاء کرام کی بعثت یقینی ہے۔ قرآن حکیمؔ میں ارشاد ہوا ہے: لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ ہر قوم کے لئے ہادی بھیجا گیا ہے۔ برِعظیم اتنا بڑا ملک تھا، اللہ تعالیٰ نے یقیناً یہاں کے باشندوں کو بے ہدایت نہیں چھوڑا ہو گا۔ مولانا مملوک العلیؒ کے فرزندِ ارجمند مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سے روایت ہے کہ انہیں کلیر شریف کی نہر کے پانی میں انوارِ نبوت نظر آئے تھے۔ انہوں نے یہ انوار دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ نہر کسی نبی کی قبر کے قریب سے گزر کر آتی ہے۔ اجودھیا میں حضرت شیث علیہ السلام کی قبر بتائی جاتی ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے تو اجودھیا کو جودی سے تعبیر کیا ہے جہاں حضرت نوح علیہ السلام کا سفینہ لنگر انداز ہوا تھا۔ موصوف ہندوؤں کے قانون دان مَنو کو "نوح" مانتے تھے اور مہاتما بُدھ کو قرآن میں مذکور ذوالکفل سمجھتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کا خیال تھا کہ کفل، کپل کی تعریب ہے اور مہاتما بدھ کپل وستو میں پیدا ہوئے تھے۔ ذوالکفل کے معنی ہیں کفل والا۔ اس لئے یہ لقب مہاتما بُدھ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح مولانا مرحوم "والتین" کا اطلاق بہار پر کرتے تھے جہاں بُدھ مت پروان چڑھا تھا۔

پہلے سفر میں زائرین سرہند میں چار روز قیام کے بعد پاکستان واپس چلے گئے۔ اس کے بعد متعدد بار وہاں حاضری کا موقع ملا اور ہر بار روح کو تر و تازگی ملی۔

پٹیالہ اور شملہ

بھارت کے اسفار میں مجھے دو بار پٹیالہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار میں بلا ارادہ وہاں پہنچ گیا۔ بلا ارادہ یوں کہ میں سرہند میں جی ٹی روڈ کے کنارے کھڑا چنڈی گڑھ جانے والی بس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں کھڑے چند مسافروں نے مجھے بتایا کہ رات ہو چکی ہے اس لئے اب چنڈی گڑھ جانے والی بس شاید ہی ملے۔ اتنے میں ایک بس وہاں آکر رکی اور کنڈکٹر نے پٹیالہ، پٹیالہ کی رٹ لگانی شروع کر دی۔ اس نے مجھے کہا کہ آپ بھی آجائیں۔ میں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ مجھے چنڈی گڑھ جانے والی بس کا انتظار ہے۔ اس نے کہا کہ چنڈی گڑھ جانے والی بس کا ٹائم گزر چکا ہے۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں، میں رات کو گیارہ بجے والی ٹرین سے چنڈی گڑھ چلا جاؤں گا۔ وہ بس وہاں بڑی دیر تک کھڑی رہی۔ نہ جانے میرے دل میں کیا خیال آیا کہ میں اس میں سوار ہو گیا۔

بس قریباً پون گھنٹے میں پٹیالہ پہنچ گئی۔ میں نے مسافروں سے کسی اچھے ہوٹل کا پتہ پوچھا تو انہوں نے کہا کہ موتی باغ کے سامنے ایک بڑا عمدہ ہوٹل ہے، اس میں ٹھہر جائیں۔ میں بس اسٹینڈ سے اس ہوٹل میں پہنچا اور اپنا سامان کمرے میں رکھ کر کھانے کے لئے لاؤنج میں آیا۔ وہاں ایک طرف بار کھلا ہوا تھا۔ سکھ شراب کے جام لنڈھا رہے تھے۔ میں نے ویجیٹیرین کھانا طلب کیا اور کھانا کھا کر بازاروں کی سیر کے لئے نکل گیا۔

آریا سماج بازار میں ایک بزرگ کا مزار نظر آیا۔ یہ مزار ایک کمرے کے اندر تھا جہاں چھت پر جھاڑ فانوس لگے ہوئے تھے۔ مزار پر ایک عمدہ قسم کی چادر ڈالی ہوئی تھی اور وہاں ٹیوب لائٹس جل رہی تھیں۔ سکھوں کے مرکز میں ایک بزرگ کے مزار کی یہ تعظیم دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ میں بازاروں میں گھوم پھر کر ہوٹل پہنچا اور اگلی صبح یونیورسٹی جانے کا پروگرام بنایا۔

میں نو بجے کے قریب یونیورسٹی روانہ ہوا۔ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ شہر سے چار پانچ میل ورے قلعہ بہادر گڑھ سے قریب راجپورہ جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ میں رکشا میں سوار ہو کر وہاں پہنچا اور سب سے پہلے شعبۂ تاریخ دیکھنے گیا۔ صدر شعبہ سردار فوجا سنگھ اپنے دفتر میں بیٹھے فائلیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کے چپڑاسی کو اپنا کارڈ دیا۔ وہ کارڈ لے کر اندر گیا اور اس کے پیچھے پیچھے میں بھی کمرے میں داخل ہوا۔ سردار فوجا سنگھ نے کارڈ دیکھا تو اس پر صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور لکھا ہوا تھا۔ دوسرے الفاظ میں میں ان کا COUNTERPART تھا۔ وہ کارڈ دیکھ کر فوراً اٹھے اور اتنے میں میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا اور میری آمد پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ انہوں نے اپنے تمام سٹاف کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور ان کے ساتھ میرا تعارف کرایا اس کے بعد کافی کا دور چلا۔

شعبۂ تاریخ میں میں نے کافی وقت گزارا۔ اس کے بعد سردار فوجا سنگھ مجھے فارسی کا شعبہ دکھانے لے گئے۔ مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ پنجابی یونیورسٹی میں فارسی کا شعبہ موجود ہے۔ صدر شعبہ پروفیسر گونت سنگھ ممتاز نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فارسی میں ایم اے کیا تھا۔ وہ فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے میری آمد پر فی البدیہہ چند فارسی اشعار کہے جن میں اپنی خوشی و مسرت کا اظہار کیا تھا۔

پروفیسر گونت سنگھ ممتاز نے مجھے بتایا کہ ان کے ہاں فارسی کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے دس گورو مغل حکمرانوں کے ہم عصر تھے اور سکھ مسلوں کے بارے میں بھی تمام تر معلومات فارسی کتب تواریخ میں ملتی ہیں۔ رنجیت سنگھ کا سرکاری روزنامچہ اور اس کی درباری تاریخ عمدۃ التواریخ مرتبہ سوہن لعل بھی فارسی میں ہے۔ اسی طرح اخبار سنگھاں اور احمد شاہ بٹالوی کی تاریخ ہندوستان، جس میں سکھوں کے مذہب کی بنیاد اور اس کے ارتقاء کا ذکر ہوا ہے، فارسی زبان میں ہیں۔ اس لئے اگر سکھوں نے فارسی میں سدھ بدھ پیدا نہ کی تو وہ اپنی تاریخ سے بیگانے ہو جائیں گے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ سکھوں میں بھی اتنا شعور پیدا ہو گیا ہے کہ فارسی جانے بغیر وہ اپنی تاریخ کا مطالعہ نہیں کر سکتے کاش اتنا شعور ہمارے ہاں مسلمانوں میں بھی پیدا ہو جائے۔

پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں بابا فرید کے نام پر ایک "چیئر" قائم کی گئی ہے۔

پروفیسر گورنت سنگھ ممتاز "بابا فرید پروفیسر آف جسٹس ازم" کہلاتے تھے۔ سکھوں نے بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کو اپنا لیا ہے۔ اسی طرح گورو نانک دیو یونیورسٹی امرتسر میں "میاںمیر چیئر" قائم کی گئی ہے۔ سکھ حضرت میاں میر لاہوری کا اس لئے بڑا احترام کرتے ہیں کہ انہوں نے گورو رام داس کی استدعا پر ہر مندر امرتسر کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔ ہمارے ہاں اپنے بزرگوں کے نام پر چیئرز قائم کرنے کا کسی نے سوچا تک نہیں۔

اسی یونیورسٹی میں بابا فرید میموریل سوسائٹی بھی ہے۔ اس سوسائٹی نے "بابا شیخ فرید الدین گنج شکر، حالاتِ زندگی اور تعلیمات" کے عنوان سے گوربچن سنگھ طالب کی ایک کتاب شائع کی ہے جس کی قیمت صرف دو روپے رکھی ہے۔ اس کی جلد پر کم از کم دس روپے لاگت ضرور آئی ہو گی۔ جب میں وائس چانسلر سے ملنے گیا تو انہوں نے یہ کتاب مجھے بطورِ تحفہ عطا کی۔

ان دنوں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے وائس چانسلر سردار کرپال سنگھ نارنگ تھے۔ راقم الحروف سردار فوجا سنگھ اور گورنت سنگھ ممتاز کی معیت میں ان سے ملنے گیا۔ یہ ملاقات ان دونوں حضرات نے ہی کروائی تھی۔ نارنگ صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ وہ آزادی سے قبل خالصہ کالج گوجرانوالہ کے پرنسپل تھے۔ اب یہ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ کہلاتا ہے۔ کالج کے پرنسپل کے دفتر میں جس بورڈ پر پرنسپلوں کے نام اور ان کے عہدے کی مدت درج ہے، اس پر نارنگ صاحب کا نام بھی درج ہے۔

وائس چانسلر سے مل کر ہم انسائیکلو پیڈیا آف سکھ ازم کے دفتر میں اس ادارے کے ڈائریکٹر پروفیسر ہربنس سنگھ سے ملنے گئے۔ انہوں نے مجھ سے زمزمہ توپ اور اخبار سنگھاں پر مقالے لکھنے کی فرمائش کی، جو میں نے پوری کر دی۔

پنجابی یونیورسٹی میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے شعبے کی عمارت قابلِ دید ہے۔ ایک تالاب میں پانچ کونوں والی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ ہر کونہ ایک جہاز سے مشابہ ہے اور ان کے بادبان اوپر جا کر مل جاتے ہیں۔ یہ عمارت دراصل سکھ مت کی بنیادی تعلیم کی غمازی کر رہی ہے۔ اس پنج کونی عمارت میں، سکھ مت، ہندومت، اسلام، عیسائیت اور بدھ مت کے شعبے قائم ہیں۔ ایک مسلمان شعبۂ اسلامیات کے سربراہ ہیں اور ایک پادری شعبۂ عیسائیت کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔

سردار فوجا سنگھ اور گورنت سنگھ ممتاز نے کہا کہ میں دوپہر کا کھانا کھائے بغیر وہاں سے نہیں جا سکتا۔ انہوں نے یونیورسٹی کی کینٹین میں ویجیٹیرین کھانا تیار کروایا اور کئی اساتذہ کو کھانے کی دعوت دی۔ کھانا بہت اچھا تھا۔ بیٹھنے کی جگہ تازہ برفی پیش کی گئی اور جب کھانا ختم ہو گیا تو ایک بوڑھا سکھ بڑا کاغذ کے رومال لے کر آیا۔ سردار فوجا سنگھ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یہ پہلے لانے چاہیں تھے۔ میں اس بات سے بعد محظوظ ہوا اور میں نے کہا کہ سنا ہوا تھا، آج دیکھ بھی لیا ہے۔ اس پر تمام حضرات بے ساختہ ہنس دیئے۔

سردار فوجا سنگھ اور گورنت سنگھ ممتاز نے کہا کہ آئندہ میں جب بھی پٹیالہ آؤں تو ہوٹل میں قیام کرنے کی بجائے یونیورسٹی گیسٹ میں ٹھہرا کروں۔ میں نے ریکارڈ آفس میں پروفیسر بخشیش سنگھ نجر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے ایک اُستاد کو میرے ساتھ کر دیا۔ ریکارڈ آفس شہر میں تھا اس لئے میں یونیورسٹی کے اساتذہ سے الوداعی ملاقات کر کے شہر روانہ ہوا۔

بخشیش سنگھ نجر نے پنجاب سلاطین کے عہد میں، پنجاب مغلوں کے عہد میں اور پنجاب انگریزوں کے عہد میں، کے عنوانات سے انگریزی زبان میں تین کتابیں لکھی ہیں، یونیورسٹی کے اساتذہ ان سے خوش نہیں ہیں۔ نجر صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ انہوں نے مجھے چائے پلائی اور ریکارڈ آفس میں موجود فارسی مخطوطات کی فہرست عطا کی۔ میں نے لاہور آکر اس فہرست کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس بڑے نادر مخطوطات موجود ہیں۔ نجر صاحب نے بتایا کہ ان کے دفتر میں بے شمار مخطوطات بوریوں میں بند پڑے ہیں جن کی ابھی تک فہرست تیار نہیں ہوئی۔ تقسیم ہند کے وقت اس علاقے میں مسلمانوں کی قدیم بستیاں موجود تھیں۔ کہرام، سامانہ، ہنوڑ، سرہند، بسی، ڈیرہ میر میراں، سنام، منصور پور اور چائل سے سیکڑوں کی تعداد میں مخطوطات دستیاب ہوئے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سکھوں نے برچھا گردی کے اس دور میں مخطوطات کو ضائع نہیں ہونے دیا۔

نجر صاحب نے کہا کہ ان کے دل میں پاکستان جانے اور لاہور دیکھنے کی بڑی آرزو ہے۔ میں نے کہا کہ سال میں سکھوں کے چار جتھے لاہور جاتے ہیں اور ہر جتھے میں تین

سے چار ہزار تک افراد شامل ہوتے ہیں ۔ وہ کسی جتھے میں شامل ہو کر لاہور آجائیں ۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ "سکھ" نہیں ہیں ۔ اس لئے وہ سکھوں کے جتھے میں شامل ہو کر لاہور جانے سے معذور ہیں" ۔ میں ان کی یہ بات سن کر بڑا حیران ہوا ۔ مجھے حیران دیکھ کر انہوں نے کہا کہ وہ صرف بابا نانک کو گورو مانتے ہیں اور ان کے بعد نو گوروؤں کو گورو تسلیم نہیں کرتے ، وہ تو سیاستدان تھے ۔

اس وقت نجز صاحب کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی ۔ جب میں نے احمد شاہ بٹالوی کی تاریخِ ہندوستان کا مطالعہ کیا تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ جن ہندو کھتریوں نے سکھ مت قبول کیا ہے وہ بابا نانک کا زیادہ احترام کرتے ہیں اور اپنے گھروں اور بسوں میں بابا نانک کی تصویریں آویزاں کرتے ہیں ۔ جن جاٹوں نے سکھ مت قبول کیا ہے ، وہ دسویں گورو گوبند سنگھ کے شیدائی ہیں اور ان کی تصویریں اپنے گھروں ، بسوں اور ٹرکوں کے آگے آویزاں کرتے ہیں ۔ نجز ، کھتریوں کی ایک گوت ہے اور بخشیش سنگھ کا تعلق اسی گوت سے ہے ۔ ان کی باتیں سن کر مجھے معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے جاٹ اساتذہ اسی وجہ سے ان کا نام سن کر ناک بھوں چڑھاتے تھے ۔

بخشیش سنگھ نجز سے مل کر میں ہوٹل گیا اور اپنا سامان اٹھا کر بس اسٹینڈ پہنچا ۔ میں نے چنڈی گڑھ جانے والی بس کا ٹکٹ خریدا اور چنڈی گڑھ روانہ ہوا ۔ یہ بس قلعہ بہادر گڑھ اور پنجابی یونیورسٹی کے سامنے سے گزرتی ہوئی راجپورہ پہنچی ۔ راجپورہ سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ایک تاریخی قصبے بنوڑ سے میرا گزر ہوا ۔ حضرت مجدد الفِ ثانی کے خلیفۂ اعظم حضرت سید آدم بنوڑی کا تعلق اسی قصبے سے تھا ۔ ان کی مقبولیت دیکھ کر شاہجہان نے انہیں حج کے بہانے جلا وطن کر دیا تھا ۔ ان کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا اور جنت البقیع میں حضرت عثمان غنیؓ کے مزار مبارک سے اتنا قریب دفن ہوئے کہ ان کے گنبد کا سایہ ان کی قبر پر پڑتا تھا ۔

برِ عظیم پاک و ہند پر خاندان سادات نے ۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۱ء تک حکومت کی ہے ۔ اس خاندان کے بانی سید خضر خان (م ۱۴۲۱ء) کا تعلق بھی بنوڑ سے تھا ۔ اس کے والد سلیمان کا مزار بنوڑ میں ہے ۔ وہاں مجھے ایک گنبد بھی دکھائی دیا شاید یہ اس کا مقبرہ ہو

ہمارے زمانے کے محدثِ کبیر اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذِ رشید مولانا محمد یوسف بنوری کا تعلق بھی سید آدم بنوڑی اور قصبہ بنوڑ سے ہے ۔ انہوں نے اپنی نسبت بنوڑی کو عربی لباس پہنا کر بنوری بنا دیا ہے ۔ کراچی میں بنوری ٹاؤن انہی کی یاد گار ہے ۔ اب بنوڑ کے غیر مسلم باشندوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہو گا کہ ان کے قصبے کی خاکِ پاک سے کتنے بڑے لوگ پیدا ہوئے ہیں ۔

چنڈی گڑھ پہنچ کر میں نے ایک Paying Guest House میں قیام کیا ۔ شام کو اپنے والدِ مرحوم کے ایک ہندو دوست شری روشن لال کپور کو ملنے گیا ۔ ان کے گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ موصوف فرید آباد (دہلی) میں KELVINATOR کی فیکٹری میں چیف سیکورٹی آفیسر کے فرائض انجام دے رہے ہیں ۔ ان کے اہلِ خانہ بڑے تپاک سے پیش آئے ۔ (میں فرید آباد جا کر ان سے ملا اور ان سے پوچھا کہ وہ مجھے پہچان لیں گے ؟ انہوں نے کہا کہ اگر تم طفیل محمد کے بیٹے ہو تو میں تمہیں پہچانتا ہوں ۔ اس کے بعد انہوں نے چائے سے تواضع کی اور میرے والدِ مرحوم اور دادا جان مرحوم کی تصویریں لے کر رکھ لیں) ۔

اگلے روز صبح میں یونیورسٹی گیا ۔ پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کا یہ میرا پہلا دورہ تھا ۔ جب میں کیمپس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی چست پاجامہ پہنے اور کتابیں اٹھائے جا رہی ہے ۔ اس کے لباس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ پنجاب کی رہنے والی نہیں ہے ۔ میں نے اس سے شعبۂ تاریخ کا پتہ پوچھا اور یہ بھی دریافت کیا کہ وہ کونسے شعبے میں پڑھتی ہے ؟ اس نے کہا کہ وہ فلسفہ کے مضمون میں پی ایچ ڈی کر رہی ہے ۔ میں نے اس کے مقالے کا عنوان پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ "فلسفۂ انقلاب" پر تحقیق کر رہی ہے ۔ میں نے کہا کہ ہمارے ہاں مولانا عبید اللہ سندھیؒ (م ۱۹۴۴ء) ایک بہت بڑے انقلابی ہو گزرے ہیں ۔ ہم انہیں "امام انقلاب" کہتے ہیں ۔ انہوں نے اُردو زبان میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں ۔ اس نے کہا کہ وہ اُردو نہیں جانتی لیکن اس کے والد اُردو جانتے ہیں ۔ میں نے پوچھا کہ وہ کہاں رہتے ہیں ۔ تو اس نے بتایا کہ وہ فیض آباد میں سکونت پذیر ہیں ۔ اس بچی نے کہا کہ میں ان کے شعبے میں بھی آؤں اور صدر شعبہ سے ضرور ملوں ۔

میں اس بچی سے اجازت لے کر شعبۂ تاریخ پہنچا لیکن ابھی تک وہاں کوئی استاد نہیں آیا تھا۔ اس لئے میں قریب ہی یونیورسٹی کنٹین میں چائے پینے چلا گیا۔ کنٹین سے نکل کر میں شعبۂ فلسفہ گیا۔ وہ بچی اپنے کمرے کی صفائی کروا رہی تھی۔ اس نے کہا کہ آیئے صدرِ شعبہ سے ملتے ہیں۔ وہ مجھے لے کر صدرِ شعبہ کے دفتر میں گئی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ لاہور کے رہنے والے ہیں اور گورنمنٹ کالج میں قاضی محمد اسلم سے فلسفہ پڑھتے رہے ہیں۔ انہوں نے کافی کے ساتھ میری تواضع کی اور اپنے گھر فون کیا کہ دوپہر کے کھانے پر ایک مہمان بھی ہوگا۔

میں شعبۂ تاریخ جانا چاہتا تھا۔ صدرِ شعبۂ فلسفہ نے صدرِ شعبۂ تاریخ کو فون کیا کہ وہ چند منٹ میں ایک V.I.P. مہمان کو لے کر آرہے ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنی کار میں بٹھایا اور شعبۂ تاریخ پہنچا کر شعبہ کے صدر سے تعارف کروایا۔ ان کے اصرار کے باوجود صدرِ شعبۂ فلسفہ وہاں نہ رُکے اور جاتے جاتے مجھے کہہ گئے کہ میں جہاں بھی ہوں کھانے کے وقت تک ان کے پاس پہنچ جاؤں۔

صدرِ شعبۂ تاریخ نے تمام اساتذہ کو اپنے دفتر میں بلا لیا اور چائے کا آرڈر دیا۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ان کے ہاں قدیم ہندوستان کی تاریخ، تہذیب و تمدن پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یورپ کی تاریخ بھی ان کے ہاں پڑھائی جاتی ہے لیکن ہندو اور سکھ طلبہ مُسلم دور کی تاریخ پڑھنا پسند نہیں کرتے۔

اسی شعبے کے اُستاد ست پرکاش سنگر میرے آبائی وطن پھلور کے نواحی قصبے اَپرہ کے رہنے والے تھے۔ ابنِ انشاء (م ۱۹۷۸ء) کا آبائی گاؤں تھلہ، اَپرہ سے بہت قریب ہے۔ ست پرکاش سنگر پھلور کے بہت سے مسلمانوں سے واقف تھے۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور اپنے اہلِ خانہ سے میرا تعارف کرایا۔ انہوں نے مغلیہ دور میں ٹیکسٹائل انڈسٹری پر بڑی تحقیق کی تھی۔ انہوں نے اپنے مضامین کے آوف پرنٹس مجھے دیئے۔ وہ بڑے معروف ناول نگار ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں کا ایک سیٹ مجھے دیا اور ایک سیٹ ملک معراج خالد صاحب کے لئے دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اور ملک صاحب ایک زمانے میں دیہات سدھار کے پروگرام میں اکٹھے کام کیا کرتے تھے۔ میں نے پاکستان آکر وہ سیٹ ملک صاحب کی خدمت میں پہنچا دیا۔

ست پرکاش سنگر مجھے شعبۂ فلسفہ میں پہنچا گئے اور صدرِ شعبہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ تناول کیا۔ ان کے اہلِ خانہ سے بھی گفتگو رہی۔ افسوس کہ اگلے سال پروفیسر صاحب کا انتقال ہو گیا۔

چنڈی گڑھ سے میں نمازِ عصر کے قریب کالکا روانہ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد کنڈکٹر نے "منی ماجرا" کی آواز لگائی جسے سُن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ ہمارے ہاں منی ماجرا کے "جگّر" (بے وقوف) بہت مشہور تھے اور لوگ ان کی حماقت کے لطیفے سنایا کرتے تھے۔ اس کے بعد ہماری بس پنجور جا کر رُکی۔ وہاں مغلوں کے زمانے کا ایک باغ ہے جہاں مغل حکمران لاہور یا کابل جاتے ہوئے رُکا کرتے تھے۔

نمازِ مغرب کے وقت میں کالکا پہنچا۔ جونہی بس رُکی بڑی تیز بارش شروع ہو گئی۔ مسافروں نے بھاگ کر ایک ہوٹل کے برآمدے میں پناہ لی۔ میرا سوٹ کیس بس کی چھت پر پڑا تھا۔ کنڈکٹر بھی کہیں پناہ لے چکا تھا۔ میں تیز بارش کے باوجود بس کی چھت پر چڑھا اور سوٹ کیس نیچے لاتے لاتے بُری طرح بھیگ گیا۔ میں نے اسی ہوٹل میں قیام کیا۔ کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کئے اور نمازِ مغرب قدرے تاخیر سے ادا کی۔ جب بارش رُکی تو میں نے ہوٹل کے ریسٹوران میں چائے نوش کی اور بازاروں کی سیر کرنے نکل گیا۔

کالکا پہاڑی شہر ہے۔ یہ کوہ شوالک کے دامن میں واقع ہے۔ بازار اُونچے نیچے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن کے پاس زمین ہموار ہے۔ میں نے واپس آکر کھانا کھایا اور عشاء کی نماز ادا کر کے سو گیا۔

اگلی صبح میں سات بجے کے لگ بھگ کالکا سے شملہ جانے والی ٹرین میں سوار ہوا۔ یہ ٹرین "شملہ کوئین" کے نام سے مشہور ہے۔ کسی زمانے میں تین انجن ایک ٹرین کو کھینچ کر شملہ لے جاتے تھے۔ اب ایک ہی ڈیزل انجن ٹرین کے آگے لگایا جاتا ہے۔ چھوٹی لائن کے ریل کے ڈبے بھی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ میں نے پہلی بار چھوٹی لائن پر سفر کیا تھا۔ راستے میں ۴۳ سرنگیں آتی ہیں۔ ایک طویل سرنگ سے نکلے تو بڑوگ آگیا۔ یہاں کا ماحول کالکا کے ماحول سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ٹرینوں کا کراس تھا اس لئے مسافر ناشتہ کرنے چلے گئے۔

بارہ بجے کے قریب ٹرین سرہل پہنچی ۔ اس سے اگلا اسٹیشن شملہ ہے ۔ مجھے یہیں اترنا تھا ۔ اسٹیشن پر صرف دو قلی نظر آئے ۔ میں نے ایک قلی کو بلایا تو اس نے پوچھا کہ کہاں جانا ہے ؟ میں نے کہا یونیورسٹی کے لیکچرز کے فلیٹس میں ۔ قلی نے پوچھا کہ کتنے نمبر فلیٹ میں ۔ میں نے کہا کہ ۳۵ نمبر میں ۔ اس نے فوراً کہا کہ آپ خان صاحب کے گھر جائیں گے ؟ میں نے اثبات میں جواب دیا اور دل ہی دل میں خوش ہوا کہ میں پریشانی سے بچ گیا ہوں ۔ جب ہم خان صاحب کے گھر پہنچے تو اس وقت وہ باورچی خانے میں انڈوں کا آملیٹ بنا رہے تھے ۔ ان کی اہلیہ شملہ گئی ہوئی تھیں ۔ اس لئے خان صاحب دوپہر کے کھانے کی تیاری میں معروف تھے ۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں آملیٹ کھا لوں گا ؟ میں نے اثبات میں جواب دیا اور خان صاحب میرے لئے بھی آملیٹ بنانے لگے ۔

اسی وقت مجھے ایک قریبی فلیٹ سے ڈاکٹر من جیت سنگھ آہلو والیہ نے دیکھ لیا ۔ وہ اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر فوراً وہاں پہنچ گئے ۔ انہوں نے خان صاحب سے کہا کہ ان کی سرہل میں موجودگی میں میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا ۔ میرا قیام ان کے ہاں ہو گا ۔ خان صاحب نے کہا کہ انہیں کھانا تو کھا لینے دیں ۔ آہلو والیہ نے کہا کہ یہ کھانا بھی ہمارے ہاں کھائیں گے اور اگر وہ چاہیں تو وہ بھی ان کے ہاں کھانا کھا لیں ۔ آہلو والیہ زبردستی میرا سامان اٹھا کر اپنے گھر لے گئے ۔

آہلو والیہ ایک زمانے میں شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں " سلاطین دہلی کی راجپوت پالیسی " پر پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہے تھے ۔ میرا علی گڑھ آنا جانا رہتا تھا ۔ شعبۂ تاریخ اور لائبریری میں ان سے ملاقات رہتی تھی ۔ ایک بار انہوں نے مجھے شملہ آنے کی دعوت دی ۔ جب میں نے شملہ جانے کا پروگرام بنایا تو انہی ایام میں اے ، آر ، خان علی گڑھ آ گئے ۔ موصوف کا وطن تو رام پور ہے لیکن انہوں نے F.C.COLLEGE لاہور میں تعلیم پائی تھی ۔ میں نے خان صاحب سے شملہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور یہ بھی کہا کہ میں اسی ہفتے وہاں آ رہا ہوں ۔ انہوں نے کہا کہ ان دنوں آہلو والیہ وہاں نہیں ہوں گے ۔ انہوں نے مدراس یونیورسٹی میں VIVA - VOCE کرنے جانا ہے اس لئے میں بخوشی ان کے ہاں قیام کر سکتا ہوں ۔ میں نے ان کی دعوت قبول کر لی ۔ اتفاق دیکھئے کہ جس ٹرین سے میں سرہل پہنچا اس سے پہلی ٹرین میں

آہلو والیہ وہاں پہنچ گئے ۔ انہوں نے جب مجھے خان صاحب کے فلیٹ کی بالکنی میں دیکھا تو اپنی اہلیہ کے ساتھ مجھے لینے پہنچ گئے ۔ میں نے چار روز ان کے ہاں قیام کیا ۔ انہوں نے میری بڑی خاطر مدارات کی ۔

ان کے فلیٹ سے قریب ہی ہماچل پردیش یونیورسٹی تھی ۔ آہلو والیہ اور خان صاحب شعبۂ تاریخ سے منسلک تھے ۔ ان کے صدرِ شعبہ A.B. PANDEY ان دنوں دکن گئے ہوئے تھے اس لئے ان کے ساتھ ملاقات نہ ہو سکی ۔ ان کی تصانیف مجھے ایک دکان سے مل گئیں جو میں نے خرید لیں ۔

بھارتی حکومت نے شملہ میں وائسریگل لاج کو ایک علمی اور تحقیقی ادارے میں تبدیل کر دیا ہے ۔ بھارت کے نامور اسکالر اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد تین سال کے لئے وہاں چلے جاتے ہیں ۔ دورانِ ملازمت اگر وہ کوئی کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن مصروفیت کی بنا پر نہیں لکھ سکے تو ریٹائرمنٹ کے بعد حکومت انہیں موقع مہیا کرتی ہے ۔ اس ادارے میں میری ملاقات پروفیسر شمعون لوکھنڈ والا سے ہوئی ۔ موصوف گجرات کے باشندے ہیں اور انہوں نے گجراتی مسلمانوں کی تاریخ ، تہذیب اور ثقافت پر بڑا کام کیا ہے ۔ ان دنوں بھی وہ کسی پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے ۔ ان کی مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے ساتھ یاد اللہ تھی اس لئے وہ اس عاجز کے ساتھ بڑے تپاک سے ملے اور دیر تک ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی ۔ اگلے روز ان کے ادارے میں ایک مہمان اسکالر نے گاندھی جی کے فلسفے پر لیکچر دینا تھا ، لوکھنڈ والا نے مجھے بھی لیکچر سننے کے لئے مدعو کیا ۔ اس ادارے کی لائبریری کا انچارج ایک مسلمان تھا اور وہ یہاں آنے سے قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں کام کر چکا تھا ۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور لائبریری کے مختلف حصے دکھائے ۔

اگلے روز میں مقررہ وقت پر گاندھی جی کے فلسفہ پر لیکچر سننے گیا ۔ ایک بہت بڑے گول میز کے گرد لوگ بیٹھے تھے ۔ مہمان مقرر نے اپنا مقالہ پیش کیا ۔ اس کے بعد چائے کا دور شروع ہوا اور ساتھ ساتھ سوال و جواب کا سلسلہ بھی جاری رہا ۔

وائسریگل لاج کا کچھ حصہ بجنسہٖ محفوظ رکھا گیا ہے ۔ اس میں وائسرائے کا سونے کا کمرہ بھی ہے اور ایک بال روم بھی ۔ بال روم میں لارڈ کلائیو سے لے کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن

تک تمام گورنرز جنرل کے فوٹو آویزاں تھے ۔ وائسریگل لاج کا یہ حصہ قابلِ دید ہے ۔

سمرہل سے شملہ کے تجارتی مرکز کا فاصلہ ساڑھے تین میل ہے ۔ شملہ میں کسی بھی قسم کی سواری نہیں ملتی ۔ اس لئے اگر ٹرین کا وقت ہو تو لوگ سمرہل سے بذریعہ ٹرین شملہ چلے جاتے ہیں ورنہ یہ راستہ پیدل طے کرنا ہوتا ہے ۔ میں صبح اپنی قیام گاہ سے نکلتا اور دوپہر کو کھانے کے وقت واپس آتا ۔ سہ پہر کو پھر شملہ جاتا اور عشاء کے لگ بھگ واپس آتا ۔ اس طرح روزانہ چودہ میل مسافت طے کرنا پڑتی ۔

سمرہل سے قریب ہی گورنر ہاؤس تھا ۔ جسے راج بھون کہتے ہیں ۔ ان دنوں نواب مالیر کوٹلہ گورنر تھے جو راج بھون میں قیام پذیر تھے ۔ راج بھون اور ہماچل پردیش یونیورسٹی میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے ۔ شملہ کی مال روڈ پر شام کے وقت بڑی چہل پہل ہوتی ہے ۔ ایک مقام سکینڈل پوائنٹ کہلاتا ہے ۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے مہاراجہ پٹیالہ وائسرائے کی بیٹی کو اٹھا کر لے گیا تھا ۔ بیٹی تو حکومت نے برآمد کرلی لیکن مہاراجہ پٹیالہ کا شملے میں داخلہ بند کر دیا ۔ اس نے شملہ سے قریب اپنی ریاست کی حدود میں چائل آباد کر لیا ۔ اس نے وہاں کرکٹ کی پچ بنوائی جو دنیا میں کرکٹ کی سب سے اونچی پچ مانی جاتی تھی ۔

سکینڈل پوائنٹ پر مشہور آریہ سماجی رہنما لالہ لاجپت رائے کا بُت نصب کیا گیا ہے ۔ جس چبوترے پر یہ بُت نصب ہے اس پر یہ مرقوم ہے کہ یہ بُت لاہور میونسپلٹی کے لان میں نصب تھا اور آزادی کے بعد مشرقی پنجاب کی حکومت نے حکومتِ پاکستان کی وساطت سے یہ بُت لاہور سے منگوا کر شملہ کی اہم شاہراہ پر نصب کر دیا ہے ۔

مال روڈ کے متوازی ، قدرے نشیب میں لوئر بازار ہے جہاں جنرل سٹورز اور کھانے پینے کے سامان کی دکانیں ہیں ۔ اسی بازار میں ایک مسجد ہے جہاں کشمیری رہتے ہیں ۔ وہاں نماز اور جمعہ ہوتے ہیں ۔ ایک اور مسجد بھی اسی نواح میں ہے لیکن وہاں نماز نہیں ہوتی ۔

شملہ میں ایک جگہ "جاکھو" کے نام سے موسوم ہے ۔ وہاں ہندوؤں کا ایک مندر ہے جہاں ہزاروں کی تعداد میں بندر رہتے ہیں ۔ وہ اتنے دیدہ دلیر ہیں کہ زائرین کے ہاتھوں سے کھانے پینے کی اشیاء چھین کر لے جاتے ہیں ۔ اس لئے وہاں بہت محتاط ہو کر

رہنا پڑتا ہے ۔

شملہ کے قبرستان میں سر شفاعت احمد کی قبر تھی جس کا اب نشان باقی نہیں رہا ۔ حال ہی میں ایک تقریب میں پنجاب کے سابق گورنر (لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ) عتیق الرحمن اور ان کی اہلیہ محترمہ سے ملاقات ہوئی ۔ موصوفہ سر شفاعت احمد کی بیٹی ہیں ۔ انہوں نے بھی راقم کو بتایا کہ وہ شملہ گئی تھیں ۔ وہاں انہوں نے اپنے والد کی قبر تلاش کی لیکن اس کا نشان مٹ چکا ہے ۔ لہٰذا وہ دعائے مغفرت کرکے واپس چلی آئیں ۔ سر شفاعت احمد نے وائسرائے کی کونسل میں ممبر شپ قبول کرلی تھی جو اس وقت کے عوام کی اُمنگوں کے خلاف تھی ۔ اس لئے کسی حریت پسند نے انہیں گولی مار دی ۔ موصوف کی جان تو بچ گئی لیکن وہ اس قدر کمزور ہو گئے کہ جلد بعد ان کا انتقال ہو گیا ۔ سر شفاعت احمد الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے سربراہ رہ چکے ہیں ۔ ان کے زمانے میں اس یونیورسٹی کا شعبۂ تاریخ پورے ملک میں مشہور تھا ۔ وہاں ان کے علاوہ پروفیسر رَشبروک ولیمز ، ڈاکٹر بینی پرشاد ، ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد جیسے نامور مؤرخین موجود تھے ۔

شملہ میں چار دن قیام کے بعد راقم الحروف بذریعہ بس کالکا روانہ ہوا ۔ شملہ جاتے وقت میں نے یہ سفر ریل کے ذریعے کیا تھا اس لئے واپسی پر میں نے سڑک کے راستے سفر کرنے کو ترجیح دی ۔ بس کچھ دیر کے لئے سولن میں رُکی ۔ مسافر چائے پینے چلے گئے ۔ فضاء میں سولن بروری میں تیار ہونے والی شراب کی بُو پھیلی ہوئی تھی ۔ چار ساڑھے چار گھنٹے میں بس چنڈی گڑھ پہنچ گئی ۔ وہاں سے مجھے انبالہ جانے والی بس مل گئی ۔ انبالہ میں راقم الحروف حضرت سائیں توکل شاہ صاحبؒ کا مزار دیکھنا چاہتا تھا لیکن رکشا ڈرائیور کی حماقت کی وجہ سے وہاں حاضر نہ ہو سکا ۔ میں انبالے سے بس میں سوار ہو کر سہارنپور پہنچا اور وہاں سے بس تبدیل کرکے نماز مغرب سے چند منٹ پہلے دیو بند پہنچ گیا ۔

کلکتہ، گیا، سہسرام

۱۹۵۵ء میں مجھے پہلی بار سعید الدین احمد ڈار کے ہمراہ کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم دونوں مشرقی پاکستان میں کومیلا سے قریب مینامتی کے مقام پر محکمۂ آثارِ قدیمہ کی نگرانی میں ہونے والی کھدائی میں حصہ لینے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر ہم نے بھارت کا TRANSIT-VISA حاصل کیا۔ ہمیں تیرہ جگہ رُکنے کی اجازت تھی اور ہم نے پندرہ روز میں پاک بھارت سرحد عبور کرنا تھی۔

ہوڑہ میں ہمارے ہم وطن ہندو سیٹھوں کی رہائش تھی۔ ان کا ہوڑہ میں لوہے کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ سالکیہ میں بنارس روڈ پر ان کی رہائش تھی۔ وہ اس علاقے میں "پنجابی بابو" کے نام سے معروف تھے۔ ان کے ہاں اس زمانے میں چھ کاریں تھیں۔ انہوں نے ڈرائیوروں سے کہا کہ یہ جہاں بھی جانا چاہیں انہیں فوراً لے جائیں۔ البتہ شام کو وہ ہمیں کلکتے کی سیر کرانے لے جایا کریں گے۔ ہم دن بھر کلکتہ شہر میں گھومتے پھرتے اور شام کو اپنے میزبانوں کے ساتھ مختلف مقامات دیکھنے جاتے۔

اپنی اوّلین فرصت میں ہم ولزلی اسکوائر میں مدرسۂ عالیہ دیکھنے گئے۔ ان دنوں مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ اس ادارے کے پرنسپل تھے۔ تقسیمِ بنگال کے موقعہ پر مدرسے کا مُسلم سٹاف اور طلبہ ڈھاکہ چلے گئے اور جاتے وقت مدرسے کی لائبریری بھی خالی کر گئے۔ مولانا ابُوالکلام آزاد نے ۱۹۴۸ء میں از سرِ نو اس مدرسے کا اجراء کیا اور مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کو پرنسپل مقرر کیا۔ انہوں نے دس سال اس منصب پر کام کیا اور مدرسے کو اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔

مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی بُنیاد گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۲ء تا ۱۷۸۵ء) نے رکھی تھی۔ یہ مدرسہ صرف اور صرف مُسلم طلبہ کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اب بھی "سیکولر" بھارت میں کوئی غیر مُسلم یہاں داخل نہیں ہو سکتا۔ متحدہ بنگال اور مشرقی پاکستان کے بہت سے سیاستدانوں نے اسی تاریخی ادارے میں تعلیم پائی تھی۔ پرنسپل کا شاندار بنگلہ

بھی مدرسے کے ساتھ ہی موجود ہے۔ پرنسپل حکومت مغربی بنگال کا کلاس وَن افسر سمجھا جاتا ہے۔

مولانا اکبر آبادی نے ایک بار راقم کو بتایا کہ مدرسے کے لئے ایک شیخ الحدیث کی ضرورت تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد وفاقی حکومت میں وزیرِ تعلیم تھے۔ انہوں نے ایک عالمِ دین کو شیخ الحدیث مقرر کرنے کی سفارش کی۔ مولانا اکبر آبادی اس عالم کے کام اور علمیت سے مطمئن نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کے تقرر میں پس و پیش کیا تو مولانا آزاد نے فرمایا "میرے بھائی! اب اسی طرح کے شیخ الحدیث ملا کریں گے۔"

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ہمیں مدرسہ دکھایا اور اپنے دفتر میں بٹھا کر چائے پلائی۔ انہوں نے اگلے روز ہمیں ڈنر پر بلایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر ہمارے میزبانوں میں سے کوئی صاحب ڈنر پر آنا چاہیں تو انہیں خوشی ہو گی۔

ولزلی اسکوائر اور اس سے ملحقہ علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ولزلی اسکوائر میں مسلم کتب فروش بھی تھے، جن کے ہاں اسلامی اور تاریخی کتابیں دستیاب تھیں۔ کلکتے کے مسلمان اُردو میں بات چیت کرتے تھے جبکہ ہندو بنگالی زبان استعمال کرتے تھے۔ جو مسلمان بنگالی زبان بولتے تھے ان کی بنگالی اور ہندوؤں کی بنگالی میں نمایاں فرق تھا۔

چاندنی چوک کلکتے کا ایک بارونق علاقہ ہے۔ یہاں برابرن کورٹ آفس کے نام سے ایک عظیم الشان بلڈنگ ہے۔ اس بلڈنگ کے مالک فرید صاحب کو ہندوستان کے قدیم سکّے جمع کرنے کا شوق ہے۔ اس موضوع پر ان کے مضامین بھی چھپتے رہتے ہیں۔ راقم کے ساتھ ان کی خط و کتابت بھی رہتی ہے۔

ایک روز ہمارے میزبان ہمیں کالی دیوی کا مندر دکھانے لے گئے۔ یہ سناتن دھرمیوں کا مندر ہے اور ہمارے میزبان آریہ سماجی تھے اس لئے وہ خود تو اندر نہ گئے لیکن ہمیں اندر بھیج دیا۔ مندر کے دروازے پر ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر یہ عبارت درج تھی: NON BELIEVERS ARE NOT ALLOWED۔ میں اور ڈار صاحب انگریزی لباس میں ملبوس تھے اس لئے ہمیں کوئی نہ پہچان سکا۔ یہ مندر دریائے ہگلی کے کنارے تعمیر کیا گیا ہے اس لئے مد کے وقت دریا کا پانی مندر کے صحن میں آجاتا

ہے اور جزر کے وقت باہر نکل جاتا ہے۔ ہندو تو یہی کہیں گے کہ دریا کا پانی ماتا رانی کے چرن دھونے کے لئے آتا ہے۔ ایک کمرے میں کالی دیوی کا بُت نصب تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا اور آنکھیں بڑی خوفناک تھیں۔ اس کی سرخ رنگ کی زبان باہر کی جانب نکلی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں انسانی کھوپڑیوں کا ہار ڈالا ہوا تھا۔ مندر کے باہر کالے رنگ کے بکرے کھڑے تھے۔ عقیدت مند بکرا خریدتے اور جلاد سے اس کی سری کٹوا کر ماتا رانی کے قدموں میں بطورِ بھینٹ چڑھاتے۔ کالی دیوی خونی دیوی مانی گئی ہے اور جادو ٹونہ کرنے والے منتروں میں اس کا نام لیتے ہیں۔ ہم کالی دیوی کے "درشن" کرکے باہر نکلے تو ہمارے میزبان نے پوچھا "دیکھ آئے ہیں؟ دیکھئے گو کیسے گوسائیوں نے کیا پاکھنڈ رچا رکھا ہے"۔

کلکتہ کے مسلمانوں میں یہ بات مشہور ہے کہ کالی دیوی نے اس علاقے میں بڑا ظلم و ستم ڈھا رکھا تھا اور لوگ اس سے بڑے خوف زدہ رہتے تھے۔ ایک بار جمعہ پیر کے ساتھ اس کا مقابلہ ہو گیا تو پیر صاحب نے اپنی "مطہر" سے اس کا کام تمام کر دیا۔

ایک روز ہمارے میزبانوں نے ہمیں کلکتہ کے جنرل پوسٹ آفس کی عمارت دکھائی۔ انہوں نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ یہ عمارت اس جگہ تعمیر ہوئی ہے جہاں حادثۂ بلیک ہول پیش آیا تھا جس کے نتیجے میں نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ ہوئی تھی۔ ہم نے ان کے ساتھ ایڈن گارڈن بھی دیکھا یہ بھی دریائے ہگلی کے کنارے واقع ہے۔ وہاں ایک برگد کا پیڑ ہے جس کے بارے میں بڑے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پورے عالم میں برگد کا سب سے بڑا پیڑ ہے۔ اس کے سیکڑوں تنے بن گئے ہیں اور اصل تنے کا پتہ چلانا بڑا مشکل ہے۔ اس پیڑ کے نیچے ہزاروں افراد آرام کر سکتے ہیں۔

ایک روز ہم نے کلکتہ کلب اور انڈیا کافی ہاؤس دیکھے۔ کلکتہ کے معززین ان دونوں جگہوں پر جمع ہوتے ہیں۔ کلکتہ کلب میں INDOOR GAMES کا بڑا اچھا انتظام تھا۔ لوگ بلیرڈ کھیلنے میں معروف تھے۔ کافی ہاؤس بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں نشستوں کا اس انداز سے انتظام کیا گیا تھا کہ اتنے بڑے ہال میں خلوت کا احساس ہوتا تھا۔

کلکتے میں ایک پرائیویٹ عجائب گھر "ملک منزل" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں سنگِ مرمر سے تراشے گئے بُت قابلِ دید ہیں۔ متعدد کمرے نوادرات سے بھرے پڑے ہیں۔ ان نوادرات کو دیکھنے سے طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ وہاں کے پہرے دار مخصوص قسم کی وردیوں میں ملبوس تھے اور وہ ہاتھوں میں بلّم پکڑ کر پہرہ دیتے تھے۔ ملک منزل کی طرف جاتے ہوئے ہمارے میزبانوں نے ہمیں وہ عمارت بھی دکھائی جہاں سے نیتاجی سبھاش چندر بوس (م ۱۹۴۵ء) فرار ہو کر جاپانی فوج کے ساتھ مل گئے تھے۔

ایک دن ہم کلکتہ یونیورسٹی دیکھنے گئے۔ اس یونیورسٹی کا شعبۂ تاریخ بڑا مشہور رہا ہے۔ وہاں سر جدو ناتھ سرکار، موجمدار، قانونگو، رائے چودھری اور دتہ جیسے نامور مورخ تاریخ پڑھاتے رہے ہیں۔ جدو ناتھ سرکار کی زندگی کا بیشتر وقت اورنگ زیب عالمگیر (م ۱۷۰۷ء) پر تحقیق کرنے میں صرف ہوا ہے۔ ڈار صاحب کو طلبہ یونین میں بھی دلچسپی تھی۔ اس لئے ہم طلبہ یونین کے دفتر میں یونین کے عہدہ داروں سے ملنے گئے۔ انہوں نے ہمیں اپنی یونین کے ترجمان "ایکتا" کا مجلّہ دیا۔ اس میں انگریزی، ہندی اور بنگالی میں مضامین چھپتے تھے۔ وہ مجلّہ اب تک میرے ذاتی کتاب خانے میں موجود ہے۔ یونیورسٹی سے باہر دور تک کتب فروشوں کی دکانیں ہیں۔

پارک روڈ پر گمنویا ہوٹل بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ ہم متعدد بار وہاں چائے پینے گئے۔ ہمیں ہمارے میزبانوں نے یہ کہا کہ اگر کوئی کلکتے آئے اور گمنویا ہوٹل میں نہ جائے، تو اس کا کلکتے آنا یا نہ آنا، دونوں برابر ہیں۔ پارک روڈ کے کونے پر انڈین میوزیم کی عمارت ہے۔ یہ ہندوستان کا سب سے بڑا عجائب گھر ہے۔ کلکتہ ۱۹۱۱ء تک ہندوستان کا دارالحکومت رہا ہے۔ اس لئے یہ اس ملک کا مرکزی عجائب گھر تھا۔ اس عجائب گھر میں مہاتما بدھ کے مجسّے، ہندوؤں کی دیویوں اور دیوتاؤں کے بُت، ہندوستان کے قدیم سکّے اور دوسرے نوادرات دیکھنے کے لائق ہیں۔ ایک سٹینڈ پر شہابِ ثاقب رکھا ہوا ہے اور وہ جس گاؤں میں گرا تھا، اس کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ اس عجائب گھر کو بغور دیکھنے کے لئے ایک پورا دن درکار ہے۔

عجائب گھر سے قریب ہی کلکتے کا سب سے اہم چوک "اسپلینڈ" ہے۔ اس کے ایک جانب راج بھون ہے جہاں گورنر کی رہائش ہے۔ چوک میں دھرم تلہ کی مسجد ہے

جس کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ جب انگریز سلطان ٹیپو کے بیٹوں کو یہاں لائے تھے تو انہوں نے یہ مسجد بنوائی تھی ۔ یہیں سے لوئر چیت پور روڈ شروع ہوتی ہے ۔ دھرم تلہ کی مسجد سے ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک عالی شان مسجد ہے ۔ اسے ناخدا مسجد کہتے ہیں ۔ یہ کلکتے کی جامع مسجد ہے ۔ ناخدا مسجد کئی منزلہ ہے اور رمضان کے دنوں میں ہر منزل میں کئی کئی حافظ تراویح میں قرآن سناتے ہیں ۔ مولانا عبدالغنی چشتی صابری (م ۱۹۵۸ء) نے راقم کو بتایا کہ انہوں نے وہاں متعدد رمضان گزارے ہیں ۔ ان دنوں مساجد میں لاؤڈ اسپیکر لگانے کا رواج نہ تھا اس لئے ایک حافظ گنتی کے نمازی لے کر تراویح پڑھانے لگتا تھا ۔ مسجد میں بیک وقت تیرہ چودہ جگہ تراویح ہوتی تھی اور یہ سلسلہ رات بھر جاری رہتا تھا ۔ "ناخدا" ملاح کو کہتے ہیں ۔ دراصل یہ لفظ ناؤخدا (ناؤ کا مالک) تھا جو کثرتِ استعمال سے ناخدا ہو گیا ۔ اس مسجد سے قریب ہی کلکتے کا مشہور علاقہ ذکریا سٹریٹ ہے ، جو مسلمانوں کا مرکز ہے ۔

ایک روز ہمارے میزبان ہمیں لیک ایریا دکھانے لے گئے ۔ یہ کلکتے کی بہترین قسم کی سیر گاہ ہے ۔ ایک جھیل کے کنارے امپیریل پام عجب بہار دکھاتے ہیں ۔ یہ بہت اچھی سیر گاہ ہے اور وہاں خوب رونق رہتی ہے ۔ اسی علاقے میں وکٹوریا میموریل کے نام سے ایک سفید رنگ کی عمارت بنائی گئی ہے جس میں اسلامی فنِ تعمیر کو اُجاگر کیا گیا ہے ۔ اس کے گنبد بہت خوش وضع ہیں ۔ اس عمارت کا شمار برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی گنی چنی عمارتوں میں ہوتا ہے ۔

شہر کے وسط سے دریائے ہگلی گزرتا ہے جو دریائے گنگا ہی کی ایک شاخ ہے ۔ اس دریا کی گہرائی بہت زیادہ ہے اس لئے اس پر بغیر SPAN کے پل تعمیر کیا گیا ہے ۔ اس پل پر سے ٹرام بھی گزرتی ہے ۔ اس پل کو عرفِ عام میں "ہوڑہ برج" کہتے ہیں ۔ یہ پل ہوڑہ کو کلکتے سے ملاتا ہے ۔ دریا کے ایک جانب کی آبادی ہوڑہ کہلاتی ہے اور دوسری جانب کی کلکتہ ۔ کلکتہ خلیج بنگال سے اندازاً ۸۵ میل کے فاصلے پر ہے ۔ سمندر سے کلکتہ تک مد کے وقت جہاز آتے ہیں ۔ وہ جہاز ہوڑہ برج کے نیچے سے بآسانی گزر جاتے ہیں ۔ کلکتہ اور سمندر کے درمیان ایک خطرناک جنگل ہے جو "سُندر بن" کے نام سے مشہور ہے ۔ اس جنگل میں بنگال کے مشہور ٹائیگر رہتے ہیں ۔ ہمارے ہاں بعض حضرات نے

سُندر بن میں مَردم خور ٹائیگر مارنے کے فرضی قصّے لکھے ہیں اور اب یہ ادب کی ایک مستقل صِنف بن گئی ہے ۔

ہوڑہ ریلوے کا بہت بڑا اسٹیشن ہے ۔ پُورے ملک سے یہاں ٹرینیں آکر ختم ہوتی ہیں ۔ مجھے ایک بات بہت پسند آئی کہ ٹیکسیاں اور پرائیویٹ کاریں پلیٹ فارم پر آ جاتی ہیں ، مسافر ان میں سوار ہو کر اسٹیشن سے باہر نکلتے ہیں تو گیٹ پر ٹکٹ کلکٹر کو ٹکٹ تھما دیتے ہیں ۔

ہوڑہ ریلوے اسٹیشن سے سیالدہ ریلوے اسٹیشن کا فاصلہ تین میل ہے ۔ ہگلی کی وجہ سے ریلوے لائن دریا کے پار نہیں جاتی ۔ اس لئے یہ فاصلہ ٹیکسی یا وکٹوریا کے ذریعے طے کرتے ہیں ۔ دونوں اسٹیشنوں کے درمیان تین میل لمبا بازار ہے جس کا نام تو ہارڈنگ اسٹریٹ ہے لیکن عرفِ عام میں اسے بڑا بازار کہتے ہیں ۔ کلکتے کے بازار بہت بارونق ہیں ۔ برطانوی عہد میں جب لاہور اور کراچی کی آبادی اڑھائی لاکھ کے لگ بھگ تھی تو اس زمانے میں کلکتے کی آبادی ستّر لاکھ تھی اور برطانوی سلطنت میں وہ چوتھا بڑا شہر تھا ۔

کلکتے کے نواح میں ایک علاقہ مٹیا بُرج کے نام سے موسوم ہے ۔ یہیں انگریزوں نے اودھ کے معزول حکمران نواب واجد علی کو رکھا تھا ۔ اس نے وہاں ایک امام باڑہ بنوایا اور مرنے کے بعد اسی میں دفن ہوا ۔ مٹیا برج میں قیام کے دوران میں اس نے اپنی ممتوعات کے نام جو خط لکھے تھے وہ "ادبِ عالیہ کا شاہکار" تسلیم کئے جاتے ہیں ۔

جب ہم کلکتے سے روانہ ہونے لگے تو ہمارے میزبانوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے والدِ بزرگوار اور دادا جان سے ان کی طرف سے معذرت کے انداز میں کہوں کہ جس طرح سے انہوں نے ہماری سیوا کرنی تھی ، اس طرح سے نہیں کر سکے ۔ کلکتہ سے چل کر ہم پٹنہ آئے اور اسے جی بھر کر دیکھا ۔ پٹنہ دریائے گنگا کے کنارے آباد ہے ۔ اس کی چوڑائی بہت کم ہے لیکن لمبائی میلوں تک ہے ۔ پٹنہ جھٹملی اور داناپور مل گئے ہیں ۔ داناپور پٹنہ کی فوجی چھاؤنی ہے اور "اصح السیر" کے فاضل مصنف مولانا عبدالرؤف دانا پوری (م ۱۹۴۸ء) یہیں کے رہنے والے تھے ۔ جھٹملی کو حضرت شہاب الدین جگجوت کی وجہ سے شہرت ملی ہے ۔

ان دونوں شہروں کے درمیان ۹۳ کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ پٹنہ سے ٹرین میں سوار ہو کر ہم "گیا" روانہ ہوئے ہم نصف شب کے قریب گیا پہنچے۔ ہم نے پلیٹ فارم پر ہی اپنے بستر کھول لئے اور سو گئے۔ علی الصبح میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک پنڈت میرے پاس کھڑا ہے۔ اس نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا ہم یہاں یاترا کے لئے آئے ہیں؟ میں نے ڈرتے ڈرتے اثبات میں جواب دیا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ ہمارا پروہت کون ہے؟ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس نے پوچھا کہ کون دیش کون جلع (ضلع)؟ میں نے لاہور کی بجائے اپنے آبائی ضلع جالندھر کا نام بتایا تو اس نے کہا کہ اس ضلع کا پروہت کنہیالعل داڑھی والا ہے۔ اس لئے جب ہم تیرتھ کرنے جائیں تو اس کا نام بتا دیں۔ اس کے وہاں سے ہٹتے ہی میں نے ڈار صاحب کو جگایا اور ان سے کہا کہ وہ جلدی سے تیار ہو جائیں، ہم نے کنہیالعل داڑھی والے کے پاس جانا ہے۔ ہم نے اسٹیشن پر ہی مُنہ ہاتھ دھویا اور ناشتہ کرکے سامان کلوک روم میں رکھا اور اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے پولیس اسٹیشن گئے۔ وہاں شاید پاکستانی نہیں جاتے اس لئے پولیس والوں نے چائے کے ساتھ ہماری تواضع کی۔ گیا سے "بدھ گیا" اندازاً چھ میل دور ہے۔ ہم نے دراصل وہیں جانا تھا ہم ایک رکشا میں سوار ہو کر بدھ گیا روانہ ہوئے۔ وہ ہولی کا دن تھا۔ اس لئے دو تین جگہ لوگوں نے ہم پر رنگ ڈالنے کی کوشش کی۔ رکشا ڈرائیور نے رکشا بھگا لے جانے کی کوشش کی لیکن میں نے رکشا رکوایا اور رنگ پھینکنے والوں سے کہا کہ ہم مُسلمان ہیں۔ میری بات سن کر وہ اپنے ارادے سے باز آگئے۔

بدھ گیا وہ مقام ہے جہاں گوتم بدھ کو سالہا سال کی تپسیا اور سخت مجاہدے کے بعد گیان حاصل ہوا تھا۔ انہیں یہ نعمت ایک درخت کے نیچے مراقبہ کرنے کے بعد ملی تھی۔ بدھوں نے اشوک کے زمانے میں اس درخت کی شاخیں سری لنکا، برما اور تھائی لینڈ بھیجی تھیں جہاں انہیں زمین میں لگایا گیا۔ سری لنکا میں اس درخت کی نسل تا حال چلی آرہی ہے۔ بدھ گیا میں بھی اس درخت کی نسل چلی آرہی ہے اور ایک درخت عین اسی جگہ اگا ہوا ہے جہاں گوتم بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ بدھ اس درخت کا بڑا احترام کرتے ہیں اور اس کے تنے پر سیندور اور سونے چاندی کے ورق لگاتے ہیں۔

اس درخت سے چند قدم کے فاصلے پر ایک مندر ہے جس میں مہاتما بدھ کا ایک

بہت بڑا بت نصب ہے۔ اس بت پر بھی سونے کے ورق چپکانے کا رواج ہے۔ بت کے سامنے بدھ بھکشو مراقبے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ان کا مقدس ترین مقام ہے۔ اس مندر سے قریب ہی ہندوؤں نے بھی ایک مندر کھڑا کر لیا ہے۔ ڈار صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ ہندوؤں کا یہاں کیا کام ہے؟ دیکھو! انہوں نے شرارتاً یہاں مندر بنا لیا ہے۔ ہم نے مندر دیکھا اور پروہت ایک تھال میں پھول، سیندور اور صندل رکھ کر لے آیا۔ ایک چراغ بھی تھال میں روشن تھا۔ اس نے ہمیں آرتی لینے کو کہا لیکن یہ صریحاً شرک تھا اس لئے ہم اس سے باز رہے اور اسے چند سکّے دے کر آگے بڑھے۔ بدھ گیا میں سری لنکا، تبت، تھائی لینڈ اور برما کے بدھوں نے الگ الگ خانقاہیں تعمیر کی ہوئی ہیں۔ جہاں ان ملکوں کے بدھ بھکشو رہتے ہیں۔ وہ عموماً زرد یا عنابی رنگ کی چادروں میں ملبوس ہوتے ہیں اور سر پر اُسترا پھرواتے ہیں۔ جب وہ قطار بنا کر خانقاہ سے مندر کی طرف جاتے ہیں تو یہ نظارہ قابلِ دید ہوتا ہے۔

بدھ گیا کو اچھی طرح دیکھ کر ہم واپس گیا آئے۔ ہم گیا کے بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک مکان کی بالائی منزل سے کسی ہندو نے رنگ سے بھری ہوئی بالٹی ڈار صاحب کے سر پر انڈیل دی۔ ان کے مُنہ سے بے ساختہ گالی نکلی۔ ان کا لباس پانی میں بھیگ گیا۔ ان کے سر اور داڑھی سے رنگدار پانی زمین پر گر رہا تھا اور وہ سر جھکائے وہاں کھڑے تھے۔ میں نے کہا کہ مولانا جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔ آج ہولی کا تہوار ہے۔ ہم نے کونسا بار بار اس دن بھارت آنا ہے۔ میرے کپڑوں پر بھی رنگ کے چھینٹے پڑے۔ شاید ایسے ہی موقع پر کسی صاحب دل نے یہ کہا تھا:

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

اس رنگ کا یہ فائدہ ہوا کہ اگلے روز ہم بنارس کے مندروں میں آزادانہ گھومتے رہے اور کوئی پنڈت یا پروہت ہمیں پہچان نہ سکا۔ شہر میں گھوم پھر کر ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے اور ریستوران میں کھانا کھانے گئے۔ ہم میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے آس پاس کے میزوں پر بھی کھانا کھانے والے بیٹھے ہوئے تھے کہ ریلوے اسٹیشن کا سٹاف ہولی کھیلنے وہاں آپہنچا۔ وہ قدرے مہذب لوگ تھے۔ انہوں نے رنگ پھینکنے کی بجائے ماتھوں پر گلال لگانے پر ہی اکتفا کیا۔ ہم نے اسی وقت اُٹھ کر اپنے ماتھے دھو ڈالے

گیا ہے ہم سہسرام پہنچے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان ۲۰۳ کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ ہم نے سامان کلوک روم میں رکھا اور شیر شاہ سوری کا مقبرہ دیکھنے گئے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور ہولی کی وجہ سے چوکیدار چھٹی پر تھا۔ اس لئے اندر جانے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم جنگلہ کود کر اندر جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ اتنے میں چوکیدار ادھر آنکلا۔ اس نے انعام کے لالچ میں دروازہ کھول دیا۔

شیر شاہ سوری (م ۱۵۴۵ء) کا مقبرہ ایک تالاب کے وسط میں ہے۔ ڈیوڑھی سے لے کر مقبرے تک پتھر کا پل بنا ہوا ہے۔ امرتسر میں ہر مندر اور دُرگیانہ، لاہور میں شہزادی نادرہ بیگم کا مقبرہ اور شیخوپورہ میں ہرن مینار سے متصل بارہ دری اسی نمونے پر بنائے گئے ہیں۔ شیر شاہ کا مقبرہ باقی تینوں عمارتوں سے پہلے بنا تھا۔ شیر شاہ سوری نے کالنجر کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور قلعے کے اندر گولے پھینکے جا رہے تھے۔ اتفاق سے ایک گولہ قلعے کی فصیل سے ٹکرا کر میگزین میں آگرا اور زمین پر پڑا ہوا گولہ بارود بھک سے اُڑ گیا۔ اس حادثے میں شیر شاہ بری طرح جھلس گیا لیکن اس کے باوجود وہ سپاہیوں کو قلعے پر حملہ جاری رکھنے کی تلقین کرتا رہا۔ جب قلعہ فتح ہوا تو شیر شاہ کو یہ مژدہ سنایا گیا۔ اس نے اپنی زبان سے الحمدللہ کہا اور اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ کسی نے "ز آتش مُرد" (۹۵۲ھ) سے اس کی تاریخِ وفات نکالی ہے۔

شیر شاہ کی وصیت کے مطابق اسے سہسرام میں دفنایا گیا۔ اس کا مقبرہ بڑا رُعب دار ہے جو اس کے مزاج کی غمازی کرتا ہے۔ اس کے والد حسن سُور کا چھوٹا سا مقبرہ بھی تالاب کے ایک کونے میں تاحال موجود ہے۔ چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ یہ شیر شاہ کے پتاجی کا مقبرہ ہے۔ ڈار صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: اچھا! تو یہ بڑے سُور کا مقبرہ ہے۔

شیر شاہ کا مقبرہ چونکہ ایک وسیع و عریض تالاب کے وسط میں ہے اس لئے وہاں مچھروں کی بہتات تھی۔ ہمارے لئے مقبرے کے اندر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ اس لئے ہم فوراً وہاں سے بھاگے۔ ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ رُوم میں بھی مچھروں کی بہتات تھی۔ ہم نے اسٹیشن ماسٹر سے اس کی شکایت کی تو اس نے کہا کہ اگر ہم شکایات کے رجسٹر میں رپورٹ درج کر دیں، تو شاید ان کا بھی بھلا ہو جائے۔ ڈار صاحب نے شکایت لکھی

اور اپنا پتہ بھی نوٹ کر دیا۔ ہمارے لاہور آنے کے ایک ماہ بعد اس ریلوے ڈویژن کے سپرنٹنڈنٹ کا خط ڈار صاحب کو ملا جس میں اس نے ڈار صاحب کو لکھا کہ ریلوے اسٹیشن پر ویٹنگ روم کی کھڑکیوں اور دروازوں پر جالیاں لگا دی گئی ہیں، اس لئے ہم جب دوبارہ وہاں جائیں گے تو ہمیں شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔

سہسرام میں ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ بنارس جانے والی ٹرین نصف شب کے بعد وہاں پہنچنی تھی اس لئے ہم رات کا کھانا کھا کر فلم دیکھنے چلے گئے۔ ۳۹ سال گزر جانے کے باوجود مجھے اس فلم کے گانوں کے بُول یاد ہیں۔

ہم آخری شو دیکھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچے اور کلوک روم سے اپنا سامان نکلوایا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین آگئی اور اس میں سوار ہو کر ہم صبح سویرے بنارس پہنچ گئے۔ ہمیں صبح بنارس دیکھنے کی عُجلت تھی اس لئے سامان کلوک روم میں رکھ کر شہر چلے گئے۔

بنارس اور سارناتھ کی سیر کر کے ہم لکھنؤ گئے اور تین چار روز وہاں قیام کیا۔ لکھنؤ سے ڈار صاحب نے واہگہ بارڈر کا ٹکٹ خریدا اور میں نے شاہجہانپور کا، کیونکہ میرے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ میں اپنے فاضل دوست قاری محمد بشیر الدین پنڈت سے ملے بغیر شاہجہانپور سے گزر جاؤں۔ اس لئے شاہجہانپور پہنچ کر ہمارے راستے الگ ہو گئے۔

آگرہ، فتح پور سیکری، گوالیار

علی گڑھ سے آگرہ ۵۳ میل ہے اور بس وہاں دو گھنٹوں میں پہنچا دیتی ہے۔ علی گڑھ سے نکلتے ہی چند میل کے فاصلے پر ہاتھرس آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساسنی ہے جو مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے ساتھی اور حکومتِ موقتہ ہند کابل کے صدر راجہ مہندر پرتاپ (م ۱۹۷۹ء) کا وطن ہے۔ مجھے پروفیسر شیخ عبدالرشید (م ۱۹۸۳ء) نے بتایا کہ وہ علی گڑھ آکر مسلمانوں کے ساتھ عیدین کی نمازوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ راجہ صاحب نے My Fifty Five Years in Exile کے عنوان سے اپنی سوانح عمری بھی لکھی ہے۔

ہاتھرس سے آگے بڑھیں تو مسلمانوں کے قدیم قصبے نظر آنے لگتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بڑی بڑی مسجدیں موجود ہیں جو الحمد للہ آباد ہیں۔ اسی راستے میں سعد آباد پڑتا ہے جہاں سعادت یار خان رنگین کے والد طہماس خان کو افراسیاب خان نے ایک باغی زمیندار کی سرکوبی کے لئے بھیجا تھا۔ سعد آباد سے چل کر ہم آگرہ پہنچتے ہیں۔ دریائے جمنا عبور کرنے سے پہلے اعتماد الدولہ کا مقبرہ آتا ہے۔ اعتماد الدولہ غیاث بیگ نور جہاں کا والد تھا۔ اس مقبرے میں اعتماد الدولہ اور اس کی اہلیہ محوِ خواب ابدی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق اس مقبرے کا ڈیزائن خود نور جہاں نے تیار کیا تھا۔ جمنا کا پانی مقبرے کو چھو کر گزرتا ہے۔ یہ مقبرہ اتنا خوبصورت ہے کہ اگر آگرے میں تاج محل نہ ہوتا تو لوگ اسے ہی دیکھنے کے لئے آگرے کا سفر کیا کرتے۔ تاج محل کی موجودگی میں مقبرہ اعتماد الدولہ کا حسن گہنا گیا ہے۔

اعتماد الدولہ کے مقبرے سے قریب ہی دو پل ہیں۔ ان میں سے ایک پل کے ذریعے دریا عبور کرتے ہیں۔ دریا کا دوسرا کنارہ، جو شہر کی جانب ہے، ہاتھی گھاٹ کہلاتا ہے۔ شاید کسی زمانے میں یہاں شاہی فیل خانے کے ہاتھی دریا میں نہاتے ہوں۔

آگرہ فورٹ کے ریلوے اسٹیشن سے متصل شہزادی جہاں آرا بیگم (م ۱۶۸۱ء) کی

تعمیر کردہ مسجد ہے۔ یہی آگرے کی جامع مسجد ہے۔ یہ ریلوے لائن سے اتنی قریب ہے کہ اس کی پوری تصویر ریلوے لائنوں میں ہی کھڑے ہو کر اُتار سکتے ہیں۔ مسجد کی چھت پر تین دھاری دار گنبد ہیں جو دیکھنے میں بڑے بھلے دکھائی دیتے ہیں۔ مسجد کے نیچے دکانیں ہیں اس لئے متعدد سیڑھیاں چڑھ کر مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔

مسجد کی درمیانی محراب کے اوپر مسجد کی تعمیر پر خرچ ہونے والی رقم ہندوستانی سکوں کے علاوہ ایرانی اور تورانی سکوں میں بھی درج ہے۔ اس سے شاہجہان کے عہد میں شرحِ مبادلہ معلوم ہو سکتی ہے۔

مسجد کے سامنے مسلمانوں کے چوتھے درجے کے رہائشی ہوٹل اور کھانے کے ریستوران ہیں۔ مسجد سے شہر کا مرکز فوارہ چوک زیادہ دُور نہیں ہے۔ سیب بازار سے گزر کر وہاں پہنچتے ہیں۔ ایک سفر میں میرا بیٹا ظفر بھی میرے ساتھ تھا۔ جب ہم سیب بازار سے گزر رہے تھے تو دوسری جانب سے ایک ارتھی آرہی تھی جس کے آگے باجا بج رہا تھا۔ ظفر یہ منظر دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہندوؤں کے ہاں جب کوئی شخص زیادہ عمر پا کر مرتا ہے تو اسے دُھوم دَھام اور باجے کے ساتھ شمشان تک لے جاتے ہیں۔

چوک فوارہ میں ایک سندھی ہندو کا ہوٹل ہے جہاں رہائش کا خاطر خواہ انتظام ہے اور وہاں کھانا بھی بہت عمدہ ملتا ہے۔ میں چھ سات بار اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ اس ہوٹل سے قریب ہی کوتوالی ہے جہاں غیر ملکی سیاحوں کو اپنی آمد کی اطلاع کرنا ہوتی ہے۔ اس سے قریب ہی مسلمانوں کی دکانیں ہیں جو چمڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔ کوتوالی سے قریب ایک مسجد ہے۔ میں اس میں ظہر کی نماز ادا کرنے گیا تو میں نے مسجد میں ایک اشتہار لگا دیکھا جس سے یہ معلوم ہوا کہ ہر سال ماہ رجب کی ۲۵، ۲۶، اور ۲۷ تاریخوں کو تاج محل میں شاہجہان کا عُرس منایا جاتا ہے۔ یہ اطلاع میرے لئے باعثِ حیرت اور مسرت تھی کہ آگرے کے عوام اب تک اس نیک دل بادشاہ کی یاد منا رہے ہیں۔

آگرے کا قلعہ بابر کے عہد سے لے کر جہانگیر کے عہد تک مغلوں کا پایۂ تخت رہا ہے۔ یہ قلعہ دریائے جمنا کے کنارے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی سنگِ سرخ کی فصیل

قابل دید ہے۔ قلعے میں اَمر سنگھ گیٹ سے داخل ہوتے ہیں۔ قلعے کے وسیع لان میں ایک قدِ آدم پتھر کا پیالہ رکھا ہوا ہے جو ایک ہی چٹان سے تراش کر بنایا گیا ہے۔ اس پر فارسی کے اشعار بھی کندہ ہیں۔ عوام میں یہ روائت مشہور ہے کہ ملکہ نور جہاں اس میں عرقِ گلاب بھر کر نہایا کرتی تھی۔

قلعے کے اندر بعض محلات ہندو انہ طرز تعمیر کی غمازی کرتے ہیں۔ یہاں اکبر اور جہانگیر کی ہندو بیویاں رہتی ہوں گی۔ فتح پور سیکری میں رانی جودھا بائی کا محل بھی اسی انداز پر تعمیر کیا گیا تھا۔ قلعے کے اندر ایک کپاؤنڈ مچھلی بھون کے نام سے موسوم ہے۔ دیوانِ عام کے سامنے ایک انگریز افسر کی قبر ہے جس پر اس کا نام اور تاریخ وفات کندہ ہے۔ قلعے کے اندر ایک سنگِ سیاہ کا تخت پڑا ہے۔ اب اس میں ایک دراڑ پڑ گئی ہے۔ عوام اس پر سُونا رگڑ کر دیکھتے ہیں۔ عام روائت یہی ہے کہ یہ تخت اس پتھر سے تراشا گیا ہے جو کسوٹی بنانے کے کام آتا ہے۔ یہ تخت الہ آباد میں تھا۔ جہانگیر نے جب اپنے والد کے خلاف باغیانہ رویہ اختیار کیا تو اس نے اسی تخت پر بیٹھ کر اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا تھا۔

اس تخت سے قریب ہی وہ تاریخی مثمن بُرج ہے جس میں شاہجہان نے اسیری کا زمانہ گزارا تھا۔ مثمن بُرج میں جا بجا آئینے لگے ہوئے ہیں جن میں تاج محل کا عکس پڑتا ہے۔ سیاح بڑے شوق کے ساتھ یہ عکس دیکھتے ہیں حالانکہ سامنے تاج محل نظر آتا ہے۔ قلعے کے اندر دیوانِ خاص اور مُوتی مسجد بھی دیکھنے کے لائق ہیں۔ مُوتی مسجد میں مسلمان نوافل ادا کر لیتے ہیں لیکن لال قلعہ دہلی میں اورنگ زیب کی تعمیر کردہ مُوتی مسجد میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ اسے مکمل طور پر آثارِ قدیمہ کا درجہ دے دیا گیا ہے

قلعے کے باہر فصیل سے قریب ایک گھوڑے کا مجسّمہ پڑا ہے جو سنگِ سرخ سے بنایا گیا ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب راجہ اَمر سنگھ راٹھور نے اپنے گھوڑے سمیت قلعے کی فصیل سے چھلانگ لگائی تھی تو اس کا گھوڑا یہیں گرا تھا۔ وہ اس گھوڑے پر سوار ہو کر راجستھان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس کے گھوڑے نے اتنی پُھرتی دکھائی کہ وہ سکندرہ کے قریب فوت ہو گیا۔ وہاں بھی ایک چھوٹا سا مندر ہے جس کے

صحن میں ایک چبوترے پر اس گھوڑے کا مجسمہ موجود ہے۔

قلعہ دیکھ کر ہم تاج محل گئے۔ تاج محل سے ذرا پہلے بائیں ہاتھ ایک سنگِ سرخ کا مقبرہ آتا ہے۔ یہ ستی النساء خانم کا مقبرہ ہے۔ وہ جہانگیر کے ملک الشعراء طالب آملی کی بہن تھی۔ ممتاز محل کی وفات کے وقت شاہجہان کے بچے کمسن تھے۔ ستی النساء خانم نے ان کی دیکھ بھال کی اور شاہجہان کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں سمجھ کر ان کی تعلیم و تربیت کی۔ بدیں وجہ مرنے کے بعد اسے تاج محل سے قریب جگہ ملی۔

تاج محل کے صدر دروازے سے پہلے دونوں جانب دکانیں آتی ہیں جہاں تاج محل کے ماڈل اور تصاویر فروخت ہوتی ہیں۔ صدر دروازے کے بالمقابل جو آبادی ہے وہ تاج گنج کے نام سے موسوم ہے۔ ایک روایت کے مطابق تاج محل تعمیر کرنے والے کاریگروں کی اولاد وہاں رہتی ہے۔ اب ان لوگوں نے کراچی میں بھی اس نام سے ایک ہاؤسنگ سکیم بنائی ہے۔

تاج محل میں داخل ہونے کے لئے ٹکٹ خریدنا ہوتا ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جمعہ کے دن آگرے کی کسی بھی تاریخی عمارت میں داخلے کے لئے ٹکٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ بھارت کی حکومت نے مسلمانوں کا یہ مؤقف تسلیم کر لیا ہے کہ یہ محض تاریخی عمارتیں ہی نہیں ہیں بلکہ مزارات بھی ہیں۔ اس لئے فاتحہ خوانی کے لئے ایک دن وہاں داخلہ مفت ہونا چاہیے۔ یہ سہولت ہمارے ہاں موجود نہیں ہے۔

تاج محل کی عمارت بڑی خوشنما ہے۔ راقم نے اسے سیاہ بادلوں میں، چاندنی رات میں، ستاروں کی جھلملاہٹ میں اور اندھیری رات میں دیکھا ہے۔ ان سب کا اپنا اپنا مزہ ہے۔ ممتاز محل اور شاہجہان کی اصل قبریں تہ خانے میں ہیں۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے سنگِ مرمر کا زینہ بنا ہوا ہے۔ فرسٹ فلور پر بھی تعویذ موجود ہیں۔ ان کے گرد سنگِ مرمر کا ایک کٹہرہ بنا ہوا ہے جس پر پراچین کاری کا کام قابلِ دید ہے۔ تعویذوں پر بھی اسمائے الٰہی لکھے ہوئے ہیں۔ تاج کے کتبات امانت خان شیرازی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ آخری عمر میں وہ پاک بھارت سرحد کے قریب سرائے امانت خان نامی ایک قصبے میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ اس کا مقبرہ اور سرائے تا حال اٹاری سے چھ سات میل کے فاصلے پر اٹاری سے ترنتارن جانے والی سڑک پر موجود ہیں۔ سیاحوں کی موجودگی

میں کبھی کبھی چوکیدار اللہ اکبر کی صدا بلند کرتا ہے تو گنبد کے اندر اس کی گونج دیر تک موجود رہتی ہے۔

دریائے جمنا تاج محل کو چھو کر گزرتا ہے۔ دریا کے پار کھنڈرات نظر آتے ہیں۔ عام روایت یہی ہے کہ وہاں شاہجہان نے اپنے لئے مزار تعمیر کروانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ دریا کے پار تاج محل کے بالمقابل سنگِ سیاہ سے ایک ایسا ہی مقبرہ اس کے لئے تعمیر کیا جائے اور دونوں کو ایک پل کے ذریعے ملا دیا جائے لیکن اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے قبل ہی وہ جون ۱۶۵۸ء میں اپنے فرزند اورنگ زیب عالمگیرؒ کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔

تاج کے احاطے میں آمنے سامنے دو عمارتیں ہیں۔ ایک تو مسجد ہے اور دوسری عمارت تقابل قائم کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ اسے تسبیح خانہ کہتے ہیں۔ اس کے فرش پر تاج محل کے کلس کا ڈیزائن بنا ہوا ہے۔ تاکہ اگر کلس ضائع ہو جائے تو اسی سکیل پر نیا کلس بنا کر تاج کے گنبد پر نصب کر دیا جائے۔

تاج محل کے بارے میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی (م ۱۹۸۳ء) نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس پر انہیں پیرس یونیورسٹی نے ڈاکٹر کی ڈگری عطا کی تھی۔ اس مقالے کی تیاری کے دوران وہ کئی ماہ تک آگرے میں مقیم رہے تھے۔ ان کا قیام مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے والدِ بزرگوار ڈاکٹر ابرار حسین کے مکان پر تھا۔ اس کا اعتراف انہوں نے اپنے مقالے میں بھی کیا ہے۔

آگرے میں کلاں محل اور گڈریوں والا کرہ نام کے دو محلّے ہیں۔ ان محلوں میں غالب کا بچپن گزرا تھا۔ "مرقع غالب" میں پرتھوی چندر نے ان دونوں مکانوں کی تصویریں شامل کر دی ہیں جہاں غالب اپنے بچپن میں رہتے تھے۔ یہ مکان اب مرزا غالب کی یادگار بن کر رہ گئے ہیں۔

آگرہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفۂ اول میر محمد نعمان بدخشیؒ کا مزار ہے۔ مجھے یہ مزار دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا لیکن وہاں میری رہنمائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ میں کوتوالی سے قریب ایک چرم فروش کی دکان پر گیا۔ وہاں تین چار بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے میر صاحب کے مزار کا پتہ پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے

کہا کہ یہاں ایک صاحب رہتے ہیں، جن کے والد قیامِ پاکستان کے بعد پشاور چلے گئے تھے لیکن وہ خود یہیں رہتے ہیں۔ وہ آگرے سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ انہوں نے مجھ سے میرا پتہ لے لیا۔ عشاء سے قریب وہ صاحب مجھے تلاش کرتے ہوئے ہوٹل میں آگئے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کا مزار وجے نگر سے آگے چاول والوں کے باغ سے قریب موجود ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ کسی رکشا ڈرائیور کو کہہ دیں جو مجھے وہاں لے جائے۔ انہوں نے کہا کہ اگلے روز صبح ساڑھے آٹھ بجے رکشا ڈرائیور مجھے اس ہوٹل سے لے جائے گا۔ اگلے روز صبح ایک رکشا ڈرائیور مجھے ڈھونڈتے ہوئے ہوٹل پہنچا اور وہ مجھے ریلوے مال گودام سے آگے وجے نگر سے ہوتا ہوا چماروں کی ایک بستی میں لے گیا۔ یہ بستی "دھنی کی نگریا" کہلاتی ہے۔ بستی کے ایک جانب چماروں کے جھونپڑے ہیں اور ایک گندے نالے کے پار میر صاحب کا روضۂ مبارک ہے۔ گندے نالے میں سؤر لوٹیں لگاتے ہیں۔

میر صاحب کا روضہ بیس دری کی طرز پر تعمیر ہوا ہے اور اس کے دروں میں سنگِ سرخ کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ دروازے پر ایک ہندو "مجاور" بیٹھا ہوا تھا۔ میں جوتے اتار کر اندر داخل ہوا۔ میر صاحب کا مزار ایک کمرے کے اندر ہے جس کے دروازے پر رات کو قفل ڈال دیا جاتا ہے۔ غلام گردش میں مزار کا اصل کتبہ بھی پڑا تھا جو "مجاور" نے مجھے دکھایا۔ میں نے میر محمد نعمان بدخشیؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کی اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کی۔ آگرے کے ایک اور سفر میں میں خود ہی ان کے مزار پر پہنچ گیا۔

میر محمد نعمان بدخشیؒ، خواجہ محمد ہاشم کشمی برہانپوریؒ کے ہم وطن اور خواجہ باقی باللہؒ کے مرید تھے۔ ابھی ان کی رُوحانی منزل طے نہیں ہوئی تھی کہ خواجہ صاحب کا وصال ہو گیا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے انہیں خط لکھ کر سرہند شریف بلا لیا اور اپنی نگرانی میں ان کی منزل مکمل کروا دی۔ میر صاحب نے مغلوں کے دارالحکومت آگرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ خواجہ بدر الدین سرہندی نے "حضرات القدس" کی دوسری جلد میں ان کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔

آگرہ کے ایک سفر میں راقم دیال باغ دیکھنے گیا۔ وہاں ایک ہندو نے تاج محل

کی طرز پر مندر تعمیر کرنا شروع کیا تھا، جو نامکمل رہ گیا۔ دیال باغ جنت سازی کا مرکز ہے۔ وہاں کے بنے ہوئے جوتوں کی بھارت میں بڑی مانگ ہے۔

راقم دو بار قاضی نور اللہ شوستری (م ۱۶۱۰ء) کے مزار پر جا چکا ہے۔ ۱۹۵۵ء کے سفر میں مزار پر ایک سادہ سا گنبد تھا اور بس۔ اب وہاں ایک عالی شان مقبرہ تعمیر ہو گیا ہے جس کا گنبد سامرا میں حضرت علی نقیؑ اور حضرت حسن عسکریؑ کے گنبدوں کی وضع کا ہے۔ گنبد کے ساتھ دو مینارے بھی تعمیر ہوئے ہیں۔ ان میں بھی سامرا کے میناروں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری صاحب "مجالس المومنین" مغل فرمانروا اکبر کے عہد میں لاہور کے قاضی تھے۔ وہ مذہباً شیعہ تھے لیکن عدالتی فیصلے فقہ حنفی کے مطابق کرتے تھے۔ جہانگیر کے عہدِ حکومت میں انہوں نے ایک شعر کہا جس میں امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اہانت کا پہلو نکلتا تھا۔ جہانگیر نے ان کی گرفتاری کا حکم دیا اور انہیں اپنے دربار میں طلب کیا۔ اس حاضری کے موقع پر انہوں نے شیخ سلیم چشتی کی شان میں گستاخی کی۔ جہانگیر ان ہی دعا سے پیدا ہوا تھا اس لئے اس کے دل میں شیخ موصوف کی بڑی عزت تھی۔ شیعہ تذکروں نویسوں کے بقول جہانگیر نے انہیں دُرّۂ خار دار سے پٹوایا جس کے نتیجے میں وہ انتقال کر گئے۔

شیعہ حضرات انہیں شہیدِ ثالث مانتے ہیں۔ شہیدِ اول شیخ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن مکی العاملی (م ۱۳۸۴ء) تھے اور شہید ثانی شیخ زین الدین العاملی (م ۱۵۳۷ء) تھے۔ تیسرا مقام شہادت قاضی نور اللہ شوستری کو ملا۔ کراچی کی رضویہ کالونی میں ایک سڑک "خیابانِ شوستری" ہے جو ان کی طرف منسوب ہے۔ بھارت کے شیعہ حضرات میں یہ بات مشہور ہے کہ جو غریب شیعہ کربلائے معلیٰ اور نجفِ اشرف نہ جا سکے وہ آگرہ میں قاضی نور اللہ شوستری کے مزار پر حاضری دے لے۔ قاضی صاحب کے احاطۂ مزار میں ان کے بہت سے عقیدتمندوں کی قبریں ہیں۔

ایک روز میں اپنے بیٹے ذُفر کے ہمراہ سکندرہ گیا۔ وہاں مغل بادشاہ اکبر کا مقبرہ ہے۔ مقبرے کی ڈیوڑھی بڑی خوبصورت ہے۔ اس کے اوپر چاروں کونوں میں مینارے ہیں جو تاج محل کے میناروں سے ہو بہو ملتے ہیں۔ یہ کہنا بجا نہ ہو گا کہ تاج محل کے

میناروں کا ڈیزائن یہیں سے لیا گیا ہے۔ مقبرے کی عمارت کئی منزلہ ہے۔ جس طرح اکبر کے مذہبی نظریات چوں چوں کا مربہ تھے اسی طرح مقبرے کی عمارت بھی چوں چوں کا مربہ ہے۔ ایک منزل اسلامی فن تعمیر کی غمازی کر رہی ہے تو دوسری منزل پر ہندو طرز تعمیر کے اثرات نمایاں ہیں، ایک منزل بدھوں کے فن کی نمائندگی کر رہی ہے۔ عمارت کے گرد غلام گردش بنا ہوا ہے جس میں متعدد مغل شہزادوں اور شہزادیوں کی قبریں ہیں۔ غلام گردش میں اب تک نقاشی کے نمونے موجود ہیں اور بعض جگہوں پر سنہرا رنگ ابھی تک اپنی چمک دکھا رہا ہے۔

یہ مقبرہ جنگل میں واقع ہے اس لئے وہاں لنگور بہت ہیں۔ وہ اتنے دلیر ہیں کہ لوگوں کے ہاتھ سے اشیائے خور و نوش چھین کر لے جاتے ہیں۔ ذُفر یہ نظارہ دیکھ کر بڑا محظوظ ہوا۔

اکبر کے مقبرے کو متاخر مغلوں کے دور میں چورامن جاٹ نے بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ وہ مقبرے سے چاندی کے دروازے اور کھڑکیاں اکھاڑ کر لے گیا۔ اس نے اکبر کی قبر کھدوا کر اس کی ہڈیاں جلا کر ان کی راکھ جمنا میں بہا دی۔ مفتی عتیق الرحمن عثمانی (م ۱۹۸۴ء) نے ایک بار راقم کو بتایا کہ ان کے والدِ بزرگوار حضرت مولانا شاہ عزیز الرحمن عثمانی (م ۱۹۲۸ء) اپنے احباب کے ساتھ سکندرہ گئے۔ جوں ہی انہوں نے اکبر کی قبر کے قریب کھڑے ہو کر آنکھیں موندیں تو موصوف فوراً وہاں سے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ اکبر عذاب میں مبتلا ہے اس لئے فوراً یہاں سے بھاگ چلو۔ راقم نے یہی بات پیر محمد ابراہیم ہاشمی نقشبندی (م ۱۹۹۳ء) کے صاحبزادے محمد یعقوب ہاشمی سے بھی سنی ہے۔ انہوں نے جب اکبر کی قبر پر مراقبہ کیا تو فوراً وہاں سے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ بدبخت عذاب میں مبتلا ہے۔ بہرحال یہ اللہ والوں کے مشاہدات ہیں اس لئے ہمارے لئے کفِ لسان ہی مناسب ہے۔

اکبر کے مقبرے سے ذرا فاصلے پر موضع سکندرہ سے باہر نور جہاں کے مقبرے کی طرز پر سنگ سرخ کی ایک عمارت ہے جس میں Cross Ventilation کا خیال رکھا گیا ہے۔ بعض لوگ اسے سکندر لودھی کا مقبرہ بتاتے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا مقبرہ لودھی گارڈن دلی میں ہے جہاں متمول لوگ گولف کھیلنے آتے ہیں۔

سکندرہ اور آگرے کے درمیان ۔ سکندرہ سے قریب ایک شاندار گوردوارے کی عمارت نظر آتی ہے ۔ سکھوں کا یہ کہنا ہے کہ اس جگہ سے اورنگ زیب نے گورو تیغ بہادر کو گرفتار کیا تھا ۔ اسی گوردوارے سے قریب لاڈلی بیگم کے مقبرے کے نام سے ایک چوکھنڈی موجود ہے ۔ اس کے اندر ٹوٹی پھوٹی قبروں کے نشانات ہیں ۔ اسی چوکھنڈی میں ابوالفضل، فیضی اور ان کے والد شیخ مبارک ناگوری کی قبریں ہیں ۔

آگرہ سے فتح پور سیکری کا فاصلہ ۲۲ میل ہے ۔یہاں شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ ہے ۔ اکبر کو ان کے ساتھ اتنی عقیدت تھی کہ اس نے اپنا دارالحکومت آگرہ سے فتح پور سیکری منتقل کر لیا اور وہاں عالیشان عمارات بنوائیں ۔ فتح پور اور سیکری دو الگ الگ قصبے ہیں لیکن انہیں ملا کر پڑھا جاتا ہے ۔ اسی مقام پر بابر نے ۱۵۲۷ء میں رانا سانگا کو شکست دے کر اس کے پورے ہندوستان کا فرمانروا بننے کا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا ۔

اکبر نے شہر کے گرد فصیل بنوائی جس کے بچے کچھے حصے تا حال موجود ہیں ۔ اکبر کی تعمیر کردہ عمارات ایک پہاڑی کے اوپر ہیں ۔ اسی پہاڑی پر اس نے گجرات کی فتح کی خوشی میں ایک شاندار دروازہ بنوایا تھا جو " بلند دروازہ " کے نام سے موسوم ہے ۔ اس دروازے سے باہر ایک باؤلی ہے ۔ بلند دروازے سے قریب دیوار پر لڑکے کھڑے رہتے ہیں ۔ وہ ایک روپیہ لے کر دیوار سے باؤلی میں چھلانگ لگاتے ہیں ۔ دروازے سے گزر کر ایک وسیع احاطے میں داخل ہوتے ہیں ۔ سامنے ایک بڑے گنبد میں اسلام خان کی قبر ہے ۔ وہ حضرت سلیم چشتی کا پوتا اور بنگال کا گورنر تھا ۔ اسے موسیقی کے ساتھ اتنی دلچسپی تھی کہ وہ ماہانہ اسی ہزار روپے موسیقاروں پر خرچ کرتا تھا ۔ اس کے بہت سے اعزہ اس کے مقبرے کے جوار میں مدفون ہیں ۔

اسلام خان کے مقبرے سے قریب ہی اس کے جدِ امجد شیخ سلیم چشتی کا مزار ہے ۔ اکبر کی نرینہ اولاد نہ تھی ۔ اس نے شیخ موصوف سے دعا کروائی اور وضع حمل سے قبل اپنی رانی جودھا بائی کو شیخ سلیم کے گھر بھیج دیا ۔ وہیں شہزادہ سلیم پیدا ہوا ۔ اکبر نے اپنے ولی عہد کا نام ان کے نام پر رکھا تھا ۔ شیخ صاحب کا مزار سرتاپا سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے ۔ اس کی جالیاں اور بریکٹ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ مزار کے اوپر ایک چھپر کھٹ ہے جس پر سیپ کے ساتھ بہت عمدہ کام کیا گیا ہے ۔ مزار کا مجاور مجھے بھی ہندو

ہی لگا ۔ اس نے مجھے دیکھ کر یہ کہنا شروع کیا کہ یہ اکبر کے گورو شیخ سلیم کی سمادھی ہے ۔ مجھے جتنی بھینٹ چڑھانی ہے ، وہ گولک میں ڈال دوں ۔ شیخ موصوف کے مزار سے جانبِ قبلہ مسجد ہے ۔ جب اکبر نے محضر نامہ کی منظوری کے بعد دینی قیادت سنبھالی تو اس نے جمعہ کے روز اسی مسجد کے منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا تھا ۔ خطبہ اس نے کیا دینا تھا وہ فیضی کی ایک رُباعی پڑھ کر منبر سے نیچے اتر آیا ۔

مسجد کے مشرقی دروازے سے باہر نکلیں تو بائیں ہاتھ رانی جودھا بائی کا محل ہے اس میں گھومتے پھرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی مندر میں گھوم رہے ہیں ۔ رانی نے یہ محل اپنے ذوق کے مطابق ہندوانہ طرز پر تعمیر کروایا تھا ۔

رانی جودھا بائی کے محل سے آگے ایک بہت بڑا کمپاؤنڈ آتا ہے ۔ اس میں ایک عمارت " رُومی سلطانہ کا محل " کے نام سے موسوم ہے ۔ یہ غالباً اس کی بیوی رقیہ سلطان کا محل تھا جو ترکی کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں جانتی تھی ۔ بدیں وجہ اس کا نام رُومی سلطانہ پڑ گیا ۔ اس محل سے قریب ہی ایک تالاب کے وسط میں ایک نشست گاہ ہے جس پر بیٹھ کر اکبر وِرد کیا کرتا تھا ۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ مسلمان تھا ۔ جب اس نے دینِ الٰہی کی داغ بیل ڈالی تو یہ بات قصۂ پارینہ بن کر رہ گئی ۔ اس سے قریب ہی ایک پانچ منزلہ ہوادار بلڈنگ ہے جو پنچ محل کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کی بالائی منزل پر چڑھ کر میلوں تک کا علاقہ نظر آتا ہے ۔ پنچ محل کے بعد " عبادت خانہ " کی عمارت ہے ۔ اس عمارت کے درمیان میں ایک ستون بنا ہوا ہے جس پر منبت کاری کا کام اپنی نظیر آپ ہے ۔ اسی عمارت میں اکبر مذہبی مباحثے کروایا کرتا تھا ۔ جنہوں نے بعد ازاں مناظروں کی صورت اختیار کر لی اور اکبر کو علماء سوء نے دینِ حق سے برگشتہ کر دیا عبادت خانہ کے بعد اسی جیسی ایک اور عمارت ہے جو " بیربل کا محل " کہلاتی ہے ۔ اس کے اندر ایک دیوار پر اکبر کا قد آدم پورٹریٹ بنا ہوا ہے ۔

اس پہاڑی کے نیچے ایک ہاتھی مینار بنا ہوا ہے ۔ جس طرح جہانگیر نے شیخوپورہ میں ہرن مینار بنوایا تھا اسی طرح اکبر نے اپنے ایک محبوب ہاتھی کی قبر بنوا کر اس کے ساتھ یہ مینار بنوا دیا ہے ۔ اس مینار سے قریب ایک بڑا کنواں ہے جہاں سے شاہی محل کو پانی مہیا کیا جاتا تھا ۔ شاہ فتح اللہ شیرازی نے اس کنوئیں کا پانی تین مرحلوں میں

محلوں کی چھتوں پر پہنچا دیا تھا۔ میری اہلیہ کے ماموں زاد بھائی پروفیسر مجتبیٰ احمد علوی نے شاہ فتح اللہ کے اس انتظام کا ایک کتابچے میں ذکر کیا ہے جسے حکومتِ ہند نے اپنے طرح پر شائع کیا ہے۔

ایک سیاح ڈیڑھ پونے دو گھنٹے میں فتح پور سیکری کی تمام عمارتیں دیکھ لیتا ہے۔ فتح پور سے بس کے ذریعے آگرہ پہنچتے ہیں۔ اس بس کا ٹرمینس عید گاہ سے قریب ہے اور اسی علاقے میں سینٹ جانس کالج آگرہ ہے جس کا شمار پاک و ہند کے چوٹی کے کالجز میں ہوتا ہے۔ مشہور نقاد حامد حسن قادری بدایونی (م ۱۹۶۴ء) اور پروفیسر محمد طاہر فاروقی (م ۱۹۷۸ء) اُستاد اسلامیہ کالج پشاور قیام پاکستان سے قبل اس کالج میں پڑھاتے رہے ہیں۔

آگرہ کے ایک سفر میں مجھے بھارگوا ہوسٹل میں مشہور مؤرخ پروفیسر سری واستوا سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ آزادی سے قبل ڈی اے وی کالج لاہور کے شعبۂ تاریخ کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے بھی چیئرمین رہے ہیں۔ انہوں نے مغل فرمانروا اکبر اور نواب شجاع الدولہ پر بڑی بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں۔

راقم متعدد بار آگرہ گیا ہے لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں حضرت ابوالعلاء اکبر آبادی رحمۃ اللہ کے مزار پر نہ جا سکا۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ شاہ عبدالرحیم دہلوی ان سے فیضیاب ہوئے تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدّث فرماتے ہیں کہ اب بھی اگر کوئی شخص ان کے دادا شاہ عبدالرحیم کے مزار پر مراقبہ کرے تو وہ نسبت ابوالعلائیہ محسوس کرے گا۔

گوالیار:

۹ جولائی ۱۹۶۷ء کو مجھے پہلی بار گوالیار جانے کا اتفاق ہوا۔ آگرہ سے گوالیار کا فاصلہ ۷۰ میل ہے اور بس یہ مسافت دو گھنٹے میں طے کر لیتی ہے۔ جب آگرہ سے بس روانہ ہوئی تو مجھے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک غیر مسلم پروفیسر نے پہچان لیا۔ اس نے مجھے یہ اندوہناک خبر سنائی کہ محترمہ فاطمہ جناح کا انتقال ہو گیا ہے۔ آگرہ سے بس چل کر دھولپور میں رُکی۔ مغل فرمانروا بابر کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔ اس نے یہاں ایک باغ لگوایا جہاں وہ تفریح کے لئے آیا کرتا تھا۔ دھولپور سے چند میل کے فاصلے

پر دریائے چنبل ہے۔ یہ وہی تاریخی دریا ہے جس کا ذکر داراشکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان تخت نشینی کے موقع پر آتا ہے۔ داراشکوہ کی یہ بڑی خواہش تھی کہ اورنگ زیب کی فوج کو چنبل عبور کرنے سے رُوکا جائے۔ اسی طرح اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب اس کے بیٹوں معظم اور اعظم کے درمیان تخت نشینی کے لئے جنگ ہوئی تو معظم نے بھی یہ کوشش کی کہ اعظم کو ہر قیمت پر چنبل عبور کرنے سے رُوکا جائے۔ ہمارے زمانے میں پھولن دیوی نے اسی دریا کے کناروں پر دہشت پھیلائی ہوئی تھی۔ راقم نے دریا کے پل پر سے گزرتے ہوئے دریا کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ موسم برسات کے باوجود یہ دریا اپنے کناروں سے بہت نیچے بہتا ہے۔ اس کے کناروں پر سرکنڈوں کے جنگل ہیں جن میں شیر اور دوسرے درندے پائے جاتے ہیں۔

دھولپور اور گوالیار کے درمیان سڑک پر مور اِدھر سے اُدھر آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ گوالیار کا قلعہ ایک بلند پہاڑی پر واقع ہونے کی وجہ سے دُور سے نظر آنے لگتا ہے۔ یہ قلعہ راجپوتوں کے فنِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ راجہ مان سنگھ تنوار نے بھی اس کی تزئین و آرائش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اسے راگ وِدیا کے ساتھ بڑا شغف تھا۔ اس نے گوالیار کو موسیقی کا ایک عظیم مرکز بنا دیا۔ اس نے "مانکتوہل" کے عنوان سے موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ عالمگیری عہد کے ایک نامور امیر فقیر اللہ سیف خان نے راگ درپن کے نام سے اس کا فارسی میں ترجمہ کر دیا اور اس میں بہت سے اضافے بھی کئے۔ یہ کتاب دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے سربراہ ڈاکٹر نور الحسن انصاری (م ۱۹۸۰ء) کی سعی و کاوش سے طبع ہو چکی ہے۔

میرے لئے اس قلعے میں ایک کشش یہ بھی تھی کہ جہانگیر نے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ (م ۱۶۲۴ء) کو یہاں نظر بند رکھا تھا۔ اس نظر بندی کے دوران حضرتِ والا قدر نے قرآن مجید حفظ کیا۔ ان کی سعی و تبلیغ سے صدہا غیر مسلم قیدیوں نے اسلام قبول کیا اور بہت سے فاسقوں اور فاجروں نے اپنے قبلے کی سمت درست کی۔ قید سے رہائی کے بعد یہ ہدایت یافتہ لوگ سرہند میں آبسے تھے اور حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کی وفات کے سو سال بعد جب "روضۃ القیومیہ" احاطۂ تحریر میں آئی تو اس وقت ان لوگوں کی اولاد سرہند میں آباد تھی۔

اسی قلعے میں اورنگ زیب نے اپنے بھائی شہزادہ مُراد کو نظر بند کیا تھا۔ اس کی خواہش پر اس کی محبوبہ سرس بائی کو بھی اس کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔ ایک بار شہزادہ مُراد نے رات کے وقت قید سے فرار ہونے کا انتظام کر لیا۔ جب وہ سرس بائی کو الوداع کہہ کر روانہ ہونے لگا تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ جس سے پہرہ دار چوکنے ہو گئے اور شہزادہ مُراد پکڑا گیا۔ بعد ازاں اورنگ زیب نے گجرات کے دیوان علی نقی کے قتل کے قصاص میں شہزادہ مُراد کو قتل کروا دیا۔

شیر شاہ سوری (م ۱۵۴۵ء) کے جانشین اسلام شاہ (م ۱۵۵۳ء) نے گوالیار کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تو اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ یوں بھی دہلی اور آگرہ کی نسبت یہ مرکزی مقام تھا اور وہاں بیٹھ کر راجستھان پر کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ مغلوں کے آخری دور حکومت میں مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طالع آزما مرہٹہ سردار سندھیہ نے گوالیار کے گرد و نواح پر تسلط قائم کر کے اسے اپنی راجدھانی قرار دیا۔ انگریزوں نے اس ریاست کو تسلیم کر لیا۔ راقم نے گوالیار کے ڈاک کے ٹکٹ اور تانبے کے سکّے دیکھے ہوئے ہیں۔ برطانوی ہند کے ڈاک کے ٹکٹوں پر گوالیار OVER PRINT کیا ہوا تھا۔ تانبے کے سکّے پر ایک طرف مہاراجہ سندھیہ کا پورٹریٹ مضروب تھا اور دوسری جانب ایک گائے کی مُورت کندہ تھی اور اس کے گرداگرد دیوناگری حروف میں گوالیار لکھا ہوا تھا۔ ہندو دکاندار اس سکّے کو، جس پر گائے منقوش تھی، برکت کے لئے اپنی تجوریوں میں رکھتے تھے۔

گوالیار اور لشکر دو جڑواں شہر ہیں۔ لشکر، چھاؤنی یا کینٹ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ گوالیار سے لشکر تک جانے کے لئے رکشا یا ٹمپو مل جاتا ہے۔ وہاں کی تمام تاریخی عمارتیں لشکر میں ہیں۔ گوالیار سے لشکر جاتے ہوئے قلعہ کے نیچے شیخ خانو گوالیریؒ کی درگاہ آتی ہے۔ وہاں کے سجادہ نشین دیوان سید صولت حسین شاہ، سجادہ نشین درگاہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قریبی عزیز ہیں۔ وہ چند سال قبل لاہور تشریف لا کر راقم کو شرف میزبانی بخش چکے ہیں۔

لشکر میں ہی جامع مسجد ہے جو مغل عہد کی یادگار ہے۔ مسجد کے چاروں طرف دکانیں ہیں اور مسجد ان دکانوں کے اُوپر بنائی گئی ہے تاکہ مسجد کے مصارف پُورے

کرنے کے لئے مستقل طور پر آمدنی ہوتی رہے۔ اس مسجد کے نیچے ایک صراف نے مجھے اکبر کے چاندی کے رُوپے دکھائے۔ میرے پاس پہلے ہی اس طرح کے رُوپے موجود تھے اس لئے میں نے انہیں خریدنے میں دلچسپی نہ لی۔

اس مسجد سے تھوڑے ہی فاصلے پر حضرت محمد غوث گوالیاری (م ۱۵۶۳ء) کا روضہ ہے۔ اس کا شمار مغلیہ دورِ حکومت میں تعمیر ہونے والی عظیم عمارتوں میں ہوتا ہے۔ مغلوں کے فنِ تعمیر پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اس مزار کا ذکر اور تصویر ضرور ہوتی ہے۔ وہ دیکھنے میں کسی بادشاہ کا مقبرہ معلوم ہوتا ہے۔ مزار کی سنگِ مرمر کی جالیاں قابلِ دید ہیں۔ مزار تین منزلہ عمارت ہے اور اس پر بڑا باریک اور نفیس کام ہوا ہے۔

حضرت محمد غوث گوالیاری رحمۃ اللہ برِعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں شطاریہ سلسلۂ تصوّف کے سب سے بڑے شیخ تھے۔ انہوں نے "جواہر خمسہ" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا اُردو ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ انہوں نے امرت کنڈ نامی سنسکرت کی ایک کتاب کا بحرالحیاۃ کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کا موضوع منترازم ہے۔ ان کے علاوہ انہوں نے ایک مختصر سا رسالہ بھی تصنیف کیا ہے جو "معراج نامہ" کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ علامہ اقبال کو اس رسالے کی بڑی تلاش رہی لیکن وہ دستیاب نہ ہو سکا۔ راقم نے احمد آباد میں اس کا سراغ لگایا اور اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ شیخ محمد غوث فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کو اس میں شک ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جسمانی معراج ہوا تھا۔ یہ گروہ آنحضرتؐ کے رُوحانی معراج کا قائل ہے حالانکہ اس عاجز کو کئی مرتبہ جسمانی معراج ہوا ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے گجرات کے قیام میں تحریر فرمایا تھا اس لئے علماء گجرات نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ جب یہ فتویٰ قاضی القضاۃ شیخ وجیہ الدین گجراتی کے سامنے توثیق کے لئے پیش کیا گیا تو انہوں نے "مجرم" کو اپنے حضور طلب کیا۔ جب شیخ محمد غوث کو ان کے سامنے لایا گیا تو شیخ وجیہ الدین نے ان کے رُخِ انور کو دیکھ کر فتویٰ چاک کر ڈالا اور حاضرین سے کہا کہ ایسے نُورانی چہرے والا بزرگ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ شیخ علی متقی (م ۱۵۶۷ء) گجرات کے نامور عالم تھے۔ وہ شیخ وجیہ الدین کے اس فعل پر اس قدر خفا

ہوئے کہ اپنے کپڑے پھاڑ کر ان کے گھر پہنچے اور ان سے کہا کہ وہ ترویج کفر و بدعت پر کس طرح راضی ہو گئے؟ شیخ وجیہہ الدین نے کہا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ قال ہے اور شیخ محمد غوث جو کچھ فرماتے ہیں، وہ حال ہے۔ بعد ازاں شیخ وجیہہ الدین نے حضرت محمد غوث کی بیعت کرلی اور ان کے سب سے بڑے خلیفہ بنے۔ ان حالات میں شیخ علی متقیؒ گجرات کی سکونت ترک کر کے حجاز مقدس چلے گئے۔

حضرت محمد غوث گوالیاریؒ کے بابر کے ساتھ بڑے خوشگوار مراسم تھے۔ جب بابر نے گوالیار کا محاصرہ کیا تو ان دنوں شیخِ موصوف کے مرید قلعے کے دروازے کی حفاظت پر مامور تھے۔ انہوں نے اپنے مرشد کا اشارہ ملتے ہی دروازہ کھول دیا اور بابر کی فوج قلعہ کے اندر داخل ہو گئی۔ بابر کے جانشین ہمایوں نے بھی ان کے ساتھ بڑا تعلق رکھا۔ اسی تعلق کی بنا پر شیر شاہ سوری اپنے عہدِ حکومت میں حضرت محمد غوث کے درپئے آزار ہوا اور موصوف گوالیار کی سکونت ترک کر کے گجرات تشریف لے گئے جہاں ان پر کفر کا فتویٰ لگا۔ ہمایوں نے ان کے بھائی شیخ بہلول عرف شیخ پھول کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کرلی تھی۔ ہمایوں کی وفات کے بعد اکبر نے بھی شیخ محمد غوث سے تعلق رکھا۔ بیرم خان نے ایک کروڑ دام سالانہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

حضرت محمد غوث کو موسیقی کے ساتھ بڑا شغف تھا۔ انہوں نے تان سین کو مسلمان کر کے اس کی تربیت کی۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ میاں تان سین اور اس کا بیٹا بلاس خان حضرت محمد غوث کے روضۂ مبارک کے احاطے میں دفن ہوئے ہیں۔ میاں تان سین کا تو باقاعدہ سالانہ عُرس ہوتا ہے۔

پنجاب یُونیورسٹی لائبریری میں رُوزنامہ نوائے وقت کی فائلیں موجود نہیں۔ مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۵۷ء کو نوائے وقت میں میاں تان سین کے عرس کی خبر شائع ہوئی تھی۔ میاں صاحب، حضرت محمد غوث کے باقاعدہ مرید تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اور ان کے فرزند، حضرتِ والا قدر کے روضۂ مبارک کی حدود میں مدفون ہیں۔ ان کے مقبروں پر چھتریاں بنی ہوئی ہیں اور قبروں پر سبز رنگ کی چادریں پڑی رہتی ہیں۔ گوالیار کے موسیقار ان کے مزار پر بیٹھ کر گھنٹوں ریاض کرتے ہیں۔ میری موجودگی میں بھی ایک معمر موسیقار وہاں بیٹھ کر ریاض کر رہا تھا۔

تاریخ معصومی سندھ کے مصنف میر محمد معصوم بھکری (م ۱۰۱۴ھ) بڑے بلند پایہ خطاط تھے۔ وہ جہاں کہیں جاتے ایک پتھر کی سل پر چند اشعار لکھ کر بطور یادگار کسی عمارت کی دیوار پر نصب کر دیتے۔ انہوں نے حضرت محمد غوث کے مقبرے کی ایک دیوار پر ایسی ہی یادگار نصب کی ہے۔ مزار کے احاطے میں سنگِ سرخ سے بنی ہوئی ایک مسجد بھی ہے، جو قابلِ دید ہے۔ حضرت کا مقبرہ ایسا خوشنما ہے کہ اسے دیکھنے سے طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ راقم تین بار گوالیار جا چکا ہے۔

حضرت محمد غوث کا مقبرہ ایسی جگہ واقع ہے کہ گوالیار سے جھانسی جانے والی ریلوے لائن اس کے قریب سے گزرتی ہے اور ٹرین سے روضۂ مبارک کا منظر صاف دکھائی دیتا ہے۔ آگرہ سے براستہ گوالیار، جھانسی جانے والی ٹرین قلعہ کے تین اطراف سے گھومتی ہے۔ قلعہ بلندی پر واقع ہونے کی بنا پر مشرقی جانب کے مکانات اور منادر دیر تک نظر آتے رہتے ہیں۔ ایک بار بھوپال کے چند مسلمان ٹرین میں سفر کر رہے تھے میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جب گوالیار آیا تو وہ اسے کفر گڑھ کہہ کر گالیاں بکنے لگے۔

آزادی کے بعد جب ریاستیں ختم ہوئیں تو گوالیار کا الحاق مدھیہ پردیش سے ہوا اور اسے ہی مدھیہ پردیش کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ گوالیار کا محلِ وقوع ایسا ہے کہ وہ یُوپی کی سرحد سے قریب واقع ہے اس لئے عوام کے لئے سرکاری دفاتر کے چکر لگانے میں دشواری پیش آنے لگی۔ اس پر بھارتی حکومت نے گوالیار کی بجائے بھوپال کو مدھیہ پردیش کا دارالحکومت بنا دیا۔

گوالیار میں وانگا ہوٹل بڑا مشہور ہے۔ میں نے گوالیار کے پہلے سفر میں وہیں کھانا تناول کیا۔ وہ کھانا اس قدر لذیذ تھا کہ دوسرے دونوں سفروں میں راقم کھانے کے لئے وہیں گیا۔ اب بھی گوالیار جانے کی بڑی تمنا ہے، دیکھئے یہ موقع کب ملتا ہے؟

الہ آباد

شیراز ہند جونپور سے راقم الہ آباد پہنچا۔ اس کا پرانا نام پریاگ تھا۔ اسلامی عہد میں اسے الہ آباد کہنے لگے۔ یہاں ہندوؤں کے تین مقدس دریاؤں کا سنگم ہے۔ گنگا اور جمنا تو نظر آتے ہیں لیکن "تیسرا دریا" سرسوتی نظر نہیں آتا۔ یہ غالباً فرضی دریا ہے جو یہاں گنگا اور جمنا میں آملتا ہے۔ جمنا کا پانی ہلکے نیلے رنگ کا ہوتا ہے اور گنگا کا ملیالہ۔ گنگا قدرے نشیب میں بہتی ہے اس لئے جمنا کا پانی اسے بڑی تیزی کے ساتھ کاٹتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ دونوں دریاؤں کے دھارے بڑی دور تک الگ الگ بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حضرت جگر مرادآبادی نے شاید یہی منظر دیکھ کر کہا تھا:

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
لب سواد ساحلِ گنگا و گلگشتِ جمن ساقی

گنگا، جمنا اور سرسوتی کا سنگم ہندوؤں کے ہاں بڑا مقدس تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے مُردوں کی راکھ اور پھول (ہڈیاں) یہاں لاتے ہیں۔ مُردوں کے لواحقین کشتی میں سوار ہو کر ایک پروہت کی معیت میں سنگم پر پہنچتے ہیں اور اس کی دعاؤں کے بعد پھول اور راکھ دریا میں بہا دیتے ہیں۔ ہر بارہ سال بعد سنگم پر کُنبھ کا میلہ لگتا ہے جس میں ہندوستان بھر سے سَنت اور سادھو آکر شریک ہوتے ہیں۔ گزشتہ کُنبھ کے میلے میں ایک کروڑ سے زائد افراد شریک ہوئے تھے۔

مغل فرمانروا اکبر نے سنگم پر ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ اس کے ایک طرف جمنا بہتا ہے اور دوسری سمت گنگا۔ مغلوں کے زمانے میں الہ آباد صوبے کا صدر مقام تھا اور اس قلعہ کے اندر ٹکسال تھی جہاں سکّے ڈھالے جاتے تھے۔ راقم کے ذخیرۂ مسکوکات میں الہ آباد کی ٹکسال میں ڈھالے گئے سکّے موجود ہیں۔

الہ آباد بظاہر ہندوؤں کا بہت بڑا تیرتھ ہے لیکن دیکھنے میں مسلمانوں کا شہر نظر آتا ہے۔ شہر میں مندر کم اور مسجدیں زیادہ ہیں۔ راقم نے وہاں دیکھا کہ بازاروں میں جا بجا

مسجدیں ہیں جن کے نیچے دکانیں ہیں اس وقت بھی شہر میں ۴۰ فیصد مسلمان آباد ہیں۔ الہ آباد میں بارہ دائرے (خانقاہیں) ہیں۔ جن میں سے دائرہ شاہ فاخر خاص طور پر مشہور ہیں۔ دائرہ شاہ اجملؒ کو امام بخش ناسخ کی وجہ سے بڑی شہرت ملی ہے۔ یہ دائرہ خسرو باغ سے قریب ہے۔ اس کے بانی شاہ اجملؒ کے پردادا کے بھائی شیخ محمد افضل (م ۱۷۴۳ء) تھے۔ شیخ موصوف کا انتقال ۲ جنوری ۱۷۴۳ء کو ہوا تو ان کے داماد اور بھتیجے شیخ خوب اللہ ان کے جانشین ہوئے۔ انہوں نے اپنے مُرشد کے کام کو آگے بڑھایا۔ شیخ خوب اللہ کا وصال ۱۳ اکتوبر ۱۷۶۱ء کو محمد شاہ کے عہد میں ہوا تو ان کی مسند پر ان کے فرزند محمد فاخر زائر تشریف فرما ہوئے۔ ان کے دور میں یہ دائرہ مرجعِ خلائق بن گیا۔ شیخ محمد فاخر زائر نے ۲۰ اکتوبر ۱۸۰۱ء کو وفات پائی تو ان کے فرزندِ ارجمند شیخ قطب الدین مسند آراء ہوئے۔ ان کا انتقال حج کے دوران فروری ۱۷۷۳ء میں مکّہ مکرمہ میں ہوا تو ان کی جگہ شاہ محمد اجملؒ گدی نشین ہوئے۔ ان کے زمانے میں اس دائرے کی شہرت چار دانگِ عالم میں پھیل گئی اور یہ دائرہ انہی کے نام سے منسوب ہو گیا۔ شاہ محمد اجملؒ ۴۷ سال تک مسندِ ارشاد پر تشریف فرما رہے۔ ان کے زمانے میں پنجاب سے بھی لوگ ان سے فیضیاب ہونے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ پیر غلام دستگیر نامی کے اجداد میں سے پیر قلندر شاہ (م ۱۸۳۳ء) رتہ پیراں (ضلع نارووال) سے الہ آباد جا کر شاہ محمد اجملؒ سے فیضیاب ہوئے۔ امام بخش ناسخ (م ۱۸۳۸ء) انہی کے زمانے میں دائرہ شاہ اجملؒ میں قیام پذیر رہا تھا۔ اس کے دائرہ میں قیام کی وجہ سے یہ دائرہ علمی و ادبی حلقوں میں معروف ہو گیا۔ شاہ صاحب کے ایک پوتے غلام اعظم نے باقاعدہ ناسخ کی شاگردی اختیار کرلی۔ غلام اعظم الہ آباد کی سکونت ترک کر کے لاہور آبسا اور یہاں اس کا شمار اولیاء اللہ میں ہونے لگا تھا۔ شاہ محمد اجملؒ کا ایک نواسہ شاہ علی جعفر (م ۱۸۳۳ء) بھی ایک باکمال شاعر تھا۔ اس کے اُستاد کا کسی نے نام نہیں لکھا۔ عین ممکن ہے کہ اسے بھی ناسخ سے تلمذ ہو۔ شاہ محمد اجملؒ نے ۳۰ اگست ۱۸۲۱ء کو رحلت فرمائی تو ان کے فرزند شاہ ابُوالمعالیؒ مسند آراء ہوئے۔ لیکن وہ اپنے والدِ بزرگوار کے مقام تک نہ پہنچ سکے۔ ان کا فرزند غلام اعظم لاہور چلا گیا۔ شاہ علی جعفر کے دو فرزند تھے۔ ان میں سے ایک کا نام محمد اکبر عرف محمد جان قدسی تھا۔ وہ بڑے اچھے شاعر تھے دوسرے فرزند کا نام شاہ علی

کبیر تھا لیکن انہوں نے اپنے عرف میرن جان سید سے شہرت پائی - آنجہانی مالک رام (م ۱۹۹۳ء) کو اس خانوادے کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا -

شاہ اجمل ، ان کے اجداد اور احفاد کی قبریں کھلے آسمان کے نیچے ہیں اور ان کے جانب قبلہ ایک مسجد ہے جو مسلم آبادی میں ہونے کی وجہ سے آباد ہے - دائرہ سے ملحقہ محلّہ بھی اسی نام سے موسوم ہے - وہاں محمد کاظم عثمانی نام کے ایک بزرگ رہتے تھے - جن سے میری خط و کتابت تھی - انہوں نے "قصاصِ عثمانؓ" کے عنوان سے ایک بلند پایہ کتاب بھی تحریر کی ہے ، جس کے دو نسخے انہوں نے راقم کے نام ارسال کئے تھے - انہوں نے قصاصِ عثمانؓ میں کھل کر اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مؤقف کی حمایت کی ہے - راقم ان کی خدمت میں حاضر ہوا - ان کے دو جواں سال بھتیجے ، جو کسی بنک میں ملازم تھے ، وہ بھی ہمارے ساتھ شریکِ گفتگو ہو گئے - عثمانی صاحب نے راقم کو بتایا کہ ان کا نسبی تعلق حضرت عثمانِ غنیؓ سے نہیں بلکہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مُرشد حضرت عثمان ہَرونیؒ سے ہے -

راقم آثم کو دائرہ شاہ محبّ اللہ الہ آبادی (م ۱۹۳۰ء) دیکھنے کی بڑی آرزو تھی - کیمبرج یونیورسٹی میں میرے ایک ساتھی عبدالرحمن داعی نے ، جو علامہ نجیب اشرف ندوی (م ۱۹۶۸ء) کے شاگرد تھے ، پروفیسر آربری (م ۱۹۶۹ء) کی نگرانی میں شاہ صاحب پر پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھا تھا - شاہ صاحب نظریۂ وحدت الوجود میں رسوخ کی بنا پر ابنِ عربیِ ثانی کے لقب سے مشہور ہیں - راقم کے شجرۂ طریقت میں بھی ان کا نام نامی آتا ہے میں ایک رکشا میں سوار ہو کر الہ آباد کے بازاروں سے گزرتا ہوتا بارہ کھمبہ میں دائرہ شاہ محبّ اللہ پہنچا - وہاں مسجد اور مدرسہ موجود ہیں لیکن ان کا مزار وہاں نہیں ہے - یہ مسجد داراشکوہ کے دَورِ اقتدار میں تعمیر ہوئی تھی - مسجد کے اوپر ایک سفید گنبد ہے جو بہت ہی خوشنما ہے - اس کے علاوہ مسجد کی چھت پر مغل وضع کی دو برجیاں ہیں - وہ بھی بڑی دلکش ہیں - میرے استفسار پر وہاں موجود حضرات نے مجھے بتایا کہ ان کا مزار کیڈ گنج میں ہے - میں ایک رکشا میں سوار ہو کر کیڈ گنج پہنچا اور وہاں ان کا مزار تلاش کر لیا - ان کی قبر ایک چبوترے پر کھلے آسمان کے نیچے ہے - چبوترے سے نیچے بہت سی قبریں ہیں جن میں اصغر گونڈوی کی قبر قابلِ ذکر ہے - ان کا انتقال ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو

صبح تین بجے فالج کے حملے سے ہوا تھا - ان کی شخصیت اور فن پر ڈاکٹر محمد اقبال احمد خاں نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس پر انہیں ڈاکٹریٹ ملی تھی - یہ مقالہ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور نے حال ہی میں شائع کر دیا ہے -

شاہ محبّ اللہ آبادیؒ کے مزار پر حاضری دینے کے بعد راقم کی ملاقات ان کی درگاہ میں واقع مسجد کے امام کے ساتھ ہوئی - انہوں نے شاہ صاحب کے بارے میں بڑی مفید باتیں کیں ، جو عام مساجد کے مولوی نہیں کرتے -

الہ آباد کے دائروں میں دائرۂ شاہ محمدی بھی بڑی شہرت کا حامل ہے - شہر سے باہر ایک بستی دارا گنج کہلاتی ہے - وہاں شاہ دِلرُبا کا مزار ہے - شہزادہ دارا شکوہ کی ان کے ساتھ باقاعدہ خط و کتابت رہتی تھی - یہ خط و کتابت شائع ہو چکی ہے - راقم کے خیال میں کسی اسکالر نے ان دائروں پر ڈھنگ سے کام نہیں کیا -

الہ آباد یونیورسٹی کا شمار برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی درجۂ اوّل کی یُونیورسٹیوں میں ہوتا ہے - وہاں کا شعبۂ تاریخ بڑا مشہور ہے - وہاں سر شفاعت احمد ، رُشبروک ولیمز ، بینی پرشاد ، بنارسی پرشاد سکسینہ ، ایشوری پرشاد اور ڈاکٹر تارا چند جیسے فاضل مؤرخین پڑھاتے رہے -

شعبۂ انگریزی میں اُردو کے نامور شاعر رگھو سہائے فراق گورکھپوری (م ۱۹۸۲ء) پڑھاتے رہے ہیں - ان کا مضمون انگریزی تھا لیکن وہ اُردو کے بلند پایہ شاعر تھے - ان کا انتقال ۳ مارچ ۱۹۸۲ء کو دہلی میں ہوا لیکن ان کا جسد خاکی الہ آباد لے جا کر سنگم پر سپرد آتش کیا گیا -

الہ آباد یُونیورسٹی کی طرح الہ آباد ہائی کورٹ بھی بہت مشہور ہے - یُوپی کا دارالحکومت لکھنؤ ہے لیکن ہائی کورٹ الہ آباد میں ہے - ہائی کورٹ کے ججوں میں اُردو کے عظیم شاعر اور محسن آنند نرائن مُلّا اور مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فاضل وائس چانسلر سر شاہ سلیمان خاص طور پر مشہور ہیں - شاہ صاحب نے آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کا رَد کیا تھا - ہائی کورٹ کے وکلاء میں سر تیج بہادر سپرو (م ۱۹۴۹ء) اور پنڈت موتی لعل نہرو (م ۱۹۳۱ء) سرفہرست ہیں -

الہ آباد میں نہرو خاندان کی رہائش گاہ "آنند بھون" بھی دیکھنے کی چیز ہے - اسے

اب قومی یادگار کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ بھارتی حکومت کے خیال میں جنگِ آزادی آنند بھون میں بیٹھ کر ہی لڑی گئی تھی۔ اس عمارت کا طرزِ تعمیر بھی بڑا دلکش ہے اور اس میں ہندوؤں کے فنِ تعمیر کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔

راقم آثم کے لئے الہ آباد میں سب سے زیادہ کشش شہزادہ خسرو کے مقبرے میں تھی۔ یہ مقبرہ خسرو باغ میں ہے اور اس کے ارد گرد کی آبادی خسرو آباد کہلاتی ہے۔ یہ باغ جہانگیر نے تعمیر کیا تھا۔ اس کا رقبہ ہمارے شالا مار باغ جتنا ہو گا۔ اس باغ میں سب سے پہلے شہزادہ سلیم کی رانی مان بائی عرف شاہ بیگم کی سمادھ بنی تھی۔ وہ سلیم کی چہیتی بیوی تھی۔ سلطان النساء، سلیم کی سب سے پہلی اولاد تھی۔ اکبر کے آخری دورِ حکومت میں شہزادہ سلیم نے اپنے باپ کے خلاف الہ آباد میں بغاوت کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اکبر کی ایک ملکہ سلیمہ سلطان نے، جو اکبر کی پھوپھی زاد تھی، درمیان میں پڑ کر باپ بیٹے میں صلح کروا دی اور وہ الہ آباد جا کر سلیم کو آگرے لے آئی اور اسے اکبر کی والدہ حمیدہ بیگم کی پناہ میں دے دیا۔ اس کے بعد شہزادہ خسرو اپنے باپ سلیم کے نقشِ قدم پر چل پڑا۔ ان حالات میں خسرو کی ماں شاہ بیگم نے ۲۶ مئی ۱۶۰۴ء کو افیم کھا کر خودکشی کر لی۔ سلیم کو اس کی وفات کا بڑا رنج ہوا۔ اکبر نے اس موقع پر سلیم کو تعزیت کا خط لکھا اور اسے تسلی دی۔ سلیم نے اس کی سمادھی پر مقبرہ تعمیر کروایا۔ اس گنبد کے اندر اور بھی کئی قبریں ہیں۔ درمیان میں سب سے اونچی "قبر" شاہ بیگم کی ہے۔ غالباً اسے یہاں سردِ آتش کیا گیا تھا۔ اس کی "قبر" بھی بنا دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ گنبد کے اندر جتنی قبریں ہیں ان پر کلمہ طیبہ اور اسم ذات (اللہ) مرقوم ہے لیکن شاہ بیگم کی "قبر" پر کلمہ اور اسمِ ذات منقوش نہیں ہے۔ یہ مقبرہ تین منزلہ ہے اور اس کا طرزِ تعمیر دوسرے تین مقبروں سے، جو اس احاطے میں موجود ہیں، بالکل مختلف ہے۔ اس مقبرے کی پیشانی پر شولنگ نما کوئی چیز بنی ہوئی ہے اور گنبد کی جگہ راجپوتی طرز کی چھتری بنی ہوئی ہے۔

شاہ بیگم کے مقبرے سے قریب ہی اس کی بیٹی سلطان النساء نے اپنے لئے ایک گنبد دار دو منزلہ مقبرہ تعمیر کروایا تھا۔ مقبرے کی پیشانی پر اس کا سال تعمیر ۱۰۳۳ھ / ۱۶۲۴ء مرقوم ہے۔ اس گنبد کے اندر کوئی قبر نہیں ہے۔ سلطان النساء نہ جانے کہاں

مدفون ہے؟ اس مقبرے میں منبت کاری کا کام لائقِ تعریف ہے۔

اسی احاطے میں ایک مقبرہ بغیر قبر کے موجود ہے۔ یہ مقبرہ اکبر شاہ ثانی (م ۱۸۳۷ء) کے فرزند مرزا جہانگیر نے اپنے لئے تعمیر کروایا تھا لیکن سلطان النساء کی طرح اسے بھی یہاں دفن ہونا نصیب نہیں ہوا۔ جہانگیر مرزا نے انگریز ریذیڈنٹ MR.SETON پر پستول چلایا تھا۔ انگریزوں نے اسے اس جرم میں گرفتار کر کے الہ آباد میں نظر بند کر دیا جہاں بحالتِ قید ۱۸۲۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کا مزار دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کی درگاہ میں محمد شاہ اور شہزادی جہاں آراء بیگم کی قبروں کے ساتھ ایک الگ حجرے میں ہے۔ ایک روائت یہ بھی ہے کہ مرزا جہانگیر کو امانتاً الہ آباد میں اس کے تعمیر کردہ مقبرے میں دفنایا گیا اور بعد ازاں اس کا تابوت دہلی منتقل کر دیا گیا۔

اس احاطے میں چوتھا گنبد شہزادہ خسرو کا ہے۔ وہ اگست ۱۵۸۶ء میں لاہور میں پیدا ہوا۔ سب سے بڑا پوتا ہونے کے ناتے وہ اکبر سے بہت قریب تھا۔ اکبر کے آخری ایامِ حیات میں جب اس کے ولی عہد سلیم نے باغیانہ رویہ اختیار کیا تو اکبر کے بعض مصاحب سلیم کی بجائے خسرو کی تخت نشینی کے لئے راہ ہموار کرنے لگے۔ وہ راجہ بھگوان داس کچھواہہ کا نواسہ اور راجہ مان سنگھ کا بھانجا ہونے کے علاوہ اکبر کے دودھ شریک بھائی خانِ اعظم مرزا عزیز کوکتاش کا داماد بھی تھا۔ اس لئے اسے راجپوتوں کے علاوہ خانِ اعظم اور اس کے مصاحبوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اکبر کی وفات سے دو تین روز قبل حالات نے پلٹا کھایا۔ نواب مرتضیٰ خاں فرید بخاریؒ کے گھر میں حضرت [redacted] ثانی کے دامنِ ارادت سے وابستہ اُمراء نے میٹنگ کر کے سلیم کی حمایت کا فیصلہ کیا اور سلیم سے، جو شاہی محل سے نکل کر نواب مرتضیٰ خان فرید بخاریؒ کے گھر میں پناہ لے چکا تھا، وعدہ لیا کہ وہ بادشاہ بن کر اسلام کی حمایت کرے گا۔ اس میٹنگ کی روئداد اسد قزوینی نے "واقعاتِ اسد قزوینی" میں نقل کی ہے۔ وہ ان تمام واقعات کا عینی شاہد تھا۔

اتفاق سے قلعے کا ایک دروازہ، جو خضری دروازہ کہلاتا تھا، نواب موصوف کے سپاہیوں کے کنٹرول میں تھا۔ نواب صاحب اپنے حامی اُمراء کی معیت میں سلیم کو لے

کر اسی دروازے کے راستے اکبر کی خوابگاہ میں پہنچے۔ انہوں نے سلیم کو اکبر کے قدموں میں ڈال دیا۔ اکبر کی زبان بند ہو چکی تھی۔ اس نے اشارے سے کہا کہ اس کی پگڑی سلیم کے سر پر رکھ دیں اور ہمایوں کی تلوار اس کی کمر سے باندھ دیں۔ یہ ایک طرح سے سلیم کی جانشینی کا اعلان تھا۔ اس کے بعد اُمراء سلیم کو دربار میں لے گئے۔ اسے تخت پر بٹھایا اور مبارک باد پیش کی۔ اکبر ہنوز زندہ تھا اور محل کے اندر خسرو کے حمایتی موجود تھے۔ اس لئے سلیم کی جان کو خطرہ تھا۔ ان حالات میں نواب مرتضیٰ خان فرید بخاری اسے دوبارہ اپنے گھر لے گئے۔ اس واقعہ کے دو روز بعد اکبر فوت ہو گیا اور مراسم تعزیت ادا کر کے سلیم، جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ راجہ مان سنگھ اپنے بھانجے خسرو کو لے کر جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے باپ کے قدموں میں ڈال دیا۔ جہانگیر نے اسے اٹھا کر گلے لگا اور اس کا قصور معاف کر کے اسے مان سنگھ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ چند روز بعد خسرو اپنے دادا کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بہانے محل سے نکلا اور پنجاب کی جانب فرار ہو گیا۔ جہانگیر نے نواب مرتضیٰ خان فرید بخاری کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا اور خود بھی ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ خسرو نے لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ نواب موصوف سلطان پور لودھی پہنچ گئے ہیں تو وہ لاہور کا محاصرہ اٹھا کر کابل جانے کے ارادے سے راوی پار کر گیا۔ وہ چناب پار کرنے ہی والا تھا کہ نواب صاحب وہاں پہنچ گئے۔ خسرو اور اس کے ساتھی جان کی بازی لگا کر لڑے اور اس جھڑپ میں نواب صاحب کے متعدد اعزہ کام آئے اس کے باوجود خسرو کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہوا۔ یہ ۸ مئی ۱۶۰۶ء کا واقعہ ہے۔ اسی اثناء میں جہانگیر بھی وہاں پہنچ گیا۔ جس مقام پر طرفین میں جنگ ہوئی تھی وہ بھیروں وال کہلاتا تھا۔ جہانگیر نے وہ موضع نواب صاحب کو بطورِ انعام بخش دیا۔ نواب صاحب نے عرض کیا کہ بھیروں وال خالص ہندوانہ نام ہے، اسے تبدیل کر دیجئے۔ جہانگیر نے اس کا نام فتح آباد رکھا۔ یہ موضع سوہدرہ کے آس پاس ہونا چاہیے۔ راقم کی حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی (م ۱۹۹۳ء) کے ساتھ اس مسئلے پر خط و کتابت ہو چکی ہے۔ اس نام کا کوئی موضع وہاں نہیں ہے۔ شاید یہ موقع دریا برد ہو چکا ہے۔

جہانگیر شہزادہ خسرو اور اس کے ساتھیوں کو لے کر لاہور آیا۔ اس نے موجودہ

ریلوے اسٹیشن، ریلوے روڈ، میکلوڈ روڈ، اور ریلوے پولیس لائنز کے علاقے میں خسرو کے ساڑھے سات صد ساتھیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا اور شہزادے کو یہ منظر دکھا کر بینائی سے محروم کر دیا۔ اسے اور کیا دیکھنے کی خواہش ہو گی۔ ایسے ہی موقع پر کسی نے کیا خوب کہا ہے:

شاہان کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
پھرتی ان کی آنکھوں میں سلائیاں دیکھیں

خسرو جہانگیر کی قید میں رہا۔ جدروپ گسائیں کی سفارش پر اس نے خسرو کے بارے میں اپنی پالیسی بدلی اور ماہر اطباء سے علاج کے بعد اس کی بینائی کسی حد تک لوٹ آئی۔ انہی ایام میں شاہجہان کی درخواست پر جہانگیر نے خسرو کو اس کی تحویل میں دے دیا۔ ایک روایت کے مطابق شاہجہان نے اسے تھوڑی تھوڑی مقدار میں زہر دینی شروع کر دی جس کے اثر سے ۲۹ جنوری ۱۶۲۲ء کو دکن میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی میت الہ آباد لے جا کر اس مقبرے میں سپردِ خاک کی گئی۔

خسرو کے مقبرے کی دیواروں پر کئی جگہ اسم ذات (اللہ) لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے حسرت افزاء شعر لکھے ہوئے ہیں ان سب کو نقل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کی وجہ میرا تساہل نہیں بلکہ مقبرے کے اندر اندھیرا تھا جس کی وجہ سے شعر صحیح نہیں پڑھے جاتے تھے۔ راقم نے تین اشعار بطورِ نمونہ نقل کئے ہیں:

خاک پیراہن شد از خار قضاء در باغِ عمر
ہم زمین بگریست ہم از آسمان فریاد شد
شد قبا بر قامتِ مردم قبا در ماتمش
شاہ خسرو را بسوی خلد چوں ارشاد شد

۱۰۳۱ھ

شد غریقِ رحمت حق چوں ولی پاک بود
خاصا درگاہ خدا و ہمدم استاد بود

اس مقبرے کی پیشانی پر ایک لوح نصب ہے۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے راقم نے اسے بمشکل یوں پڑھا ہے:

بروِ ملایک رحمت ہمیشہ نُور نثار
زہی تنومند گُلو بریں برگِ خاک
خرد ز سالِ بنائش بصد نتیجۂ فکرت
نوشت با قلم اختراع " روضۂ پاک "
۱۰۲۲ھ کتبہ شبیر سلطان سرہندی

شہزادہ خسرو کے پہلو میں اس کے فرزند داور بخش عرف بلاقی کی قبر ہے۔ جب ۲۹ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو جہانگیر کا انتقال ہوا تو اس وقت شاہجہان دکن میں تھا۔ اسے دارالحکومت پہنچنے میں بہت دن لگ جاتے۔ ان حالات میں نور جہان نے اپنے داماد شہریار کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور وزیرِ سلطنت آصف خاں نے خسرو کے بیٹے داور بخش عرف بلاقی کو مصنوعی تخت پر بٹھا کر اس کے نام کا خطبہ پڑھوا دیا۔ جب آصف خان نے شہریار کو شکست دے کر نور جہاں کے منصوبے کو ناکام بنا دیا تو شاہجہان کی تخت نشینی کے راستے میں حائل تمام رکاوٹیں دُور ہو گئیں۔ شاہجہان نے آصف جاہ کو حکم دیا کہ وہ تخت کے تمام دعویداروں کو مَوت کے گھاٹ اُتار دے۔ چنانچہ ۲۳ جنوری ۱۶۲۸ء کو بلاقی سمیت چودہ شہزادے جنّت کو سدھارے۔ آصف خان نے بلاقی پر اتنی مہربانی ضرور کی کہ اس کا جسدِ خاکی الہ آباد بھجوا دیا جہاں اسے اس کے بدنصیب باپ خسرو کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا۔

اس باغ کے اندر ایک مقبرہ " بی تنبولن کا مقبرہ " کہلاتا ہے۔ اس مقبرے کے اُوپر بہت اچھی نشست گاہ بنی ہوئی ہے جہاں سیّاح بیٹھے رہتے ہیں۔ عوام میں یہ مشہور ہے کہ یہ مقبرہ اس تنبولن کا ہے جو شہزادہ خسرو کو پان بنا کر کھلایا کرتی تھی۔ اسی طرح یار لوگوں نے دہلی میں ہمایوں کے مقبرے سے قریب ایک گنبد کو حاجی شریعت اللہ کا مزار مشہور کر دیا ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہمایوں کا حجام تھا۔ ظاہر ہے کہ شہزادوں اور شاہی خاندان کے افراد کے مقبروں میں بی تنبولن اور شریعت اللہ حجام کا کیا کام؟

یہ سب مقبرے ایک ہی سیدھ میں ہیں۔ مان بائی عرف شاہ بیگم کا مقبرہ باغ کے صدر دروازے کے عین سامنے ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ باغ اسی کے لئے

بنایا گیا تھا اور باقی مقبرے بعد میں تعمیر ہوئے تھے۔ صدر دروازے کی پیشانی پر ایک کتبہ نصب ہے جس پر یہ عبارت منقوش ہے:

" حسبُ الحکم حضرت شاہنشاہے خلافت پناہے ظلِ الٰہے
نُور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی "

یاحی یاقیّوم   اللہ خیر حافظا

باہتمام مرید با اخلاص آقا رضا معمار
ایں بنای عالی صُورتِ اتمام یافت۔ ۱۰۱۵ھ

خسرو باغ دیکھ کر راقم بازار نخاس کہنہ دیکھنے گیا۔ یہ الہ آباد کا ایک بارونق بازار ہے۔ مجھے سراج بوٹ ہاؤس دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ الہ آباد میں اس کا وہی مقام ہے جو کسی زمانے میں لاہور میں کرنال بُوٹ شاپ کا تھا۔ ایک بار الہ آباد میں کانگرس کا اجلاس تھا۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس (م ۱۹۴۵ء) بھی کانگرس کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے کلکتہ سے الہ آباد آئے۔ اجلاس کے خاتمے پر ان کے جُوتے کھو گئے۔ سراج بُوٹ ہاؤس کے ایک سابق سیلز مین منصور احمد ساکن کنڈیاں نے راقم کو بتایا کہ رات کا وقت تھا۔ نیتاجی ننگے پاؤں سراج بُوٹ ہاؤس پہنچے۔ سیلزمینوں نے فوراً درجنوں جُوڑے انہیں دکھائے۔ نیتاجی کو ایک جُوڑا پسند آگیا۔ انہوں نے اس کے دام پوچھے تو سراج بُوٹ ہاؤس کے مالک نے کہا کہ ان کا ان کی دکان پر تشریف لانا ہی ان کے لئے بڑا اعزاز ہے۔ اسے اس بات کی خوشی ہے کہ انہیں جُوتوں کا ایک جُوڑا پسند آگیا ہے۔ یہی اس کے دام ہیں۔ میری یہ خواہش بیس سال بعد پوری ہوئی۔

الہ آباد کے ایک بازار میں ایک فوّارے کے اندر بُت نصب ہے۔ ایک دیہاتی عورت نے پانی کا ایک گھڑا اپنے سر پر دھرا ہوا ہے اور دوسرا گھڑا اپنے کولھے پر اٹھایا ہوا ہے۔ فنکار نے یہ بُت اس انداز سے بنایا ہے کہ اندر ہی اندر ان گھڑوں میں پانی جاتا ہے اور وہ اُچھل رہے ہیں۔ سر پر اٹھائے ہوئے گھڑے سے جو پانی نیچے گر رہا ہے اس کے ساتھ جس انداز سے اس کے کپڑے " بھیگ " رہے ہیں، وہ منظر دیدنی ہے۔

الہ آباد دیکھ کر میں بذریعہ کالکا میل علی گڑھ روانہ ہوا۔ یہ چھ ساڑھے چھ گھنٹے کا سفر ہے اور کالکا میل بڑی تیز رفتاری سے یہ سفر طے کرتی ہے۔ راستے میں کانپور، اٹاوہ

اور پھپھوند آتے ہیں ۔ اٹاوہ کو نواب محسن الملک (م ۱۹۰۷ء) کی وجہ سے شہرت ملی ہے اور پھپھوند کو احمق پھپھوندوی (م ۱۹۵۷ء) نے مشہور کیا ہے ۔

الہ آباد سے علی گڑھ تک چھ ساڑھے چھ گھنٹے کا سفر تھا ۔ راقم نے اپنے سوٹ کیس سے اُردو کی کوئی کتاب نکالی اور اسے پڑھنا شروع کر دیا ۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ بعد میں نے کتاب بند کی تو میرے سامنے والی سیٹ پر ایک ہندو خاتون بیٹھی تھی ۔ اس نے مجھے بڑی حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا کہ میں نے اُردو کہاں سے سیکھی ہے ؟ میں نے کہا لاہور سے ۔ اس نے دوسرا سوال کیا: اب کہاں رہتے ہیں ؟ میں نے جواب دیا: لاہور میں۔ اس نے اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے تیسرا سوال کیا: وہ کیسے ؟ وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ میں ہندو ہوں اور ہندو کے لاہور میں رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ میں نے اس کی حیرانی ختم کرنے کے لئے کہا کہ میں مسلمان ہوں اور لاہور میں رہتا ہوں ۔ اس نے اس پر اظہار مسرت کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ اوکاڑ روڈ کرشن نگر کی رہنے والی ہے اور وہاں ان کا گھر " بیل والا گھر " کے نام سے مشہور تھا اور صرف اتنا ہی کہنے پر تانگے والے وہاں پہنچا دیتے تھے ۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ شملہ میں رہتی ہے ۔ اس کا شوہر رام جی کو پیارا ہو چکا ہے اور الہ آباد میں اس کے سسرالی رشتے دار رہتے ہیں ۔ وہ یہاں کسی کام کے سلسلے میں آئی تھی ۔ فتح پور پہنچ کر اس نے مجھے چائے پلائی اور ٹونڈلہ پہنچ کر میں نے اس احسان کا بدلہ چکا دیا ۔ وہاں ریلوے اسٹیشنوں پر مٹی کے آبخوروں میں چائے فروخت کرتے ہیں اور چائے پی کر آبخورہ توڑ دیتے ہیں ۔ اس خاتون نے راقم کو بتایا کہ یُو پی میں چھوت چھات باقی علاقوں کی نسبت زیادہ ہے ، اس لئے یہاں کپّوں میں چائے پینے کی بجائے آبخوروں کے استعمال کا رواج ہے ۔ میں شام کو نماز مغرب سے چند منٹ قبل علی گڑھ پہنچ گیا جہاں میرے بیوی بچے میرا انتظار کر رہے تھے ۔

کانپور اور اس کے مضافات

اگست ۱۹۸۳ء میں راقم الحروف کو کانپور جانے کا موقع ملا ۔ لکھنؤ سے بس کے ذریعے دو گھنٹے میں کانپور پہنچ جاتے ہیں ۔ کانپور دریائے گنگا کے کنارے آباد ہے ۔ اُن دنوں دریا طغیانی پر تھا ۔ سڑک کے کنارے ایک پتھر پر کانپور ۲۱ کلو میٹر لکھا ہوا تھا ۔ اس پتھر سے لے کر کانپور تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا اور دیہات پانی میں گھرے ہوئے تھے ۔ جب ہم کانپور کے قریب پہنچے تو مجھے ایسا لگا کہ یہ شہر بلند ٹیلوں پر آباد ہے جن کا ارتفاع دریا کی سطح سے تیس فٹ سے زائد ہو گا ۔ ہمارے دائیں ہاتھ کانپور کی آبادی تھی اور بائیں ہاتھ جاج مئو نظر آ رہا تھا ۔

میں ٹرین میں کانپور سے کئی بار گذرا تھا لیکن وہاں رکنے اور شہر دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا ۔ اس لئے میں شہر سے ناواقف تھا ۔ مجھے نئی سڑک اور مسٹن روڈ کے اتصال پر ایک ہوٹل نظر آیا جس کا نام " ہوٹل کارتر " تھا ۔ یہ ہوٹل ایک مسلمان پولیس افسر کا تھا اس لئے مجھے وہاں بڑی آسائش ملی ۔

مسٹن گنج پر ہی مچھلی بازار کی مسجد ہے جہاں ۱۹۱۳ء میں ایک سانحہ پیش آیا تھا ۔ مسجد کے عین سامنے ہندوؤں نے سڑک کے وسط میں ایک پیپل کا پودا کاشت کر کے اس کے گرد چبوترہ بنا لیا اور پھر وہاں مندر تعمیر کر لیا ۔ اس سے ٹریفک میں رکاوٹ پیدا ہو گئی ۔ میونسپل کارپوریشن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اس لئے انہوں نے ٹریفک کی سہولت کے لئے مندر پر ہاتھ ڈالنے کی بجائے مسجد کا کچھ حصہ گرا دیا ۔ جب مسلمانوں نے اس مسمار شدہ حصے کو تعمیر کرنا چاہا تو پولیس نے گولی چلا دی اور بہت سے مسلمان شہید ہو گئے ۔ اس پر ملک گیر تحریک شروع ہو گئی اور شاعروں نے اپنے اشعار کے ذریعے خون مسلم کو گرما دیا ۔ راقم الحروف نے اس تاریخی مسجد کی زیارت کی اور وہاں نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل کی ۔

طلاق محل کانپور میں میرے ایک کرم فرما حکیم حافظ حبیب الرحمٰن صاحب رہتے

ہیں۔ انہوں نے اب پی ایچ ڈی بھی کرلی ہے۔ میری ان کے ساتھ خط و کتابت رہی تھی لیکن کبھی بالمشافہ ملاقات کا موقع میسّر نہیں آیا تھا۔ راقم اولین فرصت میں ان کے مطب پر گیا۔ اس وقت موصوف مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں سلام کرکے مریضوں میں بیٹھ گیا۔ جب میری باری آئی تو حکیم صاحب فرمانے لگے: "فرمایئے کیا خدمت کروں؟" میں نے عرض کیا کہ میرا نام پروفیسر محمد اسلم ہے اور میں لاہور سے آیا ہوں۔ اتنا سنتے ہی حکیم صاحب اپنی مسند سے اُٹھ کر مجھ سے لپٹ گئے اور گھر سے چائے لانے کے لئے ایک ملازم کو دوڑایا۔ حکیم صاحب بڑی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔

اگلے روز صبح حکیم صاحب ہوٹل تشریف لائے اور مجھے ساتھ لے کر پٹکا پور پہنچے۔ یہ کانپور کا ایک محلّہ ہے۔ اس محلّے میں ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء میں حاجی عبدالرحمن خان مرحوم نے جامع العلوم کانپور کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جس کا سنگِ بنیاد راقم آثم کے دادا مُرشد حکیم الامت حضرت شاہ اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ (م ۱۹۴۳ء) کے دستِ مبارک نے رکھوایا۔ حضرت حکیم الامت نے چودہ سال اس مدرسے میں تدریس کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ حکیم حبیب الرحمن صاحب نے راقم کی ملاقات مدرسے کے رُوحِ رواں مفتی منظور احمد مظاہری سے کرائی۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ اس وقت اڑھائی صد سے زائد طلبہ جامع العلوم میں تعلیم پا رہے ہیں۔ وہاں درسِ نظامی کی تکمیل کرائی جاتی ہے اور دیوبند اور مظاہر العلوم کی طرز پر دورۂ حدیث کرایا جاتا ہے۔ اس مدرسے کا مسلکِ خاص "دیوبندی تھانوی" ہے۔

ایک شام حکیم حبیب الرحمن صاحب نے اپنے دولت کدے پر چند احباب کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ ان کی والدۂ محترمہ نے اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کیا جو حکیم صاحب نے بڑے فخر کے ساتھ مہمانوں کے سامنے رکھا۔ کھانے سے پہلے اور بعد اہلِ علم کے ساتھ طویل ملاقات رہی۔ ان مہمانوں میں گوہر کانپوری نام کے ایک شاعر بھی تھے جو جاج مئو میں رہتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا زیادہ وقت بمبئی میں گزرتا ہے جہاں وہ فلموں کے لئے گیت لکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھے محمد اسمٰعیل المتخلص بہ اسلم لکھنوی کے یہ اشعار پڑھ کر سنائے جو بقول ان کے راقم کے حسبِ حال ہیں:

عجب اسلم کی ہے طبیعت، ملی ہے غنچوں کی ان کو فطرت
خوشی ہے تو مسکرا رہے ہیں، الم ہے تو مسکرا رہے ہیں

***

وہ آرزو نہیں پیغامِ موت ہے اسلم
جو دل میں گھٹ کے رہے اور زبان پہ آ نہ سکے

***

عشق میں رسم نہیں سعیٔ علاج اے اسلم
درد خود بڑھ کے نہ کیوں درد کا درماں ہو جائے

***

اب اسلم ہنس رہے ہیں ہم پہ یہ کون و مکاں والے
کبھی وہ دن بھی تھے، جب زینتِ کون و مکاں ہم تھے

***

حکیم صاحب نے مجھے ہائی بلڈ پریشر کا نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا جسے میں رفاہِ عامہ کے لئے نقل کر رہا ہوں:

اُسرول، دانۂ ہیل خورد، تخم کاہو مقشّر، برادۂ صندل سفید، یشب، طباشیر نقرہ اصلی، زہر مُہرہ، گل سُرخ، یہ آٹھوں چیزیں ہم وزن لے کر ان کا سفوف تیار کرلیں اور صبح و شام چائے کا نصف چمچہ استعمال کریں۔ اس مرض میں خمیرۂ مروارید اصلی یا خمیرۂ صدف میٹھے انار کے رَس کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ بھی کارگر ثابت ہوتا ہے۔

کانپور میں کرنیل گنج، جرنیل گنج، چمن گنج اور بیگم گنج نام کی آبادیاں ہیں۔ ایک آبادی پھول باغ کے نام سے مشہور ہے۔ انگریزوں کے نام سے بھی کئی سڑکیں موسوم ہیں جن میں سے لاٹوش روڈ، ایلیسی روڈ، مسٹن روڈ اور گورا بازار قابلِ ذکر ہیں۔

حکیم حبیب الرحمن طلاق محل کے علاقے میں رہتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی نواب نے اپنی بیگم کو طلاق دے کر رہنے کے لئے وہاں محل بنوا دیا تھا تاکہ وہ عقدِ ثانی نہ کر سکے۔ اسی علاقے میں راقم نے حافظ محمد حلیم کا قائم کردہ یتیم خانہ اور حلیم مُسلم کالج دیکھے۔ حافظ صاحب سرہند بستی کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے کانپور میں

چمڑا رنگنے کا بہت بڑا کارخانہ لگایا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اور بھی بہت سے کارخانے کھل گئے اور کانپور چمڑے کی صنعت کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ شہر میں چمڑے کے سامان اور جوتوں کی دکانیں کثرت کے ساتھ ہیں۔ الحمد اللہ چمڑے کا کاروبار مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے اور وہ بڑے خوشحال ہیں۔

کانپور چمڑے کی تجارت کے علاوہ علم و ادب کا بھی ایک اہم مرکز ہے۔ منشی دیانرائن نگم (م ۱۹۴۲ء) کانپور سے مجلہ "زمانہ" نکالا کرتے تھے۔ یہ مجلہ برِ عظیم کے علمی و ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ "زمانہ" نے اُردو کی ترویج اور ترقی میں مثبت کردار ادا کیا ہے۔ ایک زمانے میں مولانا حسرت موہانی (م ۱۹۵۱ء) نے بھی کانپور میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ حسرت موہانی کے مجلّے "مستقبل" نے بھی علمی حلقوں میں اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔ کانپور میں رہائش اختیار کرنے کے باوجود وہ کانپوری نہ بن سکے۔ انہوں نے اس کا اظہار اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے:

نہ چھوٹا درِ یار ہم سے نہ چھوٹا
بہت ہم نے چاہا بنیں کانپوری

آغا میر معتمد الدولہ سید محمد خان ضیغم جنگ، نائب السلطنت اودھ (م ۱۸۳۲ء) اپنے منصب سے معزول ہو کر اکتوبر ۱۸۳۱ء میں کانپور چلے آئے تھے۔ "صاحب رائے" نے ان کی معزولی پر کہا تھا: "آج اس گھر میں سنیچر اوترا"۔ آغا میر کے کانپور آنے سے وہاں علم و ادب کا چرچا شروع ہوا۔ ان کا قیام کانپور میں سات ماہ سے زائد نہیں رہا لیکن ان کے احفاد نے ان کی روشن کی ہوئی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔ ان کے نواسے نواب سید احمد حسین خان المتخلص بہ سالک کانپوری (م ۱۸۸۱ء) نے اپنے نانا کی روایت کو قائم رکھا۔ سالک کانپوری کے ہم عصر شعراء میں نواب سید علی حسین خان المتخلص بہ تمنا لکھنوی المعروف بہ نواب دولہا بہادر نے لکھنؤ کی سکونت ترک کے کانپور میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ وہ ناسخ اور منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال کانپور میں ۱۸۸۸ء میں ہوا۔ تمنا لکھنوی کے فرزند اور تلمیذ نواب سید اکبر حسین المتخلص بہ سیف کانپوری (م ۱۸۸۳ء) اپنے والد کے ہم پلّہ شاعر تھے۔ ان کے ہم عصروں میں منشی احمد حسین خان عروج کانپوری (م ۱۸۹۳ء) نے بھی کانپور کا نام روشن کیا۔ سید محمد علی خان

بہادر شمس کانپوری (م ۱۸۷۰ء) بھی ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ ان حضرات کے مقام اور مرتبے کو دیکھ کر یہ مترشح ہوتا ہے کہ الحاقِ اودھ (م ۱۸۵۶ء) کے بعد یہ حضرات لکھنؤ کی سکونت ترک کرکے کانپور چلے آئے تھے۔

ہمارے زمانے میں صفی لکھنوی کے شاگرد اما شنکر بازل کانپوری (م ۱۹۶۹ء) سید حسین بہزار لکھنوی ساکن کانپور (م ۱۹۶۵ء) وزیر کانپوری (م ۱۹۶۲ء) سید ابو محمد ثاقب کانپوری (م ۱۹۸۵ء) کرشن سہائے وحشی کانپوری (م ۱۹۴۰ء) سری دھر شاد نگم ناشاد کانپوری (م ۱۹۷۰ء)، جلیل مانکپوری کے تلمیذ رشید سید تصدیق حسین صدق جائسی (م ۱۹۷۶ء) جگر اور حسرت کے شاگرد فنا نظامی کانپوری (م ۱۹۸۸ء) اور خواجہ عبدالسلام مدیر ہفت روزہ "صداقت" (م ۱۹۹۳ء) نے کانپور کو چار دانگِ عالم میں مشہور کر دیا ہے۔

"دھنی کی نگریا":

حکیم حبیب الرحمن صاحب نے میری رہنمائی کی اور میری برسوں پرانی آرزو بر آئی۔ ان کے فرمانے کے مطابق میں ان کے مطب سے قریب کانپور سے ہردوئی جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ میں نے آٹھ روپے میں گنج مراد آباد کا ٹکٹ خریدا۔ بس دریائے گنگا عبور کرکے ضلع اناؤ میں داخل ہوئی۔ اسی ضلع میں مولانا حسرت کا وطن موہان ہے۔ بس کانپور سے چل کر بہت جلد اناؤ پہنچ گئی۔ وہاں سے چل کر بس صفی پور پہنچی جو ہمارے مشہور شاعر اقبال صفی پوری کا وطن ہے۔ صفی پور سے بارہ کلو میٹر کی مسافت طے کرکے میں بانگر مئو پہنچا۔ اسی قصبے میں ۱۱ جولائی ۱۸۸۸ء کو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ (م ۱۹۵۷ء) پیدا ہوئے تھے۔ بانگر مئو کے بعد اگلا سٹاپ گنج مراد آباد تھا، جہاں راقم نے بس سے اترنا تھا۔

گنج مراد آباد کو حضرت شاہ فضلِ رحمٰن کی وجہ سے شہرت ملی ہے۔ موصوف کا اصل وطن گنج مراد آباد سے قریبی قصبہ ملّاواں تھا لیکن انہوں نے گنج مراد آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ شاہ صاحب، حضرت شاہ محمد آفاق (م ۱۸۳۵ء) کے مُرید تھے اور موخرالذکر کو حضرت ضیاء اللہ نے خرقۂ خلافت عطا فرمایا تھا۔ حضرت ضیاء اللہ، خواجہ محمد زبیر سرہندیؒ (م ۱۷۳۸ء) کے مُرید تھے اور موخرالذکر کو اپنے دادا خواجہ محمد نقشبندؒ (م

۱۷۰۲ء) سے خلافت ملی تھی ۔ خواجہ محمد نقشبند اپنے والدِ محترم خواجہ محمد معصوم سرہندی (م ۱۶۶۸ء) کے فرزند اور جانشین تھے ۔ دوسری جانب شاہ فضل رحمٰن نے شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (م ۱۸۲۳ء) سے درسِ حدیث لیا تھا اور وہ اپنے والدِ بزرگوار شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی (م ۱۷۶۲ء) کے شاگرد تھے ۔ ان کے شجرۂ طریقت اور سلسلۂ تلمذ میں کم سے کم واسطے آتے ہیں ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی عمر ۱۰۵ سال ہوئی تھی ۔ شاہ صاحب کے مریدِ مخلص مولانا محمد علی مونگیری (م ۱۹۲۷ء) نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کی بنیاد رکھی تھی ۔ عہدِ حاضر کے نامور عالمِ دین حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے "تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ" لکھ کر ندوہ کا قرض ادا کیا ہے ۔ فاضل مصنّف نے درجنوں کتابیں لکھی ہیں لیکن ان کی نظر میں یہ کتاب ان کی تمام تصانیف پر سبقت لے گئی ہے ۔

شاہ فضل رحمٰن نے قرآن حکیم کا بھاشا زبان میں ترجمہ کیا تھا جس کا نام انہوں نے "من موہن کی باتیں" رکھا تھا ۔ اس کا کچھ حصہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی سعی و کاوش سے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے شائع ہو گیا ہے ۔ اُردو زبان کی شیرینی سے شادکام ہونے والوں کو اس کا بار بار مطالعہ کرنا چاہیے ۔

شاہ صاحب نے فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ کا ترجمہ "جب ان کا نُور اجیالا ہوا" کیا ہے ۔ اسی طرح وہ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کا ترجمہ "دھن اور پُوت سنگار ہے جیتے جی کا" کرتے ہیں ۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کو انہوں نے اردو کے ان الفاظ کا جامہ پہنایا ہے : "اس کی راج چوکی میں سارے اکاس اور دھرتی سما رہے ہیں" ۔ انہوں نے وبرا بوالدیہ کا ترجمہ "اور اپنی ماتا پتا کا سپوت پوت تھا" کیا ہے ۔ الذی بیدہ الملک کا ترجمہ انہوں نے "جس کے ہاتھ میں راج پاٹ ہے" کیا ہے ۔ ان کے چند مزید ترجمے ملاحظہ ہوں :

اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ	تُو سندیسی ہے
وَهُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ	وہ بچتوں کو بھلی راہ پر لگاتا ہے
اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ	جن پر تیری دیا ہوئی
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ	من موہن نے اون کے جی اور

	کانوں پر ٹھپا لگا دیا
بِیَدِکَ الْخَیْر	تیرے اس میں دھن بھی ہے
قَالَ اِنِّیْ عَبْدُاللّٰهِ	بالک گود میں بولا کہ ٹھیک
	میں من موہن کا داس ہوں
وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْل	اور تو اکاس پاتی میں اسمٰعیل مہاسدہ کی
	کتھا یاد کر
جَعَلَنِیْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ	اور مجھ کو آدرمان پایا ہوا کیا
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ	پھر تم اے منی پری جِنّ پالنہار کی
	کون سی دیا سے سر پھراتے ہو

اسی طرح جب شاہ فضل رحمٰن علیہ الرحمہ حدیثوں کا بھاشا زبان میں ترجمہ کرنے بیٹھے تو انہوں نے یہاں بھی اپنی جولانیِ طبع دکھائی ۔ الجامع الصحیح البخاری کے شروع میں امام بخاری نے ایک باب کا آغاز کیف بداء الوحی کے عنوان سے کیا ہے ۔ شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے "خدا کے سندیس کا پھاٹک کیسے کھلا" یہاں انہوں نے وحی کا ترجمہ سندیس ، باب کا ترجمہ پھاٹک اور بداء کا ترجمہ کھلا کیا ہے ۔ اس ترجمے کی لذّت ہی کچھ اور ہے ۔

تذکرہ شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ پڑھ کر میرے دل میں گنج مراد آباد حاضری کی شدید خواہش پیدا ہوئی لیکن مجھے کئی سال تک اس قصبہ گنج کا انتظار کرنا پڑا ۔ میں ریلوے اسٹیشن سے قریب بس سے اترا اور ایک دکاندار سے درگاہ کا راستہ پوچھا ۔ اس نے بتایا کہ آبادی کی مغربی جانب شاہ صاحب کی درگاہ ہے ۔ میں گلیوں سے گزرتا ہوا شاہ صاحب کی درگاہ تک پہنچا ۔ ان کی درگاہ کا جنوبی حصہ زمین بوس ہو چکا ہے ۔ چند حجرے باقی رہ گئے ہیں ان میں امام صاحب رہتے ہیں ۔ جب میں وہاں پہنچا تو امام صاحب موجود نہ تھے ۔ درگاہ کی چابی ان کے پاس تھی ۔ راقم نے وضو کیا اور مسجد میں نوافل ادا کئے ۔ اتنے میں امام صاحب آگئے اور میری درخواست پر انہوں نے قفل کھول دیا ۔ اس گنبد کے نیچے تین قبریں ہیں ۔ ان کی ترتیب یوں ہے : مزار احمد میاں ، مزار دیوان کریم شیر خان ، مزار شاہ فضل رحمٰن ۔ شاہ صاحب کی قبر پر سرخ رنگ کی ایک چادر ڈالی ہوئی

تھی جس پر جا بجا سفید حروف میں اسم ذات (اللہ) لکھا ہوا تھا۔ ان کے سرہانے دیوار پر یہ عبارت مرقوم تھی: ھذا من فضل ربی - ربنا الرحمٰن المستعان -

حضرت شاہ فضلِ رحمٰن جس مقبرے میں محوِ خوابِ ابدی ہیں، اس کی شمالی دیوار پر یہ اشعار کندہ ہیں:

۶۸۶

قطعۂ تاریخ

فرزنِ آن مردِ یگانہ ڈاکٹر ممتاز علی
نجم رخشان سعادت تافت کہ ز سیمای او
بخت و طالع یار و یاور باد و اقبالش بلند
صبح نوروزی دہد یا رب شب یلدای او
داشت از فرطِ ارادت عشق با مولای خویش
خاصہ مردے بُود از مردانِ حق مولای اُو
فضلِ رحمان قبلۂ عالم مطاع روزگار
در دلِ اہلِ صفا تا حشر بادا جای اُو
گفت تاریخ بنایش بسمل از روی نیاز
تا بود وردِ زبان والہ و شیدای اُو
حبذا لوحِ مزارش قبلۂ دنیائے من
کعبۂ دینم حطیم روضۂ والای اُو

۱۳۳۳ھ

حضرت شاہ فضلِ رحمٰن کے فرزند حضرت احمد میاںؒ (م ۱۹۱۶ء) بھی اسی گنبد میں آرام فرما رہے ہیں۔ ان کے مزار کے سرہانے شمالی دیوار پر یہ اشعار مرقوم ہیں:

ھوالرحمٰن

تاریخِ رحلت حضرت احمد میاں رحمتہ اللہ علیہ
از شیخ نظیر حسین قدوائی فضلِ رحمانی، گدیونی ضلع بارہ بنکی

چو از ما رفت مُرشدزادۂ ما

قرار و صبر از دلِ خستگاں رفت
بروں آمد فغانہا از زبانہا
صداہا از زمین تا آسمان رفت
وفاتِ شاہِ اقلیمِ طریقت
چناں شد کز جہاں، شاہِ جہاں رفت
یقین دارم کہ اُو از فضلِ رحمٰن
بہ نزدِ والدِ خود در جناں رفت
نظیر این گفت بہر سالِ رحلت
بگلزارِ ارم احمد میاں رفت

۱۳۳۵ھ

گنبد سے باہر حضرت احمد میاں کے صاحبزادے اور جانشین شاہ نعمت اللہ صاحب کی ابدی آرام گاہ ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
انک علیٰ صراط المستقیم

۱۹۵۵ء

ولادت: ۱۳۰۷ھ　　　　وصال ۱۳۷۵ھ

قطعۂ تاریخِ وفات حسرت آیات مولوی شاہ نعمت اللہ میاں صاحب

با ادب ہشیار ہی رہنا ذرا جوشِ جنوں
فضل و رحمت کا ہے حامل یہ ولی پر سکون
بُولی رحمت غم میں جوہر کو جو دیکھا سرنگوں
اولیاء کی شان ہے: لا خوف ولاھم یحزنون
۱۳۷۵ھ

نقشبندی و فضلِ رحمانی
در مزار است صاحبِ دانش

ذاکر لا الہ الا اللہ
نعمت اللہ میاں فرشتہ منش

۱۳۷۵ھ

پیش کردہ قاضی فرید احمد (ایضاً)

شاہ فضل رحمٰنؒ کے روضہ سے جانب قبلہ مسجد کے صحن میں ایک چھتری تلے ان کے پوتے اور شاہ نعمت اللہ کے بھائی حضرت شاہ رحمت اللہ کی ابدی آرام گاہ ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

تاریخ وصال حضرت مولانا شاہ رحمت اللہ میاں صاحب سجادہ نشین

۱۱ مئی ۱۹۶۴ء یوم جمعہ

رفت از دنیا ولی ابنِ ولی
صوفی و ابدال و عالم متقی
واقفِ اسرار ذاتِ کبریا
قلبِ او از فضل رحمٰن منجلی
اصطفا گوید ز سال رحلتش
• رحمت اللہ در جنتی •

تخلص سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ تاریخ مشہور تاریخ گو اصطفا خان لکھنوی کا نتیجۂ فکر ہے۔ کراچی کے قبرستانوں میں مدفون بہت سے حضرات کی تاریخ وفات اصطفا خاں کی کہی ہوئی ہے۔

حضرت شاہ فضل رحمٰنؒ کے مزار سے جانب قبلہ مسجد ہے، بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ مزارِ مبارک مسجد کے صحن کے شمال مشرقی گوشے میں ہے۔ مسجد کے تین در ہیں اور اس کی چھت پر تین ہی گنبد ہیں۔ مسجد سے ملحق جانبِ شمال حضرت شاہ صاحب کا ذاتی حجرہ ہے۔ امام صاحب نے راقم کو بتایا کہ حضرت کا عُرس ۲۲ ربیع الاول کو ہوتا ہے جس میں قرب و جوار سے ان کے معتقدین جمع ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کا تعلق سلسلۂ نقشبندیہ سے تھا اس لئے عُرس کے موقع پر وہاں خرافات نہیں ہوتیں۔

گنج مراد آباد کی آبادی ساڑھے سات ہزار نفوس پر مشتمل ہے اور اس میں مسلمانوں کا حساب غیر مسلموں سے زیادہ ہے۔ اس قصبے کے غیر مسلم بھی شاہ صاحب کا بڑا احترام کرتے ہیں اور ان کے مزار پر نذریں پیش کرتے ہیں۔ گنج مراد آباد سڑک اور ریل کے ذریعے کانپور اور ہردوئی سے ملا ہوا ہے۔ اس لئے وہاں تک پہنچنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔

گنج مراد آباد سے ۲۴ میل کے فاصلے پر اودھ کا مشہور قصبہ بلہور ہے جسے گزشتہ صدی میں مولانا خرم علی بلہوری کی وجہ سے بڑی شہرت ملی ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی (م ۱۸۹۰ء) فرماتے ہیں کہ وہ ۱۸۵۷ء میں حجازِ مقدس جاتے ہوئے پونا کے ایک نواحی قصبے میں پہنچے۔ جمعہ کا دن تھا۔ مولانا نماز جمعہ ادا کرنے مسجد میں گئے تو اس وقت خطیب صاحب تقریر شروع کر چکے تھے۔ وہ مولانا رحمت اللہ کو نہیں جانتا تھا اس لئے بے دھڑک تقریر کر رہا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس نے اپنی تقریر میں کہا "میں نہ اپنی کی بات مانوں نہ شافعی کی۔ میں تو وہ بات مانوں جو میرے رسولؐ نے کہی"۔ اس کے بعد اس نے مولانا خرم علی بلہوری کی تصنیف نصیحۃ المسلمین سے چند شعر پڑھ کر سنائے۔ پھر ایک حدیث کا ترجمہ سناتے ہوئے کہا یہ بات "مسکوۃ" میں بھی موجود ہے"۔ مولانا فرماتے ہیں کہ وہ "مسکوۃ" کا لفظ سن کر بڑے حیران ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں یہ احساس ہوا کہ خطیب صاحب مشکوٰۃ کا حوالہ دے رہے تھے۔ مولانا رحمت اللہ فرماتے ہیں کہ وہ بڑے حیران ہوئے کہ جو شخص حنفی کو ہنیفی، شافعی کو شاپھی اور مشکوٰۃ کو مسکوۃ کہتا ہے، وہ مجتہد مطلق بنا بیٹھا ہے۔

گنج مراد آباد سے راقم کانپور آیا۔ شام کو حکیم حبیب الرحمٰن صاحب کے ساتھ نشست ہوئی اور اگلے روز میں کانپور سے بذریعہ ٹرین علی گڑھ پہنچ گیا۔

پانی پت

یہ جون ۱۹۷۳ء کے اواخر کی بات ہے کہ میں تغلق آباد سے مفتی عتیق الرحمن عثمانی سے ملنے پرانی دہلی آیا۔ انہوں نے راقم کو بتایا کہ وہ شیخ عبداللہ کی دعوت پر اگلے روز بذریعہ ہوائی جہاز سرینگر جا رہے ہیں۔ شیخ صاحب نے انہیں حضرت بل میں ایک دینی مدرسے کے معائنے کے بہانے بلایا تھا۔ مفتی صاحب بھی چند روز کے لئے دہلی کے ہنگاموں سے دُور رہ کر ذہنی سکون چاہتے تھے۔ انہوں نے سرراہے مجھ سے کہا کہ کشمیر چلو گے؟ اس وقت تک میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں کشمیر کی سیاحت کر سکوں گا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ کل بذریعہ ہوائی جہاز سرینگر تشریف لے جائیں، میں کل ٹرین کے ذریعے جموں روانہ ہوں گا اور وہاں سے بس کے ذریعے سرینگر پہنچ جاؤں گا۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ ان کا قیام حضرت بل میں یونیورسٹی آف کشمیر کے صدر دروازے کے عین سامنے محکمہ اوقاف کے مہمان خانے میں ہو گا۔ میں نے عرض کیا کہ وہاں موصوف کسی سے میرا تعارف نہ کرائیں میں اپنا تعارف خود کراؤں گا۔

راقم شام کو تغلق آباد پہنچا اور اپنی اہلیہ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے کہا کہ میں کل صبح پنجاب کے دَورے پر جا رہا ہوں۔ اس لئے میں ابھی سامان اٹھا کر شہر چلا جاتا ہوں اور رات ندوۃ المصنفین میں بسر کر کے صبح سات بجے ٹرین میں سوار ہو جاؤں گا۔ اس پروگرام کے مطابق میں نے اگلی صبح پانی پت کا ٹکٹ خریدا۔ دہلی سے پانی پت کا فاصلہ ۸۹ کلو میٹر ہے۔ ٹرین نے وہاں پہنچنے میں سوا دو گھنٹے لگا دیئے۔ میں نے ریلوے اسٹیشن پر چائے پی اور ایک رکشا میں سوار ہو کر حضرت شرف الدین بو علی شاہ قلندرؒ (م ۱۳۲۴ء) کے مزار پر پہنچا۔ درگاہ سے باہر ایک عمارت پر، جس کی چھت بنگالی وضع کی تھی، بخشیٔ ہند حضرت شرف الدین بو علی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہاں شاید کبھی سجادہ نشینوں کی رہائش ہو گی۔

درگاہ کا احاطہ کافی وسیع ہے۔ صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ ایک چبوترے پر مولانا الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴ء) کی قبر ہے۔ راقم نے دو بار پانی پت کا سفر کیا ہے۔ پہلے سفر میں حالی کی قبر بڑی خستہ حالت میں تھی اور اس کے گرد لوہے کا جنگلہ لگا ہوا تھا۔ دوسرے سفر میں اس پر الٹرا ماڈرن طرز کی "عمارت" بنی ہوئی دیکھی۔ مولانا حالی محلہ انصاریاں پانی پت کے رہنے والے تھے۔ ان کے اخلاف میں سے صالحہ عابد حسین (م ۱۹۸۸ء)، خواجہ غلام الثقلین (م ۱۹۱۵ء) اور خواجہ غلام السیدین (م ۱۹۷۱ء) نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ حالی، سرسید کے ساتھی تھے اور جدید شاعری کے بانی۔ انہوں نے سرسید کی فرمائش پر مدّ و جزرِ اسلام لکھی تھی جو علمی حلقوں میں "مسدس حالی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ راقم نے ان کے لئے دعائے مغفرت کی اور ان کی قبر کے پاس بیٹھ کر ان کی مشہور مناجات پڑھی:

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

اس مناجات نے جو لُطف اس دن اس جگہ دیا، ویسا لُطف اور کبھی نہیں آیا۔

حالی کے مزار سے قلندر صاحب کے رَوضے تک ایک وسیع صحن ہے جس میں ہزار کے قریب افراد بیٹھ سکتے ہیں۔ حضرت کے مزار کے گرد سنگ مرمر کی خوشنما جالیاں لگی ہوئی ہیں اور درمیان میں ان کا مزار پُر انوار ہے۔ ایک الگ کمرے میں ان کے مقبول نظر شہزادہ مبارک خان کی قبر ہے۔ قلندر صاحب انہیں بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی سفارش رَد نہیں کرتے تھے۔ مزار کے عقب میں سجادہ نشینوں کی قبریں ہیں۔

قلندر صاحبؒ اور حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ ہم عصر تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے مابین مکاتبت بھی ہوتی رہتی تھی۔ قاصد کے فرائض حضرت امیر خسرو (م ۱۳۲۵ء) انجام دیا کرتے تھے۔ یہ روایت زبان زد خلائق ہے کہ ایک بار حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ نے قلندر صاحب کو یہ رباعی لکھ کر بھیجی:

اے رہبرِ خلق مرا رہ نما
در مشکلِ ایں بیت جوابم فرما
گویند خدا بود و فلک ہیچ نبود

گر فلک ہیچ نبود کجا بود خدا

قلندر صاحب نے اس کا یہ جواب دیا:

در مذہب و ملت خبرے نیست مرا
می دان بیقین کہ لامکان است خدا
خواہی کہ ترا کشف شود این معنی
جان در تن خود ببیں کہ کجا دارد جا

قلندر صاحب پر استغراق غالب رہتا تھا۔ ان کا انتقال بھی اسی عالم میں جنگل میں ہوا تھا۔ چند لکڑہاروں نے ان کی میت شناخت کر لی اور اسے موجودہ جگہ لا کر دفن کیا۔ بعض لوگوں نے موضع بڈہ کھیڑا میں بھی ان کا مزار بنا لیا ہے۔

قلندر صاحب کے مزار پر مجھے ایک نو دس سالہ مسلمان بچہ مل گیا جو انعام کے لالچ میں میرا رہبر بن گیا۔ میں اس کے ساتھ حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ (م ۱۳۶۳ء) کے مزار پر حاضر ہوا۔ راقم کے شجرۂ طریقت میں ان کا نام نامی آتا ہے۔ موصوف حضرت شمس الدین ترک پانی پتی علیہ الرحمہ کے مرید اور حضرت احمد عبدالحق ردولوی (م ۱۴۳۴ء) کے مرشد تھے۔ پانی پت کے عثمانی انہی کی اولاد ہیں۔ ان کا مزار ایک شاندار گنبد کے نیچے ہے۔ راقم نے وہاں فاتحہ خوانی کی اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کی۔

ان کے روضۂ مبارک کے صحن میں مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی (م ۱۹۶۹ء) کی آخری آرام گاہ ہے۔ موصوف تحریکِ خلافت کے رہنما تھے اور ترکِ موالات کے جرم میں میانوالی جیل میں مقید رہ چکے تھے جہاں وہ سیاسی قیدیوں کو ماہ رمضان میں نماز تراویح پڑھایا کرتے تھے۔ انہوں نے آزادی کے موقع پر پانی پت میں ہی رہنے کا عزم کر لیا تھا۔ انہوں نے فسادات کے زمانے میں مسلمانوں کی بڑی مدد کی اور جو مسلمان وہاں رہ گئے ان کی خدمت میں کوئی کسر باقی اٹھا نہ رکھی۔ دہلی اور پانی پت کے مسلمان ان کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔

حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ کے روضۂ مبارک سے چند گز کے فاصلے پر ایک چوکھنڈی میں دو قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک قبر حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ (م ۱۷۸۰ء) کی اہلیۂ محترمہ کی ہے۔ نامور ادیب شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے ان کے ساتھ مذہبی تعصب کی بنا پر انصاف نہیں کیا۔ آزاد لکھتا ہے: "سنا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے گھر

میں ڈھوبن ڈال رکھی تھی۔ میرے فاضل دوست مولانا ابو العرفان ندوی، ناظم تعلیمات ندوۃ العلماء لکھنؤ اس فقرے کو اپنی زبان سے ادا کر کے خوب لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ ایک روز مرحوم مجھ سے کہنے لگے کہ اس فقرے میں "سنا ہے" کہہ کر آزاد نے اپنے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں لی۔ ثانیاً "ڈال رکھنا" کا بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ محترمہ دہلی میں جس حویلی میں رہتی تھیں وہ شاہ غلام علی دہلوی (م ۱۸۲۴ء) نے ان سے خرید کر خانقاہ شریف میں شامل کر لی تھی۔ اس کا بیعنامہ میرے فاضل دوست پروفیسر منظور الحق صدیقی ساکن راولپنڈی کے پاس موجود ہے۔ حویلی فروخت کرنے کے بعد موصوفہ اپنے شوہرِ نامدار کے مریدِ اخلاص سرشت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ کے پاس چلی آئی تھیں۔ قاضی صاحب نے انہیں اپنے مرشد کی اہلیہ سمجھ کر ماں کا درجہ دیا۔

اس چوکھنڈی میں دوسری قبر حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۸۱۰ء) کی ہے۔ محب اللہ پانی پتی نے فھم مکرمون فی جنۃ النعیم (م ۱۲۲۵ھ) سے ان کی تاریخ وفات نکالی ہے۔ قاضی صاحب نے قرآن پاک کی عربی زبان میں ایک ضخیم تفسیر لکھی ہے جسے انہوں نے اپنے مرشد حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ کے نام معنون کیا ہے۔ قاضی صاحب کی تفسیرِ مظہری، ندوۃ المصنفین دہلی سے آٹھ جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔ مفتی عتیق الرحمن عثمانی نے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے۔ عوام الناس نے حضرت مرزا مظہر جانجاناں کو صرف شاعر سمجھ کر ان پر بڑا ظلم کیا ہے۔ جس شیخِ طریقت کے مریدوں میں شاہ غلام علی دہلوی، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور مولانا نعیم اللہ بہرائچی جیسے فضلاء شامل ہوں، ان کے روحانی مرتبے کا کیا کہنا؟

یہ چوکھنڈی مرورِ ایام سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور پانی پت سے مسلمانوں کے انخلاء کے بعد اس کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ اللہ کریم حضرت شاہ زید ابوالحسن کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس کی مرمت کروا کے لوہے کا ایک پھاٹک لگوا دیا ہے جو چٹخنی چڑھانے سے بند ہو جاتا ہے۔

میں قاضی صاحب کے مزارِ مبارک پر فاتحہ پڑھ کر فارغ ہوا تو میرا رہبر مجھے حضرت شمس الدین ترک پانی پتی کے مزار پر لے گیا۔ حضرت کا مزار مبارک پچھلے کمرے میں ہے اور اگلے کمرے پر ایک بدبخت سکھ نے قبضہ کر کے وہاں گرنتھ صاحب رکھ کر

میں میرا گزر پانی پت کے قلعے کے نیچے سے ہوا ۔ یہ قلعہ کھنڈر بن چکا ہے ۔ دیواروں میں درخت اُگ آئے ہیں اور جہاں ملبہ پڑا ہوا تھا اس پر بھی روئیدگی نظر آتی تھی ۔

پانی پت کے ہندو شرنارتھیوں میں سرائیکی بولنے والوں کی اکثریت تھی ۔ وہ لوگ بھکر ، لیہ ، کلور کوٹ ، مظفر گڑھ اور کوٹ اَدو سے نقلِ مکان کر کے وہاں آباد ہوئے ہیں ۔ ان کا ذریعہ معاش دری اور کھیس بافی ہے ۔ راقم نے وہاں بھکر دری ہاؤس لیہ دری ہاؤس اور کلور کوٹ دری ورکس کے بورڈ لگے ہوئے دیکھے ہیں ۔ گلیوں میں عورتیں سرائیکی زبان میں گفتگو کر رہی تھیں اور بڑی بوڑھیوں کا لباس بھی وہی تھا جو وہ اپنے اصلی وطن میں پہنا کرتی تھیں ۔

راقم نے ریلوے اسٹیشن پر دوپہر کا کھانا قدرے تاخیر سے کھایا ۔ شام کے چار بجے مجھے پانی پت سے ٹرین ملی جس میں سوار ہو کر میں سوا سات بجے انبالہ چھاؤنی پہنچ گیا ۔ وہاں مجھے رات کے ایک بجے تک کشمیر میل کا انتظار کرنا پڑا ۔ جب کشمیر میل انبالہ چھاؤنی پہنچی تو اس میں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ تھی ۔ میں ہمت کر کے ایک ڈبے میں داخل ہو گیا ۔ لدھیانہ جا کر مجھے بیٹھنے کے لئے جگہ مل گئی ۔ جالندھر پہنچ کر ٹرین قریب قریب خالی ہو گئی اور مجھے ایک برتھ مل گئی ۔ میں اس پر سو گیا ۔ جب صبح میری آنکھ کھلی تو ٹرین پٹھانکوٹ پہنچنے والی تھی ۔ پٹھانکوٹ جا کر میں نے چائے پی ۔ اس کے بعد میں ایک کھڑکی کے قریب بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرنے لگا ۔ نو بجے کے قریب ٹرین جموں پہنچ گئی ۔ وہاں پہنچ کر میں نے ناشتہ کیا اور سرینگر جانے کے لئے محکمۂ ڈاک کی ایک بس میں ، جو جموں سے ڈاک لے کر سرینگر جاتی ہے ، بیس روپے کا ٹکٹ خرید کر سوار ہو گیا ۔ یہ بس پونے دس بجے جموں سے سرینگر روانہ ہوئی ۔

خطّۂ بینو نظیر کشمیر

جموں سے روانہ ہو کر اڑھائی گھنٹے بعد بس کُد جا کر رُکی ۔ راستے میں اُدھم پور آیا لیکن ڈرائیور نے وہاں بریک نہ لگائی ۔ جب ہم کُد پہنچے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا ۔ وہاں ہندوؤں کے متعدد ریستوران تھے ۔ اتفاق سے میری نظر ایک مُسلم ریسٹورنٹ پر پڑی ۔ مجھے وہاں اُبلے ہوئے چاول اور قورمہ مل گیا ۔ کُد میں بھارتی حکومت نے شیخ عبداللہ کو کئی سال تک نظر بند رکھا تھا ۔ اب وہ جیل ختم ہو گئی ہے ۔ کُد سے چل کر ہم بٹوت پہنچے ۔ وہاں ڈرائیور نے چائے کے لئے وقت دیا ۔ بٹوت سے چل کر بس رام بن میں رُکی ۔ یہ پیالے کی طرح ایک وادی ہے جس کے درمیان سے دریائے چناب بہتا ہے ۔ وہاں سڑک کے کنارے سکھوں کا ریسٹورنٹ تھا ۔ وہاں مسافروں نے چائے نوش کی اور وہاں سے چل کر ہم بانہال پہنچے ۔ یہاں ایک بڑا بلند پہاڑ ہے جو ریاست جموں کو ریاست کشمیر سے الگ کرتا ہے ۔ یہ دونوں ریاستوں کی قدرتی سرحد ہے ۔ آزادی سے قبل اس پہاڑ کو عبور کرنے میں بس کے چار پانچ گھنٹے لگ جاتے تھے ۔ جب بھارت نے کشمیر پر قبضہ کیا تو وہاں فوجی کنٹرول برقرار رکھنے کی غرض سے اس پہاڑ میں ۳ کلو میٹر لمبی سرنگ کھود کر چار پانچ گھنٹے کی مسافت سے نجات پالی ۔ سرنگ کے اندر جگہ جگہ بلب لگے ہوئے ہیں اور بس چند منٹوں میں سرنگ پار کر لیتی ہے ۔

راقم نے سرنگ پار کرنے کے بعد واضح فرق محسوس کیا ۔ بانہال سے گزرنے کے بعد زبان ، مذہب ، لباس ، آب و ہوا ، پرندے ، فصلیں اور درخت تک بدل جاتے ہیں ۔ پہلا قصبہ قاضی کنڈ آتا ہے جہاں سے مُسلمان چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں ۔ میں نے یہ سفر جون کے اواخر میں کیا تھا اس لئے سڑک کے دونوں جانب تا حدِ نظر دھان کے کھیت دکھائی دے رہے تھے ۔ سڑک کے کناروں پر چنار کے درخت تھے جو بڑے بھلے نظر آتے تھے ۔ قاضی کنڈ کے بعد اَونتی پور اور پامپور آتے ہیں ۔ اَونتی پور زعفران کی کاشت کے

لئے مشہور ہے ۔ کشمیر میں صرف یہی جگہ ہے جہاں زعفران پیدا ہوتا ہے ۔ پانپور میں سڑک کے کنارے سیّد حسن منطقی کا مزار ہے ، جو بڑا صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا ۔ جموں سے صبح پونے دس بجے چل کر میں نمازِ عشاء کے بعد سرینگر پہنچا ۔ لاری اڈے سے میں ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر حضرت بل پہنچا ۔ وہاں مجھے مدینۃُ العلوم جانا تھا ۔ میں نے وہاں پہنچ کر مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہ یُونیورسٹی کے صدر دروازے کے سامنے محکمہ اوقاف کے مہمان خانے میں فروکش ہیں ۔ دو طلبہ نے میری رہنمائی کی ۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہاں چند طلبہ موجود تھے ۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مفتی صاحب کسی کے ہاں کھانے کے لئے تشریف لے گئے ہیں اور وہ طلبہ کو میری آمد کے بارے میں بتا گئے تھے ۔ طلبہ نے اسٹوو جلا کر میرے لئے چائے تیار کی ۔ اس وقت اس چائے نے جو لطف دیا ، ویسا شاید ہی پہلے کبھی آیا ہو ۔ تھوڑی دیر بعد مفتی صاحب ، مولانا ابوالعرفان ندوی کے ہمراہ وہاں تشریف لے آئے ۔ انہیں میرے وہاں آنے سے بے حد مسرّت ہوئی ۔

ایک رُوز شیخ عبداللہ نے اپنے ایک معتمد عبدالسلام دیوا کو کار اور ڈرائیور سمیت ہمارے پاس بھیجا ۔ دیوا صاحب ہمیں اننت ناگ اسلام آباد لے گئے ۔ وہاں ہم نے ایک مندر اور اس کے ساتھ ایک تالاب دیکھا جہاں ایک چشمے سے پانی آتا تھا ۔ پاس ہی ایک مسجد تھی جس کے بارے میں ہمیں یہ بتایا گیا کہ وہ شہزادہ دارا شکوہ نے بنوائی تھی ۔ اننت ناگ اسلام آباد سے ہم اُچھابل گئے ۔ دیوا صاحب نے وہاں کے گیسٹ ہاؤس میں دوپہر کے کھانے کا آرڈر بک کروایا اور ہمیں لے کر کوکر ناگ چلے گئے ۔ وہاں ایک چشمے کے قریب ایک چنار کے پیڑ کے نیچے ہمارے لئے کرسیاں لگا دی گئیں ۔ وہاں چشمے سے اُبل اُبل کر پانی زمین سے باہر آرہا ہے ۔ جس طرح مرغی زمین کریدتی ہے ، اسی طرح پانی زمین سے نکلتا ہے ۔ (کوکر ، مرغی کو کہتے ہیں ۔ میری دانست میں کوکر ، پنجابی ککڑی سے قریب تر ہے) ۔ اسی لئے اسے کوکر ناگ کہتے ہیں ۔ چشمے پر متعین ایک شخص صاف و شفاف گلاسوں میں تازہ پانی لے کر آیا ۔ مفتی صاحب ، مولانا ابوالعرفان صاحب اور دیوا صاحب نے گلاس اٹھائے لیکن میں جوتے اتار کر اور پتلون اوپر چڑھا کر چشمے میں اتر گیا اور چلّو بھر بھر کر پانی پینے لگا ۔ چشمے کا پانی ایک ندی کی صورت میں آگے بڑھتا ہے ۔ اس

ندی کے کنارے دُور تک گلاب کاشت کیا ہوا ہے ۔ ہم ڈیڑھ پونے دو گھنٹے وہاں رُکے ۔

کوکر ناگ سے ہم اچھابل آئے ۔ وہاں کھانا تیار تھا ۔ گیسٹ ہاؤس کے لان میں سے ایک چشمے کا پانی ایک پختہ کھال میں سے گزرتا ہے ۔ میں نے اس کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھانے کی فرمائش کی ۔ دیوا صاحب نے کھال کے کنارے دری بچھوا دی ۔ ہم نے وہاں کھانا کھایا اور کھال پر ہی وضو کر کے نمازِ ظہر ادا کی ۔ اچھابل سے روانہ ہو کر ہم پہلگام پہنچے ۔ پام ویو ہوٹل میں ہمارے لئے کمرے ریزرو تھے ۔ ہم نے وہاں قیام کیا ۔ ہم گھنٹہ بھر لیٹ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور بازار کی سیر کو نکل گئے ۔ بازار کیا تھا ؛ گنتی کی بیس پچیس دکانیں ہوں گی ۔ ٹورسٹ اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے ۔ چند لداخی کستوری فروخت کر رہے تھے اور چند پہاڑی لوگ سلاجیت لئے بیٹھے تھے ۔ اَمر ناتھ جی کی یاترا کے دن قریب آرہے تھے اس لئے ہندوستان سے سادھو وہاں پہنچنا شروع ہو گئے تھے ۔ اَمر ناتھ جی کے یاتریوں کا BASE CAMP پہلگام میں لگتا ہے ۔

پہلگام ، ایک چھوٹی سی تیز رفتار ندی لدھرو کے کنارے آباد ہے ۔ اس ندی کے کنارے امرتسر کے مسلمان تاجروں کی بنوائی ہوئی مسجد موجود ہے ۔ مسجد کے اندر وضو کا انتظام نہیں ہے ۔ وضو کے لئے دریا تک سیڑھیاں اترتی ہیں ۔ ہم نے عصر کی نماز اسی مسجد میں ادا کی ۔ اسی دوران میں ڈرائیور گاڑی لے کر آگیا ۔ ہم اس میں سوار ہو کر اَمر ناتھ جی کی طرف جانے والی سڑک پر روانہ ہوئے ۔ پانچ چھ میل کے بعد سڑک کی حالت اچھی نہ تھی ۔ بارشوں کی وجہ سے سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی ۔ اس لئے ہم مغرب سے پہلے پہلگام لوٹ آئے ۔ مغرب کی نماز اسی مسجد میں ادا کر کے ہم اپنی قیام گاہ پر واپس آگئے ۔ پہلگام سرد جگہ ہے ۔ جون کے آخری ایام تھے ۔ اس کے باوجود رات کو کافی سردی ہو گئی ۔ اگلے رُوز ہم ناشتہ کر کے پہلگام سے چلے اور دوپہر تک سری نگر پہنچ گئے ۔

اسی رات شیخ صاحب کے ہاں ہم نے کھانا تناول کرنا تھا ۔ ان کا ایک کارندہ عشاء کے قریب ہمیں لینے آگیا ۔ شیخ صاحب میڈوز ہوٹل کے عقبی حصے میں رہتے تھے ۔ ان کی بیگم صاحبہ غالباً ہوٹل کے مالک کی صاحبزادی ہیں ۔ جب ہم وہاں پہنچے تو دس بارہ نوجوان جو آزاد کشمیر سے انگلستان جا کر آباد ہو گئے تھے ، برٹش پاسپورٹ پر کشمیر آئے

ہوئے تھے، وہ بھی وہاں موجود تھے۔ ڈرائنگ روم میں فرشی نشست کا انتظام تھا۔ دیواروں کے ساتھ گدیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے وہاں پہنچنے کے چند منٹ بعد شیخ صاحب بھی بالائی منزل سے نیچے اترے۔ وہ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس تھے۔ انہوں نے کرتے کے اوپر سلیٹی رنگ کی واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ میں نے ان کی تصویریں دیکھی ہوئی تھیں۔ اس دن معلوم ہوا کہ اصل اور نقل میں بڑا فرق ہے۔ ان کے چہرے پر بھول پن تھا۔ وہ تمام مہمانوں سے فرداً فرداً ملے۔ اس کے بعد کھانا شروع ہوا۔

مولانا ابوالعرفان ندوی نے مجھ سے کہا کہ آج پورا وازہ وان ہو گا۔ ایک ملازم نے اُبلے ہوئے چاولوں کے تشت لا کر ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ ایک تشت چار افراد کے لئے ہوتا ہے۔ چاروں آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ مولانا ندوی اور مفتی صاحب آمنے سامنے بیٹھے تھے اور میں شیخ صاحب کے بالمقابل بیٹھا۔ اس تشت کے اوپر دو سیخ کباب اور دو سینے کی بوٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے میزبان نے ہمیں کھانے کی دعوت دی۔ اتنے میں ایک وازہ (باورچی) ایک برتن میں سالن اٹھا لایا اور اس نے چاروں افراد کے سامنے تھوڑا تھوڑا سالن ڈال دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوسرا سالن لے آیا۔ اس روز چونکہ پورا وازہ وان تھا اس لئے ۲۱ قسم کا سالن تیار کیا گیا تھا۔ شیخ صاحب اپنے مہمانوں کو بتاتے جاتے تھے کہ اس سالن کو روغن جوش کہتے ہیں۔ یہ ہرز وانگن ہے۔ یہ دودھ میں پکایا گیا ہے۔ یہ دہی میں تیار کیا گیا ہے۔ یہ دستہ ہے۔ آخر میں بہت بڑا کوفتہ لایا گیا جسے گوشتابہ کہتے ہیں۔ یہ گویا فل اسٹاپ تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ۲۱ قسم کے سالن کھلانے کے بعد کشمیر میں میٹھی چیز پیش نہیں کرتے۔ کشمیر میں چونکہ نمک نہیں ہوتا اور وہ پچھلے زمانے میں زعفران کے بدلے نمک حاصل کیا کرتے تھے، اس لئے وہ نمک کو بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔

ایک روز مفتی شبیر نے ہمیں کھانے پر بلایا اور گیارہ قسم کا وازہ وان تیار کروایا۔ ایک روز میر واعظ محمد فاروق نے ہماری دعوت کی۔ ایک روز ہم نے رینہ واری میں ایک شادی کی تقریب میں شرکت کی۔ وہاں بھی وازہ وان ہی پیش کیا گیا۔ مولانا ابوالعرفان مجھ سے کہنے لگے کہ ان کے لئے اگر کشمیر میں کوئی کشش ہے تو وہ وازہ وان ہی ہے، ورنہ وہ کب کے لکھنؤ چلے گئے ہوتے۔ بھارت میں جب کوئی V.I.P مہمان

سرکاری دورے پر آتا ہے تو اس کے لئے سرینگر سے وازہ وان تیار کر کے ہوائی جہاز کے ذریعے دلی لاتے ہیں۔

رینہ واری، سرینگر کا ایک محلہ ہے۔ وہاں متو خاندان میں شادی تھی۔ جوان لڑکیاں ریشمی پاجامے اور روایتی کرتے پہنے، سروں پر قصابے باندھے بارات کے استقبال کے لئے دو رویہ کھڑی تھیں۔ وہ کشمیر کے روایتی گیت گا کر باراتیوں کا استقبال کر رہی تھیں۔ ان دنوں شادی کے موقع پر ۲۵ افراد سے زائد مہمانوں کو کھانا کھلانے پر پابندی عائد تھی۔ اس لئے شادی والے گھر میں ۲۵ باراتیوں کے بٹھانے اور کھلانے کا انتظام تھا۔ باقی مہمان قریبی گھروں میں بٹھائے گئے اور انہیں وہیں وازہ وان کھلایا گیا۔

ایک روز شام کے وقت ہم تینوں میر واعظ کی رہائش گاہ راجوری کدل گئے۔ مفتی صاحب نے میر واعظ مولوی محمد فاروق سے میر واعظ مولوی محمد یوسف (م ۱۹۶۸ء) کی تعزیت کرنی تھی کیونکہ وہ میر واعظ کی وفات کے بعد کشمیر نہیں گئے تھے۔ رسمی تعزیت کے بعد مولوی محمد فاروق نے سماوار میں کشمیری چائے منگوائی۔ یہ چائے نمکین تھی۔ مفتی صاحب اس کے عادی نہ تھے۔ انہوں نے میری جانب دیکھا۔ میں سارا معاملہ بھانپ گیا۔ میں نے میر واعظ کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا: "حضرت مجھے اس کا بخوبی علم ہے کہ کشمیری سے چائے میں ڈالنے کے لئے چینی مانگنی گالی دینے کے مترادف ہے لیکن مفتی صاحب نمکین چائے کے عادی نہیں ہیں"۔ میر واعظ نے ہاں ہاں کہتے ہوئے ایک خادم کو اندر بھیجا اور وہ فوراً چینی لے آیا۔ مفتی صاحب کے علاوہ مولانا ندوی اور راقم نے بھی چینی استعمال کی۔

میر واعظ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ہم شیخ صاحب سے مل چکے ہیں اس لئے انہوں نے یہ سوچا کہ ہم کہیں ان کے خیالات لے کر واپس نہ چلے جائیں لہٰذا انہوں نے ہمیں گلمرگ لے جانے کی پیش کش کی، جسے ہم نے قبول کر لیا۔ ہم تین کاروں میں سرینگر سے ٹنگمرگ روانہ ہوئے۔ ٹنگمرگ پہنچ کر ہم نے تھوڑی دیر ایک ریسٹ ہاؤس کے لان میں آرام کیا۔ اس موقع پر راقم نے چند باتیں کیں جنہیں سب نے غور سے سنا۔ میر واعظ فرمانے لگے: "آپ تو بڑے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ آپ دوسری کار میں کیوں

بیٹھے ہیں، اب ہماری کار میں بیٹھیں" ۔ چنانچہ ٹنگمرگ سے گلمرگ جاتے ہوئے میں ان کی کار میں بیٹھ گیا ۔ مفتی صاحب بھی اسی کار میں تھے ۔ راستے میں ایک ٹین کی شیڈ نظر آئی ۔ میر واعظ نے فرمایا کہ یہاں ٹچر باندھے جاتے تھے ۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ٹنگمرگ سے گلمرگ تک سڑک نہ تھی اور سیاح ٹچروں پر یہ مسافت طے کرتے تھے ۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے ایک بورڈ لگا ہوا دیکھا جس پر چراڑ شریف جانے والے راستے کی نشاندہی کی گئی تھی ۔ وہاں ایک بہت بڑے بزرگ نور الدین ریشی (م ۱۴۳۸ء) کا مزار ہے ۔ ان سے کشمیر میں ریشی سلسلے کو بڑا فروغ ملا ہے ۔

چراڑ شریف کے موڑ سے گلمرگ زیادہ دور نہیں ہے ۔ وہاں گولف کورس بنا ہوا ہے جہاں متمول لوگ گولف کھیلنے آتے ہیں ۔ گولف کورس کے ایک جانب چند ہوٹل ہیں اور دوسری جانب گولف کلب ۔ میر واعظ نے دوپہر کے کھانے کا وہیں انتظام کروایا تھا ۔ ہم نے کلب میں کھانا تناول کیا اور نمازِ ظہر ادا کی ۔ اس کے بعد ہم ادھر اُدھر گھومتے رہے ۔ گلمرگ میں خاموشی بہت ہے اس لئے خاموش طبع لوگ اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ آزادی سے چند سال قبل ابو الکلام آزاد یہیں ٹھہرے تھے ۔ یہاں سے انہوں نے نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی (م ۱۹۵۰ء) کے نام جو خط لکھے ہیں ان پر گلمرگ کی بجائے گل مرغ لکھا ہے ۔ گلمرگ کی سیر کر کے ہم شام کے وقت سرینگر پہنچ گئے ۔

مولوی محمد فاروق صاحب نے ہمیں دعوت دی کہ اگر ہم چاہیں تو ایک دن رات نگین باغ میں کسی ہاؤس بوٹ میں ٹھہر جائیں اور اگر پسند کریں تو چشمۂ شاہی پر ایک فرشتہ بنگلے میں قیام کرلیں ۔ ہم نے ان کے ساتھ ہاؤس بوٹ کا بھی معائنہ کیا ۔ نگین باغ میں ساڑھے چار صد ہاؤس بوٹ کھڑے تھے ۔ حال ہی میں سائرہ بانو بیماری سے اٹھی تھی ۔ اس کا شوہر دلیپ کمار اسے بحالی صحت کے لئے سرینگر لایا اور انہوں نے ایک ہاؤس بوٹ میں قیام کیا تھا ۔ اس لئے ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ان کے پرستار شکاروں میں بیٹھ کر نگین باغ کے چکر لگا رہے تھے ۔ اس لئے ہم نے چشمۂ شاہی پر قیام کیا ۔ میر واعظ گھر سے کھانا تیار کروا کے لائے ۔ ان کے ساتھ طویل ملاقات رہی ۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد موصوف دوبارہ تشریف لائے ۔ مفتی صاحب اور میر واعظ سیاسی ذہن رکھتے تھے اس لئے وہ الگ بیٹھ گئے ۔ راقم اور مولانا ابو العرفان صاحب گھاس پر جا

بیٹھے ۔ چشمۂ شاہی کے بنگلے کا ہر ملازم خفیہ پولیس کا اہلکار تھا ۔ جو بیرا پانی لے کر آتا وہ بھی خفیہ پولیس کا کارندہ تھا اور جو کمرے یا میز کی صفائی کے لئے آتا وہ بھی خفیہ پولیس کا آدمی تھا ۔ اس لئے میں اور مولانا ندوی الگ جا بیٹھے ۔

ایک روز میں کشمیر یونیورسٹی گیا ۔ وہاں صدر شعبۂ تاریخ ڈاکٹر محب الحسن سے ملاقات ہوئی ۔ انہوں نے ٹیپو سلطان پر تحقیقی کام کیا ہے ۔ موصوف چند روز بعد ریٹائر ہونے والے تھے ۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کی جگہ سنبھال لوں ۔ میں نے معذرت چاہی ۔ اس کے بعد میں مفتی عبدالغنی کے ساتھ رجسٹرار سے ملنے گیا ۔ رجسٹرار نے کشمیری زبان میں مفتی صاحب سے کہا کہ وہ مجھے یہاں رہنے پر آمادہ کرلیں اور میں محب الحسن صاحب کے بعد شعبۂ تاریخ کا سربراہ بن جاؤں ۔

مفتی عبدالغنی نے میری ملاقات شعبۂ کشمیریات کے سربراہ سعید صاحب کے ساتھ کروائی ۔ انہوں نے بتایا کہ جرمنی میں دو اسکالرز کشمیری زبان و ادب پر کام کر رہے ہیں ۔ اس شعبے میں DARDIC LANGUAGES پر کام ہو رہا ہے ۔ اس گروپ میں کھوار، کوہستانی، شینا، کشمیری کے علاوہ وائنہ اور کافرستان کی زبان بھی شامل ہے ۔ لداخی زبان کو تبتی زبان کی شاخ بتایا جاتا ہے اس لئے وہ اس گروپ سے الگ ہے ۔ سعید صاحب نے بتایا کہ کوہستانی زبان پر پشتو کا اثر ہے اس لئے اس زبان پر کام کرنے کے لئے پشتو کا علم بھی ضروری ہے ۔ وہاں میری ملاقات ایک ہندو اسکالر سے کرائی گئی جو شاردا زبان کا عالم تھا ۔ پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ کشمیریات اور آزاد کشمیر میں مظفر آباد میں ایک ایسے ہی "شعبے" کی بے بسی میرے سامنے آگئی ۔ ہم کشمیر، کشمیر تو بہت کرتے ہیں لیکن وہاں کی زبان، تاریخ، ثقافت اور تہذیب کے مطالعہ کی طرف مطلق توجہ نہیں دیتے ۔

کشمیر یونیورسٹی سرینگر کا دم مسلمانوں کے لئے غنیمت ہے ۔ بھارت میں مسلمانوں کو صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ ملتا ہے ۔ دوسری یونیورسٹیوں میں وہ MERIT پر داخل نہیں ہو سکتے ۔ اس لئے اگر انہیں علی گڑھ میں داخلہ نہ ملے تو وہ سرینگر کا رخ کرتے ہیں ۔ اس لئے کشمیر یونیورسٹی میں بھارت کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے طلبہ بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔

ایک روز راقم مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے ساتھ مدرسہ نصرۃ العلوم دیکھنے گیا۔ ہمیں میر واعظ نے وہاں مدعو کیا تھا۔ یہ مدرسہ ان کی انجمن نصرۃ الاسلام چلا رہی ہے۔ وہاں ہماری ملاقات مولانا عبدالکبیر صاحب سے ہوئی۔ موصوف ایک زمانے میں مسلم مسجد لوہاری گیٹ لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا عبدالکبیر سری نگر چلے گئے۔ ان کی رہائش حضرت بل میں تھی جہاں ان کا جدید طرز کا بنگلہ قابلِ دید تھا۔ عثمانی صاحب یہ بنگلہ دیکھ کر حیران رہ گئے تو ایک واقف حال نے بتایا کہ یہاں فتویٰ بہت مہنگے داموں بکتا ہے۔ چار پانچ ہزار روپے سے کم میں مفتی تجدید نکاح کا فتویٰ نہیں دیتا۔

ایک روز صوفی نذیر احمد نے ہمیں بربر شاہ میں اہلحدیث کی مسجد میں چائے کی دعوت دی۔ ہم نمازِ مغرب کے قریب وہاں پہنچے۔ بربر شاہ جھیل ڈل ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس کے کنارے پر اہلحدیث کی مسجد ہے۔ صوفی نذیر احمد ایک اچھے صحافی ہیں۔ ان کے مضامین انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۶۵ برس ہو گی۔ میں نے اپنی زندگی میں ان کی داڑھی سے لمبی اور گھنی داڑھی نہیں دیکھی۔ مولوی مدن کی داڑھی بھی اس کے آگے ہیچ تھی۔ میں نے ان سے اجازت لے کر ان کی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ بعد ازاں میں نے مفتی صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت بل کی درگاہ میں سرورِ کائنات کا موئے مبارک ایک شیشی میں ڈال کر رکھا ہوا ہے اور خانیار شریف میں حضرت عبدالقادر جیلانی کا موئے مبارک زیارت کے لئے رکھا ہوا ہے۔ اگر کوئی چیز سنبھال کر رکھنی ہے تو صوفی صاحب کی ریشِ مبارک کا ایک بال بوتل میں بند کر کے کہیں رکھوا دیجیے۔ مفتی صاحب میری بات سن کر بے حد محظوظ ہوئے۔

سرینگر میں خانیار شریف کے علاقے میں یوز آصف نامی کسی شخص کی قبر ہے۔ مرزائیوں نے اسے حضرت عیسیٰؑ کی قبر مشہور کر دیا ہے۔ خواجہ کمال الدین (م ۱۹۳۲ء) نے تو اس موضوع پر انگریزی زبان میں ایک کتاب بھی لکھ ماری ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سُولی پر فوت نہیں ہوئے تھے۔ جب انہیں جمعہ کی سہ پہر سُولی پر لٹکایا گیا تو فوراً بعد سبت شروع ہو گیا۔ پہرے دار وہاں سے چلے گئے تو عیسائیوں نے ان کو سُولی سے اتار لیا اور ان کے زخموں کا علاج کیا۔ جب وہ صحتیاب ہو گئے تو چھپتے چھپاتے

کشمیر پہنچ گئے جہاں انہوں نے بقیہ زندگی گزاری۔ ان کی والدۂ محترمہ حضرت مریم بھی بیت المقدس سے کشمیر چلی آئیں اور وفات کے بعد جس مقام پر دفن ہوئیں وہ ان کے نام Mary کی مناسبت سے Murree مشہور ہو گیا۔ مرزائیوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ سرینگر (مقدس شہر) کے معنی بیت المقدس ہیں۔ جب حضرت عیسیٰؑ بیت المقدس سے کشمیر آئے تو ان کی وجہ سے کشمیر کا دارالحکومت بیت المقدس یعنی سرینگر کہلانے لگا۔ ایسی ہی بھول بھلیوں پر مرزا غلام احمد کی "نبوت" کی بنیاد ہے۔

ایک روز راقم مزار سلاطین دیکھنے گیا۔ ایک پختہ چوکھنڈی کے اندر کشمیر کے سلاطین کے مزارات ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ دلچسپی مرزا حیدر دوغلات (م ۱۵۵۱ء) کے مزار سے تھی۔ مزارات پر سلاطین کے نام نہیں لکھے ہوئے۔ وہاں موجود چوکیدار بتا دیتا ہے کہ یہ فلاں سلطان کی قبر ہے۔ اکثر سلاطین کی قبریں گھاس نے ڈھانپی ہوئی تھیں۔ سلطان سکندر بُت شکن اور سلطان زین العابدین بڈ شاہ بھی وہیں محوِ خواب ابدی ہیں۔ ان مزارات سے قریب ایک گنبد میں سلطان سکندر کی والدہ مدفون ہے۔ مقبرے کے اندر داخل ہونے کے لئے تین چار سیڑھیاں چڑھنا ہوتی ہیں۔ میں نے بغور دیکھا کہ سیڑھیوں میں عام پتھروں کی بجائے بُت نصب ہیں جن کی اہانت کر کے مقبرے کے اندر داخل ہوتے ہیں۔

اس چار دیواری کے باہر ایک ریڑھی پر پُرانے برتن فروخت ہو رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک پرات پُرانے سکّوں سے بھری پڑی ہے جن پر زنگ لگا ہوا ہے۔ میرے استفسار پر ریڑھی والے نے بتایا کہ وہ یہ سکّے اسّی روپے کلو فروخت کر رہا ہے۔ میں نے ایک پاؤ سکّے خریدے۔ ان میں پانچ سکّے ہندو دور کے تھے۔ باقی سکّے سلطان فتح شاہ، حسن شاہ اور ابراہیم کے تھے۔ لاہور آنے کے بعد میں نے انہیں صاف کروایا اور اپنے ذخیرۂ مسکوکات میں شامل کر لیا۔

ایک روز میں دریائے جہلم کے کنارے سری پرتاپ سنگھ میوزیم دیکھنے گیا۔ وہاں مجھے ایک تاریخی مخطوطے - راج درشنی - کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کا تعلق جموں اور پنجاب کی تاریخ سے تھا۔ سیدوں کے آخری اور نودھیوں کے ابتدائی دور میں پنجاب اور جموں میں ککھڑوں نے بڑی تباہی مچائی تھی۔ شیخا ککھڑ عوام کے لئے عذاب بنا ہوا تھا

اس مخطوطے میں راجگان جموں کے علاوہ شیخا کھوکھر کا تذکرہ بھی موجود ہے ۔ عجائب گھر میں موجود دوسرے نوادرات بھی میری توجہ کا مرکز بنے رہے ۔

ایک روز میں رنبیر گنج بازار میں غلام محمد نور محمد تاجر کتب کی دکان دیکھنے گیا ۔ ان کی شائع کردہ " تاریخِ اعظمی " کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس موجود ہے ۔ انہوں نے حال ہی میں " تاریخِ حسن " کی تیسری جلد کا اُردو ترجمہ شائع کیا تھا ۔ اس میں کشمیر کے صوفیاء ، شعراء اور اہلِ فضل و کمال کے سوانحِ حیات ملتے ہیں ۔ راقم نے یہ کتاب وہاں سے خریدی اور کشمیر یونیورسٹی کے فاضل اُستاد ڈاکٹر محبّ الحسن سے ۶ جولائی ۱۹۷۳ء کو اس پر ان کے دستخط کروائے ۔

ہری پربت کے دامن میں مُلّا شاہ بدخشیؒ (م ۱۶۶۱ء) کی خانقاہ کے آثار موجود ہیں ، اس خانقاہ کی چھتیں گر چکی ہیں لیکن دیواریں ہنوز کھڑی ہیں ۔ یہ خانقاہ شہزادہ دارا شکوہ نے ان کے لئے تعمیر کروائی تھی ۔ دارا شکوہ اور اس کی بہن جہاں آرا بیگم حضرت مُلّا شاہ کے مخلص مُرید تھے ۔ دارا شکوہ نے خانقاہ کے ساتھ مسجد اور حمام بھی بنوایا ۔ اتفاق سے ایک پتھر اب تک وہاں موجود ہے جس پر یہ تاریخِ بنا کندہ ہے :

تاریخ حمام و مسجد سلطان دارا شکوہ

حمام تو و مسجدت ای دیدہ باز
کرم است یکے یکی جماعت پرداز
تاریخ بنائے ہر دو را گوید " شاہ "
یکجای وضو آمد و یکجای نماز

۱۰۶۹ ھ

شاعر نے اپنا تخلص " شاہ " استعمال کیا ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ تاریخ مُلّا شاہ بدخشیؒ کی کہی ہوئی ہے ۔ مُلّا شاہ بدخشیؒ گرمی کے موسم میں لاہور میں نہیں رہ سکتے تھے ۔ اس لئے ان کے مُرشد حضرت میاں میر قادری (م ۱۶۳۵ء) نے انہیں اجازت دے دی تھی کہ وہ گرمی کا موسم کشمیر میں گزار لیا کریں اور سردیوں میں لاہور میں ان کی خدمت میں حاضر رہیں ۔ دارا شکوہ نے کشمیر میں اپنے مُرشد کے لئے خانقاہ ، مسجد اور حمام بنوا دیا تھا جس کی تصدیق اس کتبے سے ہوتی ہے ۔

ایک روز ہم تینوں جھیل ڈل کے دوسرے کنارے پر شالا مار باغ اور نشاط باغ دیکھنے گئے ۔ یہ دونوں جگہیں بڑی اچھی تفریح گاہیں ہیں ۔ ان کے قریب ہی ایک جگہ حیل بل کہلاتی ہے وہاں چنار کا ایک اتنا قدیم درخت ہے کہ اگر چھ سات افراد ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر اس کے تنے کا احاطہ کرنا چاہیں تو شاید ہی کر پائیں ۔ اس کے قریب ہی ایک جگہ " ہاروَن " ہے جہاں سے شہر کو پینے کا پانی سپلائی کیا جاتا ہے ۔ نسیم باغ حضرت بل سے قریب ہے ۔ وہاں مولانا ابوالعرفان ندوی کے ایک دوست رحمٰن عباد رہتے تھے ، جو پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے ۔ ہم دو تین بار ان کے ہاں بھی گئے ۔ دراصل مولانا ندوی کو پان کھانے کی عادت تھی اور رحمٰن عباد صاحب لکھنؤ کے رہنے والے تھے اس لئے ان کے ہاں ندوی صاحب کو اپنی پسند کے پان مل جاتے تھے ۔

سرینگر میں سب سے اُونچی پہاڑی تختِ سلیمان کے نام سے موسوم ہے ۔ ہندو اسے شنکر اچاریہ کی پہاڑی کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ اس کے ایک طرف ٹیلی ویژن اسٹیشن ہے ۔ میں ایک رُوز ہمت کر کے اس پہاڑی پر چڑھ گیا ۔ اس پہاڑی کے اوپر درجنوں سیڑھیاں چڑھ کر شنکر اچاریہ کا مندر آتا ہے ۔ اس جگہ سے میلوں تک وادیٔ کشمیر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے ۔ تختِ سلیمان پر عبداللہ خان چوگان بیگی کی قبر تھی ۔ اکبر نے شاہ فتح اللہ شیرازی (م ۱۵۸۹ء) کو اس کے پہلو میں دفن کروایا تھا ۔ میں دیر تک ان کی قبریں تلاش کرتا رہا لیکن کامیاب نہ ہوا ۔ وہاں ایک جگہ پتھر بکھرے پڑے تھے ۔ شاید یہ ان کے مزاروں کے کھنڈرات ہوں ۔ تختِ سلیمان کے دامن میں چند قبریں ہیں جو زمانۂ حال ہی میں بنائی گئی ہیں ۔ یہ جگہ گگری بل کہلاتی ہے ۔ اسی جگہ ڈاکٹر سلام الدین نیاز کے والد محترم عبدالعزیز مرحوم کا گھر تھا ۔ اسی گھر سے قریب مشہور شاعر خوشی محمد ناظر (م ۱۹۴۴ء) کی ابدی آرام گاہ ہے ۔

ایک رُوز میں جامع مسجد دیکھنے گیا ۔ یہ بھی فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے ۔ مسجد کے اندر دو منبر تھے ۔ ایک منبر پر خطیب خطبۂ جمعہ دیتا ہے اور دوسرا منبر میر واعظ کے لئے مختص ہے ۔ جس رُوز میر واعظ خطبۂ جمعہ ارشاد فرمائیں اس رُوز وہ یہ منبر استعمال کرتے ہیں ۔ مسجد کے چاروں جانب ایک ہی طرز کے برآمدے اور نوکیلی بُرجیاں ہیں ۔ کشمیر کی مساجد اسی نمونے پر تعمیر ہوئی ہیں ۔ جامع مسجد دیکھ کر میں خانقاہ

معلیٰ دیکھنے گیا ۔ یہ شاہِ دریا آستین امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ (م ۱۳۸۵ء) کی یادگار ہے ۔ وادیٔ کشمیر میں یہ سب سے بڑا دینی اور رُوحانی مرکز ہے ۔ یہاں ہر وقت درجنوں کی تعداد میں مرد و زن اوراد فتحیہ پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں ۔

سید علی ہمدانیؒ نے تین بار کشمیر کا دورہ کیا اور وہ کشمیر کو دین ، فن اور تہذیب و ثقافت دے گئے ۔ ایک بار وہ وادی میں ایک درّے سے داخل ہوئے اور دوسرے درّے سے باہر نکل گئے اور راستے میں ۳۷۰۰۰ غیر مسلموں کو مشرف باسلام کر گئے ۔

میں درگاہ سے متعلق لائبریری دیکھنا چاہتا تھا ۔ سنا ہے کہ وہاں بڑے نایاب مخطوطات موجود ہیں ۔ بد قسمتی سے ان دنوں لائبریرین لمبی چھٹی لے کر سرینگر سے باہر گئے ہوئے تھے اس لئے لائبریری بند پڑی تھی ۔ لہذا میری لائبریری دیکھنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی ۔

خانقاہ معلیٰ کے احاطے میں بخشی غلام محمد اور میر قاسم کی قبریں ہیں ۔ یہ دونوں کشمیر کے وزیرِ اعلیٰ رہ چکے ہیں ۔ کشمیری بخشی غلام محمد سے بڑے خوش تھے ۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ وہ آپ بھی کھاتا تھا اور اس کی وجہ سے لوگ بھی سرکاری رقوم ہضم کرتے تھے ۔ شیخ عبداللہ نہ خود کھاتے تھے اور نہ ہی کسی اور کو کھانے کا موقع فراہم کرتے تھے ۔

شہر کے اندر ایک پہاڑی ہری پربت کے نام سے موسوم ہے ۔ سرینگر کا قلعہ اسی پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے ۔ اسی پہاڑی کے دامن میں سلطان العارفین حضرت حمزہؒ (م ۱۵۷۶ء) کا مزار ہے ۔ یہ شاید سرینگر کے سب سے بڑے بزرگ ہیں ۔ ان کا مزار ملّا شاہ بدخشیؒ کی خانقاہ سے قریب ہے ۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے جو راستہ جاتا ہے اس پر ایک دروازہ بنا ہوا ہے جو " اکبری دروازہ " کے نام سے موسوم ہے ۔

جس مہمان خانے میں ہم قیام پذیر تھے ، اس کی نچلی منزل میں چند کاریگر ٹھہرے ہوئے تھے جن کا تعلق جے پور سے تھا ۔ ان دنوں ڈل کے کنارے حضرت بل کی درگاہ از سرِ نو تعمیر ہو رہی تھی ۔ اس کے سنگِ مرمر کے گنبد پر لگانے کے لئے کلس تیار کیا جا رہا تھا ۔ یہ کاریگر اسی کام کے لئے بلائے گئے تھے ۔ انہوں نے تانبے کے چھوٹے بڑے ٹکڑے ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر جوڑے اور ان کے اوپر سونے کے ورق چپکا کر انہیں اسٹوو

کے ساتھ آنچ دی تو وہ ورق تانبے پر چپک گئے ۔ حضرت بل کی عمارت میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک رکھا ہوا ہے ۔ اس عمارت کے باہر ایک پتھر پر یہ شعر کندہ ہے :

تاریخ ورود با یکے ہاتف بگفت
کشمیر مدینہ بشد از موئے نبیؐ

۱۱۱۱ھ

جھیل ڈل کے اندر ایک جزیرہ ہے جو چار چناری کے نام سے موسوم ہے ۔ وہاں کبھی چنار کے چار درخت تھے ، اب تین رہ گئے ہیں ۔ اسی جگہ مہاراجہ کا کبوتر خانہ تھا ۔ ڈل جھیل کئی حصوں میں منقسم ہے ۔ یہ تمام حصے دریائے جہلم کے ذریعے ملے ہوئے ہیں ۔ شہر دریا کے دونوں کناروں پر آباد ہے ۔ ایک درجن سے زائد پل آمد و رفت کے لئے بنائے گئے ہیں ۔ ان میں سے زینا کدل اور امیرا کدل خاص طور پر مشہور ہیں ۔ اب ایک نیا پل تعمیر ہوا ہے جو بڑبرو برج کہلاتا ہے ۔

ایک شام میں اور مولانا ندوی ان کے ایک دوست سے ملنے گئے وہ چشمۂ شاہی کے نواح میں خیمہ لگوا کر کچھ کام کروا رہے تھے ۔ ان کے خیمے سے قریب خوبانی کا ایک درخت تھا جس پر پکی ہوئی خوبانیاں لگی ہوئی تھیں ۔ مولانا نے کہا کہ وہ اپنے مہمان سے کہتے ہیں کہ وہ کسی ملازم سے کہیں کہ ہمیں خوبانیاں توڑ دے ۔ میں نے عرض کیا کہ ملازم کی کیا ضرورت ہے ۔ میں خود ہی درخت پر چڑھ گیا ۔ مولانا ارے ارے کرتے رہے ۔ میں نے درخت پر چڑھ کر خوبانیاں کھائیں اور مولانا کو بھی کھلائیں ۔ میں نے کہا کہ میں گھر جا کر یہ تو کہہ سکوں گا کہ میں نے درخت پر چڑھ کر خوبانیاں کھائی تھیں ۔ اسی جگہ ایک کو میٹر رقبے میں مختلف رنگوں کا گلاب اُگا ہوا تھا ۔ ہمارے میزبان نے ہمیں بتایا کہ نہرو خاندان سے تعلق رکھنے والا ایک شخص اس کا انچارج ہے اور یہ گلاب اسی نے کاشت کروایا ہے ۔

ایک روز کہیں جاتے ہوئے ہم نے زینا کنڈ میں وہ جگہ بھی دیکھی جہاں تک مجاہدین یلغار کرتے ہوئے ۱۹۴۷ء کے آغاز میں پہنچ گئے تھے ۔ سرینگر کی ایئرپورٹ پر توپوں کے گولے گر رہے تھے اور کشمیر کی حکومت سرینگر سے فرار ہو کر جموں پہنچ گئی

ہی اور مہاراجہ ہری سنگھ بمبئی میں پناہ لے چکا تھا اگر نوابزادہ لیاقت علی خاں ہفتہ عشرہ اور صبر کر لیتے اور جنگ بندی پر آمادہ نہ ہوتے تو سرینگر مجاہدین کے قبضے میں آجاتا اور مسئلہ کشمیر حل ہو جاتا۔

میرے استفسار پر چند حضرات نے بتایا کہ اگر کشمیر اور پاکستان کے درمیان پیر پنجال کے بلند و بالا برفانی پہاڑ حائل نہ ہوتے تو کشمیری یہاں سے ترکِ وطن کرکے پاکستان پہنچ جاتے۔

سرینگر کے بازاروں میں لال چوک اور تلارڈ قابلِ دید ہیں۔ لال چوک سے ہر طرف جانے والی بسیں مل جاتی ہیں۔ تلارڈ میں کبھی مولوی رہتے ہوں گے۔ مولانا میرک شاہ اندرابی (م ۱۹۷۳ء) اسی محلّے کے رہنے والے تھے۔ وہ خود تو پاکستان چلے آئے تھے لیکن ان کا ایک بیٹا جس کا نام غالباً عبداللہ تھا، ان دنوں وہیں مقیم تھا۔ حضرت معین الدین نقشبندیؒ (م ۱۹۷۴ء) صاحبِ "فتاویٰ نقشبندیہ" کی خانقاہ بھی سرینگر میں تا حال موجود ہے۔ ان کے والد بزرگوار خواجہ خاوند محمود المعروف بہ حضرت ایشانؒ (م ۱۹۴۰ء) لاہور میں مدفون ہیں۔ حضرت معین الدینؒ، شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کے شاگردِ رشید تھے۔

میں تیرہ روز سرینگر میں ٹھہرا۔ چودھویں روز میں محکمۂ ڈاک کی بس میں سوار ہو کر جموں پہنچا۔ مجھے وہاں سے رات کو ٹرین میں برتھ مل گئی اور میں اگلے رُوز صبح لدھیانے پہنچ گیا۔ وہاں چوڑے بازار میں پیرس کلاتھ ہاؤس پر جواہر لعل وڈیہرہ سے ملاقات کی۔ وہ میرے والد مرحوم کے دوست ایشرداس کے فرزند تھے۔ ان سے مل کر میں اپنے آبائی وطن پھلور گیا۔ میں اپنی دادی کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے گیا تو وہاں جا کر دیکھا کہ قبرستان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ وہاں مُرغی خانے بن گئے ہیں اور لوگوں نے رہائش اختیار کرلی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ قبرستان سے میں اپنے آبائی محلّے میں گیا۔ پُرانے لوگ مرکھپ گئے تھے صرف ایک واقف کار سے ملاقات ہوئی۔ بازار میں چند بڑے بُوڑھے ملے۔ ان سے مل کر میں لدھیانے گیا اور وہاں سے سرہند شریف پہنچا۔ وہاں تھوڑی دیر قیام کے بعد دہلی ہوتے ہوئے تغلق آباد پہنچ گیا۔ مفتی صاحب مجھ سے پہلے دہلی پہنچ گئے تھے، انہوں نے میرے اہل خانہ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو مطلع کر دیا تھا کہ میں کشمیر کی سیاحت کے بعد جلد ہی واپس آنے والا ہوں۔

اَمرتسر، بٹالہ، قادیان

راقم ایک بار گورو نانک دیو یُونیورسٹی امرتسر کے صدر شعبۂ تاریخ پروفیسر جگدیش سنگھ گریوال کی دعوت پر اٹھارہویں صدی کی تاریخ و ثقافت پر منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے امرتسر گیا۔ وہاں ہندوستان کی مختلف یُونیورسٹیوں سے سیمینار میں شرکت کی غرض سے مندوبین آئے ہوئے تھے۔ تین رُوز تک سیمینار جاری رہا۔

ایک رُوز میں فرصت نکال کر دربار صاحب دیکھنے گیا۔ میں نے اپنے جوتے ایک سیوادار کے حوالے کرکے نمبر حاصل کیا اور پاؤں دھو کر بڑی ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ ڈیوڑھی سے چند سیڑھیاں نیچے اُتر کر میں تالاب کے کنارے پہنچا۔ تالاب کے چاروں طرف سنگِ مرمر کا فرش لگا ہوا ہے جس پر سیوا کروانے والوں کے نام کندہ ہیں۔ تالاب کے چاروں طرف برآمدے ہیں اور ان کے عقب میں چھوٹے چھوٹے حجرے۔ ان میں بعض حجرُوں میں گرنتھی، گرنتھ صاحب کے پاٹھ میں مشغول تھے اگرچہ وہاں پاٹھ سُننے والا کوئی نہ تھا۔ برآمدوں میں دُور سے آنے والے سکھ یاتری آرام کر رہے تھے۔

تالاب کے کنارے پر بیری کا ایک بہت پُرانا درخت نظر آیا۔ اس کی شاخوں کو سہارا دے کر کھڑا کیا ہوا ہے۔ یہ بیری دربار صاحب سے بھی زیادہ قدیم بتائی جاتی ہے۔ جب چوتھے گورو رامداس (م ۱۵۸۱ء) نے امرتسر کی بنیاد رکھی اور یہاں تالاب بنوانا شروع کیا تو اس وقت یہی ایک درخت اس نواح میں موجود تھا۔ مزدور اور رضا کار کام کرتے کرتے تھک جاتے تو وہ اسی بیری کے سائے میں آرام کرتے اور تازہ دم ہو کر دُوبارہ کام میں لگ جاتے۔ اسی بنا پر اس کا نام "دکھ بھنجی بیری" پڑ گیا۔

دربار صاحب کے اندر ہر مندر کی عمارت تالاب کے وسط میں بنائی گئی ہے اور وہاں تک ایک پُل کے ذریعے پہنچتے ہیں۔ جہاں سے پُل شروع ہوتا ہے وہاں ایک شاندار دروازہ بنایا گیا ہے۔ اسے عرفِ عام میں درشنی ڈیوڑھی کہتے ہیں۔ درشنی ڈیوڑھی

سے باہر چند میٹر کے فاصلے پر زرد رنگ کے دو جھنڈے نصب ہیں جنہیں سکھوں کی اصطلاح میں "نشان صاحب" کہتے ہیں۔ میرے استفسار پر سکھوں نے بتایا کہ پانچویں گورو ارجن دیو کے زمانے تک ایک جھنڈا ہوا کرتا تھا۔ چھیویں پاتشاہی (چھٹی بادشاہی) گورو ہر گوبند (م ۱۶۴۴ء) نے مغلوں کی سیادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انہوں نے کہا کہ اب پیری کے ساتھ میری بھی چلے گی۔ اس لئے ان میں سے ایک جھنڈا پیری کا ہے اور دوسرا میری کا۔

ان جھنڈوں کے قریب ہی ایک عمارت اکال تخت کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں لکڑی کا ایک تخت سجا کر رکھا ہوا ہے اور اس پر گدیاں اور گاؤ تکیے رکھے ہوئے ہیں۔ سکھوں کے ہاں چار اکال تخت ہیں۔ ان میں سے ایک امرتسر میں ہے اور بقیہ تین، حضور صاحب (ناندیڑ: دکن)، پٹنہ صاحب اور آنند پور میں ہیں۔ یہاں صبح و شام نوبت بجائی جاتی ہے جسے ہم Insignia of Royalty کہہ سکتے ہیں۔ سکھوں کی اَرداس (عرضداشت: دعا) میں ان چاروں اکال تختوں کا واسطہ دے کر خدا سے دعا مانگی جاتی ہے۔

درشنی ڈیوڑھی سے باہر ایک چھوٹا سا گورودوارہ ہے جہاں ایک گرنتھی گرنتھ کا پاٹھ کرتا رہتا ہے۔ وہاں زائرین کے بیٹھنے کے لئے جگہ نہیں ہے۔ اسے گورودوارہ لاچی صاحب کہتے ہیں سکھوں کی روایت کے مطابق مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اس علاقے کے افسرِ مال مستا رنگڑ نے ہر مندر پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر شراب پیتا اور زنانِ فاحشہ کا رقص دیکھا کرتا تھا۔ سکھوں کو اس کے اس فعل سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ ایک روز دو سکھ جوان اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر یہاں پہنچے۔ انہوں نے اس جگہ، جہاں گورودوارہ لاچی صاحب ہے، اپنے گھوڑے کھڑے کئے۔ وہ ایک تھیلے میں ٹھیکریاں ڈال کر لائے تھے۔ جب پہرہ دار نے انہیں اندر جانے سے روکا تو انہوں نے کہا کہ وہ مالیہ ادا کرنے آئے ہیں۔ انہوں نے پہرہ دار کو وہ تھیلہ دکھایا اور اس نے انعام کے لالچ میں انہیں اندر جانے دیا۔ جب وہ اندر پہنچے تو اس وقت مستا رنگڑ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ ان میں سے ایک جوان نے کرپان مار کر اس کا پیٹ پھاڑ ڈالا اور جلدی سے باہر آکر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر نظروں سے غائب ہو گئے۔ سکھوں نے ان کی یاد میں اس جگہ

گورودوارہ تعمیر کیا۔

درشنی ڈیوڑھی سے گزرتے ہی سنگِ مرمر کا پل شروع ہو جاتا ہے۔ جہاں پل ختم ہوتا ہے وہیں "ہر مندر صاحب" کی عمارت ہے۔ دروازے کے اوپر سونے کے پترے چڑھے ہوئے ہیں اور دروازے کی پیشانی پر سونے کے پتروں سے ہی بابا نانک (م ۱۵۳۹ء) اور ان کے دو ساتھیوں بھائی بالا اور بھائی مرداند کی تصویریں بنائی ہوئی ہیں۔ اس عمارت کی بُرجیوں اور گنبد پر بھی سونے کے پترے چڑھائے گئے ہیں۔ پانی کے تالاب کے اندر یہ عمارت جہاز کا منظر پیش کرتی ہے۔ سکھوں کا یہ کہنا ہے کہ جو اس جہاز میں سوار ہو گا وہی پار ہو گا۔ اس عمارت کے گرد "مطاف" بنا ہوا ہے جہاں کبھی کبھی کوئی سکھ "طواف" کرتے ہوئے نظر آجاتا ہے۔

ہر مندر کے اندر داخل ہوتے وقت سکھ دروازے کی دہلیز کو چُھوتے ہیں۔ اس کے عین سامنے ایک کٹہرے کے اندر گرنتھ صاحب رکھا ہوا ہے اور اس سے قریب ہی شبد کیرتن کرنے والوں کی ایک منڈلی بیٹھی رہتی ہے۔ کبھی گرنتھی پاٹھ شروع کر دیتا ہے اور کبھی وہ منڈلی شبد کیرتن کرنے لگتی ہے۔ ہر مندر کے اندر تھوڑے سے آدمیوں کے بیٹھنے کو جگہ موجود ہے۔ جو سکھ ہر مندر میں داخل ہوتا ہے وہ چند سکے بطور نذر گرنتھ صاحب کے سامنے ڈال کر اسے ماتھا ٹیکتا ہے۔ جب وہ عقبی حصے میں جاتا ہے تو تالاب سے ایک چُلو پانی لے کر اپنے سر پر ڈالتا ہے اور اس کے چند قطرے اپنے حلق میں ٹپکاتا ہے۔

گرنتھ صاحب صبح چار بجے ایک پالکی میں رکھ کر ہر مندر میں لاتے ہیں۔ رات کو دس بجے گرنتھ صاحب کی "سواری" شاہانہ انداز سے ایک بنگلے کی طرف جاتی ہے۔ ان چھ گھنٹوں میں ہر مندر کو دودھ اور پانی کے ساتھ دُھویا جاتا ہے۔ چھت گیری تبدیل کی جاتی ہے اور تازہ پھول چھت گیری میں لگائے جاتے ہیں۔ صبح چار بجے گورو گرنتھ صاحب کو شاہانہ انداز سے چاندی کی پالکی میں رکھ کر ہر مندر میں لاتے ہیں۔ وہ گرنتھ صاحب کو زندہ گورو کا درجہ دے کر اس کی تعظیم کرتے ہیں۔

دن میں کئی بار اَرداس کرائی جاتی ہے۔ تمام حاضرین ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بیک زبان یہ کہتے ہیں:

جہاں جہاں خالصہ صاحب تہاں تہاں رچھیا ریت، دیگ تیغ کی فتح پنتھ کی جیت سری صاحب جی سہائے، خالصہ جی کے بول بالے، من نیواں مت اُچی، مت پت کا راکھا آپ اکال پُرکھ واہگورو۔ سکھاں نوں سکھی دان، بھروسہ دان، نام دان، وساہ دان، سری امرتسر جی کے اشنان، چوکیاں جھنڈے بُنگے جگو جُگ اٹل، دھرم کا جیکار۔ سری خالصہ صاحب جی سہائے۔ پنج پیارے چار صاحبزادے چالی مکتے، جنہاں تیرا نام جپیا، وَنڈ کے چھکیا، تیغ چلائی، دیگ ہلائی، اُوہناں سنگھاں تے سنگھنیاں دی کمائی دے وَل دھیان دھر کے خالصہ صاحب جی بُولیو واہگورو واہگورو۔ جنہاں سنگھاں تے سنگھنیاں نے دھرم ہیت سیس دتے، بند بند کٹائے کھوپریاں لُوہائیاں، چرکھڑیاں تے چڑھے، تے آریاں نال چیرائے گئے، جنہاں بی بیاں نے اپنے بچیاں دے ٹکڑیاں دے ہار گلاں وچ پا کے تے کھڑیاں ہو کے سوا سوا مَن دانے پیسے اُوہناں دی کمائی دے ول دھیان دھر کے خالصہ صاحب جی بُولیو واہگورو واہگورو۔ جو بُولے سو نہال۔ ست سری اکال۔

ایک بار میں نے ایک "سمجھدار" سکھ سے پُوچھا کہ اس میں تو مُسلمانوں کے سکھوں پر مظالم کا ذکر ہے جو دن میں کئی بار یاد کرایا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر کسی قوم کو زندہ رکھنا ہو تو اسے اس کے شہیدوں کے واقعات سناتے رہنا چاہیے۔

دربار صاحب سے قریب ہی بابا ٹل کا لنگر ہے۔ یہاں زائرین کو مفت کھانا ملتا ہے۔ جب وہ کھانا کھانے جاتے ہیں تو زور سے یہ نعرہ لگاتے ہیں۔ بابا ٹل پکیاں پکایاں گھل۔ دربار صاحب میں جتنی دیر شبد کیرتن جاری رہتا ہے اتنی دیر چند سیوادار حلوہ لے کر راستے میں کھڑے رہتے ہیں اور ہر شخص کو بلا تفریق مذہب و ملت حلوہ (کڑاہ پرشاد) دیتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ دستور ہے کہ جب بھی گوردوارے میں گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہو گا، حلوہ ضرور تیار کیا جائے گا۔

دربار صاحب کی عمارت میں ہی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کا صدر دفتر ہے۔ یہی ادارہ تمام گوردواروں کا انتظام چلاتا ہے۔ ایک زمانے میں برہمنوں نے گوردواروں پر قبضہ کر لیا تھا اور تمام نذرانے وہ لے جاتے تھے۔ موجودہ صدی کے تیسرے عشرے کے آغاز پر سکھوں نے باقاعدہ تحریک چلائی اور برہمنوں کو گوردواروں سے نکالا۔ ننکانہ

صاحب کے گدی نشین پنڈت نے اس موقع پر کئی سکھوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ ان کی یادگاریں ننکانہ صاحب میں گوردوارہ جنم استھان کے اندر موجود ہیں۔ اس کے باوجود سکھوں نے اپنی تحریک جاری رکھی اور پنجاب اسمبلی نے ایک قانون پاس کر کے گوردواروں کا انتظام گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کر دیا۔

دربار صاحب کے علاوہ امرتسر میں سکھوں کے تین اور گوردوارے بھی قابلِ دید ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام ٹاہلی صاحب، دوسرے کا منڈی صاحب اور تیسرے کا کول سر ہے۔ ہندوؤں نے بھی ہَر مندر کی طرز پر دُرگیانہ کے نام سے ایک مندر بنایا ہے، مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

مجھے پروفیسر کرنیل سنگھ تھمند کی بیٹی من دیپ کور کی شادی میں شرکت کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ دو روز پہلے ان کے ہاں اکھنڈ پاٹھ شروع ہو گیا تھا۔ اسے ہمارے ختمِ قرآن کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں۔ گرنتھی باری باری آتے ہیں اور ۴۸ گھنٹوں میں مکمل گرنتھ صاحب پڑھ لیتے ہیں۔ شادی کی تقریب سے پہلے گرنتھ صاحب ایک شامیانے کے نیچے لا کر رکھ دیتے ہیں۔ دُولھا اور دُلھن کو اس کے سامنے بٹھاتے ہیں۔ گرنتھی گرنتھ کا شبد شروع کر دیتا ہے۔ جب وہ رُکتا ہے تو دولھا اور دلھن گرنتھ صاحب کے گرد چکر لگا کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ گرنتھی پھر پاٹھ شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ چار چکر پورے کرتے ہیں۔ چوتھے چکر کے ختم ہونے کے ساتھ ہی شادی مکمل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک "مائی" کا سترھواں تھا۔ اسے اس روز فوت ہوئے سترہ دن ہو گئے تھے۔ کرنیل سنگھ نے وہاں جانا تھا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں بھی اکھنڈ پاٹھ ہوا تھا۔ اس کے بعد اَرداس کی گئی اور بعد میں کڑاہ پرشاد (حلوہ) تقسیم ہوا۔ جب لوگ رخصت ہونے لگے تو گھر والے قطار بنا کر اپنے گھر سے باہر کھڑے ہو گئے اور وہ ہاتھ جوڑ کر آنے والوں کا شکریہ ادا کرتے رہے۔

کرنیل سنگھ نے مجھے وہ دکان بھی دکھائی جہاں [illegible] بخش کُشتہ (م ۱۹۵۵ء) کتابیں فروخت کیا کرتا تھا۔ یہ دکان ایک بازار کی نکڑ پر ہے۔ ایک روز میں نمازِ جمعہ ادا کرنے خیر الدین کی مسجد میں گیا۔ نماز میں سوا سو کے [illegible] مسلمان موجود تھے۔ ان میں اکثریت کشمیری مسلمانوں کی تھی جو محنت مزدوری کرنے وہاں آئے ہوئے تھے یا یوپی

کے مسلمان تھے جو امرتسر کی منڈی سے سامان خریدنے آئے ہوئے تھے۔ مسجد سے باہر کئی ہندو اور سکھ عورتیں اپنے شیر خوار بچے اٹھائے کھڑی تھیں۔ وہ مسلمانوں سے استدعا کر رہی تھیں کہ وہ ان کے بچوں کو دم کر دیں۔

ایک روز میں گورو بازار، مصری بازار، پاپڑ وڑیاں والا بازار اور مجیٹھ منڈی دیکھنے گیا۔ ایک روز کرنیل سنگھ مجھے پاسیوں کے چوک میں کیسر کے ڈھابے میں کھانا کھلانے لے گئے۔ یہ دیکھیٹرین ہوٹل ہے۔ وہاں کے ثابت ماش بڑے لذیذ مانے جاتے ہیں۔ ایک تنور میں چھوٹی چھوٹی روٹیاں لگائی جا رہی تھیں اور انہیں گھی سے چوپڑ کر گاہکوں کے سامنے رکھتے تھے۔ اس ہوٹل میں بڑا رش تھا۔ جو لوگ ماس (گوشت) کھاتے ہیں وہ منگل کے ڈھابے کا رُخ کرتے ہیں۔ ہمارے میزبان کہتے تھے کہ اگر کوئی شخص امرتسر آئے اور ان میں سے کسی ایک ہوٹل میں کھانا نہ کھائے تو اس کا یہاں آنا نہ آنا برابر ہیں۔

امرتسر میں جلیانوالہ باغ بھی ایک تاریخی مقام ہے۔ یہ دربار صاحب سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس باغ کا صرف ایک ہی دروازہ ہے۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو بیساکھی کے موقع پر یہاں ایک جلسہ ہوا جس پر جنرل ڈائر نے وارننگ دیئے بغیر گولی چلا دی۔ سیکڑوں افراد موقع پر ہلاک ہو گئے۔ باغ کے اندر ایک کنواں ہے۔ اس پر ایک تختی لگی ہوئی ہے کہ افراتفری کے عالم میں درجنوں افراد اس کنوئیں میں گر کر مر گئے تھے۔ یہ باغ چاروں اطراف سے مکانوں میں گھرا ہوا ہے اس لئے راہِ فرار کوئی نہ تھی۔ مکانوں کی دیواروں میں گولیوں کے نشان موجود ہیں جنہیں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اس موقع پر مرنے والوں کی مندر نما یادگار باغ میں تعمیر کی گئی ہے۔

اس باغ کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر آہلو والیوں کا کٹڑہ ہے۔ یہاں کپڑے کا کاروبار ہوتا ہے۔ اس کٹڑے میں ہمارے فاضل دوست میر انور سعید محمود کا مکان تھا جو بڑا گھر کہلاتا تھا۔ اس بازار کے دکانداروں میں ابھی تک میر صاحب کے جاننے والے موجود تھے۔ ان کے گھر سے متصل میر صمدو کی مسجد تھی۔ میر صمدو میر انور سعید محمود کے پڑدادا اور رنجیت سنگھ کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے امرتسر میں یہ مسجد تعمیر کی تو سکھوں نے رنجیت سنگھ سے شکایت کی کہ میر صمدو نے

امرتسر میں "مکہ" تعمیر کر لیا ہے۔ رنجیت سنگھ نے اُن سے کہا کہ وہ کسی دن وہاں جا کر موقع دیکھے گا۔ رنجیت سنگھ نے میر صمدو سے کہا کہ آپ اس مسجد میں بکری بھی لگاتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ رنجیت سنگھ کے کہنے پر میر صاحب نے وہاں بکری لگائی۔ رنجیت سنگھ وہاں پہنچا اور جُوتے اُتار کر مسجد میں داخل ہوا۔ ایک سکھ نے پوچھا کہ مہاراج آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ رنجیت سنگھ نے کہا کہ یہ بکری ہے ہمیں عدالت کا احترام کرنا چاہیے۔ میر صاحب نے رنجیت سنگھ کی موجودگی میں ایک مقدمہ سُنا اور مہاراجہ چند منٹ وہاں بیٹھ کر یہ کہتے ہوئے رخصت ہوا کہ یہ تو بکری ہے، مسجد کہاں ہے؟

ایک روز میں جان محمد کی مسجد دیکھنے گیا۔ اس میں کشمیریوں نے رہائش اختیار کر لی ہے۔ وہ نماز کے اوقات میں وہاں نماز بھی پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن خیر الدین کی مسجد کی بات ہی اور ہے۔

میں نے کٹڑہ مہاں سنگھ، کٹڑہ جیمل سنگھ اور کٹڑہ شیر سنگھ دیکھے۔ ہال بازار بھی ہمارے ہاں کی انارکلی کی طرح بارونق بازار ہے۔ بازار مائی سیواں میں کپڑے کی دکانیں دیکھیں۔ امرتسر پنجاب میں ہول سیل مال کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ آزادی سے قبل پنجاب، کشمیر، بلوچستان، افغانستان، چترال، وزیر اور وسط ایشیاء تک سے سوداگر وہاں آتے تھے۔ اب وہاں اتنا کاروبار نہیں رہا۔ تاہم کشمیر اور پنجاب کے سوداگر وہیں سے مال خرید کر لے جاتے ہیں۔

بٹالہ:

سیمینار کا آخری سیشن دوپہر کے کھانے سے پہلے ختم ہو گیا۔ راقم نے بٹالہ جانے کی خواہش ظاہر کی تو پروفیسر جگدیش سنگھ گریوال نے کہا کہ ان کے شعبے کا ایک طالب علم پروین پال، جو پی ایچ ڈی کر رہا ہے، بٹالے کا رہنے والا ہے۔ میں اسے ساتھ لے جاؤں، وہ میری رہبری کرے گا۔ چنانچہ میں اور پروین پال امرتسر سے بذریعہ بس بٹالہ روانہ ہوئے۔ ان دونوں شہروں کے مابین ۳۸ کلو میٹر کا فاصلہ ہے اور بس ایک گھنٹے میں وہاں پہنچا دیتی ہے۔ بٹالہ پہنچ کر ہم رکشا میں سوار ہو کر میاں محلہ

پہنچے ۔ وہاں جا کر میں نے خانقاہ فاضلیہ کا پتہ پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ اس محلّے میں ایک دکاندار ہے جو قیامِ پاکستان سے پہلے سے یہاں رہتا ہے ، اس سے معلوم کریں ۔ ہم اس دکاندار سے ملے تو اس نے ہمیں بتایا کہ خانقاہ فاضلیہ اس کی دکان کے عقب میں ہے ۔

میں اور پرویز پال خانقاہ فاضلیہ پہنچے تو ایک سکھ خاتون دروازے میں بیٹھی تھی ۔ میں نے اس سے کہا کہ میں خانقاہ دیکھنے آیا ہوں ۔ اس نے کہا کہ ضرور دیکھئے اور مولوی صاحب سے بھی مل لیجے وہ بھی برابر والے کمرے میں موجود ہیں ۔ میں مولوی صاحب کے کمرے کی جانب گیا تو وہ چار پائی پر بیٹھے تھے ۔ میں نے السلام علیکم کہا تو وہ چھلانگ لگا کر چار پائی سے نیچے کودے اور گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا ۔ میں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو موصوف مجھے لے کر خانقاہ پہنچے ۔

قیامِ پاکستان سے قبل حضرت فاضل الدینؒ اور ان کے جانشینوں کی قبریں کھلے آسمان تلے ایک چبوترے پر تھیں ۔ قیامِ پاکستان کے بعد ڈلہوری سے فقرالدین نام کے ایک درویش یہاں آگئے ۔ انہوں نے ہمت کر کے اس چبوترے پر ایک وسیع کمرہ تعمیر کروا کے اس میں بجلی لگوا دی اور مزارات کو مٹنے سے بچا لیا ۔

خانقاہ فاضلیہ قادریہ بٹالہ کے بانی حضرت ابو الفرح فاضل الدینؒ (م ۱۷۳۹ء) تھے ۔ انہیں حضرت محمد افضل کلانوریؒ (م ۱۷۳۲ء) سے خلافت ملی تھی ۔ حضرت محمد افضل ، حضرت ابو محمد قادریؒ (م ۱۶۵۰ء) کے مرید تھے اور انہیں شیخ محمد طاہر لاہوریؒ (م ۱۶۳۰ء) سے خرقۂ خلافت ملا تھا ۔ شیخ محمد طاہر ، حضرت امام ربانی مجدد الفِ ثانیؒ (م ۱۶۲۴ء) کے مُرید تھے لیکن اُن پر قادری نسبت ، جو حضرت مجددؒ کو شاہ کمال کیتھلیؒ (م ۱۵۷۳ء) سے ملی تھی ، غالب تھی ۔ حضرت ابو الفرح فاضل الدینؒ کے مزار کے سرہانے جو لوحِ نصب ہے ، اس پر یہ عبارت منقوش ہے :

۷۸۶

عام وصال حضرت جناب ابو الفرح

سید محمد فاضل الدین قادریؒ

۷ ماہ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ

مورثِ اعلیٰ

حضرت فاضل الدینؒ کے مزار سے جانب قبلہ ان کے پڑپوتے سید محمد شاہ (م ۱۷۵۵ء) محوِ خوابِ ابدی ہیں ۔ اُن کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے :

سید محمد شاہ صاحب

۱۲۲۳ھ ۱۳ ربیع الثانی

دریغے

حضرت فاضل الدینؒ کے مزار سے جانبِ مشرق ان کے پوتے کے پوتے اور سید محمد شاہ کے فرزند سید احمد شاہ (م ۱۸۳۰ء) کی قبر ہے ۔ موصوف رنجیت سنگھ (م ۱۸۳۹ء) کے ہم عصر اور تاریخ ہندوستان کے مصنف تھے ۔ اس تاریخ کا واحد مخطوطہ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور میں محفوظ ہے جو ان کے فرزند سید حسین شاہ نے لائبریری کی نذر کیا تھا ۔ سید احمد شاہ کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے :

سید احمد شاہ صاحب

۱۲۳۵ھ ۳ شوال

دارِ غم

سید احمد شاہ بٹالویؒ کے مزار سے جانبِ مشرق ان کے پردادا سید غلام قادر رحمۃ اللہ (م ۱۷۶۲ء) صاحب "رمز العشق" کی ابدی آرام گاہ ہے ۔ ان کی قبر پر سن وفات درج نہیں ہے ۔ ان کے احمد شاہ ابدالی کے ساتھ بڑے خوشگوار مراسم تھے ۔ ان کے لوحِ مزار پر صرف اتنی عبارت کندہ ہے :

سید غلام قادر اہل اللہ

سید غلام قادرؒ کے فرزند سید غلام غوثؒ کو کاہنیا مسل کے سردار گو بخش سنگھ نے گرفتار کر لیا تھا لیکن چار ماہ بعد وہ قید سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ۔ وہ کابل جاتے ہوئے وزیر آباد پہنچے تو وہاں ان کی ملاقات سردار مہاں سنگھ کے ساتھ ہوئی ۔ اس وقت مہاں سنگھ کا بیٹا رنجیت سنگھ تین سال کا تھا ۔ سید غلام غوثؒ نے اسے دُعا دی کہ وہ بڑا کامیاب حکمران بنے گا ۔ اتفاق سے انہی دنوں سید غلام غوثؒ نے بمرضِ طاعون وفات پائی تو ان کا فرزند سید محمد شاہ ان کا تابوت لے کر اپنے وطنِ مالوف بٹالہ کی

جانب روانہ ہوا ۔ بٹالہ پر ان دنوں کنہیا مسل کے سکھوں کا تسلط تھا اس لئے وہاں جانا خطرے سے خالی نہ تھا ۔ ان حالات میں محمد شاہ نے اپنے والدِ بزرگوار کا تابوت کلانور میں حضرت محمد افضلؒ کی درگاہ میں سپردِ خاک کر دیا ۔ احمد شاہ بٹالوی نے ان کی تاریخ وفات ۱۷۸۳ء لکھی ہے ۔

سید غلام قادرؒ کے پہلو میں سید احمد شاہؒ کے فرزند سید حسین شاہ (م ۱۸۶۲ء) کی ابدی آرام گاہ ہے ۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے :

سید حسین شاہ صاحب

۱۲۸۹ھ ۲۶ ذیقعد

غم ہر دم

سید حسین شاہ کے برابر جانبِ مشرق ان کے صاحبزادے سید ظہور الحسن شاہ (م ۱۹۰۰ء) کی آخری آرام گاہ ہے ۔ موصوف سید نذر محی الدین قادریؒ (م ۱۹۶۹ء) کے والدِ بزرگوار تھے ۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے :

سید ظہور الحسن شاہ صاحب

۱۳۱۷ھ ۲ شوال

غمے از ہر دے

حضرت محمد شاہ صاحبؒ کے مزار سے جانبِ جنوب جناب نصیر الحق شاہؒ کی قبر ہے ۔ موصوف سید شمیم حسین قادری (م ۱۹۸۳ء) چیف جج پنجاب ہائی کورٹ کے ماموں تھے اور ان کے نام پر بٹالے کا ایک دروازہ بھی موسوم ہے ۔ بٹالہ میونسپلٹی کے ہندو اور سکھ ارکان نے اس کا نام نہیں بدلا وہ اب تک " نصیر الحق گیٹ " کہلاتا ہے ۔

سید شمیم حسین قادری بھی اسی خاندان کے فرد ہیں لیکن گزشتہ صدی کے اواخر میں ان کے جدِ امجد سید ظہور الحق کا اپنے ابنِ عم سے گدی نشینی کے مسئلے پر تنازعہ ہو گیا اور مقدمہ ہائی کورٹ تک پہنچا ۔ اس مقدمے کی کارروائی ہائی کورٹ کی Proceedings میں شائع ہو چکی ہے ۔ ان حالات میں سید ظہور الحق ایک الگ گنبد میں دفن ہوئے ۔ اس گنبد کے اندر ابھی تک نقش و نگار اور فارسی اشعار موجود ہیں ۔ دوپہر کے وقت ایک بدبخت سکھ اس گنبد کے اندر چار پائی بچھا کر لیٹ جاتا ہے ۔ اس

نے کتنے بھی پالے ہوئے ہیں جو گنبد کے اندر آرام کرتے ہیں ۔

اس گنبد سے باہر دو قبریں ہیں ۔ ان میں سے ایک قبر کے سرہانے جو کتبہ نصب ہے ، اس پر یہ اشعار منقوش ہیں :

حکمِ خدا سے چل بسیں حضرت بی صاحب
مریم مثال فخرِ زمان قابلِ بہشت
تاریخ انتقال کی مشتاق نے کی جو فکر
ہاتف کی تھا زبان پہ کہ " داخلِ بہشت "

۱۳۴۷ھ

دوسری قبر کے لوح پر یہ عبارت کندہ ہے :

بڑی بی بی جی صاحبہ حُور وَش
بہ حکمِ الٰہی ہوئے عدم
ہوئی سالِ رحلت کی مشتاق فکر
ندا آئی " خاتونِ بزمِ ارم "

۱۳۴۷ھ

حضرت فاضل الدین قادریؒ کے نو تعمیر شدہ روضے کے اندر ان کی پائینتی ایک ہی لائن میں آٹھ قبریں ہیں ۔ ان میں سے ایک قبر سید شمیم حسین قادری کے نانا سید محمد فیض محی الدین صاحب کی ہے ۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے :

۷۸۶

مرقد منور

سید محمد فیض محی الدین صاحب مرحوم و مغفور
تاریخ وفاتش غمی از ہر دمی
۶ ربیع الثانی ۱۳۶۲ ہجری " بُود حضوریٔ رسول "
۳ مارچ ۱۹۴۳ء

ان کے قدموں میں ان کے فرزند ارجمند اور شمیم حسین قادری کے ماموں سید محمد کی آخری آرامگاہ ہے ۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے :

مرقد جناب سیّد محمد صاحب مرحوم

ازیں دارِ فنا چوں گشت راہی
سوی دارالبقاء و قُربِ شاہی
خیال حسرت مرگِ جوانی
گزشتہ در دلم ز انسان کہ دانی
بگفتم با صد حسرت بدانی
کہ از ما رفت عمرِ جوانی

رجب ۱۳۴۶ھ / دسمبر ۱۹۲۷ء

خانقاہ کے احاطے میں ایک عالیشان مسجد ہے جس کے اوپر تین گنبد ہیں ۔ اس مسجد کے اندر ایک حصے میں خانقاہ میں مقیم سکھوں نے خشک چارے کا ذخیرہ کیا ہوا تھا ۔ فقر الدین نے راقم کو بتایا کہ وہ مسجد کے ایک گوشے میں نماز ادا کر لیتا ہے ۔ کسی متعصب سکھ نے مسجد کی دیوار کے ساتھ لوہے کا بورڈ لٹکایا ہوا تھا جس پر "گوردوارہ مسیت گڑھ" لکھا ہوا تھا ۔

جب میں خانقاہ سے رُخصت ہونے لگا تو ایک سکھ خاتون نے مجھ سے کہا کہ کھانے کا وقت ہو رہا ہے ۔ میں رُوٹی کھا کر جاؤں ۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا ۔ میں نے مولوی فقر الدین سے کہا کہ میں بٹالے میں سر فضل حسین (م ۱۹۳۶ء) کی قبر دیکھنا چاہتا ہوں ۔ مولوی صاحب نے کہا کہ وہ "ٹک وڈے دے تھلے" میں مدفون ہیں ۔ مولوی صاحب میرے ساتھ چلنے پر رضا مند ہو گئے ۔ جب ہم اس قبرستان میں پہنچے تو وہاں مسجد میں ایک سکھ رہائش پذیر تھا ۔ وہ ہمیں دیکھ کر باہر نکل آیا ۔ اس نے ایک چھتری کے نیچے سر فضل حسین اور ان کی اہلیہ کی قبریں دکھائیں ۔ اس نے مجھ سے کہا کہ مسجد سے قریب لڑکے اکھاڑہ تیار کر رہے تھے ۔ وہاں سے ایک پتھر ملا ہے جو اس نے مسجد کے اندر سنبھال کر رکھا ہوا ہے ۔ وہ اُردو نہیں پڑھ سکتا اس لئے میں وہ پتھر دیکھ لوں ۔ وہ سر فضل حسین کی والدہ امیر النساء کی قبر کا کتبہ تھا ۔ اس کتبے سے یہ معلوم ہوا کہ اس خاتون کا انتقال ۱۸۸۵ء میں پشاور میں ہوا تھا اور وہ حسب وصیت بٹالہ میں دفن ہوئیں ۔ یہ کتبہ سر فضلِ حسین نے ۱۹۲۸ء میں جب وہ ریونیو ممبر تھے ، نصب

کروایا تھا ۔

یہاں سے ہم نے مولوی صاحب کو رخصت کیا اور شمشیر خان کا مقبرہ اور تالاب دیکھنے گئے ۔ شمشیر خان مغل فرمانروا اکبر (م ۱۶۰۵ء) کا ہم عصر تھا ۔ اس کا مقبرہ اس کے تعمیر کردہ تالاب کے کنارے ہے ۔ یہ تالاب ہماری بادشاہی مسجد کے صحن سے بھی زیادہ وسیع ہے ۔ اس کا مقبرہ ہشت پہلو ہے اور اس کی دیواروں پر زائرین نے بہت کچھ لکھ دیا ہے ۔ میر شاہ محمد نے یہ شعر لکھا ہے :

آفرین باد بریں ہمت این مردِ سخا
کہ ہمیں باغ چنیں حوض زہی کرد بنا

اسی طرح ایک زائر یہ رُباعی لکھ گیا ہے :

شاباش بریں خواجہ کہ از بہرِ خدا
این مسجد و حوض و باغ را کرد بنا
عالم شدہ فیض یاب از دولتِ او
بی شبہ بہ فردوسِ بریں دارد جا

ایک "مومن" زائر نے یہ دو اشعار تحریر کئے ہیں :

محمد چو بالائے منبر نشست
علی شاہِ مردان برابر نشست

دوسرا شعر راقم نے یوں پڑھا ہے :

علی و آلِ علی را بجان و دل صلوٰت
بہ دشمنانِ علی صد ہزار لعنت باد

ایک سیاح نے یہ دو اشعار دیوار پر کندہ کئے ہیں :

ہزار گنجِ قناعت ہزار گنجِ کرم
ہزار طاعتِ شبہا ہزار بیداری
ہزار رُوزہ و ہر رُوزہ را ہزار نماز
قبول نیست تو گر خاطر بیازاری

ایک سیاح ایک دیوار پر اپنی یہ یادگار چھوڑ گیا ہے :

چشم کہ درد خار بُود چوں شبیہ
دانش کہ بے کار بُود چوں شبیہ

ایک زائر نے مقبرے کی دیوار پر یہ شعر لکھا ہے:

دل را رَباب سازم و رگہائے تار تار
دیگر نہ بُود ہست بجز یار یار یار

ایک صاحب دل یہ مصرع لکھ گئے ہیں:

اگر داری دلِ پاکی در آ در حلقۂ مستان

ایک اور زائر اپنی یادگار ان الفاظ میں نقش کر گیا ہے:

بیا ساقی کہ این ویرانہ از بسیار کس ماندہ

ایک دیوار پر یہ شعر رقم ہوا ہے:

بہ ہست و نیست مرنجاں ضمیر و خوشدل باش
کہ نیستیست سرِ انجام ہر کمال کہ ہست

ہر کشن داس ولد جیمل نامی ایک زائر نے محرم ۱۲۹۰ھ میں یہ شعر دیوار پر لکھا تھا:

احوال دل بدوست چہ محتاج گفتن است
بر شمع سوزِ سینۂ پروانہ روشن است

اسی طرح ۳ محرم ۱۲۹۵ھ کو شیخ عبداللہ ساکن چک عمر ضلع گجرات نے یہ شعر ایک دیوار پر رقم کیا:

برحمت سرِ زلفِ تو واثقم ورنہ
کشش چو نیست ازاں سُو چہ سُود کوشیدن

ایک عاشقِ زار یہ شعر دیوار پر کھود گیا ہے:

الٰہی نرم گرداں از کتوم دلہائے خُوباں را
وگرنہ جستجو را راہبر کُن عشق بازاں را

ایک صاحب یہ شعر وہاں لکھ گئے ہیں:

غرض از سیر و سفر صحبتِ اہلِ نظریست
ورنہ ز عقودن ایں بادیہ خوش در دلبریست

ان کے علاوہ بھی بہت سے اشعار دیواروں پر لکھے ہوئے ہیں، جو امتدادِ زمانہ سے ماند پڑگئے ہیں اور انہیں پڑھنا آسان نہیں ہے۔

شمشیر خان کی قبر کے تعویذ پر چراغ جلائے جاتے ہیں۔ وہاں اگر بتیاں جلنے کے نشان بھی موجود تھے۔ ان کے مزار سے قریب ہی BARING COLLEGE ہے۔ یہ کالج اسی مشن کا تعمیر کردہ ہے جس نے لاہور میں F.C.COLLEGE بنایا تھا۔ راقم نے سید شمیم حسین قادری سے سُنا تھا کہ ان کی خانقاہ کی بہت سی کتابیں اور نادر مخطوطات اس کالج کی لائبریری میں موجود ہیں۔ بھارت کے مسلم اسکالرز کو ان کا پتہ چلانا چاہیے۔ اس کالج سے قریب ہی ہندوؤں کا شمشان تھا۔ وہاں ایک مردہ جل رہا تھا۔ شاید اسے ایک روز پہلے سپردِ آتش کیا گیا تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے باجے کے ساتھ ایک ارتھی وہاں پہنچی اور تھوڑی دیر بعد ایک اور ارتھی آگئی۔ ہم تین چار گھنٹے بعد جب دوبارہ وہاں آئے تو تین الاؤ روشن تھے اور فضاء میں گوشت جلنے کی بُو آرہی تھی۔

میں اور پروین پال شمشان کے قریب کھڑے تھے کہ ایک بس آتی دکھائی دی۔ پروین نے کہا کہ یہ بس قادیان جا رہی ہے۔ آپ وہاں چلیں گے؟ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ قادیاں یہاں سے صرف دس میل ہے اور بس والے ایک روپیہ فی مسافر کرایہ وصول کرتے ہیں۔ جب وہ بس قریب آکر رُکی تو ہم اس میں سوار ہو گئے۔ راستے میں ایک گاؤں ونڈالہ گرنتھیاں آیا اور ہم بیس منٹ میں قادیان پہنچ گئے۔

قادیان:

جب ہم لاری اڈے پر بس سے اترے تو مجھے دُور سے ایک مینارہ نظر آیا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ مینارۃ المسیح ہے۔ ہم نے وہاں تک پہنچنے کے لئے راستہ پُوچھا تو دکانداروں نے ہماری رہنمائی کی۔ جونہی ہم مینارۃ المسیح کو جانے والی گلی میں پہنچے ہمیں دُور سے ایک لحیم شحیم قادیانی، قمیص اور پاجامے میں ملبوس، سر پر ٹوپی رکھے ہوئے اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ قریب پہنچ کر میں نے سلام کیا تو اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔ "میرا نام عبدالرحیم عاجز ہے۔ میں ریٹائرڈ گورنمنٹ آفیسر ہوں۔ میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد دین کی خدمت کے لئے یہاں

رہائش اختیار کر لی ہے اور میں انجمن احمدیہ کا سیکریٹری ہوں"۔ میں نے بہشتی مقبرہ اور "مسجدِ اقصیٰ" دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا کہ وہ تو ہم دیکھ ہی لیں گے، پہلے جو کچھ وہ دکھانا چاہتا ہے، وہ تو دیکھ لیں۔

عبدالرحیم عاجز ہمیں مرزا غلام احمد قادیانی (م ۱۹۰۸ء) کا رہائشی مکان دکھانے لے گیا۔ اس نے ہمیں ایک کمرہ دکھایا جس کی چاروں دیواروں میں طاقچے بنے ہوئے تھے۔ عربی زبان میں ایسے طاقچے کو مشکوٰۃ کہتے ہیں۔ عبدالرحیم عاجز نے مجھے بتایا کہ مرزا صاحب چل پھر کر لکھنے کے عادی تھے۔ ان چاروں طاقچوں میں دواتیں پڑی رہتی تھیں۔ قلم اور کاغذ مرزا صاحب کے ہاتھ میں ہوتے تھے اور وہ ان دواتوں میں قلم ڈوب کر لکھا کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ تو مشائین کا طریقہ ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ یہ سمجھتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔ اس کمرے میں دو تین سیڑھیاں چڑھ کر ایک چھوٹا سا حجرہ آتا ہے جسے دارالفزن کہتے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس حجرے میں بیٹھ کر مرزا صاحب اُمّت کی حالت زار پر رویا کرتے تھے۔ اسی طرح کا ایک اور حجرہ تھا جو دارالفکر کہلاتا ہے۔ اس میں بیٹھ کر مرزا صاحب اُمّت کے بارے میں غور و فکر کیا کرتے تھے اور اسی میں سے گزر کر موصوف مسجدِ مبارک میں پہنچ جاتے تھے۔ یہ مسجد ان کے گھر سے ملحق تھی۔

اس مکان سے متصل ایک مکان میں مرزا غلام احمد کا پوتا مرزا وسیم احمد رہتا ہے۔ وہ بھارت کے قادیانیوں کا سربراہ ہے۔ ان دنوں وہ حیدر آباد دکن گیا ہوا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ یہاں سے عبدالرحیم عاجز ہمیں "مسجد اقصیٰ" لے گیا۔ وہاں فرش پر پانی چھڑکا جا رہا تھا۔ ہمیں یہ بتایا گیا کہ نمازِ مغرب کے وقت قادیان کے تمام قادیانی مرد و زن اس مسجد میں جمع ہوتے ہیں اور درمیان میں پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ مغرب سے عشاء تک وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان دنوں مینارۃ المسیح کی مرمت ہو رہی تھی اور اس کی بیرونی سطح پر سنگِ مرمر لگایا جا رہا تھا۔ عبدالرحیم عاجز نے مجھے کہا کہ میں اس مینارے پر چڑھ جاؤں۔ میں نے معذرت چاہی لیکن اس نے اصرار کیا۔ میں اس کے اصرار پر مینارے پر چڑھا تو میرا سانس پھول گیا۔ (اگر میں مر جاتا تو وہ مجھے وہیں بہشتی مقبرے میں دفن کر دیتے)۔ جب میرا سانس درست ہوا تو میں نے اِرد گرد کا جائزہ لیا۔ میلوں تک کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک

جانب میں نے درختوں کا جھنڈ دیکھا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ہو نہ ہو یہی بہشتی مقبرہ ہے۔ "مسجدِ اقصیٰ" کے صحن میں میرزا غلام احمد قادیانی کے والد مرزا غلام مرتضیٰ (م ۱۸۷۶ء) کی قبر ہے۔ تذکرۂ رؤسائے پنجاب میں سر لیپل ایچ گرفن اور کرنل میسی نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ "نونہال سنگھ، شیر سنگھ اور دربارِ لاہور کے دَور دَورے میں غلام مرتضیٰ ہمیشہ فوجی خدمات پر مامور رہا۔ ۱۸۴۱ء میں یہ جرنیل ونچورا کے ساتھ منڈی اور کلو کی طرف بھیجا گیا اور ۱۸۴۳ء میں ایک پیادہ فوج کا کمیدان بنا کر پشاور روانہ کیا گیا۔ ہزارہ کے مفسدے میں اس نے کارہائے نمایاں کئے اور جب ۱۸۴۸ء کی بغاوت ہوئی تو یہ اپنی سرکار کا نمک حلال رہا اور اس کی طرف سے لڑا۔ اس موقع پر اس کے بھائی غلام محی الدین نے بھی اچھی خدمات کیں"۔ دوسری جگہ یہی دونوں مؤرخ لکھتے ہیں: "اس خاندان نے غدر ۱۸۵۷ء کے دَوران میں بہت اچھی خدمات کیں۔ غلام مرتضیٰ نے بہت سے آدمی بھرتی کئے اور اس کا بیٹا غلام قادر جنرل نکلسن صاحب بہادر کی فوج میں اس وقت تھا جب کہ افسرِ موصوف نے تریمو گھاٹ پر نمبر ۴۶ نیٹو انفنٹری کے باغیوں کو جو سیالکوٹ سے بھاگے تھے، تہ تیغ کیا۔ جنرل نکلسن صاحب بہادر نے غلام قادر کو ایک سَند دی جس میں یہ لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں خاندانِ قادیاں ضلع گورداسپور کے تمام دُوسرے خاندانوں سے زیادہ نمک حلال رہا"۔ اسے کہتے ہیں "جادُو وہ جو سر چڑھ کر بولے"۔

جب میں "مسجدِ اقصیٰ" دیکھ کر فارغ ہوا تو عبدالرحیم عاجز نے اپنے فرزند عبدالحفیظ سے کہا کہ وہ ہمیں بہشتی مقبرے لے جائے اور دَربان سے کہے کہ ہمیں اس وقت بہشتی مقبرہ دیکھنے کی خصوصی اجازت دی گئی ہے۔ راستے میں ہمیں عبدالحفیظ نے بتایا کہ عصر سے مغرب تک وہاں صرف عورتوں کو جانے کی اجازت ہے۔ اس لئے ہمیں خصوصی اجازت ملی ہے۔ جب ہم گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو برقعہ پوش عورتیں ہمیں دیکھ کر دیواروں کی طرف مُنہ کر کے کھڑی ہو گئیں۔ عبدالحفیظ کی معیت میں ہم خطۂ خاص میں پہنچے۔ اس خطّے میں مرزا غلام احمد (م ۱۹۰۸ء) اور اس کے خلیفۂ اوّل حکیم نورالدین بھیروی (م ۱۹۱۴ء) کے علاوہ مرزا صاحب کے اعزہ و اقارب کی قبریں ہیں۔ مرزا صاحب کے قدموں میں اس کی تین بیویں: سارہ بھاگلپوری، اُمِ طاہر اور اَمۃُ الحیٔ کی قبریں ہیں۔ سارہ منسوب

بہار کے ضلع بھاگلپور کے ایک قصبے پرینی کی رہنے والی تھی ۔ وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان کے ہیڈ ماسٹر عبدالقادر کی بہن اور میرے ایک اُستاد عباس بن عبدالقادر کی پھوپھی تھی ۔ اس کی قبر کے کتبے پر یہ مرقوم تھا کہ اس کا نکاح مرزا بشیر الدین محمود کے ساتھ مرزا غلام احمد پر ہونے والی ایک وحی کی بناء پر ہوا تھا ۔ اُم طاہر ، قادیانیوں کے موجودہ خلیفہ طاہر احمد کی ماں تھی ۔

مقبرۂ خاص ایک چار دیواری کے اندر ہے ۔ اس میں دو جگہ سلاخیں لگا دی گئی ہیں تاکہ لوگ دُور سے ان قبروں کی " زیارت " کر لیں ۔ مقبرۂ خاص سے باہر چند قطاروں میں مرزا صاحب کے " صحابیوں " کی قبریں ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک کے لوح پر اس کی نمایاں خدمات درج ہیں ۔ ایک لوح پر یہ کندہ تھا کہ صاحبِ قبر لدھیانہ کے مناظرے میں مرزا صاحب کے ساتھ موجود تھا ۔ دوسری لوح پر یہ مرقوم تھا کہ صاحبِ قبر مرزا صاحب کی تجہیز و تکفین میں شریک تھا ۔ ایک " صحابی " نے یہ وصیت کی تھی کہ اس کے لوحِ مزار پر یہ لکھ دیا جائے کہ وہ مرزا صاحب کا خادمِ خاص تھا ۔ انہی قبروں میں ایک قبر بھائی عبدالرحمٰن کی تھی ۔ مجھے عبدالحفیظ نے بتایا کہ وہ پیدائشی سکھ تھا اور پیشے کے اعتبار سے وہ گرنتھی تھا ۔ سکھوں کے ہاں گرنتھی کو بھائی جی کہتے ہیں اس لئے بھائی اس کے نام کا جزو بن گیا ۔ جب اس نے مختلف ادیان کا مطالعہ کیا تو اسے قادیانیت میں " صداقت " نظر آئی اور وہ قادیانی ہو گیا ۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ پاکستان چلا آیا ۔ اس نے یہ وصیت کی تھی کہ اسے بہشتی مقبرے میں دفنایا جائے چنانچہ اس کی وصیت پر عمل کیا گیا ۔ یہ واحد مرزائی تھا جس کا جسدِ خاکی پاکستان سے بھارت لے جا کر قادیان میں دفنایا گیا ۔

اختر اورینوی (سید اختر احمد) پٹنہ یونیورسٹی میں اُردو کا پروفیسر تھا ۔ اس نے اُردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے ۔ وہ بڑا سچا پکا قادیانی تھا ۔ اس کا انتقال ۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء کو پٹنہ کے کرچی اسپتال میں ہوا ۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کی میت پٹنہ سے قادیاں لے جا کر بہشتی مقبرے میں دفن کی گئی ۔ ۲ فروری ۱۹۹۴ء کو اس کی بیوی شکیلہ اختر بھی فوت ہو گئی ہے ۔ وہ ایک اچھی افسانہ نگار تھی ۔ اسے بھی یقیناً وہیں دفن کیا ہو گا ۔

سید برکات احمد ، خواجہ میر دردؒ کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا ۔ وہ انڈین فارن سروس میں ملازم تھا ۔ اس نے MUHAMMAD AND THE JEWS کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا اُردو ترجمہ " رسول اکرمؐ اور یہودِ حجاز " کے عنوان سے پروفیسر مشیر الحق (م ۱۹۹۰ء) نے کیا تھا ۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد برکات احمد نے اپنی بیٹی کے پاس اندور میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کا جسدِ خاکی بھی قادیان لے جا کر بہشتی مقبرے میں سپردِ خاک کیا گیا ہے ۔

عبدالحفیظ نے ہمیں وہ جگہ بھی دکھائی جہاں مرزا غلام احمد کی نمازِ جنازہ ہوئی تھی ۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ مرزا صاحب کے جنازے میں نمازیوں کی سات صفیں بنی تھیں اس لئے اب ان کے ہاں یہ روایت بن گئی ہے کہ نمازِ جنازہ کے وقت سات صفیں ہی بنائی جاتی ہیں ۔

عبدالحفیظ ہمیں ساتھ لے کر اپنے گھر پہنچا ، جہاں اس کے والد نے چائے تیار کر کے رکھی ہوئی تھی ۔ اس نے ہمیں چائے پلائی اور اس کے بعد رُخصت کیا ۔ اس کا یہ تقاضا تھا کہ میں رات وہیں رہوں ، لیکن میں نے معذرت چاہی ۔ دو سال کے بعد مجھے دوبارہ امرتسر ، بٹالہ اور قادیان جانے کا اتفاق ہوا ۔ اس بار میں نے اکیلے ہی قادیاں میں گھوم پھر کر قصبے کا جائزہ لیا ۔

وہاں اس وقت تیرہ صد قادیانی آباد تھے ۔ ان میں اکثریت بہاریوں کی تھی ۔ انہوں نے گزر بسر کے لئے تھوڑا بہت کام شروع کیا ہوا تھا ۔ کوئی ریڈیو مرمت کرتا تھا ۔ کسی نے بجلی کے سامان کی دکان کھولی ہوئی تھی ۔ کوئی معمولی سا چائے کا ریسٹورنٹ چلا رہا تھا ۔ ایک شخص بازار میں بیٹھا آئس کریم بیچ رہا تھا ۔ ایک مرزائی سائیکلوں کو پنکچر لگا رہا تھا ۔ غربت و افلاس کی جھلک ان کے چہروں سے نمایاں تھی ۔ ان کا فقط یہی " کارنامہ " تھا کہ وہ قادیانؔ آباد تھے ۔ قادیان کی آبادی پندرہ ہزار نفوس پر مشتمل ہے جس میں تیرہ صد مرزائی ہیں اور وہ سمٹ سمٹا کر قادیاں کے ایک گوشے میں آ بسے ہیں ۔ گلیوں اور بازاروں میں ہُو کا عالم تھا ۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی ۔ مرزا صاحب نے بر بنائے الہام یہ لکھا تھا کہ قادیان کی آبادی بڑھ کر لاہور سے جا ملی ہے ۔ اس طویل و

مرض شہر میں اسے رؤیا، میں ایک بازار دکھایا گیا تھا جس میں کٹڑے سے کٹڑا چھلتا تھا اور بگھیاں، ٹم ٹم، وکٹوریا اور خدا جانے کون کون سی سواریاں وہاں رواں دواں تھیں۔ اس بازار میں سونے چاندی کا کاربار ہو رہا تھا اور بڑی بڑی توندوں والے سیٹھ گدیوں پر بیٹھے کاروبار میں معروف تھے۔ مرزا صاحب نے بر بنائے الہام کہا تھا کہ ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے کہ لوگ لاہور کے بارے میں استفسار کریں گے تو انہیں بتایا جائے گا کہ اب وہ قادیاں کا ایک محلہ ہے۔ میں قادیاں کے ویران بازار میں کھڑا اس الہام پر غور کر رہا تھا تو اس الہام کے تار و پود تارِ عنکبوت کی طرح ہوا میں ہچکولے کھاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہاں بڑی بڑی توندوں والے جواہرات کا کاروبار کرنے والے سیٹھ تو کجا، خالی شکم مرجھائے ہوئے چہروں والے ٹٹ پونجئے دکاندار نظر آرہے تھے جو قادیاں کے ایک گوشے میں سمٹ آئے تھے۔ قادیاں پھیلنے کی بجائے اب سمٹ چکا تھا۔ واپس آکر میں نے دو مضمون بعنوان "میں نے قادیاں دیکھا" اور "بہشتی مقبرے میں چند لمحے" مجلہ ختم نبوت کراچی میں شائع کرائے۔

شیرازِ ہند جونپور

۱۸ اگست ۱۹۷۸ء کو میں رات کے دس بجے جونپور پہنچا۔ لاری اڈے سے قریب ہی اولند گنج میں ہندوؤں کا ایک ہوٹل نظر آیا جس پر "لکشمی ہوٹل" کا بورڈ آویزاں تھا۔ یہ بڑا صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ میں نے وہیں قیام کیا۔ میں نے کمرے میں سامان رکھ کر غسل کیا اور دن بھر کی تھکاوٹ دور کی۔ میں کپڑے بدل کر کھانے کے لئے ریسٹورنٹ میں گیا۔ وہاں میں نے ایک عجیب بات دیکھی کہ کھانے کے ساتھ ایک پیالی میں زیرے کے ساتھ بگھارا ہوا دیسی گھی سپلائی کر رہے ہیں۔ گاہک اس کے چمچ بھر بھر کر سالن پر ڈال رہے ہیں۔ شاید جونپور میں اسی طرح گھی کھانے کا رواج ہو۔ کھانا تناول کرکے میں اپنے کمرے میں جا کر سو رہا۔

صبح سویرے اُٹھ کر میں تیار ہوا اور ریسٹورنٹ میں ناشتہ کرکے راس منڈل جانے کے لئے رکشا پر سوار ہوا۔ رکشا ڈرائیور مجھے نخاس بازار سے نکال کر گومتی کے کنارے پہنچا۔ گومتی لکھنؤ سے ہوتی ہوئی جونپور پہنچتی ہے۔ قدیم شہر اور قلعہ دریا کے پار ہیں۔ دریا پر مغل فرمانروا اکبر (م ۱۶۰۵ء) کے عہد میں منعم خان نے ایک پختہ پل تعمیر کیا تھا۔ یہ پل چار صدیوں سے پانی کے ریلوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ شاید اس زمانے میں پل ٹھیکے پر تعمیر نہیں ہوتے ہوں گے۔ پل کے قریب ایک بزرگ حضرت شیخو کا مزار ہے۔ مقامی روایت کے مطابق منعم خان نے ان کی فرمائش پر یہ پل تعمیر کیا تھا۔ اسی لئے اسے:

یادگار جناب شیخو ہے

کہتے ہیں۔ یہ پل متعدد ڈاٹوں کے سہارے کھڑا ہے۔ مغل فنِ تعمیر پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اس پل کا ذکر اور تصویر موجود ہیں۔

گومتی کے دوسرے کنارے پر قلعہ کے کھنڈرات موجود ہیں۔ اس کی فصیل جگہ جگہ سے گر چکی ہے اور جتنا حصہ موجود تھا اس پر گدھ بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے یہ منظر دیکھ

کر صفی لکھنوی (م ۱۹۵۰ء) کے یہ اشعار یاد آ گئے:

جونپور! اے مولدِ سلطان عادل شیر شاہ
تیرے آثارِ قدیمہ تیری عظمت پر گواہ
کہہ رہا ہے قلعۂ شاہی یہ با حالِ تباہ
مدتوں تک ہند کی ہم بھی رہے ہیں تخت گاہ
ایک غافل قوم کی کھوئی ہوئی عظمت ہیں ہم
ہم سے عبرت کا سبق لو، منظرِ عبرت ہیں ہم

رکشا ڈرائیور بازاروں اور گلیوں سے گھما کر مجھے (اس منزل میں پنجابی گوردوارے لے گیا۔ وہاں جا کر میں نے رکشا ڈرائیور کو رخصت کیا۔ ایک سکھ عورت گوردوارے کے فرش پر جھاڑو لگا رہی تھی۔ میں نے اس سے پنجابی زبان میں پوچھا "بی بی ایتھے مولوی ابوالعرفان ندوی دا گھر کتھے اے"۔ اس نے کہا: "گوردوارے دے پچھے مسلماناں دا محلہ بلوچ ٹولہ اے، اوتھوں پتہ کرو۔ تے اِک گھر سامنے کھیتاں وچ بھی کے مسلمان دا اے"۔ میں بلوچ ٹولے پہنچا۔ یوپی کے ہر شہر میں بلوچ ٹولہ یا بلوچ پورہ ضرور ہوتا ہے۔ یوپی میں بلوچوں نے جا کر گائے بھینسیں ذبح کرنے اور ان کا گوشت فروخت کرنے کا دھندا شروع کیا تھا۔ ہندو ان کا اپنے محلّوں میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے اس لئے انہوں نے ہر شہر میں الگ محلّے آباد کر لئے۔ بلوچ ٹولے میں چند بچے کھیل رہے تھے۔ میں نے ان سے ندوی صاحب کے گھر کا پتہ پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ کھیتوں میں جو اکیلا گھر نظر آ رہا ہے، وہ انہی کا گھر ہے۔ میں وہاں پہنچا تو ایک نوجوان صحن میں ایک ہینڈ پمپ پر بیٹھا نہا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں مولانا ابوالعرفان صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ مولانا اس وقت نیند پوری کر رہے تھے۔ اس نوجوان نے انہیں نیند سے بیدار کیا تو موصوف آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکلے اور مجھے دیکھ کر زور سے چلّائے: "اچھا تو آپ یہاں بھی پہنچ گئے"۔ جب میں قریب پہنچا تو انہوں نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ معانقہ کیا اور میری خیریت معلوم کی اور قیام کے بارے میں دریافت فرمایا۔ مولانا نے گھر میں میرے آنے کی اطلاع دی تو تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک اِنچ موٹے پراٹھے تھے اور توڑنے پر ان کے پرت کھلتے جاتے تھے۔ میں نے عرض

کیا کہ میں تو ناشتہ کر کے آ رہا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ تو اقل تواضع ہے جو ہم جونپور والے اپنے مہمان کی کرتے ہیں۔ مولانا نے اصرار کر کے مجھے دوبارہ ناشتہ کرایا اور لباس تبدیل کر کے میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔

ان کے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قبرستان تھا جس میں گنتی کی چند قبریں تھیں۔ ان میں سب سے نمایاں قبر مُلّا محمود جونپوری (م ۱۶۵۲ء) صاحب شمس بازغہ کی ہے۔ ان کی یہی تصنیف تا قیامِ قیامت علمی اور دینی حلقوں میں ان کا نام زندہ رکھے گی۔ اس قبرستان کے جوار میں محلہ سپاہ موجود ہے جہاں مُلّا محمود کی رہائش تھی۔ اس سے قریب ہی جمال خان لودھی کا مقبرہ ہے۔ اس کا مقبرہ ٹھٹھہ کے بعض گنبدوں جیسا ہے۔ بارہ ستونوں پر گنبد اٹھایا گیا ہے۔ بلوچ ٹولہ میں فیروز شاہ کا روضہ ہے۔ اس کا ڈیزائن مغلیہ فنِ تعمیر کی غمازی کرتا ہے۔ روضے کی دیواروں پر منقش اینٹوں کے آثار باقی ہیں۔ گنبد کے اندرونی حصے پر بھی نقاشی کا بہت عمدہ کام ہوا ہے۔ ایسا کام عموماً شاہجہان کے دورِ حکومت میں ہوا کرتا تھا۔ اس روضے کے ساتھ مدرسۂ فیروزیہ عثمانیہ قائم ہے جہاں طلبہ کو دینی علوم پڑھائے جاتے ہیں۔

مُلّا محمود کے مزار سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک شاندار مسجد نظر آ رہی تھی۔ اسے جھجری مسجد کہتے ہیں۔ مولانا ابوالعرفان ندوی نے راقم کو بتایا کہ ایک زمانے میں یہ مسجد فوجی چھاؤنی کے وسط میں تھی۔ اب صرف مسجد ہی باقی رہ گئی ہے۔ یہ مسجد گومتی کے کنارے پر ہے۔

مدرسۂ فیروزیہ عثمانیہ دیکھ کر ہم رکشا میں سوار ہوئے اور اٹالہ مسجد پہنچ گئے۔ یہ مسجد پرانے شہر کے وسط میں کھڑی ہے اور اس کے برآمدوں میں پرائمری سکول قائم ہے۔ اس مسجد کا سنگِ بنیاد سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ۱۳۷۶ء میں رکھا گیا اور اس کی تکمیل ۱۴۰۸ء میں ہوئی۔ یہ مسجد زرد رنگ کے پتھروں سے بنائی گئی ہے۔ اس مسجد کا FACAD قابلِ دید ہے: مسجد کے فنِ تعمیر میں ہندوؤں کے فنِ تعمیر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مسجد کی مرکزی محراب پُرشکوہ ہے اور اس پر آیت الکرسی کندہ ہے۔ مسجد کی دیواروں پر خطِ ثلث میں قرآن مجید کی آیات لکھی ہوئی ہیں۔ مسجد کا منبر ۱۱ سیڑھیوں کا ہے۔ مسجد کے دالان میں داخل ہونے کے لئے تین بڑے دروازے ہیں۔ تین اطراف

گیلریاں بنی ہوئی ہیں جن میں جمعہ کے روز نمازی بیٹھ جاتے ہیں ۔ اس مسجد کا ڈیزائن لوگوں نے اتنا پسند کیا کہ اس کے بعد جونپور میں جتنی مسجدیں تعمیر ہوئیں وہ اٹالہ مسجد کی طرز پر بنیں ۔

اٹالہ مسجد کی جنوبی دیوار سے قریب ہی راج ڈگری کالج ہے ۔ " راج " گورنمنٹ کا ہندی میں ترجمہ کیا گیا ہے ۔ میں اور مولانا ابوالعرفان صاحب کالج کے صدر دروازے پر پہنچے تو وہاں پولیس کی ایک گارڈ متعین تھی اور دروازہ مقفل تھا ۔ ہمارے استفسار پر سپاہیوں نے بتایا کہ اس وقت طلبہ امتحان دے رہے ہیں اس لئے کالج کے اندر آمد و رفت بند ہے ۔ مولانا نے فرمایا کہ ہم پرنسپل سے ملنا چاہتے ہیں ۔ مولانا نے یہ بھی بتایا کہ میں بہت دُور سے جونپور آیا ہوں ۔ مولانا کے کہنے پر ایک سپاہی پرنسپل سے ملا اور اس کی اجازت سے دروازہ کھول کر ہمیں اندر لے گیا ۔

پرنسپل نے بتایا کہ اس کا نام گنگا پرشاد چودھری ہے اور اس کا مضمون بھی تاریخ ہے ۔ ہم نے اس سے کالج کے احاطے میں ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادیؒ (م ۱۴۴۵ء) کی قبر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ خود ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے ۔ ملک العلماء کی قبر ایک چھوٹی سی چار دیواری کے اندر ہے اور وہ چار دیواری اور قبر کا تعویذ ٹوٹ پھوٹ گئے تھے ۔ میں نے پرنسپل سے کہا کہ وہ کالج کے کسی فنڈ سے ان کی مرمت کروا دیں اور ان کے نام کا کتبہ نصب کروا دیں ۔ پرنسپل نے کہا کہ وہ ملک العلماء کے نام اور کام سے واقف ہے اس لئے وہ مزار کی مرمت کروا دے گا ۔ پرنسپل نے ہمیں چائے کی پیشکش کی جو ہم نے قبول نہ کی ۔

ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادیؒ دہلی میں رہتے تھے ۔ جب ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور کے حملے کا غلغلہ بلند ہوا تو دہلی کے بہت سے باشندے نقل مکان کر گئے ۔ ان میں ملک العلماء بھی تھے ۔ موصوف دہلی سے جونپور پہنچے جہاں سلطان ابراہیم شرقی (۱۴۴۰ء ۔ ۱۴۰۰ء) نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے لئے چاندی کی ایک کرسی تیار کروا کے اپنے دربار میں رکھی ۔ ایک بار ملک العلماء بیمار ہوئے تو سلطان ابراہیم ان کی عیادت کے لئے گیا ۔ اس موقع پر سلطان نے پانی کا ایک پیالہ ان پر تصدق کر کے یہ کہتے ہوئے نوش کیا " اے اللہ ! ملک العلماء میری سلطنت کی آبرو ہیں ۔ اگر ان کی عمر پُوری ہو گئی

ہے تو میری عمر انہیں لگا دے ۔"

ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادیؒ نے فارسی زبان میں " بحر مواج " کے عنوان سے قرآن حکیم کی ایک ضخیم تفسیر لکھی ہے ۔ الحمد شریف سے لے کر سورۂ الکہف تک کی تفسیر انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے اور بقیہ حصہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کی لائبریری میں موجود ہے ۔ اس تفسیر کا سورۂ ص سے لے کر سورۂ والناس تک کا حصہ طبع ہو چکا ہے ۔ یہ مطبوعہ حصہ کراچی میں مجلس علمی کی لائبریری میں محفوظ ہے ۔ حال ہی میں راقم نے ڈیرہ نواب صاحب میں حکیم محمد حسین بدر مرحوم کے کتاب خانے میں ان کے فرزندِ ارجمند حکیم افتخار احمد اظہر چشتی کی عنایت سے اس کا ایک دیدہ زیب مخطوطہ دیکھا ۔ اس میں چند پاروں کی تفسیر ہے ۔

ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادیؒ کی قبر پر ہم نے فاتحہ پڑھی اور دیر تک اسے دیکھتے رہے ۔ مولانا ابوالعرفان ندوی نے اپنے ایک فاضلانہ مضمون میں اسے " پورب کی سرزمین میں علم کی پہلی کاشت " کہا ہے ۔ ملک العلماء کی قبر دیکھ کر ہم محلہ میر مست میں دیوان عبدالرشید کی خانقاہ رشیدیہ دیکھنے گئے ۔ دیوان عبدالرشید اور ملا محمود جونپوری ہم عصر تھے ۔ مولانا ندوی کا یہ کہنا ہے کہ اس طرح کا قران السعدین بہت کم ہوا ہے کہ دو پائے کے عالم ایک ہی شہر میں موجود ہوں ۔ اس سے قبل امیر تیمور کے دربار میں علامہ شریف جرجانی (م ۱۴۱۳ء) اور ملا سعد الدین تفتازانی (م ۱۳۸۹ء) ایک ہی زمانے میں موجود تھے ۔ دیوان عبدالرشید کی خانقاہ کی لائبریری کی بڑی شہرت سُنی تھی ۔ اس میں بعض بڑے نادر مخطوطات موجود ہیں ۔ جب ہم لائبریری دیکھنے گئے تو معلوم ہوا کہ اس کے انچارج ایک سکول ماسٹر ہیں ۔ ان کا تبادلہ کسی اور شہر میں ہو گیا ہے اس لئے لائبریری بند رہتی ہے ۔

خانقاہ رشیدیہ سے فارغ ہو کر ہم جامع مسجد دیکھنے گئے ۔ اسے لوگ عرفِ عام میں بڑی مسجد بھی کہتے ہیں ۔ یہ مسجد ایک بڑی بلند کرسی پر تعمیر کی گئی ہے ۔ ۲۱ سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کے صحن میں داخل ہوتے ہیں ۔ قبلہ رُخ دیوار کو مناروں جیسی SUPPORTS لگا کر تھاما ہوا ہے ۔ اس مسجد کا ڈیزائن بھی اٹالہ مسجد جیسا ہے ۔ اس کے صحن کے تین اطراف حجرے بنے ہوئے ہیں جن میں ایک دینی مدرسہ قائم ہے جس

کا نام "مرکزِ علوم اسلامیہ مدرسۂ قرآنیہ" ہے۔ اس وقت وہاں ۴۳ طلبہ قیام پذیر تھے۔

یہ مسجد سلطان حسین شرقی (۱۴۷۶ء - ۱۴۵۸ء) نے اپنے مُرشد حضرت تاج عینیؒ کی یاد میں تعمیر کرائی تھی۔ اس مسجد کے تین دالان ہیں۔ درمیانی دالان کے اُوپر گنبد بنا ہوا ہے اور باقی دو دالانوں کے اوپر ڈاٹ بنے ہوئے ہیں۔ ڈاٹوں والی چھت گرجوں کی چھتوں کی طرح ڈھلوان بنائی گئی ہے۔ مسجد سے ملحق شاہی قبرستان ہے۔ مسجد کا شمالی دروازہ قبرستان میں کھلتا ہے۔ اس قبرستان میں حضرت تاج عینیؒ کی قبر ہے۔ سلطان ابراہیم شرقی کی پائینتی جانب سلطان حسین شرقی کی ابدی آرام گاہ ہے۔ صرف سلطان ابراہیم کی قبر سنگِ مرمر سے بنائی گئی ہے۔ باقی قبروں میں عام پتھر استعمال ہوا ہے۔ اس قبرستان میں شاہ ہاشم (م ۹۷۶ھ) کی قبر پر تختے کی قبروں کی طرح دو لوحیں لگی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک لوح پر یہ اشعار کندہ ہیں:

شاہ ہاشم شہہ فرشتہ خصال
بُود کانِ ہُنر و علم و اَدب
رفت ازین عالم پُر محنت و غم
سوئے فردوس بصد عیش و طرب
سالِ تاریخ وفات گفتم
آہ ازاں شاہ تازہ گلِ لقب
۹۷۶ھ

بڑی مسجد دکھانے کے بعد مولانا ندوی مجھے قدیم شہر سے باہر "مسجد لال دروازہ" دکھانے لے گئے۔ راستے میں حوضِ خاص کا قدیم قبرستان نظر آیا۔ مولانا ندوی نے فرمایا کہ یہاں چند شہداء کی قبریں بھی ہیں۔ مسجد لال دروازہ شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے ویران پڑی تھی۔ جرائم پیشہ افراد اور نشے کے عادی لوگوں نے وہاں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ چند دَرد مند حضرات نے، جو مولانا حسین احمد مدنی (م ۱۹۵۷ء) کے دامنِ ارادت سے وابستہ تھے، یہاں اپنے شیخ طریقت کی یاد میں جامعہ حسینیہ لال دروازہ کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا اور مسجد آباد کرلی جزاھم اللّٰہ فی الدارین۔ اٹالہ مسجد کی طرح اس کے صحن کے تین اطراف میں حجرے ہیں جن کے آگے برآمدہ ہے۔ صدر

دروازے کے اُوپر والا حصہ ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ مسجد کے دالان میں شمالی اور جنوبی جانب مقصورے موجود ہیں۔ مسجد کی چھت کو ستون سنبھالے ہوئے ہیں اور درمیانی دالان کے اُوپر گنبد ہے۔ محراب کی قوس میں آیت الکرسی خطِ ثلث میں لکھی ہوئی ہے اور محراب کے اُوپر یہ آیت منقوش ہے:

ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النبی یایھاالذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما

مسجد کے منتظمین مولانا ابوالعرفان ندوی سے خوب واقف تھے۔ مولانا تو ان کے پاس بیٹھ گئے اور راقم مسجد کا ایک جائزہ لینے چلا گیا۔ اس مسجد سے ہم دوبارہ شہر کی جانب آئے۔ مولانا نے جھگڑو حلوائی کے ہاں سے اِمرتیاں اور بینی تیلی کے ہاں سے چنبیلی کا تیل اور عطر سنگار خرید کر مجھے دیا۔ میں نے انہیں منع بھی کیا لیکن وہ نہ مانے۔ انہیں نے راقم سے کہا کہ یہ اقل تحفہ ہے جو ہم جونپوری کسی مہمان کی خدمت پیش کرتے ہیں۔

مقبول احمد لاری یُوپی کے ایک بڑے معزز تاجر ہیں۔ انہوں نے نیپال میں بڑا کام کیا ہے اور نیپال یونیورسٹی کھٹمنڈو کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ان کے احباب نے ۱۹۷۰ء میں ان کی خدمات کے اعتراف میں "نذرِ مقبول" کے عنوان سے ایک کتاب ان کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اس کتاب کو خیر بھوروی (م ۱۹۷۱ء) نے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ اس میں "علمائے جونپور کا ماضی" کے عنوان سے مولانا ابوالعرفان ندوی کا ایک فاضلانہ مضمون شامل ہے جو لائق مطالعہ ہے۔ کاش وہ اس موضوع پر مضمون کی بجائے کتاب لکھ دیتے۔

اس مضمون کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوا کہ جونپور کی بنیاد سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۱۳۵۹ء میں اپنے مربّی اور ولیٔ نعمت جونا خان (سلطان محمد بن تغلق) کی یاد میں گومتی کے کنارے رکھی۔ حملۂ تیمور سے قبل فیروز شاہ تغلق کے پوتے سلطان ناصرالدین محمود شاہ نے خواجہ جہاں کو "ملک الشرق" کا خطاب دے کر جونپور کا گورنر مقرر کیا۔ ملک الشرق نے مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرکشی اختیار کی تاہم سکّہ و خطبہ میں سلطان دہلی کا نام ہی چلتا رہا۔ ۱۴۰۰ء میں ملک الشرق کی وفات کے بعد اس کا

حبشی ملک قرنفل اس کا جانشین ہوا۔ اس نے مکمل خود مختاری کا اعلان کرکے جونپور میں شرقی حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ ملک قرنفل نے ڈیڑھ سال بعد انتقال کیا تو اس کی مسند پر سلطان ابراہیم رونق افروز ہوا۔ شرقی حکومت اور سلطان ابراہیم شرقی لازم و ملزوم ہیں۔ اس نے ۴۳ سال حکومت کی۔ وہ غیر معمولی صلاحیت اور اعلیٰ اوصاف کا حامل تھا۔ وہ علماء و فضلاء کا بڑا قدر دان تھا اور اس کی یہی قدر افزائی دور دور سے علماء کو جونپور کھینچ لائی تھی۔ حملۂ تیمور کے وقت بہت سے علماء و فضلاء دہلی کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہوگئے۔ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے دامنِ ارادت سے وابستہ دو جنید عالم مولانا خواجگی اور مولانا احمد تھانیسری اپنے شاگردِ رشید شہاب الدین دولت آبادی کے ہمراہ دہلی سے مشرق کی جانب چل پڑے۔ ان دونوں بزرگوں نے تو کالپی میں ڈیرہ ڈال دیا لیکن تلمیذِ رشید جونپور چلے گئے۔ قاضی شہاب الدین نے جونپور میں بساطِ علم بچھا کر اس شہر کو ہمسرِ بغداد اور رشکِ بخارا بنا دیا۔

لودھیوں اور سوریوں کے عہد میں جونپور علم و ادب کا بہت بڑا مرکز مانا جاتا تھا۔ لودھیوں کے زمانے میں مُلا الہ داد جونپوری (م ۱۵۵۵ء) کا جونپور میں وہی مقام تھا جو سو سال پہلے ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی کا تھا۔ ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگردوں سے پورا دور معمور تھا۔ گھر گھر میں علم کا چرچا تھا۔ مولانا ابوالعرفان ندوی نے جونپور کے ۲۹ مدارس کی فہرست تیار کی ہے۔ لودھیوں کے عہد میں مُلا الہ داد جونپوری کے فرزند شیخ بھکاری جونپوری، شیخ معروف چشتی جونپوری، شیخ دانیال جونپوری، شاہ تھن غازی پوری، سید محمد مہدی جونپوری، شیخ حسن بن طاہر جونپوری، شیخ محمد حسن جونپوری، اور قاضی صلاح الدین خلیل جونپوری نے اپنے فضل و کمال سے جونپور کو چار دانگِ عالم میں مشہور کر دیا۔ اسی زمانے میں شیر شاہ سوری نے جونپور کے مدارس میں گلستان، بوستان اور سکندر نامہ پڑھے۔ پٹھانوں میں چونکہ پڑھنے لکھنے کا رواج نہ تھا اس لئے وہ اتنا سا پڑھ کر بھی اپنی قوم میں بڑا عالم لکھا جانے لگا۔

مغلوں کے ابتدائی دور میں قاضی صلاح الدین خلیل جونپوری کے شاگردِ رشید سید عبدالاول جونپوری شارحِ بخاری نے علمی اور دینی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ بیرم خان نے اپنے دورِ اقتدار میں انہیں دہلی آنے کی دعوت دی۔ وہیں ۱۵۷۱ء میں ان کا

انتقال ہوا۔ ہمایوں کے زمانے میں مُلا یوسف ظفر آبادی الملقب بہ قاضی خان (م ۱۵۹۳ء) جونپور میں ایک نامور عالم دین ہو گذرے ہیں۔ ہمایوں نے ان کی خدمت میں نذر پیش کی لیکن انہوں نے بادشاہ کے اصرار کے باوجود اسے قبول نہ کیا۔

شاہجہان کے عہد میں اُستاد الملک مُلا محمد افضل جونپوری نے جونپور میں بساطِ علم بچھائی۔ ان کی وجہ سے اس علاقے میں علم کا بڑا شہرہ ہوا۔ شاہجہان نے ان کا علمی کام دیکھ کر ہی یہ کہا تھا:

پُورب شیرازِ ماست

مولانا ابوالعرفان ندوی، قاضی کہلاتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ان کا تعلق "جونپور کے قاضی" سے بھی ہے؟ موصوف میری بات سن کر مُسکرائے اور فرمانے لگے کہ اس قاضی کی اولاد جونپور سے باہر چلی گئی تھی۔ ہم باہر سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔

عصر کی نماز کا وقت ہونے والا تھا۔ شدید گرمی کا موسم تھا۔ میں جونپور میں جو کچھ اور جتنا دیکھنا چاہتا تھا، وہ میں دیکھ چکا تھا۔ اس لئے میں نے مولانا سے اجازت چاہی۔ وہ اس پر مُصر تھے کہ وہ میرے ساتھ ہوٹل تک چلیں گے اور وہاں سے مجھے بس میں سوار کرا کے گھر جائیں گے تاکہ انہیں اطمینان ہو جائے کہ میں جونپور سے چلا گیا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ہوٹل جا کر نہاؤں گا اور اس کے بعد سامان سمیٹ کر بس میں سوار ہوں گا۔ موصوف فرمانے لگے کہ وہ ہوٹل میں میرے تیار ہونے کا انتظار کریں گے میں نے بمشکل تمام انہیں رُخصت کیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے غسل کیا اور سامان اٹھا کر بس اسٹینڈ پہنچا۔ مجھے وہاں سے الہ آباد جانے والی بس مل گئی۔ راستے میں ایک ریلوے پھاٹک پر بس رُکی۔ دونوں جانب گنتی کی کھو کھا نما دکانیں تھیں۔ گاؤں میں سو سوا سو سے زائد گھر نہ ہوں گے۔ میں نے ایک ہم سفر سے پُوچھا کہ یہ کونسی جگہ ہے؟ اس نے کہا: مچھلی شہر۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ اس چھوٹے سے گاؤں نے مَتین مچھلی شہری، شہیر مچھلی شہری تلمیذ منیر شکوہ آبادی، شاکر مچھلی شہری (م ۱۹۴۳ء) تلمیذ غالب، ہادی مچھلی شہری (م ۱۹۷۶ء) اور سلام مچھلی شہری (م ۱۹۷۳ء) جیسے بلند پایہ شاعر پیدا کئے ہیں۔ مچھلی شہر سے چل کر میں الہ آباد پہنچ گیا۔ جونپور سے الہ آباد تک تین گھنٹے کی مسافت ہے۔

علی گڑھ میں چند روز

میں اگرچہ رات بھر سفر کے بعد تکان محسوس کر رہا تھا لیکن علی گڑھ آتے ہی خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگا ۔ ان دنوں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی جنوبی افریقہ گئے ہوئے تھے ۔ اس لئے گھر میں میری کوئی مصروفیت نہ تھی ۔ میں ناشتہ کے بعد قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی ، سابق صدر شعبۂ دینیات ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ملنے ان کی قیام گاہ " اللہ والی کوٹھی " پہنچا ۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ موصوف مظاہر العلوم سہارنپور گئے ہوئے ہیں ۔ ان کی ایک صاحب زادی " مہرِ منظیہ میں قادریہ سلسلے کا عروج " کے عنوان سے پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہی تھیں ۔ مجھے دراصل اسی بچی سے کام تھا ۔ انہوں نے میرے ذریعے پاکستان سے سلطان باہو اور بلھے شاہ کے کلام کے اُردو تراجم منگوائے تھے ، میں نے وہ ان کے حوالے کئے ۔

اگلے روز قاضی صاحب بھی علی گڑھ لوٹ آئے ۔ موصوف ان دنوں " میون العرفان فی علوم القرآن " کے عنوان سے ایک کتاب لکھ رہے تھے ۔ انہوں نے مجھے اس کا مسودہ دکھایا تو میں نے عرض کیا کہ مولانا محمد حنیف ندوی (م ۱۹۸۷ء) نے بھی اس موضوع پر ایک مختصر کتاب لکھی ہے ۔ قاضی صاحب کی فرمائش پر میں نے لاہور آتے ہی یہ کتاب انہیں بھیج دی ۔

قاضی صاحب کے والدِ بزرگوار قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی (م ۱۹۵۳ء) برطانوی دَور میں ایک بڑے اُونچے منصب پر فائز تھے ۔ ریٹائرمنٹ کے بعد موصوف مسلم یُونیورسٹی کے اعزازی خازن بنے اور تازیست اس ذمہ داری کو نبھاتے رہے ۔ انہوں نے دورانِ ملازمت تقسیمِ ہند کا منصوبہ پیش کیا تھا لیکن سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اپنے نام کی بجائے اپنے بھائی عبدالقدیر بلگرامی کے نام سے ۱۹۲۰ء میں بدایوں کے مشہور ہفت روزہ اخبار " ذوالقرنین " میں " ایک کھلا خط گاندھی جی کے نام " کے عنوان سے چھپوایا تھا ۔ اس خط میں انہوں نے آبادی کی اکثریت کے لحاظ سے ضلعوں کی تقسیم کی

سے مطالعۂ قرآن ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

تجویز پیش کی تھی ۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ریڈکلف نے ۱۹۴۷ء میں جو ایوارڈ دیا تھا وہ اس منصوبہ سے قریب تر تھا ۔

قاضی صاحب سے میری متعدد ملاقاتیں ہوئیں ۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بارے میں لکھا ہے " صحبتش بے ذوق نیست " یہ ریمارک قاضی صاحب پر بھی راس آتا ہے ۔

میں اللہ والی کوٹھی سے نکلا تو اتفاقاً پروفیسر اُسلوب احمد انصاری مل گئے ۔ موصوف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ انگریزی کے سربراہ ہیں ۔ ان کا شمار یُونیورسٹی کے چوٹی کے اساتذہ میں ہوتا ہے ۔ انگریزی زبان و ادب کے استاد ہو کر بھی موصوف ہمیشہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنتے ہیں ۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے بزرگوں کی قرابت داری سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے تھی اور ان کی اہلیہ محترمہ کا نسبی تعلق حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۹۰۵ء) سے ہے ۔

پروفیسر اُسلوب احمد کا شمار اُردو ادب کے بہترین نقادوں میں ہوتا ہے ۔ وہ علی گڑھ سے " نقد و نظر " کے نام سے ایک ششماہی ادبی اور تنقیدی مجلّہ بھی شائع کرتے ہیں ۔ اس مجلّہ کا سرورق ہمیشہ سبز رنگ کا ہوتا ہے ۔ میں نے عرض کیا کہ رنگ میں تنوع پیدا کیجئے ۔ انہوں نے مُسکراتے ہوئے فرمایا " نہیں صاحب ! اس کا رنگ سبز ہی رہے گا " ۔ اس جواب سے ان کے اسلامی ذہن کی عکاسی ہوتی ہے ۔ اُسلوب صاحب نے مجھے نقد و نظر کے چند پرچے مرحمت فرمائے اور گرما گرم کافی سے تواضع کی ۔

پروفیسر اُسلوب احمد صاحب سے میں نے پروفیسر مختار الدین احمد آرزو ، صدر شعبۂ عربی مُسلم یُونیورسٹی علی گڑھ کے نئے مکان کا ایڈریس لیا اور رکشا میں سوار ہو کر وہاں پہنچا ۔ میں جس وقت وہاں پہنچا ، اتفاق دیکھئے کہ پروفیسر نذیر احمد صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی ، آرزو صاحب کے دروازے پر دستک دے رہے تھے ۔ میں ان کا دیرینہ نیاز مند ہوں میری اہلیہ کو ان سے تلمذ ہے ۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے کہ بڑے اچھے موقع پر آئے ہیں ۔ آج دوپہر کو ان کے ہاں ایک لکھنوی دوست کے اعزاز میں لنچ ہے اور موصوف آرزو صاحب کو دعوت دینے آئے ہیں ۔ پروفیسر صاحب نے مجھے بھی کھانے پر بلایا ۔

آرزو صاحب سے میری پرانی دوستی ہے ۔ موصوف مولانا اکبر آبادی صاحب کے

بڑے مخلص دوست ہیں۔ آرزو صاحب کو علامہ عبدالعزیز میمن مرحوم (م ۱۹۷۸ء) سے تلمذ ہے۔ آرزو صاحب کے والدِ بزرگوار مولانا ظفر الدین بہاری مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ انہوں نے حنفی فقہ پر " صحیح بہاری " کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔

آرزو صاحب علمی و ادبی حلقوں میں جانی پہچانی شخصیت ہیں اور غالب پر سند کہے جاتے ہیں۔ انہوں نے " الحماسۃ " پر تحقیقی مقالہ لکھ کر آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈی فل کی ڈگری لی تھی۔ ان کا ذاتی کتاب خانہ قابلِ دید ہے۔

میں دوپہر کے وقت دوبارہ ان کے ہاں گیا اور ان کے ساتھ ہی پروفیسر نذیر احمد صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہاں اتفاقاً اکبر علی خان عرشی زادہ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ رضا لائبریری رام پور کے لائبریرین ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تین روز بعد رام پور جانے والا ہوں۔ ان کی لائبریری میں حضرت خواجہ خاوند محمود المعروف بہ حضرت ایشاں لاہوری (م ۱۶۴۲ء) کے ملفوظات " مراۃ طیبہ " کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ عرشی زادہ نے فرمایا کہ میں جس روز بھی رام پور پہنچوں گا اسی روز موصوف وہ نسخہ مجھے دکھا دیں گے۔

کھانے پر کئی اصحاب سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے کئی حضرات کے ساتھ میرا پہلے سے تعارف نہ تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں گھر واپس آیا اور شام کو دوبارہ احباب سے ملنے نکلا۔

مولانا اکبر آبادی کے مکان سے اندازاً دو فرلانگ کے فاصلہ پر انوارالہدیٰ کمپاؤنڈ میں ایک مسجد ہے جہاں میں علی گڑھ میں قیام کے دوران نمازِ مغرب و عصر کے لئے جایا کرتا ہوں۔ اس مسجد سے ملحق انصاری لاج میں ڈاکٹر اقبال انصاری صدر شعبۂ اسلامیات رہتے ہیں۔ میں جب بھی علی گڑھ جاؤں موصوف ایک صبح ناشتہ پر ضرور بلاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا نسبی تعلق سہالی کے اس انصاری خاندان کے ساتھ ہے جس میں مولانا نظام الدین بانئ درسِ نظامی، مولانا محمد رضا، مولانا عبدالعلی بحرالعلوم، مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی جیسی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں۔

موصوف ندوۃ العلماء میں مولوی عبیدالحق صاحب پروپرائٹر مکتبۂ علمیہ لاہور کے ہم سبق رہے ہیں۔ آنمحترم لکھنے پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں اور مختلف کانفرنسوں میں علمی مقالے بھی پڑھتے ہیں۔

اس مسجد سے جانب شمال قریباً دو سو گز کے فاصلے پر مولانا تقی امینی صاحب رہتے ہیں۔ موصوف کی تصانیف میں سے " اسلام کا زرعی نظام " اور " فقہی مسائل میں حالات اور زمانے کی رعایت " خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان کا شمار تجدد پسند علماء میں ہوتا ہے۔

میں نے ایک بار " امینی " کے بارے میں ان سے دریافت کیا کہ یہ کس بزرگ کی طرف نسبت ہے؟ موصوف بے اختیار ہنس پڑے اور فرمانے لگے کہ ان کا تعلق موضع سبیجہ ضلع بارہ بنکی سے ہے۔ وہ پہلے پہل اپنے نام کے ساتھ بارہ بنکوی لکھا کرتے تھے۔ ایک بار ان کے کسی دوست نے ناک بھوں چڑھایا تو انہوں نے اسے ترک کر دیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے " اسلام کا زرعی نظام " لکھی۔ وہ چونکہ زمین کو کاشت کار کے پاس امانت سمجھتے ہیں اس لئے ان کے احباب انہیں " امینی " کہنے لگے۔

میں امینی صاحب سے ملنے گیا تو انہوں نے اپنی بچی کو چائے تیار کرنے کو کہا۔ میں نے کہا۔ " مولانا جانے دیجیے میں ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر سے چائے پی کر نکلا ہوں "۔ امینی صاحب مولانا اکبر آبادی کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ اس تعلق کی بنا پر کہنے لگے: " بھئی! یہ دامادوں کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ اس لئے چائے تو ضرور چلے گی "۔ افسوس کہ امینی صاحب کا ۲۱ جنوری ۱۹۹۱ء کو ۶۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

امینی صاحب سے مل کر میں گھر واپس آیا۔ مغرب کے بعد مولانا اکبر آبادی کے بھانجے مجتبیٰ احمد علوی تشریف لے آئے۔ علوی صاحب شعبۂ تاریخ میں اُستاد ہیں اور انہوں نے میر فتح اللہ شیرازی اور جہانگیر کے ذوقِ مصوری پر انگریزی زبان میں دو بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں۔ جنہیں ایک سرکاری ادارے نے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے۔ ان کے ساتھ تاریخ کے موضوع پر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

اگلی صبح میں فیکلٹی آف تھیالوجی دیکھنے گیا۔ ایک ہی عمارت میں سنی دینیات اور شیعہ دینیات کے شعبے ہیں۔ شیعہ دینیات کے شعبہ سے سید علی نقی المعروف بہ نقن

صاحب اور مجتبیٰ حسن کاموں پوری جیسے نامور عالم وابستہ رہ چکے ہیں۔ سنی دینیات کے شعبہ میں مولانا ابوبکر شیث، مولانا سلیمان اشرف (م ۱۹۳۳ء) نواب صدر یار جنگ بہادر (مولانا حبیب الرحمان شروانی) مولانا سعید احمد اکبر آبادی (م ۱۹۸۵ء) قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۱۸۸۰ء) کے داماد مولانا عبداللہ انصاری جیسے بزرگوں کا تعلق رہا ہے۔ اسی عمارت کے ایک کرہ میں مولانا طفیل احمد منگلوری رہا کرتے تھے اور انہوں نے یہیں "مسلمانوں کا روشن مستقبل" لکھی تھی۔

ان دنوں ڈاکٹر فضل الرحمان گنوری اس شعبہ کے صدر ہیں۔ انہوں نے "کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت" کے عنوان سے ایک معرکہ آراء کتاب لکھی ہے جس میں مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی مرحوم (م ۱۹۸۲ء) کے ساتھ بہت سے مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے "الکشاف" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند لی ہے۔ یہ مقالہ طبع ہو گیا ہے۔

اسی شعبہ میں ڈاکٹر قاری رضوان اللہ بھی پڑھاتے ہیں۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے مولانا انور شاہ کشمیری پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ اس کے علاوہ جامعۂ ازہر سے بھی ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال حسن خان بھی اسی شعبہ سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے حضرت شیخ الہند پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ یہ مقالہ علی گڑھ یونیورسٹی سے چھپ چکا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم خان بھی اسی شعبہ سے متعلق ہیں۔ انہوں نے جمال الدین اسنوی کی "طبقات الشافعیہ" پر تحقیقی کام کیا تھا۔ ان کے پاس سنن ابی داؤد کا ایک ایسا مطبوعہ نسخہ بھی ہے جس پر حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی (م ۱۸۹۵ء) نے شنگرف کے ساتھ اعراب لگائے تھے اور آخر میں اپنا نام فضل رحمٰن ملانوی تحریر فرمایا ہے۔ (ملانواں ایک قصبے کا نام ہے جو ان کی جائے ولادت تھی)۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے اس صفحے کا عکس لے لیا ہے۔

اس شعبہ میں ایک نئے اُستاد ڈاکٹر معظم علی خان کا اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے شاہ اسمٰعیل شہید پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند لی ہے۔ ان تمام اساتذہ کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے تلمذ ہے۔ اس لئے سبھی میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔

شعبہ دینیات کے اساتذہ سے مل کر میں ظہور وارڈ پہنچا۔ وہیں ڈاکٹر اقبال انصاری کے دفتر میں ڈاکٹر اکمل ایوبی صاحب ملے۔ موصوف یونیورسٹی میں ترکی زبان کے اُستاد ہیں۔ انہوں نے مغل بادشاہ بابر کی ایک منظوم تصنیف "رسالۂ والدیہ" کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہ دراصل حضرت خواجہ ناصر الدین عبیداللہ احرار کی نثر میں تصنیف تھی۔ بابر ایک بار بیمار ہوا تو اس نے منت مانی کہ اگر وہ صحت یاب ہو گیا تو اس رسالے کا منظوم ترجمہ کرے گا۔ صحت یابی کے بعد اس نے اپنی منت پوری کی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ رسالہ مجھے عنایت فرمایا۔

ظہور وارڈ ہی میں عربی کا شعبہ ہے۔ اس شعبہ سے نواب ریاض الرحمٰن خان شروانی بھی وابستہ ہیں۔ موصوف نواب عبیدالرحمٰن شروانی کے صاحبزادے اور نواب صدر یار جنگ بہادر کے پوتے ہیں۔ میں نے ایک زمانے میں ان سے عربی پڑھی تھی۔ ان کی خدمت میں بھی حاضری دی اور اگلے روز حبیب منزل میں ان کے والدِ بزرگوار کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ نواب عبیدالرحمٰن خان شروانی کی عمر پچاسی چھیاسی برس ہے۔ انہوں نے نواب محسن الملک اور وقار الملک کا دور دیکھا ہوا ہے اور ان کے بارے میں بڑی نادر معلومات رکھتے ہیں۔ موصوف دیوبند کی مجلس شوریٰ کے بھی رُکن ہیں۔ ضعف اور بڑھاپے کے باوجود بڑی باقاعدگی کے ساتھ شوریٰ کے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔

موصوف مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ ابھی کل ہی میرا ذکر ان کی مجلس میں ہوا تھا۔ وہ یوں کہ ڈاکٹر رضاء اللہ انصاری، اُستاد طبیعیات، ان سے "طبقاتِ شاہجہانی" کی مائکرو فلم بنوانے کی اجازت لینے آئے تھے۔ یہ فلم مجھے درکار تھی۔ انہوں نے اجازت دے دی۔

نواب صدر یار جنگ بہادر نے اپنا شہرۂ آفاق "کتب خانہ حبیب گنج" اپنی وفات کے وقت مسلم یونیورسٹی کو دے دیا تھا۔ اگر اس مجموعۂ کتب سے کسی قلمی کتاب کی نقل یا عکس لینا ہو تو قواعد کی رو سے اس کی اجازت ان کے ورثا سے لینی ہوتی ہے۔ الحمد للہ کہ مجھے مطلوبہ مائکرو فلم مل گئی اور لاہور آکر میں نے اس کے پرنٹس بنوائے۔ اس گراں قدر تصنیف میں شاہجہانی عہد کے علما، مشائخ اور اہل کمال کے سوانح درج ہیں۔

نواب صاحب بڑی دیر تک اُن مشاہیر کا ذکر فرماتے رہے جنہیں اُنہوں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ کاش موصوف اپنی یاد داشت مرتب کر لیتے تو ان بزرگوں کی سیرت و کردار کے بہت سے نئے گوشے ہمارے سامنے آجاتے۔ افسوس کہ نواب صاحب ۶ مئی ۱۹۹۳ء کو انتقال فرما گئے۔

واپسی پر دھوپ بڑی تیز تھی۔ اس لئے میں دوپہر کا کھانا کھا کر سو رہا۔ شام کو کئی احباب گھر پر ملنے آگئے اس لئے کہیں باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

اگلے روز صبح میں ناشتہ سے فارغ ہو کر شعبۂ تاریخ پہنچا۔ صدرِ شعبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی دفتر میں موجود نہ تھے۔ میرے استفسار پر ان کے سٹینو گرافر نے بتایا کہ موصوف گیسٹ ہاؤس گئے ہوئے ہیں۔ میں فوراً گیسٹ ہاؤس پہنچا۔ وہاں پروفیسر کشوری سرن لال مقیم تھے۔ انہوں نے خلجی خاندان کی تاریخ بڑے عالمانہ رنگ میں لکھی ہے۔ وہ ان دنوں جودھپور یونیورسٹی میں صدر شعبۂ تاریخ تھے۔ نظامی صاحب ان ہی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے نظامی صاحب سے شرف تلمذ بھی ہے۔ انہوں نے بڑے پیار سے میرا تعارف اپنے معزز مہمان سے کرایا۔ اسی صحبت میں یہ معلوم ہوا کہ کشوری سرن لال جھنگ کے باشندے تھے اور تقسیم ملک کے بعد بھارت چلے گئے۔ نظامی صاحب سے اسی شام ان کے گھر پر دوبارہ ملاقات ہوئی۔ ان کی تصانیف میں شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، تاریخِ مشائخ چشت، لائف اینڈ ٹائمز آف بابا فرید الدین مسعود گنج شکر اور حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی خاص طور پر مشہور ہیں۔ نظامی صاحب کچھ مدت تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ شام میں بھارت کے سفیر کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔ اُردو، انگریزی اور فارسی پر انہیں یکساں قدرت حاصل ہے۔

نظامی صاحب کا کتاب خانہ قابلِ دید ہے۔ تصوّف کے موضوع پر شاید ہی اتنی کتابیں کسی ذاتی لائبریری میں ہوں گی۔ ان کے بچے اور بچیاں بھی ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا فرحان نظامی آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا اور اب وہ آکسفورڈ کے اسلامک سنٹر کا سربراہ ہے۔ ایک صاحب زادی عذرا شعبۂ تاریخ میں پڑھا رہی ہیں اور انہوں نے ابوالفضل کے بارے میں انگریزی میں ایک کتابچہ تحریر کیا ہے

اور مآثر جہانگیری کو بڑی محنت کے ساتھ مرتب کر کے چھاپا ہے۔ نظامی صاحب کے داماد علوی صاحب بھی اسی شعبہ سے منسلک ہیں اور وہ دکن کی تاریخ پر سند مانے جاتے ہیں۔

شعبۂ تاریخ کے اساتذہ میں پروفیسر اقتدار حسین صدیقی نے تحقیق کے میدان میں بڑا نام پایا ہے۔ انہوں نے شہاب الدین العمری کی مسالک الابصار کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور افغانوں کی تاریخ پر ایک بڑی اچھی کتاب لکھی ہے جو علی گڑھ کے علاوہ لاہور سے بھی طبع ہو چکی ہے۔ ان کے مضامین بھارت کے علمی جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔

صدیقی صاحب ذہنی اعتبار سے میرے بڑے قریب ہیں۔ ہم مضامین اور تصانیف کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں۔ میں جب بھی علی گڑھ جاتا ہوں تو موصوف بڑے اہتمام کے ساتھ کسی بڑے ہوٹل میں لے جا کر کھانا کھلاتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا شعبۂ تاریخ ایک مثالی شعبہ ہے۔ اس شعبہ میں ۳۹ اساتذہ درس و تدریس اور تحقیق و تدقیق میں مصروف ہیں۔ شعبہ کی اپنی لائبریری میں سات صد سے زائد ایسے مخطوطات کی مائیکرو فلز موجود ہیں جن کا مُسلم ہندوستان سے کسی بھی قسم کا تعلق ہے اور علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کے کسی بھی طالب علم یا اُستاد کو مواد کی تلاش میں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

نظامی صاحب فرمانے لگے کہ یہ کام آپ کے ہاں ہونا چاہیے تھا۔ پاکستان میں مُسلم ہندوستان کے بارے میں تمام مواد موجود ہوتا اور ایک ٹیم اس پر کام کرتی، لیکن آپ لوگوں نے یہ کام بھی بھارتیوں کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

شعبۂ تاریخ میں پروفیسر عرفان حبیب بھی مانے ہوئے محقق ہیں۔ مجھے ان سے بھی تلمذ ہے۔ موصوف پر ان دنوں اشتراکیت کا غلبہ ہے۔ اس لئے اسلامی موضوعات پر لکھنے والوں کے خلاف رہتے ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی اور راقم الحروف کے خلاف تین پمفلٹ شائع کر چکے ہیں۔ میں حسب معمول ان سے ملا اور چین کا ساختہ ایک قلم ان کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے تحفہ قبول کرنے سے انکار کیا۔ جب میں نے کہا کہ یہ قلم چین کا بنا ہوا ہے تو انہوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا (موصوف چینی برانڈ کے اشتراکی ہیں!)

Classic

عرفان حبیب صاحب عہد مغلیہ میں انتظامِ حکومت کے موضوع پر سند مانے جاتے ہیں ۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا اُردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے ۔

اس شعبہ کے اساتذہ میں ڈاکٹر نصیر الدین صدیقی ، ڈاکٹر محمد عمر ، ڈاکٹر اقبال حسین اور ڈاکٹر محمود علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب کا بیشتر وقت جامعہ ملیہ دہلی میں درس و تدریس میں گزرا ہے ۔ اب کچھ عرصہ سے علی گڑھ آگئے ہیں ۔ "ہندوستان میں اسلامی تہذیب پر ہندو اثرات" ان کا خاص موضوع ہے ۔ اس موضوع پر ان کے بہت سے مقالے ماہنامہ بُرہان دہلی میں چھپ چکے ہیں ۔ موصوف نے ان مقالات کو کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے ۔ اس کتاب کو شیخ محمد اشرف مرحوم (تاجرِ کتب) نے دیکھ کر مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس کتاب کو پاکستان میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں کیونکہ اسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم "روپے میں پندرہ آنے" ہندوانہ عقائد اور بود و باش رکھتے ہیں ۔

شعبۂ تاریخ کی توسیع و ترقی میں پروفیسر محمد حبیب مرحوم (م ۱۹۷۱ء) اور پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب (م ۱۹۸۲ء) کا بڑا ہاتھ ہے ۔ اس وقت شعبہ کے اکثر و بیشتر اساتذہ ان دونوں بزرگوں کے شاگرد ہیں ۔

پروفیسر محمد حبیب مرحوم کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل تھا ۔ ان کے انگریزی مقالات پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کئے ہیں ۔ انہوں نے زیادہ کام انگریزی زبان میں کیا تھا ۔ اُردو میں ان کی صرف حضرت نظام الدین اولیاء کے بارے میں ایک تصنیف ہے جسے شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی نے "نظام فنڈ" کی مدد سے شائع کیا ہے ۔ اس کتاب کو پڑھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کمیونسٹ تھے ۔

پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب برِعظیم پاک و ہند کے مُسلم دَور کی تاریخ پر سَند مانے جاتے ہیں ۔ انہوں نے ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی ، سلطان فیروز شاہ تغلق کی خود نوشت "فتوحاتِ فیروز شاہی" اور بالکنڈ نامہ جیسی کتابیں مرتب کر کے چھاپی ہیں ۔ ان کے علاوہ انہوں نے حضرت علی ہجویریؒ کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی جو اُردو ، فارسی ، انگریزی اور ترکی زبانوں میں طبع ہو چکی ہے ۔ انگریزی زبان میں نواب

نجیب الدولہ کے بارے میں انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی جو اب نایاب ہے ۔

اسی شام کو میری درخواست پر آرزو صاحب نے مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ (م ۱۹۱۶ء) کے پوتے اسد اللہ صاحب کو میرے ہاں بھیج دیا ۔ میں ان کی معیت میں شہر کے سب سے بڑے قبرستان "شاہ جمال" میں ان کے جد امجد کی قبر پر حاضر ہوا ۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ گزشتہ صدی عیسوی کے اواخر اور موجودہ صدی کے اوائل میں بہت بڑے عالم ہو گزرے ہیں ۔ ان کے درجنوں تلامذہ نے دنیائے علم و ادب میں اپنی علمیت کا لوہا منوایا ہے ۔ ان کے ارشد تلامذہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی بھی ہیں ۔ خان صاحب نے ہی اپنے اُستاد کی قبر پر یہ کتبہ نصب کروایا تھا ۔

تاریخ وفات

چوں مولانا لطف اللہ
بُود اُستاذ العلماء
حسرت سالِ وفات شان
" اُستاذ العلماء " گفتا

۱۳۳۴ھ

یکے از تلامذہ محمد حبیب الرحمٰن خان حسرت

مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ فلسفہ سے اوّل دن ہی سے بڑے نامی گرامی فلاسفر وابستہ رہے ہیں ۔ ان فلسفاء میں سے ڈاکٹر میاں محمد شریف (م ۱۹۶۵ء) ، پروفیسر ظفر الحسن (م ۱۹۴۹ء) ، پروفیسر عمر الدین (م ۱۹۴۳ء) اور ڈاکٹر محمد نور نبی کے نام قابل ذکر ہیں ۔ پہلے تین حضرات کو میں نے نہیں دیکھا حالانکہ ڈاکٹر میاں محمد شریف اور پروفیسر ظفر الحسن آزادی کے بعد لاہور چلے آئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا ۔ البتہ ڈاکٹر محمد نور نبی کے ساتھ میرے دوستانہ مراسم تھے ۔ افسوس کہ موصوف ۶ جنوری ۱۹۸۳ء کو مختصر سی علالت کے بعد انتقال کر گئے ۔ مرحوم کو اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی اور انہوں نے حضرت بایزید بسطامیؒ اور سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے فلسفیانہ نظریات پر دو رسالے اپنی یادگار چھوڑے ہیں جو راقم الحروف کے پاس ان کے دستخطوں کے ساتھ موجود ہیں ۔ ان کے علاوہ ان کی تصانیف میں سے :

1 - SHADES OF MYSTICISM.

2 - GHAZALIS CONCEPT OF TAUHID

3 - DEVELOPMENT OF RELIGIOUS THOUGHTS IN MEDIEVAL INDIA.

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ مؤخر الذکر کتاب میں مرحوم نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیاؒ، صوفی حمید الدین سوالی اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے مذہبی خیالات پر قلم اٹھایا ہے ۔ کاش کوئی صاحب علم اس کتاب کو اُردو کے قالب میں ڈھال دے ۔

اسی شعبہ کے ایک لائق اُستاد ڈاکٹر تصدق حسین قابلِ ذکر ہیں ۔ موصوف دونوں آنکھوں سے معذور ہیں ۔ اس کے باوجود انہوں نے The Philosophy of Shah Waliullah کے عنوان سے پی ایچ ڈی کے لئے ایک گراں قدر مقالہ لکھا ہے۔ ان کی اہلیۂ محترمہ بھی اُردو ادب میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کر رہی ہیں ۔ میرے علی گڑھ میں قیام کے دوران میں ڈاکٹر صاحب موصوف ہر دوسرے تیسرے رُوز مجھے ملنے کے لئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی قیام گاہ پر تشریف لاتے رہے اور میں بھی انہیں ان کے شعبہ میں جاکر ملتا رہا ۔

ایک دن ڈاکٹر تصدق حسین کے ساتھ مسعود انور علوی نام کے ایک نوجوان بھی تشریف لائے ۔ ان کے کئی مضمون ماہنامہ بُرہان دہلی میں طبع ہو چکے ہیں ۔ تعارف ہونے پر معلوم ہوا کہ موصوف حافظ شاہ محمد مجتبیٰ حیدر سجادہ نشین کاکوری شریف کے صاحبزادے ہیں اور شعبۂ عربی میں ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کی نگرانی میں "عربی ادب کے ارتقاء میں اَودھ کا حصہ" کے عنوان سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہے ہیں۔ ان کے آبائی کتاب خانے میں بیشمار نادر و کمیاب کتابیں محفوظ ہیں ۔ ان نوادرات میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے کئی رسائل ایسے بھی ہیں جو موصوف کی زندگی ہی میں لکھے گئے تھے۔

کاکوری کے سفر میں شاہ محمد مجتبیٰ حیدر صاحب نے راقم الحروف کو "ہمعات" کا ایک ایسا نادر مخطوطہ دکھایا جو ۱۱۶۰ھ میں شاہ صاحب کی زندگی ہی میں احاطۂ تحریر میں آیا

تھا ۔ سجادہ نشین صاحب کی عنایت سے شاہ صاحب کی ایک تصنیف "فضل المبین" کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہوا ۔ اس تصنیف پر شاہ صاحب کے دستخط ثبت ہیں ۔ شاہ صاحب کا لکھا ہوا ایک اجازت نامہ بھی اسی خانقاہ میں نظر سے گزرا ۔

سجادہ نشین صاحب کو اس پر بجا طور پر فخر ہے کہ ان کے پاس شاہ ولی اللہ کے بارے میں محمد عاشق پھلتی کی تصنیف "قول الجلی" کا ایک بڑا نادر نسخہ موجود ہے ۔ میرے کاکوری جانے سے چند رُوز قبل مولانا علی میاں صاحب محض "قول الجلی" کے مطالعہ کے لئے کاکوری تشریف لے گئے تھے ۔ سجادہ نشین صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ شاہ ولی اللہ کے معتقدین نے اس کتاب کو چھاپنے کی بجائے چھپایا ہے کیونکہ اس کتاب کے مطالعہ سے بہت سی ایسی باتیں منصۂ شہود پر آتی ہیں جو شاہ ولی اللہ کے معتقدین کو ناپسند ہیں ۔ سجادہ نشین صاحب کا کہنا ہے کہ شاہ صاحب ستاروں کی تاثیر کے قائل تھے اور نجوم کا حساب لگا کر اہم کام کرنے کے عادی تھے ۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت انہوں نے فرمایا تھا کہ مریخ کا منحوس سایہ ان کے محلے پر پڑ رہا ہے اس لئے اس محلے سے ترک سکونت ہی میں عافیت ہے ۔

صاحب زادہ مسعود انور علوی اپنے آبائی کتاب خانے کی مدد سے شاہ ولی اللہ اور ان کے ساتھیوں پر مضامین لکھ رہے ہیں ۔ بُرہان میں شاہ محمد عاشق پھلتیؒ پر ان کا ایک عالمانہ مضمون چھپا ہے ۔

مولانا اکبر آبادی صاحب کے ہاں باقاعدہ آنے والوں میں ایک لائق استاد ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی بھی ہیں ۔ "عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں، محرکات، مسائل اور مقاصد" کے عنوان سے ان کا ایک عالمانہ مضمون بُرہان میں متعدد اقساط میں شائع ہوا ہے ۔ صدیقی صاحب کے ساتھ میری علمی گفتگو رہتی تھی ۔ موصوف ابھی جواں سال ہیں، اُمید ہے کہ مستقبل میں اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بڑا نام پیدا کریں گے ۔

میرے علی گڑھ میں قیام کے دوران میں "مسلمانوں کی تعلیم اور حصول ملازمت میں مشکلات" کے موضوع پر ایک آل انڈیا سیمینار ہوا ۔ اس موقع پر حکیم عبدالحمید صاحب، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر اقبال انصاری، پروفیسر عرفان حبیب، شوکت صاحب سابق پرنسپل شبلی کالج اعظم گڑھ اور ناصر الدین حیدر آبادی جیسے فضلاء

سے ملاقات ہوئی ۔ دو روزہ سیمینار کا لب لباب یہ تھا کہ بھارت کے مسلمان آج اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں سے سرسید احمد خان نے کام شروع کیا تھا ۔ اس لئے مسلمانوں کو تعلیم اور خصوصاً ٹیکنیکل تعلیم میں غیر مسلموں سے پیچھے نہیں رہنا چاہئے ۔ اس سیمینار میں بڑے بڑے نیشلسٹ مسلمانوں نے بھی یہ تسلیم کیا کہ ملازمت کے حصول میں مسلمانوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اُن کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے ۔ ایک مقرر نے سامعین کو بتایا کہ عائشہ نامی ایک لڑکی مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو گئی اس کے ہندو ممتحن دراصل اسے آشا یا اوشا سمجھتے رہے ۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ اس کا نام آشا نہیں بلکہ عائشہ ہے تو اسے صاف صاف بتا دیا کہ اُسے کسی کلیدی آسامی پر فائز نہیں کیا جا سکتا ۔ اس دلچسپ سیمینار کی صدارت بہار کے گورنر عبدالرحمٰن قدوائی نے کی اور اقلیتی اُمور کے کمیشن کے صدر ایم ایچ بیگ مہمان خصوصی تھے ۔ سیمینار کے شرکاء بیگ صاحب سے ناراض تھے کیونکہ ان کا ایک بیان اخبارات میں چھپ چکا تھا جس میں اُنہوں نے حکومت سے درخواست کی تھی کہ ہوائی جہازوں میں مسلمانوں کو نماز ادا کرنے سے جبراً روکا جائے ۔

علی گڑھ میں قیام کے دوران میں یہ معلوم ہوا کہ وزارت تعلیم حکومت ہند کے ایک ذیلی ادارے ترقیٔ اُردو بورڈ نے کشوری سرن لال کی خلجی خاندان کے بارے میں انگریزی کتاب کا اُردو میں ترجمہ شائع کر دیا ہے ۔ پروفیسر ہارون خان شیروانی کی انگریزی تصنیف کا "دکن کے بہمنی سلاطین" کے عنوان سے اُردو میں ترجمہ ہو گیا ہے ۔ جہانگیر پر بینی پرشاد، شیر شاہ سوری پر کالیکا رنجن قانون گو اور شاہجہان پر بنارسی پرشاد سکسینہ کی انگریزی کتابوں کے اُردو تراجم بازار میں دستیاب ہیں ۔ رام پور کے ایک علم دوست نوجوان تنویر احمد صاحب نے دکن کے بہمنی سلاطین اور تاریخ جہانگیر مرحمت فرمائیں ۔ تاریخ شاہجہان اور خاندان خلجی پروفیسر گروور صاحب کی مہربانی سے مل گئیں اور شیر شاہ سوری میں نے بازار سے خرید لی ۔ شیر شاہ سوری پر سہسرام کے ایک مؤرخ پروفیسر حسن آرزو نے بھی ایک کتاب اُردو میں لکھی ہے ۔ مفتی سید نجم الحسن خیر آبادی کی عنایت سے یہ کتاب بھی مجھے مل گئی ۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جو کام ہمیں کرنا چاہئے تھا ۔ وہ اغیار کر رہے ہیں ۔

شعبۂ تاریخ سے ملحق شعبۂ اُردو ہے ۔ مُسلم یونیورسٹی کا شعبۂ اُردو ہمیشہ ہی سے مشہور چلا آ رہا ہے ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی (م ۱۹۷۷ء)، پروفیسر آل احمد سرور، مولانا احسن مارہروی (م ۱۹۴۰ء)، ڈاکٹر مسعود حسین خان، اختر انصاری، ڈاکٹر معین احسن جذبی، پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی (م ۱۹۷۸ء) مسعود علی ذوقی اور سجاد حیدر یلدرم (م ۱۹۴۳ء) جیسے نابغۂ روزگار اساتذہ اس شعبہ سے منسلک رہ چکے ہیں ۔ ان دنوں ڈاکٹر مسز ثریا حسین صدرِ شعبہ ہیں ۔ ان کے علاوہ ۲۳ اور اساتذہ بھی اس شعبہ سے وابستہ ہیں ۔ اس شعبہ کی کارکردگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ گذشتہ برسوں میں پچپن فضلاء نے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے لئے مقالے لکھے ہیں اور اس وقت بھی چھیاسی ریسرچ اسکالر پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے لئے مقالے تیار کر رہے ہیں ۔ شعبہ میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے لئے پیش کئے جانے والے مقالات میں سے گیارہ مقالے کتابی صورت میں طبع ہو چکے ہیں ۔ اب تک دو خوش قسمت انسان اس شعبہ سے ڈی لٹ کی ڈگری بھی حاصل کر چکے ہیں اور ان میں ایک خاتون بھی ہیں ۔ اس شعبہ میں ہر سال ایک سیمینار منعقد ہوتا ہے اور اب تک تیرہ سیمینار ہو چکے ہیں ۔ تیرہ میں سے سات سیمینار محمد علی جوہر، حسرت موہانی، سجاد حیدر یلدرم، اقبال، پریم چند، غالب اور فانی پر ہو چکے ہیں ۔ اس سے شعبۂ اُردو کی کارکردگی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔

راقم الحروف صدرِ شعبہ مسز ثریا حسین صاحبہ سے ملا تو انہوں نے ماہنامہ "نقش کوکن" ۔ بمبئی کا آزادی نمبر بطور تحفہ عطا فرمایا اور دیر تک باہمی دلچسپی کے موضوعات پر گفتگو فرماتی رہیں ۔

مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا عربی کا شعبہ روزِ اول سے ہی بڑا مشہور رہا ہے ۔ مشہور مستشرق PROF. TRITTON اس شعبے میں پڑھا چکے ہیں ۔ راقم نے انہیں کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے ۔ انہوں نے ہی مجھے حاجی خلیفہ چلپی کی کشف الظنون سے متعارف کروایا تھا ۔ علامہ عبدالعزیز میمن (م ۱۹۷۸ء) ایک طویل عرصے تک اس شعبے کے صدر رہے ہیں ۔ وہ عالمی شہرت کے عربی دان تھے ۔ ان کے تلامذہ میں سے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب نے بڑا نام پیدا کیا ہے ۔ موصوف بھی اس شعبے کے صدر رہ چکے ہیں ۔ جب راقم ۱۹۸۶ء میں علی گڑھ گیا تو ان دنوں ڈاکٹر

عبدالعلیم (م ۱۹۷۶ء) شعبہ عربی کے سربراہ تھے۔ ان کا جھکاؤ سوشلزم کی طرف تھا۔ راقم ان سے کئی بار ملا ہے۔ وہ بحیثیتِ وائس چانسلر یونیورسٹی کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان دنوں پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کے فرزندِ ارجمند شعبۂ عربی میں پڑھا رہے ہیں۔

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر خورشید احمد فارق نے بھی ریٹائرمنٹ کے بعد علی گڑھ میں رہائش اختیار کرلی ہے۔ ایک روز راقم ان سے ملنے گیا تو ان کے مطالعہ کا کمرہ دیکھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کھڑے ہو کر لکھتے ہیں اور انہوں نے ایک اسٹینڈ پر ڈرائنگ بورڈ نصب کیا ہوا ہے جس سے وہ Writing Table کا کام لیتے ہیں۔ اس عمر میں انہیں کام کرتے دیکھ کر میری بڑی ہمت بندھی۔

شعبۂ فزکس میں ڈاکٹر رضا اللہ انصاری سے ملاقات ہوئی۔ موصوف پاکستان بھی تشریف لا چکے ہیں۔ ان دنوں موصوف میرس روڈ کی ایک کوٹھی "فلک نما" میں رہتے ہیں۔ مسلمان اور علمِ فلکیات ان کا خاص موضوعِ تحقیق ہے۔ انہوں نے راجہ جے سنگھ کی تصنیف "زیجِ محمد شاہی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ فلکیات کے موضوع پر ان کے مضامین علمی رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ راقم کئی بار ان کے دولت کدے پر بھی ان سے ملنے گیا۔ اسی شعبے میں احسان الحق مرحوم بھی اُستاد رہ چکے ہیں۔ ان کا گھر مولانا اکبر آبادی کے گھر سے بالکل قریب تھا۔ انہوں نے رؤیتِ ہلال کے موضوع پر بڑے بلند پایہ مضامین لکھے تھے جو ماہنامہ برہان دہلی میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ شام کے وقت مولانا اکبر آبادی کے ہاں تشریف لایا کرتے تھے جہاں ان سے میری ملاقات ہو جاتی تھی۔

فلکیات پر کام کرنے والوں میں شبیر احمد غوری صاحب کا نام سرِفہرست ہے۔ موصوف ریاضی اور علمِ نجوم کے اس وقت بھارت میں سب سے بڑے مسلم عالم ہیں۔ ان کے مضامین مجلہ برہان دہلی میں چھپتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہی ڈاکٹر رضا اللہ انصاری کو اس طرف متوجہ کیا ہے۔ ایک بار راقم ان سے ملنے بالائے کوٹ گیا۔ ان دنوں ان کی رہائش جامع مسجد کے بالمقابل تھی۔ اب انہوں نے سرسید نگر میں اپنا گھر بنوا لیا ہے۔

مولانا کے گھر سے قریب ہی خواجہ عبدالمجید مرحوم کا عالیشان مکان ہے۔ خواجہ

صاحب بڑے پکے نیشنلسٹ تھے اور مرنے کے بعد بھی نیشنلسٹوں کے روایتی مرکز جامعہ ملیہ دہلی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ سے الفاظ مستعار لے کر عرض کرتا ہوں کہ انہیں "نیشنلزم کا ہیضہ" ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کے نام بھی ہندوانہ طرز پر رکھے تھے۔ ان کے ایک بیٹے کا نام رویندر خواجہ ہے۔ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ چین، تھائی لینڈ، ملایا اور انڈونیشیا کے مسلمانوں کے نام اپنے ہم وطن غیر مسلموں جیسے ہی ہیں۔ اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی مقامی نام اپنا لینے چاہئیں۔ ان دنوں خواجہ عبدالمجید کا ایک پوتا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ فلسفہ کا صدر ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری ایک زمانے میں لٹن لائبریری کے نام سے موسوم تھی۔ جب لائبریری اپنی نئی عمارت میں منتقل ہوئی اور پنڈت جواہر لعل نہرو نے اس کا افتتاح کیا تو اسے مولانا ابوالکلام آزاد سے منسوب کر دیا۔ اب یہ مولانا آزاد لائبریری کہلاتی ہے۔ اس لائبریری کا شمار بھارت کی بڑی لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی (م ۱۹۵۱ء) نے اپنی وفات کے وقت اپنا عظیم الشان کتب خانہ جو حبیب گنج لائبریری کے نام سے مشہور تھا، مولانا آزاد لائبریری کو دے دیا۔ اسی طرح گورکھپور کے ایک رئیس سبحان اللہ خان نے اپنی جمع کردہ کتابیں مولانا آزاد لائبریری کو دے دیں۔ نواب محمد اسمٰعیل خان (م ۱۹۵۸ء) نے اپنے دادا نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (م ۱۸۶۹ء) کی لائبریری کی کتابیں بھی اسی لائبریری کے حوالے کر دیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی (م ۱۹۷۷ء) کی عربی کتابیں دارالعلوم دیوبند کو اور اُردو، انگریزی کتابیں مولانا آزاد لائبریری کو مل گئی ہیں۔ یوپی کے مسلمان اپنی املاک کو غیر محفوظ سمجھ کر اپنی کتابیں مسلم یونیورسٹی کو ہبہ کر رہے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد علی گڑھ میں آکر آباد ہو رہے ہیں۔

آزاد لائبریری میں کتب خانہ حبیب گنج کے ساتھ اس کے نگران مولوی معین الدین بھی چلے آئے تھے۔ وہ فاضلِ دیوبند تھے اور اسلامی اوزان کے بڑے ماہر تھے۔ میں جب بھی مطالعہ کے لئے لائبریری گیا تو انہیں اوزان پر کام کرتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے طلبہ کے ذریعے بھارت کے مختلف علاقوں سے جو منگوا کر ان کا وزن کروایا اور اس

وزن کو مختلف پایا - اس لئے رتیوں، ماشوں اور تولوں کو جَووں کے برابر قرار دینے والوں سے مولوی صاحب کا اختلاف رہتا تھا - اس موضوع پر ان کے مضمون مجلّہ برہان دہلی میں شائع ہو چکے ہیں - مولوی معین الدین شاعر اور تاریخ گو بھی تھے - ان کی کہی ہوئی کئی تاریخیں راقم کے پاس محفوظ ہیں -

آزاد لائبریری کے اورینٹل سیکشن کے انچارج محمد عبدالشاہد خان شروانی (م ۱۹۸۳ء) بڑے عالم و فاضل تھے - مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ایک بار بڑے افسوس کے ساتھ کہا کہ انہوں نے ساری زندگی لائبریری میں گنوا دی ہے - اگر وہ تعلیم و تدریس کے شعبے سے منسلک ہوتے تو بڑا نام پیدا کرتے - انہوں نے "کاروانِ خیال" پر جو پیش لفظ لکھا ہے، وہ ایک مستقل تصنیف ہے - وہ نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرز میں لکھنے والے بزرگ تھے - ان کی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد راقم انہیں ان کے مکان واقع محلہ بنی اسرائیل علی گڑھ میں ملتا رہا ہے - انہوں نے ایک سفر میں علی گڑھ کا ساختہ تالا مجھے بطورِ تحفہ دیا - ان کا یہ کہنا تھا کہ چور اسے توڑ نہیں سکتا - اسے آری کے ساتھ کاٹنا پڑے گا - موصوف مجھے ایک جیبی پاندان بھی دے رہے تھے لیکن میں نے معذرت چاہی -

انہوں نے ثورۃ الہندیہ کا "باغی ہندوستان" کے عنوان سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے - اس ترجمے کی اہلِ علم نے بڑی تعریف کی ہے - شروانی مرحوم کے گھر سے جامع مسجد زیادہ دُور نہیں ہے - یہ مسجد مغل فرمانروا محمد شاہ (م ۱۷۴۸ء) کے عہد میں اس کے ایک گورنر ثابت خان نے تعمیر کروائی تھی - اس مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ بھی ہے جہاں مولانا لُطف اللہ علی گڑھیؒ (م ۱۹۱۶ء) پڑھاتے رہے ہیں - ان کا شمار اُس دَور کے نامور علماءؒ میں ہوتا ہے - ان کے سامنے پیر مہر علی گولڑویؒ اور نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی جیسے فضلاء نے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے - نواب صاحب نے مولانا لُطف اللہ کی تاریخِ وفات "اُستاذ العلماء" (م ۳۳۴ھ) سے نکالی ہے - اِن دنوں اس مدرسے میں میرے ایک دوست قاری محمد ادریس تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں -

یونیورسٹی کی مسجد بھی قابلِ دید ہے - اس کی دیواروں پر خطِ ثلث میں آیات قرآنی مرقوم ہیں جو فنِ خطاطی کا شاہکار ہیں - اس مسجد کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہاں

ساڑھے بارہ بجے شیعہ طلبہ اور اساتذہ نمازِ جمعہ ادا کرتے ہیں اور وہ سوا ایک بجے تک مسجد خالی کر دیتے ہیں - اس کے بعد سُنّی طلبہ اور اساتذہ نمازِ جمعہ ادا کرنے وہاں آتے ہیں - اس فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی مثال پورے برِّعظیم میں نہیں ملتی - یہ سرسیّد احمد خان کا فیضان ہے - رحمۃ اللہ علیہ الفًا الفًا -

مسجد سے جانبِ شمال ناظم دینیات کا دفتر ہے اور اس سے ملحق سیّد محمود (م ۱۹۰۳ء) سرسیّد احمد خان (م ۱۸۹۸ء) سر راس مسعود (م ۱۹۳۷ء) اور سر ضیاء الدین (م ۱۹۴۷ء) کی قبریں ہیں - یہ قبریں مسقّف ہیں - اُن کے بعد کھلے آسمان تلے نواب محسن الملک (م ۱۹۰۷ء) اور سرسیّد کے رفیق زین العابدین کی آخری آرام گاہیں ہیں - زین العابدین کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

هوالغفار

۳۲۳ھ

خان بہادر زین العابدین ابن محمد حسین

مولوی سیّد زین العابدین نوّر اللہ مرقدہٗ

اِنَّ فِی الْآخِرَۃِ لِمَنَ الصّٰلِحِیْنَ یَا اللّٰہُ یَا رَحْمٰنُ یَا الصَّمَد

۱۹۰۵

اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ

بحمدِ اللہ شبِ معراج شد شاداں سُوی جنّت
عروجِ خویشتن شاں شفیعُ المذنبین دارد
تعالیٰ شانہٗ مرحوم را دولت چہ حاصل شد
بنورالعینِ اسلامی ضیا و زینِ دین دارد
فدا نازد بطبعِ خود کہ تاریخش عجب گفتہ
چناں نازد بسُوی خود کہ زین العابدین دارد
زُبدۂ اصحابِ ایمان ، قدوہ اہلِ یقین
کاشفِ رمزِ حقیقت ، واقفِ اسرارِ دین
گوہرِ دُرجِ سیادت نیّرِ برجِ شرف

رفت چوں زوحش ز دنیا پیشِ ربُّ العالمین
گفت بخشیدم ز ہر جرم و خطایا کو تو رفت
زانکہ خیر الدامنی ازاں خیرُ المرسلین
زیرِ عصیان او بگذشت چو ربِّ کریم
در جوارِ رحمتش پیوست زین العابدین
۱۳۲۳ھ

سرسیّد احمد خانؒ کے لوحِ مزار پران کے یہ شعر کندہ ہیں:

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک می آرد ز درمانے کہ من دارم
خدا دارم، دلے بریاں ز عشقِ مصطفیٰ دارم
نہ دارد ہیچ کافر، ساز و سامانے کہ من دارم
ز جبریلِ امین قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است، قرآنے کہ من دارم
فلک یک مطلعِ خورشید با ہمہ شوکت
ہزاراں مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم
ز نہاں تا ایماں سنگہا دارد رہِ واعظ
نہ دارد ہیچ واعظ چو نہانے کہ من دارم

اس کے علاوہ سرسیّد کا شجرۂ نسب بھی ایک دیوار پر مرقوم ہے جو حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔

سرسیّد احمد خان کے بعد اُن کے فرزند سیّد محمود کالج کے سیکریٹری بنے تھے لیکن وہ اپنے فرائض کماحقہ انجام نہ دے سکے تو ان کی جگہ نواب محسنُ الملک کالج کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ سیّد محمود کا انتقال ۸ مئی ۱۹۰۳ء کو سیتا پور میں ہوا اور ان کا جسدِ خاکی ان کے عظیم والد کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔

سرسیّد احمد خان کے پہلو میں ان کے عظیم المرتبت پوتے سَر راس مسعود محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ وہ علّامہ محمد اقبال کے مخلص دوست تھے۔ نادر شاہ والیٔ افغانستان

نے جن تین افراد کو کابل کا دَورہ کرنے کی دعوت دی تھی، ان میں علّامۂ موصوف اور سیّد سلیمان ندوی کے علاوہ سَر راس مسعود بھی تھے۔ ان کا انتقال ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو بھوپال میں ہوا تھا۔ ان کے بارے میں خوشی محمد ناظرؔ نے کیا خوب کہا ہے:

آنکھ سرسیّد کے جو گلزار میں کھولی تُو نے
چشمِ ناظر نے تجھے اے گلِ خنداں دیکھا
کبھی دادا نے دیا بوسہ جبیں پر تیری
باپ کا لب کبھی رُخسار سے چسپاں دیکھا
تیری خُردی ہی میں آثارِ بزرگی دیکھے
ماتھے پر اخترِ اقبال درخشاں دیکھا
جس چمن کو تیرے دادا کے لہُو نے سینچا
اس گلستان میں تجھے مُرغِ خوش الحان دیکھا

سَر راس مسعود کے برابر سَر ضیاء الدین احمد کی ابدی آرام گاہ ہے۔ علی گڑھ اور سَر ضیاء الدین احمد کا نام لازم و ملزوم ہیں۔ علی گڑھ میں یہ مشہور تھا کہ سَر ضیاء الدین احمد، اللہ تعالیٰ سے کہیں زیادہ علی گڑھ کے وفادار ہیں۔ وہ مُسلم یُونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بھی رہے اور ریکٹر بھی۔ ان کا انتقال ۲۳ دسمبر ۱۹۴۷ء کو لندن میں ہوا اور ان کا جسدِ خاکی ان کی مادرِ علمی میں سرسیّد احمد خان کے جوار میں سپردِ خاک کیا گیا۔

سَر ضیاء الدین احمد کے بعد ایک کھلے احاطے میں نواب محسنُ الملکؒ کی ابدی آرام گاہ ہے۔ ان کا انتقال ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو شملہ میں ہوا۔ کسی صاحبِ ذوق تاریخ گو نے أُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا سے ان کی تاریخِ وفات (۱۳۲۵ھ) نکالی ہے۔ ان کا جسدِ خاکی بذریعہ ٹرین ان کی زادبوم اٹاوہ لے جایا جا رہا تھا۔ جب وہ ٹرین علی گڑھ پہنچی تو طلبہ نے وہ بوگی ٹرین سے الگ کرلی جس میں ان کا تابوت رکھا ہوا تھا۔ طلبہ وہ تابوت لے کر ایم اے اُو کالج پہنچے اور اسے سرسیّد احمد خان کی ابدی آرامگاہ سے قریب سپردِ خاک کر دیا۔

نواب محسنُ الملکؒ کے مزار سے قریب ہی سرسیّد کے رفیقِ کار زین العابدین کی آخری آرام گاہ ہے۔ کالج کے قیام میں وہ سرسیّد کے دستِ راست تھے۔ اُن کے بارے

میں خوشی محمد ناظر نے کیا خوب کہا ہے:

عمدۃ السادات زین العابدین
اک طرف ہے عشق سیّد میں مگن

ایک روز میں نمازِ جمعہ ادا کرنے یونیورسٹی کی مسجد میں گیا۔ ان دنوں اتفاق سے مولانا نسیم احمد فریدیؒ (م ۱۹۸۸ء) امروہہ سے علی گڑھ تشریف لائے ہوئے تھے۔ آخری عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ موصوف تالاب کے کنارے بیٹھے وضو فرما رہے ہیں۔ میں عرض کیا "حضور میں پروفیسر محمد اسلم ہوں اور سلام عرض کرتا ہوں"۔ مولانا فریدیؒ نے بڑی محبت کے ساتھ جواب دیا اور مجھ سے دریافت فرمایا "نمازِ جمعہ کے بعد کچھ وقت ہو گا"؟ میں نے عرض کیا "میرے لئے جناب کی صحبت غنیمت ہے"۔

نمازِ جمعہ کے بعد مولانا نسیم احمد فریدیؒ تالاب کے قریب تشریف لے آئے۔ مولانا محمد تقی امینی (م ۱۹۹۱ء) بھی نمازِ جمعہ ادا کر کے ہمارے پاس چلے آئے۔ ناظمِ دینیات کے دفتر میں راقمِ آثم نے مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ یہ سلسلہ گھنٹہ سوا گھنٹہ جاری رہا۔ آخر میں مولانا فریدیؒ نے فرمایا کہ جو کچھ راقم نے کہا ہے، وہ بالکل صحیح ہے لیکن یہ باتیں خطیب نہیں بتاتے اور وہ پہلی بار ایسی گفتگو سُن رہے ہیں۔ مولانا نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں پاکستان جانے سے قبل امروہہ جا کر اُن سے ملوں گا۔ میں نے عرض کہ میں پہلے حسن پور جاؤں گا اور وہاں سے عزیز الہیٰ اخون صاحب کو ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ انہوں نے فرمایا کہ اُن کا ساتھ خوب رہے گا۔ افسوس کہ اسی سفر میں کسی نابکار ہندو چور نے ٹرین سے میرا سامان چُرا لیا اور میرا پاسپورٹ بھی سامان کے ساتھ ہی جاتا رہا۔ اب مجھے حصولِ پاسپورٹ کی فکر لاحق ہو گئی اس لئے میں نے ان کی خدمت میں معذرت لکھ بھیجی۔ افسوس کہ یہ مردِ مومن دو سال بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔

علی گڑھ میں ایک بار میرے قیام کے زمانے میں مولانا محمد اویس نگرامی ندوۃ العلماء سے شعبۂ دینیات میں VIVA-VOCE لینے آئے۔ مولانا اکبر آبادی نے اُنہیں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ میرا ان سے تعارف نہ تھا۔ میں نے پُوچھا کہ ان کا تعلق

کس ادارے سے ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ لکھنؤ میں "ایک چھوٹا سا ادارہ" ہے جسے ندوۃ العلماء کہتے ہیں۔ وہ اس سے منسلک ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف وہاں شیخ التفسیر تھے۔ افسوس کہ ۲۷ اگست ۱۹۷۶ء کو علم کی یہ شمع بھی بجھ گئی۔ اسی طرح ایک روز دوپہر کا وقت تھا۔ مولانا اکبر آبادی قدرے خفا ہو کر زنانے میں تشریف لائے۔ انہوں نے فرمایا کہ انہوں نے ایک مہمان کے لئے شربت منگوایا تھا اور اتنی دیر ہو گئی ہے، ابھی تک شربت نہیں پہنچا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ تو جانتے ہوں گے، قاری بشیر الدین پنڈت شاہجہانپور سے ملنے آئے ہیں۔ ان کا نام سُن کر میں ننگے پاؤں مردانے کی طرف بھاگا۔ میں نے عرض کیا "قاری صاحب! میں اسلم ہوں اور ان دنوں لاہور سے یہاں آیا ہوا ہوں"۔ قاری صاحب کرسی سے اُٹھ کر مجھ سے لپٹ گئے اور ہم تادیر باتیں کرتے رہے۔ مولانا نے بڑے تعجب سے پُوچھا کہ آپ ایک دوسرے سے واقف ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ میں دو بار شاہجہانپور جا کر ان سے مل چکا ہوں اور موصوف دو بار پاکستان تشریف لا کر مجھ سے مل چکے ہیں۔

علی گڑھ میں سرسیّد ہاؤس بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ یہ عمارت ڈھہ گئی تھی۔ کشمیر کے سابق وزیرِ اعلیٰ بخشی غلام محمد کی سعی و کاوش اور مالی امداد سے اسے از سرِ نو اصلی نقشے کے مطابق تعمیر کیا گیا ہے اور سرسیّد احمد خان سے متعلقہ سامان اور اُن کی کتابوں کے مسودے وہاں رکھ دیئے گئے ہیں۔ یہ عمارت دیکھ کر سرسیّد احمد خان کے اعلیٰ ذوق کا پتہ چلتا ہے کہ وہ سو سال پہلے کتنے عالیشان بنگلے میں رہتے تھے۔ اس عمارت کے اندر سرسیّد احمد خان کا ایک پورٹریٹ نصب ہے۔ اسے دیکھ کر مولانا الطاف حسین حالیؔ (م ۱۹۱۴ء) کے یہ اشعار زبان پر آجاتے ہیں:

صُورت سے عیاں جلالِ شاہی
چہرے پہ فروغِ صُبحگاہی
وہ ریشِ دراز کی سپیدی
چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
وہ ملک پہ جان دینے والا
وہ قوم کی ناؤ کھینے والا

لب پر ہے فغاں کہ اب بھی جاگو
اے خوابِ گراں کے سونے والو
تا چند رہوگے مست و سرشار
اُٹھو کہ سحر ہوئی نمودار

ایک اور موقع پر مولانا حالی نے اُن کے بارے میں فرمایا تھا:

چیست انسانی ؟ تپیدن از تپِ ہمسائگان
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شُدن
زیستن در فکرِ قوم و مُردن اندر بندِ قوم
گر توانی میتوانی سیّد احمد خان شُدن

میں اپنے احباب سے یہ کہا کرتا ہوں کہ کتابوں میں سرسیّد اور مُسلم یونیورسٹی کے بارے میں پڑھ کر اُن کی خدمات کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ ان کی خدمات کا جائزہ لینے کے لئے علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کو دیکھنا ضروری ہے۔ سرسیّد ہال کے جنوب مشرقی گوشے سے باہر ایک کنواں ہے۔ جب سرسیّد نے کالج کی بُنیاد رکھی تو سب سے پہلے وہاں کنواں کھدوایا۔ اس کنوئیں پر سنگِ سرخ کی سل نصب ہے جس پر یوپی کے ۳۹ رؤساء اور جاگیرداروں نے نام کندہ ہیں۔ یہ ۳۹ رؤساء مل کر اس کنوئیں کے مصارف برداشت نہ کر سکے اور سرسیّد نے اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے یہ کنواں مکمل کیا اور ان رؤسا کے ناموں کے بعد اپنا نام یوں لکھا:

وَ خادمہم احمد۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرسیّد نے کن حالات میں کالج کی بُنیاد رکھی اور کہاں کہاں کے دَورے کر کے کالج کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کیا۔ اکبر الہ آبادی (م ۱۹۲۱ء) نے یونہی نہیں کہا تھا:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا ہے

مولانا اُلطاف حُسین حالی نے اس کالج کے بارے میں کیا خوب فرمایا ہے:

یہ دارالعلم ستدراہِ آسیبِ زماں ہوگا
اسی دارالشفاء میں بخت پیر اپنا جواں ہوگا

یہ بیت العلم روز افزوں ترقی کا ہے سرچشمہ
اسی چشمہ سے دیکھو گے کہ اک دریا رواں ہوگا
اگر راس آگئی آب و ہوا اس کھیت کی ہم کو
تو جو اُٹھے گا پودا اس زمین سے آسماں ہوگا
کسوٹی ہے یہ دارالعلم اسلامی اخوّت کی
ہم اُس سے بدگماں ہونگے جو اس سے بدگماں ہوگا

کاش میرے فاضل دوست ضیاء الدین لاہوری سرسیّد احمد خان کے خلاف کتابیں اور مضمون لکھنے سے پہلے علی گڑھ جا کر اس مردِ قلندر کے کام کو دیکھ لیتے۔

علی گڑھ میں جامعۂ اُردو بھی ایک قابلِ ذکر ادارہ ہے۔ اس میں اُردو زبان و ادب پڑھائے جاتے ہیں۔ اس ادارے کی سَند کو مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور کشمیر یونیورسٹی سرینگر تسلیم کرتے ہیں اور اس کی بنا پر طلبہ کو داخل کر لیتے ہیں۔ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر مختار الدین احمد، اِن دِنوں جامعۂ اُردو کے نائب شیخ الجامعہ ہیں۔ موصوف پہلے آرزو تخلص کرتے تھے، لیکن اب انہوں نے اسے ترک کر دیا ہے۔ ہماری زبانوں پر آرزو اتنا زیادہ چڑھا ہوا ہے کہ اُن کے ترک کرنے کے باوجود ہم اِسے ترک نہیں کر پائے۔

سترہ جون ۱۹۸۲ء کو مجھے علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ میں نے اس فرصت کو غنیمت جان کر مشاہیر کی قبروں کے کتبے نقل کر لئے، جنہیں اب قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

قبرستان میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے پروفیسر عبد العلیم صدیقی، سابق وائس چانسلر و صدر شعبۂ عربی مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی قبر آتی ہے۔ میں ان سے بارہا ملا ہوں۔ ان کا جسم بھاری بھر کم تھا اور چہرے پر فرنچ کٹ ڈاڑھی تھی۔ میں نے انہیں ہمیشہ اچکن اور کھلے پائنچوں کا پاجامہ پہنے ہوئے دیکھا۔ ان کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے، اس پر یہ عبارت منقوش ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
پروفیسر عبد العلیم

تاریخ ولادت ۵ اگست ۱۹۰۶ء
تاریخ وفات ۱۸ فروری ۱۹۷۶ء

خدا خود میرِ مجلس بُود اندر لا مکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بُود شب جائیکہ مَن بُودم

پروفیسر عبدالعلیم مرحوم کی قبر سے چند گز آگے بڑھیں تو پروفیسر عمر الدین، سابق صدر شعبۂ فلسفہ کی قبر آتی ہے۔ یہ قبرستان میں سب سے طویل و عریض قبر ہے۔ اس کے بعد زیادہ جگہ گھیرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ موصوف کی قبر کی لوح پر یہ عبارت کندہ ہے:

یا اللہ
پروفیسر محمد عمر الدین
صدر شعبۂ فلسفہ و نفسیات
پیدائش فروری ۱۹۰۲ء
وفات اگست ۱۹۶۳ء

پروفیسر عمر الدین کے فرزند صلاح الدین محمود لاہور میں رہتے ہیں اور اُن کا شمار اچھے ادیبوں میں ہوتا ہے۔

پروفیسر عمر الدین مرحوم کی قبر سے جانبِ مشرق دس بارہ گز کے فاصلے پر مولانا فضل اللہ الجیلانیؒ محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ موصوف مولانا محمد علی مونگیریؒ بانیٔ ندوۃُ العلماء لکھنؤ کے پوتے ہیں۔ اُنہوں نے امام بخاری کی مشہور تصنیف ادبُ المفرد کی شرح "فضل اللہ الصمد" کے عنوان سے لکھی ہے۔ شاہ صاحب جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد میں پڑھاتے رہے ہیں۔ ان کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے، اس پر یہ عبارت مرقوم ہے:

یا اللہ ۷۸۶ یا محمدؐ
سلالۂ غوثُ الاعظم عالمِ با عمل محدثِ بے بدل
شیخُ الطریقت عارف باللہ حضرت مولانا الحاج
سید فضل اللہ جیلانی مجددی رحمتہ اللہ علیہ
نبیرۂ اعظم و خلیفۂ خاص قطبِ عالم حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ

تاریخ پیدائش ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۲۰ھ / ۲۹ دسمبر ۱۹۰۲ء
تاریخِ وفات ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۹۹ھ / بروز جمعرات ۲۴ مئی ۱۹۷۹ء

شاہ فضل اللہ کی قبر سے جانبِ جنوب مغرب چند گز کے فاصلے پر ڈاکٹر ہادی حسن سابق صدر شعبۂ فارسی آسودۂ خاک ہیں۔ ان کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے، اس پر یہ عبارت مرقوم ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
کل من علیہا فان
قطعۂ تاریخ
ڈاکٹر ہادی حسن پروفیسر مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آن ادیبِ خوش بیان ہادی حسن
ناگہاں از قضا خاموش شُد
بُود ذاتش شمعِ ایوان صفا
حیف از بادِ فنا خاموش شُد
گفتمش سال از پےِ درد و ہموم
طوطیِ گویائے ما خاموش شُد

۵ + ۴
۱۳۸۳ھ

تاریخِ وفات ۲۳ مئی ۱۹۶۳ء، ۲۸ ذوالحجۃ الحرام ۱۳۸۳ھ یوم پنجشنبہ وقتِ شام

ڈاکٹر ہادی حسن کی تاریخ وفات۔ طوطیِ گویائے ما خاموش شد۔ میں درد اور ہموم کے سر یعنی د + ھ = ۹ جمع کرنے سے نکلتی ہے۔

ڈاکٹر ہادی حسن کی قبر کے ساتھ ہی ان کی رفیقۂ حیات محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ
قطعۂ تاریخِ وفات
بیگم کشور ہادی حسن

زوجہ پروفیسر ہادی حسن

چو کشور بیگم آن بانوی حادی
ازین دارِ فنا بشود رحلت
ضیاء از بہر تاریخ وفاتش
بگو : زیبا مقامش باغ جنت

۱۹۵۶ء

ان اشعار سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ قطعۂ تاریخ مولانا ضیاء احمد بدایونی کا کہا ہوا ہے۔

ڈاکٹر ہادی حسن کی قبر سے اندازاً سات گز جانبِ شمال اُردو کے مایۂ ناز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی کی قبر ہے۔ ان کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی

پروفیسر رشید احمد صدیقی

پیدائش ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء

وفات ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی قبر سے قریب ہی قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی کی قبر ہے۔ ان کی قیام گاہ علی گڑھ میں "اللہ والی کوٹھی" کے نام سے موسوم ہے۔ قاضی صاحب نے اپریل ۱۹۲۰ء میں تقسیم ہند کا تصور پیش کیا تھا۔ موصوف چونکہ سرکاری ملازم تھے اس لئے اُنہوں نے اپنے بھائی عبدالقدیر بلگرامی کے نام سے بدایوں کے اخبار ذُوالقرنین میں "ایک کھلی چٹھی گاندھی کے نام" کے عنوان سے تقسیم ہند کا فارمولا پیش کیا تھا۔ یہ خط رسالہ کی صورت میں دو بار طبع ہو چکا ہے۔ قاضی صاحب کی قبر پر جو لوح نصب ہے، اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

ہُوالباقی

الحاج قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی

از منشی محمد ظہیر الدین ظہیر بلگرامی

شکوہ دارم بگوشت چو زسانم ای عزیز
الوداع از جنسیاں لبتیک با رُوحانیاں
از طفولیت چو جسم و جان مَن و تو ماندہ ایم
صبر چون آید کنوں من بر زمین تو باسمان
سالِ فوتش چون بنظم آرم کہ دل بشکستہ ام
خامہ ہم دارد جگر شق و ز صریرش نوحہ خوان
صُوری و ہم مَعنوی تاریخ آوردہ ظہیر
از برای کتبۂ لوحِ مزارش اَرمغاں
از سرِ ابجد شمر اعداد سالِ رحلتش
یک ہزار و سہ صد و ہفتاد و دو ہجری رواں

۱۳۷۲ھ

ولادت ۱۸۸۲ء۔ تاریخ وفات ۳۱ جولائی ۱۹۵۳ء

قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی کی قبر سے جانبِ مشرق چند قدم کے فاصلے پر مشہور افسانہ نویس و ناول نگار سلطان حیدر جوش کی قبر ہے۔ ان کے ناول "ابنِ مُسلم" نے بڑی شہرت پائی ہے۔ ان کی قبر پر جو لوح نصب ہے، اس پر یہ مختصر سی عبارت مرقوم ہے۔

۷۸۶

یا غفار

اناللہ و انا الیہ راجعون

سلطان حیدر جوش

(ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر)

موصوف ۱۷ مئی ۱۹۵۳ء کو فوت ہوئے تھے۔ لیکن یہ تاریخ کتبے پر درج نہیں ہے۔

اسی قبرستان کے شمالی خطہ میں خورشید لقا۔ بیگم بنتِ نواب رضا علی خان والیٔ رام پور زوجہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی سابق صدر شعبۂ تاریخ کی قبر ہے۔ بیگم صاحب کو

موسیقی کا ذوق اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ اُنہوں نے عہدِ فیروز شاہ تغلق کی فن موسیقی پر ایک کتاب غُنیۃُ المنیۃ کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کی قبر کے کتبے پر یہ عبارت درج ہے:

خورشید لقاء بیگم

ولادت ۲۰ اپریل ۱۹۳۲ء، وفات ۱۹ جون ۱۹۹۷ء

قبرستان کے شمالی حصے میں ایک چار دیواری کے اندر چند قبریں نظر آتی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں قبر مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم کی ہے۔ مولانا شعبۂ دینیات کے سربراہ تھے اور میلاد خوانی کی محفلوں میں خاص طور پر مدعو کئے جاتے تھے۔ ان کے بارے میں فیکلٹی آف تھیالوجی کے ترجمان " مجلۂ علوم الدین " میں پروفیسر حمید الدین مرحوم کا ایک دلچسپ مضمون طبع ہوا ہے۔ مولانا کو دوپہر کے وقت سونے کی عادت تھی۔ ایک دن کوئی اجنبی ان سے دوپہر کے وقت ملنے آیا۔ مولانا نے اسے دروازے ہی سے چلتا کیا۔ اس نے جاتے وقت کہا، " آپ کا اخلاق تو آج دیکھ لیا، علم پھر کبھی دیکھ لیں گے "۔ مولانا یہ واقعہ خود مزے لے لے کر اپنے احباب کو سنایا کرتے تھے۔ موصوف کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

مرقد

" مولانا سید سلیمان اشرف بہاری نظامی فخری میر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی

تاریخ رحلت ۵ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ روز چہار شنبہ

سلیمان اشرف سرِ اہلِ تقوے
بہ علم و عمل والہ دینِ اشرف
چو نقش شنید آیۂ ارجعی را
بہ جنت شد از قربتِ حق مشرف
سنش ہم دلِ پاک حسرت نوشتہ
" بہ جناتِ عدن سلیمان اشرف "

۱۳۵۷ھ ــــ ۱۳۵۸ھ

از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی المتخلص بہ حسرت

" بہ جناتِ عدن سلیمان اشرف " سے ۱۳۵۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ان کا سالِ وفات ۱۳۵۸ھ ہے۔ ماہرین فنِ تاریخ نے ایک عدد کی رعایت دی ہے۔

مولانا سلیمان اشرف کے مزار سے قبرستان کے وسطی قطعے کی طرف آئیں تو ساتھ ساتھ دو قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک قبر خان بہادر ڈپٹی حبیب اللہ خاں کی ہے اور دوسری قبر میر ولایت حسین کی۔ زندگی میں بھی ان کی دوستی مثالی تھی اور مرنے کے بعد بھی ساتھ نہ چھوٹا۔ ڈپٹی حبیب اللہ نے اپنی کوٹھی کا نام اپنے دوست کے نام کی رعایت سے "ولایت منزل" رکھا اور میر صاحب نے اپنے گھر کا نام "حبیب منزل" تجویز کیا۔ اسی "ولایت منزل" میں بیٹھ کر سید طفیل احمد منگوری نے " مسلمانوں کا روشن مستقبل " لکھی تھی۔

میر ولایت حسین کی قبر کے کتبے پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ

خان صاحب میر ولایت حسین بی۔اے

ساکنِ ریواڑی اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر و پراکٹر و سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مدرسۃ العلوم علی گڑھ

ولادت شعبان المعظم ۱۲۷۹ھ مطابق اگست ۱۸۶۲ء۔ وفات ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۴۸ھ مطابق ۸ جولائی ۱۹۲۹ء میر صاحب کی قبر سے قبلہ رُخ ڈپٹی صاحب کی قبر ہے اور ان کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت منقوش ہے:

۷۸۶

طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خٰلِدِيْنَ

مرقد

جناب الحاج ڈاکٹر خان بہادر مولوی محمد حبیب اللہ خاں صاحب مرحوم

بی اے، ایل ایل ڈی علیگ، ڈپٹی کلکٹر

کہ مدت العمر خدمتِ قوم و خدمتِ دانشگاہ اسلامیہ علی گڑھ را مطمحِ نظر خود شمردہ و بالآخر

بہ نود و چہار سالگی جان بہ جان آفریں سپردہ

قطعۂ تاریخ از ضیاء احمد بدایونی

زِ گیتی جناب حبیب الہ

چو شد جادہ پیمائے ملکِ عدم

پی جُست سالِ وفاتش ضیاء

خرد گفت "مہمانِ باغِ ارم"

مقام و تاریخِ ولادت: شاہجہانپور ۹ رمضان المبارک ۱۲۸۴ھ - ۵ جنوری ۱۸۶۸ء

تاریخِ وفات - علی گڑھ ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۸۰ھ - ۱۳ مارچ ۱۹۶۱ء

ڈپٹی صاحب کی قبر سے جانبِ جنوب مغرب چند قدم کے فاصلے پر پروفیسر محمد حبیب، سابق صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات کی آخری آرام گاہ ہے۔ راقم نے انہیں لیکچر دیتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور بدر باغ میں ان کی رہائش گاہ پر بھی کئی بار اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ انہوں نے برِ عظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کے بارے میں جس اُسلوبِ نگارش و تحقیق کا آغاز کیا تھا، وہ اب باقاعدہ ایک مکتبِ فکر بن گیا ہے اور تاریخ دان اسے "حبیب سکول آف ہسٹری" کہنے لگے ہیں۔ ان کی قبر کا کتبہ بڑا سادہ ہے اور اس پر صرف یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

محمد حبیب

۱۸۹۵ء ۱۹۷۱ء

بعد از وفات تربتِ ما در زمین مجو

در سینہائے مردمِ عارف مقامِ ماست

اس قبرستان کے جنوب مشرقی حصے میں پروفیسر حمید الدین خاں کی قبر ہے اور ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

اللہ اکبر

الحاج پروفیسر محمد حمید الدین خان

نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ

مفکّر و مُفسّر قرآنِ حکیم

بمقتضا آیۂ فرقانِ عظیم

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ

رہ نوردِ کوئے او مستقل رفت سوئے او

ولادت ۲۳ جولائی ۱۸۹۰ء وفات ۸ جولائی ۱۹۷۳ء

پروفیسر حمید الدین خان کی قبر کے سرہانے مولانا ضیاء احمد بدایونی کی قبر ہے۔ راقم کو ان سے شرفِ تلمذ ہے۔ ایک دن مرحوم ہماری کلاس کو فارسی پڑھا رہے تھے۔ دورانِ سبق انہوں نے ہم سے مخدرات کے معنی پوچھے۔ ساری کلاس خاموش رہی۔ میں نے عرض کیا کہ مخدرات عورتوں کو کہتے ہیں۔ اُستادِ گرامی نے دریافت فرمایا "کس لئے کہتے ہیں؟" میں خاموش ہو رہا تو انہوں نے فرمایا "مخدرات کے معنی ہیں چادروں میں لپٹی ہوئیں۔ اسی طرح مستورات کے معنی ہیں چھپی ہوئیں"۔ اس کے بعد حضرت مسکرائے اور فرمانے لگے "بھائی اب یہ الفاظ متروک ہو چکے ہیں۔ اب تو انہیں مکشوفات کہنا چاہیے"۔

ان کی قبر پر لوہے کی ایک تختی لگی ہوئی ہے۔ جس پر یہ عبارت مرقوم ہے:

مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ

مولانا ضیاء احمد بدایونی

وفات ۸ جولائی ۱۹۷۳ء

قبرستان کے وسطی حصے میں پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب کے والدِ بزرگوار محو خوابِ ابدی ہیں۔ ان کی قبر پر جو لوح نصب ہے۔ اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

تاریخ وفات

جناب ڈاکٹر شیخ عبدالکریم صاحب مرحوم و مغفور

پدرِ بزرگوار شیخ عبدالرشید صاحب مُسلم یُونیورسٹی علی گڑھ

وا دریغا چو ڈاکٹر صاحب

از قضا یافت جرعۂ رحلت

حیف صد حیف منتشر گشتند

جملہ اوراقِ نسخۂ صحت

ہیچ نآید ز تجربات بکار
پیش اندک نرفت از حکمت
فکرِ تاریخ چون تمنا کرد
مُلہم غیب از در رحمت
گفت تاریخِ رحلتش کہ برفت
"شیخ عبدالکریم در جنّت"

۱۳۲۳ھ

میر ولایت حسین کی قبر سے اندازاً ۲۵ گز جانب جنوب مشرق پروفیسر بی۔اے۔ خان مرحوم کی قبر ہے، ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے:

۷۸٦
پروفیسر بی اے خان
سابق صدر شعبۂ انگریزی
تاریخ ولادت ۸ فروری ۱۹۰۳ء تاریخِ وفات ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء

علی گڑھ شہر کا قبرستان، قبرستانِ شاہ جمالؒ کے نام سے مشہور ہے۔ اس قبرستان میں گذشتہ صدی کے ایک نامور عالم دین مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ مدفون ہیں۔ مولانا کا اصل وطن ضلع علی گڑھ میں پلکنہ نام کا ایک گاؤں ہے۔ اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ دراصل یہ فیل خانہ تھا اور بگڑتے بگڑتے پلکنہ ہو گیا۔ گزشتہ صدی کے نامور علماء کو مولانا لطف اللہ سے تلمذ تھا اور موصوف جامع مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔

مولانا لطف اللہ کی قبر ایک چار دیواری کے اندر ہے اور اس پر جو کتبہ نصب ہے، اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸٦
تاریخِ وفات
چوں مولانا لطف اللہ بُودہ اُستاذ العلماء
حسرتؔ سالِ وفاتِ شان ۰ اُستاذ العلماء ۰ گفتا
۱۳۳۵ھ

یکے از تلامذہ محمد حبیب الرحمٰن خان حسرتؔ

مولانا لطف اللہ کی قبر سے جانب مشرق دو ڈھائی میٹر کے فاصلے پر ان کے پوتے مفتی حفیظ اللہ کی قبر ہے۔ ان کی تاریخِ وفات کسی نے یوں کہی ہے:

موت کے ہاتھوں سے احمدؔ بے سر و پا ہو گئے
فضل و دین رُشد و ہنر جود و عطا رحم و کرم
۱۳۸۳ھ

اس میں احمدؔ نے مومنؔ کا تتبع کیا ہے۔ مومنؔ نے شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات پر یہ تاریخ کہی تھی:

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دین، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عدل

یہ قطعۂ تاریخ اتنا مقبول ہوا کہ بہت سے شاعروں نے اس کا تتبع کیا، جن میں سے ایک مفتی حفیظ اللہ کے تاریخ گو احمدؔ بھی ہیں۔

مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ کے قدموں میں، چار دیواری سے باہر، نواب صدر یار جنگ بہادر کی بہو اور مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی، آنریری ٹریژرر مسلم یونیورسٹی کی رفیقۂ حیات محو خواب ابدی ہیں۔

نینی تال، الموڑہ، رانی کھیت

ایک بار راقم الحروف کو جولائی کے اوائل میں علی گڑھ جانے کا موقعہ ملا۔ لاہور میں اس سال شدت کی گرمی پڑی تھی۔ راقم مئی اور جون کی گرمی لاہور میں برداشت کرکے علی گڑھ گیا تو مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے فرمایا کہ چند روز کے لئے پہاڑ پر ہو آؤ۔ میں اپنے اہل و عیال سمیت نینی تال جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ مولانا اکبر آبادی نے ہمارے لئے علی گڑھ سے بریلی تک ٹرین میں ریزرویشن کروا دی۔ ہم رات کو عشاء کے وقت علی گڑھ سے چل کر نصف شب کے قریب بریلی پہنچے۔ وہاں سے ہم نے ٹرین تبدیل کرنا تھا اور بڑی لائن کی بجائے چھوٹی لائن پر سفر کرنا تھا۔ بریلی سے کاٹھ گودام جانے والی ٹرین کی سلیپر کوچ پلیٹ فارم پر لگی ہوئی تھی۔ ہم اس میں سوار ہو کر سو گئے۔ یہ ٹرین نمازِ فجر سے قبل بریلی سے چل کر صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ ہلدوانی منڈی پہنچی۔ ٹرین کے بیشتر مسافر وہیں اتر گئے۔ ہمارے پاس کاٹھ گودام کے ٹکٹ تھے لیکن مسافروں کے مشورے پر ہم ہلدوانی منڈی اتر گئے۔

ہلدوانی منڈی دامن کوہ میں ایک سرسبز قصبہ ہے۔ وہاں میرے ایک کرم فرما لعل بادشاہ فاروقی رہتے ہیں جو ایک درگاہ کے سجادہ نشین ہیں۔ ان کا نسبی تعلق حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ سے ہے۔ ہم سالہا سال تک سرہند شریف میں حضرت مجدد کے عرس کے موقع پر ملتے رہے ہیں اور ہماری خط و کتابت بھی رہی ہے۔ انہوں نے راقم کو بتایا کہ جب ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا تو ہلدوانی کے نواح میں کسی پراجیکٹ پر کام ہو رہا تھا اور چار صد کے قریب پٹھان وہاں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے وہیں رہنے کا عزم کر لیا۔ وہ سب ان کے عقیدتمند تھے۔ راقم چونکہ اہلیہ اور بچوں کے ساتھ وہاں پہنچا تھا اس لئے فاروقی صاحب سے ملنے کے لئے نہ جا سکا۔

ہلدوانی منڈی سے نینی تال ۲۷ میل ہے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان بڑی اچھی ٹیکسی سروس ہے۔ ہمیں ہلدوانی منڈی سے ٹیکسی مل گئی۔ یہ ۲۷ میل کا راستہ

درختوں کی کثرت کی بنا پر سبز سرنگ بنا ہوا تھا۔ فرلانگ دو فرلانگ کے بعد ایک آبشار ملتی تھی جس کا پانی سڑک کے اوپر سے گزرتا تھا۔ راستے میں کئی جگہ LAND SLIDE بھی ملی۔ ایک دو جگہ ہمیں رکنا بھی پڑا۔ جب بیلداروں نے راستہ صاف کیا تو ہم آگے بڑھے۔

نینی تال کے بس اسٹینڈ پر ہوٹلوں کے گماشتے موجود رہتے ہیں۔ ہمیں وہاں درجۂ اوّل کے ایک ہوٹل میں، جو ایورسٹ ہوٹل کے نام سے موسوم تھا، ایسی جگہ مل گئی جس کے آگے برآمدہ تھا۔ برآمدے کے بعد ڈرائنگ روم، اس کے بعد بیڈ روم اور اس کے بعد باتھ روم تھا۔ ایسی جگہ مری میں دو ہزار روپے یومیہ سے کم پر نہ ملتی۔ ہم ایک روز ان کمروں میں ٹھہرے۔ یہ ہوٹل پانچ منزلہ تھا۔ اوپر والی منزل میں بھی جگہ خالی تھی۔ وہاں سے باہر کا منظر بھی اچھا تھا۔ اس لئے ہم دوسرے روز بالائی منزل میں منتقل ہو گئے۔ ہمارے کمروں کی کھڑکیاں جھیل کی طرف کھلتی تھیں، اس لئے وہاں رہنے کا لطف دوبالا ہو گیا۔

نینی تال سطح سمندر سے ساڑھے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ شہر ہی سے قریب ایک جگہ دس ہزار فٹ بلند ہے اور سیاح وہاں تک ڈانڈیوں میں بیٹھ کر جاتے ہیں۔ ان ڈانڈیوں کو کہار اپنے کاندھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ ہوٹل کے عقب میں ہمالیہ کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ بعض لوگوں نے ہمیں بتایا کہ صاف موسم میں وہاں سے ماؤنٹ ایورسٹ نظر آ جاتی ہے۔ ہوٹل کے سامنے ایک جھیل ہے جو سوا میل لمبی، نصف میل چوڑی اور نوے فٹ گہری ہے۔ یہ جھیل آنکھ کی شکل کی ہے اس لئے نینی تال کہلاتی ہے۔

(ہندوؤں کا یہ کہنا ہے کہ جب پاربتی فوت ہو گئی تو شوجی نے اس کا مرتک شریر (مردہ جسم) اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر ناچنا شروع کر دیا۔ شوجی نے اپنے ناچ سے پوری کائنات میں تہلکہ مچا دیا۔ ان حالات میں تمام دیوی دیوتاؤں نے شوجی کا ناچ بند کرانے کے لئے صلاح و مشورہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک پاربتی کا مرتک شریر اس کے ہاتھوں میں ہے، اس وقت تک اسے ہٹانا مشکل ہے۔ اس پر تمام دیوی دیوتاؤں نے سوریہ دیوتا (سورج دیوتا) سے کہا کہ وہ شوجی کو ناچنے سے باز رکھنے میں ان

کی مدد کرے۔ سُوریہ دیوتا نے اس کی حامی بھر لی۔ جب سُوریہ دیوتا اپنے رَتھ میں سوار ہو کر پُورب سے پچھم کی جانب چلے تو انہوں نے اپنے رَتھ کا ایک پہیہ، جو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ گھوم رہا تھا، الگ کر دیا۔ یہ پہیہ جب پاربتی کے مرتک شریر کو لگا تو اس کے پرخچے اُڑ گئے۔ پاربتی کی آنکھ اس مقام پر گری جس سے یہ تال بن گیا۔

جھیل کے پار ایک سرسبز پہاڑ کی چوٹی پر راج بھون ہے جہاں موسم گرما میں اتر پردیش کا گورنر قیام کرتا ہے۔ ایورسٹ ہوٹل کے ساتھ دُور تک ہوٹلوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ ان سب ہوٹلوں کا رُخ جھیل کی طرف ہے۔ ہوٹلوں سے بازار کی جانب جانے کے لئے رکشا بھی مل جاتا ہے اور کشتی میں بیٹھ کر بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ جھیل میں بادبانی کشتیاں بھی رواں دواں رہتی ہیں۔ ایک رُوز میں نے ایک بڑا مضحکہ خیز منظر دیکھا۔ بارش ہو رہی تھی اور ایک بھکشو بڑے اطمینان کے ساتھ بادبانی کشتی میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کر رہا تھا۔

بازار میں بڑی اچھی دکانیں ہیں۔ ایک سندھی ہندو کی دکان سے راقم نے گرم چادر اور دُھسہ خریدے۔ اس کے پاس ایک شاہ توس دیکھی۔ اس نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ اسے اُوڑھ کر ہمالہ پر چڑھ جائیں تو سردی کا مطلق احساس نہ ہو۔ لوگوں نے گھروں کے برآمدوں میں بانس کی پوروں میں پھولدار پودے اُگا کر لٹکائے ہوئے تھے۔ جھیل کے ایک سرے پر سنیما ہاؤس تھا اور اس کے باہر کھانے پینے کی چیزیں فروخت ہو رہی تھیں۔ وہاں سیاحوں کا اژدھام تھا۔ وہ گول گپے اور دہی بڑے بہت شوق کے ساتھ کھا رہے تھے۔

نینی تال میں دن میں کئی بار مُوسلادھار بارش ہوتی ہے۔ نیچے وادی سے بادل اوپر اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور چند منٹوں میں نینی تال پر چھا کر برسنے لگتا ہے۔ رکشوں کے باہر پردے لگائے ہوئے ہیں تاکہ سواریاں بھیگنے سے محفوظ رہیں۔ دو ہوٹلوں کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ چھوڑا ہوا تھا۔ پہاڑ کی ڈھلان سے پانی بڑی تیز رفتاری کے ساتھ شور کرتے ہوئے نیچے کی جانب آتا ہے اور جھیل میں جا گرتا ہے۔ اگر یہ فاصلہ نہ چھوڑا جاتا تو پانی کا تیز دھارا ہوٹلوں کو ہی بہالے جاتا۔

ہم پانچ رُوز نینی تال میں رہے۔ چھٹے روز صبح ناشتے سے فارغ ہو کر ہم الموڑہ روانہ ہوئے۔ راستہ اتنا پُر پیچ تھا کہ اکثر مسافروں کو قے ہونے لگی۔ میں بھی بہت تنگ ہوا۔ سو سوا سو میٹر کے بعد موڑ آجاتا۔ راستے میں کئی جگہ LAND SLIDE ہو چکی تھی۔ ایک جگہ ہمیں گھنٹہ بھر رُکنا پڑا۔ جب بیلداروں نے ٹریکٹر کی مدد سے راستہ صاف کیا تو بس آگے چلی۔ پُورے راستے میں بارش تھی۔ ہم خدا خدا کر کے الموڑہ پہنچے۔

الموڑہ ایک خاموش جگہ ہے۔ پہاڑ کی ڈھلان پر رہائشی مکان بنے ہوئے ہیں جہاں لوگ پُورا سیزن گزارتے ہیں۔ ایک مسطح جگہ پر بہت بڑا گرجا بنا ہوا ہے۔ میں کیمبرج میں ایک انگریز خاتون MISS FEW کا کرایہ دار تھا۔ وہ تیس برس تک الموڑہ میں مشنری کی حیثیت سے گزار چکی تھی۔ میں نے اس سے الموڑہ کا ذکر سُنا ہوا تھا۔ اب اسے دیکھنے کا موقع ملا۔

گرجا گھر سے قریب ہی ایک دو منزلہ ہوٹل تھا جو صرف لکڑی سے تعمیر ہوا تھا۔ اس کا مالک ایک سکھ تھا۔ الموڑہ میں یہی ایک ہوٹل تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بڑی وحشت ہوئی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ مجھے کوئی ٹیکسی مل جائے اور میں رانی کھیت چلا جاؤں لیکن اتنی چھوٹی سی جگہ میں ٹیکسی نہ مل سکی۔ میں نے رات اسی ہوٹل میں گزاری۔ رات کے وقت مکانوں کی بتیاں جگنوؤں کی مانند ٹمٹما رہی تھیں۔

الموڑہ اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ کماؤں کہلاتا ہے۔ MAN EATERS OF KAMAON ایک معروف کتاب ہے جسے نقی محمد خان خورجوی مرحوم (م ۱۹۷۹ء) نے شیروانی اور پاجامہ پہنا کر اُردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ سلطان محمد بن تغلق (م ۱۳۵۱ء) کے عہد میں اس کے باغی کماؤں اور گڑھوال کے علاقے میں پناہ لیا کرتے تھے۔ ایک بار اس نے بڑا بھاری لشکر ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ برسات کی کثرت اور مچھروں کی بہتات کی وجہ سے وہ پُورا لشکر تباہ ہو گیا۔ ہمارے زمانے میں نوابزادہ لیاقت علی خان نے ایک بار کماؤں کے حلقۂ انتخاب سے ہی اسمبلی کا الیکشن جیتا تھا۔ اس اعتبار سے یہ بڑا تاریخی علاقہ ہے۔ ایک زمانے میں یہ علاقہ بشمول نینی تال، نیپال کا حصّہ تھا۔ انگریزوں نے ایک جنگ کے بعد نیپال کے حکمران سے یہ علاقہ حاصل کر لیا۔

ہم نے رات بمشکل تمام الموڑہ میں گزاری اور اگلے رُوز ناشتہ کے بعد رانی کھیت روانہ ہوئے۔ ان دونوں جگہوں کے درمیان ۲۷ میل کا فاصلہ ہے۔ الموڑہ اور رانی کھیت

کے درمیان راستہ قدرے بہتر تھا۔ اس لئے سفر بڑا اچھا گزرا۔

رانی کھیت ایک خشک پہاڑ پر آباد ہے۔ یہیں مرغیوں کی ایک بیماری پر تحقیق کرکے اس کا علاج دریافت کیا گیا تھا۔ بنا بریں اس بیماری کا نام "رانی کھیت" پڑ گیا۔ یہاں فوجی چھاؤنی بھی ہے اس لئے دکانداروں کا کاروبار اچھا ہے۔ رانی کھیت میں سب سے بڑا سٹور اعجاز احمد کا ہے اور فوجی افسر وہیں خرید و فروخت کے لئے آتے ہیں۔ اسی کا ایک ہوٹل ہے جو "مُون ہوٹل" کے نام سے موسوم ہے۔ یہی رانی کھیت کا سب سے بڑا ہوٹل ہے۔ ہم اسی ہوٹل میں اُترے۔ جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو بیرے نے کہا کہ بستروں کا کرایہ الگ ہو گا۔ مجھے یہ بات سن کر بڑی کوفت ہوئی کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کمرے کا کرایہ الگ ہو اور بستر کا الگ۔ ہم نے اسی وقت وہ ہوٹل چھوڑ دیا۔ اس سے قریب ہی ایک دُو منزلہ ہوٹل تھا جو ایک مسلمان کی ملک تھا۔ مالک کی وفات کے بعد اس کی بیوہ نے وہ ہوٹل ایک ہندو کو کرائے پر دے دیا اور مالکہ نے اس کے عقبی حصے میں رہائش اختیار کرلی۔ ہوٹل کی ہندو انتظامیہ بڑے تپاک کے ساتھ پیش آئی اور انہوں نے ہمیں اُوپر کی منزل میں کمرہ دے دیا۔ ہم اس ہوٹل کے برآمدے میں بیٹھ کر پُوری وادی کا نظارہ کرتے رہے۔

ہوٹل میں شیرجی نام کا ایک نیپالی لڑکا تھا۔ انتظامیہ نے اسے ہماری خدمت کے لئے مختص کر دیا۔ وُہی ہمیں ناشتہ لاکر دیتا، بازار سے اشیائے ضرورت لا دیتا اور بچوں کے لئے دُودھ اور شام کو چائے کے وقت پکوڑے بنا دیتا۔ انتظامیہ نے ہمیں گھر جیسا ماحول فراہم کیا۔ اس وقت مجھے مُون ہوٹل کی انتظامیہ کی بدمعاملگی کا احساس ہوا۔ مسلمان واقعی بزنس نہیں کر سکتا، ہندو کو بزنس کرنا آتا ہے۔

رانی کھیت میں مسلمان دکاندار بھی تھے جو میرے بچوں سے بڑی محبت کے ساتھ پیش آتے۔ ایک مسجد بھی ہوٹل سے قریب تھی جہاں نماز کے وقت چند مسلمان جمع ہو جاتے۔ رانی کھیت سے قریب ہی ایک جگہ چوبٹیا کے نام سے موسوم ہے وہاں بڑا اچھا باغ ہے۔ مُسلم یُونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے سٹاف کے لئے وہاں چند بنگلے خریدے ہوئے ہیں جہاں موسمِ گرما میں سٹاف ممبران قیام کرتے ہیں۔

رانی کھیت ایک پُرسکون جگہ ہے لیکن نینی تال کا جواب نہیں ہے۔ رانی کھیت

میں پہاڑ، جھیل اور سبزہ ہے۔ اس کے مقابلے میں نینی تال خشک جگہ ہے۔

رانی کھیت سے ۲۷ میل کے فاصلے پر نینی تال ہے۔ نینی تال، الموڑہ اور رانی کھیت مل کر ایک مثلث بناتے ہیں، رانی کھیت سے ہم نینی تال آئے اور وہاں سے ہمیں رام پُور جانے والی بس مل گئی۔ ہم پنت نگر اور ہلدوانی منڈی ہوتے ہوئے رام پُور پہنچ گئے۔ رام پُور سے ہمیں بریلی جانے والی کوچ مل گئی۔ بریلی سے ہم ٹرین میں سوار ہو کر چندوسی ہوتے ہوئے علی گڑھ پہنچ گئے۔ اب بھی جب کبھی نینی تال کا خیال آتا ہے تو دل میں ہُوک سی اٹھتی ہے۔ اب میں شاید عمر بھر وہاں نہ جا سکوں۔

پھلّور

سلام علیٰ نجد و مَن حَل بالنجد

راقم کا آبائی وطن پھلّور دریائے ستلج کے کنارے آباد ہے۔ وہاں سے لدھیانہ کا فاصلہ نو میل اور پھگواڑہ کا فاصلہ چودہ میل ہے۔ پھلّور ضلع جالندھر کا آخری قصبہ ہے اور دریائے ستلج ضلع لدھیانہ اور جالندھر کی سرحد کا کام دیتا ہے۔ ضلع جالندھر کی چار تحصیلیں تھیں: جالندھر، نکودر، نواں شہر اور پھلّور۔ ریاست کپورتھلہ اس ضلع میں گھری ہوئی تھی۔

قیام پاکستان سے قبل پھلّور کی آبادی آٹھ نو ہزار کے لگ بھگ تھی۔ آزادی کے بعد پھلّور کی آبادی بڑھنے کی بجائے گھٹی ہے اور یہ با رونق قصبہ جس کے بازاروں میں دن کے وقت کندھے سے کندھا چھلتا تھا، اب ویران ہو گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لدھیانہ پھیل کر دریائے ستلج تک پہنچ گیا ہے اس لئے پھلّور کے باشندے خرید و فروخت اور کام کاج کے لئے لدھیانہ چلے جاتے ہیں۔ دوسری جانب پھگواڑہ بہت پھیل گیا ہے اور وہاں گرم کپڑا بننے کے کارخانے لگ گئے ہیں۔ Phagwara Suiting نے کپڑے کی منڈیوں میں اپنے لئے جگہ بنا لی ہے۔ پھگواڑہ میں سکھوں نے رام گڑھیہ کالج تعمیر کر لیا ہے جہاں پھلّور تک سے طلبہ پڑھنے کے لئے جاتے ہیں۔

پھلّور کے نواح میں تلونڈی اور اَپرہ نام کے دو بڑے قصبے ہیں۔ مشہور ادیب ابن انشاء (م ۱۹۷۸ء) تلونڈی کے رہنے والے تھے۔ اَپرہ ٹوکہ مشین بنانے کا پنجاب بھر میں سب سے قدیم اور بڑا مرکز تھا۔ پھلّور اور گورایا کے ریلوے اسٹیشنوں پر ٹوکہ مشینیں بڑی تعداد میں پڑی رہتی تھیں جو ریل کے ذریعے دوسرے شہروں کو بھیجی جاتی تھیں۔ پھلّور کے نواح میں دریا کے کنارے پر ایک قصبہ "نگر" کے نام سے مشہور ہے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ اس کا اصل نام پھولا نگری تھا اور ایک زمانے میں پھلّور اور نگر

آپس میں ملے ہوئے تھے بعد میں یہ الگ ہو گئے۔ م۔ش (میاں محمد شفیع) کے سسر میاں ہدایت علی ثاقب نگر کے رہنے والے تھے۔ اسی طرح پھلّور کے نواح میں دریا سے قریب ایک گاؤں مَئو کہلاتا تھا۔ وہاں سکھوں کا ایک بڑا گوردوارہ تھا۔ سکھوں کی روایت کے مطابق گورو ارجن دیو (۱۶۰۶ء۔۱۵۶۳ء) کی بیوی گنگا مَئو کی رہنے والی تھی۔ گورو ارجن دیو اپنی جوانی میں اسے بیاہنے آیا تو گنگا کے رشتہ داروں نے کہا کہ شادی کی رسومات انجام دینے سے قبل ارجن دیو گھوڑے پر سوار ہو کر ایک نیزہ اپنے ہاتھ میں تھام کر گھوڑا دوڑائے اور زمین میں گڑا ہوا ایک کھونٹا اکھاڑے۔ اس موقع پر کسی سمجھدار شخص نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ کھونٹا اکھڑوانے کی بجائے گڑوا لیں، لیکن وہ نہ مانے۔ گورو ارجن نے ایسا کھونٹا اکھاڑا کہ گاؤں کی وہ رونق دوبارہ بحال نہ ہو سکی۔ گورو ارجن کی مَئو میں آمد کی خوشی میں وہاں ایک گوردوارہ تعمیر کیا گیا ہے۔

پھلّور کے نواح میں ایک جانب تو مسلمانوں کے بڑے بڑے گاؤں تھے اور دوسری جانب سکھوں کے۔ بڑا پنڈ، رُڑکا، گھڑکا اور گورایا سکھوں کے بڑے گاؤں تھے۔ ان میں سے ایک ایک گاؤں دس ہزار تک افراد باہر لا سکتا تھا۔ پھلّور میں دریائے ستلج پر بیساکھی کا بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ اس میلے میں پھلّور کے ہندوؤں کے علاوہ نزدیکی دیہات سے ہزاروں کی تعداد میں سکھ نشے میں چُور ہو کر "بولیاں" بولتے ہوئے دریا میں اشنان کے لئے آتے۔ ہر سال دو تین افراد گہرے پانی میں ڈوب کر ہلاک ہو جاتے تھے۔ دریا کے کنارے پر گوجروں کے بڑے بڑے گاؤں تھے۔ وہ رَسہ گیری کرتے تھے اور کبھی کبھار اکیلے دوکیلے مسافر کو بھی لوٹ لیتے تھے۔ ان کی عورتیں عموماً گھی لا کر شہر میں فروخت کیا کرتی تھیں۔ وہ گھی بیچ کر جو پیسے کماتیں ان کا سَودا سلف خرید کر لے جاتیں۔

شہر کے اندر مسلمانوں اور ہندوؤں کے محلّے الگ الگ تھے۔ اکا دکا ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے محلّے میں بھی آباد تھے۔ شہر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مسلمانوں میں سب سے زیادہ آبادی ارائیوں کی تھی۔ ایک محلّے میں نارُو اور شیخ راجپوت رہتے تھے۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر جالندھر میں مرقوم ہے کہ سکھوں کے عروج سے قبل نارُو راجپوت شہر کے گرد و نواح کی قابل کاشت اراضی کے مالک تھے۔ ان کے زوال کے بعد

ارائیں زمینوں کے مالک بن گئے۔ راجپوتوں کا محلہ الگ تھلگ تھا۔ ان کی مسجد بھی جدا تھی اور قبرستان بھی الگ تھا۔ ارائیوں کے ساتھ راجپوتوں کی زمینوں کے بارے میں عموماً مقدمے بازی رہتی تھی۔

پھلور میں ارائیوں کے بہت سے محلّے تھے۔ شہر کا مین بازار شہر کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا تھا۔ مشرقی حصہ پھلور کہلاتا تھا اور مغربی حصہ شیخ ذرہ کے نام سے موسوم تھا۔ عام بول چال میں اسے پتندیرہ کہتے تھے۔ راقم بھی اسی حصّۂ شہر کا رہنے والا تھا۔ شہر کے بازار اسی حصّے میں تھے۔ ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی نیا بازار شروع ہو جاتا تھا جو خالصتاً ہندوؤں کا بازار تھا۔ جہاں یہ بازار ختم ہوتا تھا وہاں سے قصائیوں کا بازار شروع ہو جاتا تھا۔ اس سے اگلا بازار قبوتی دروازے کا بازار تھا اور یہ مین بازار سے جا ملتا تھا۔ مین بازار میں مسلمانوں کی بھی بہت سی دکانیں تھیں۔ دکانداروں میں گگے زئی شیخ اور خوجے شامل تھے۔ اس بازار میں کپڑے کی واحد دکان ہماری تھی اور باقی کپڑے کی دکانیں ہندوؤں اور سکھوں کی تھیں۔ مسلمانوں میں میرے چچا محمد شفیع اور محمد اقبال، مسلم لیگ کے رُوحِ رواں تھے۔ ہندو کپڑا فروشوں میں لالہ ایشر داس پھلور کانگرس کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ جواہر لعل نہرو جیسی واسکٹ اور ٹوپی پہنتے تھے۔ میں نے اُنہیں نیوکاسل (برطانیہ) میں بھی اسی لباس میں گھومتے پھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ صرّاف تمام کے تمام ہندو تھے۔ اسی طرح حلوائی بھی ہندو ہی تھے۔ ان حلوائیوں میں لالہ دولت رام بڑا ماہر حلوائی تھا۔ آخری عمر میں وہ پھلور کی سکونت ترک کرکے نیوکاسل میں آباد ہو گیا تھا۔ جہاں راقم نے اس سے چند مٹھائیاں بنانی سیکھیں۔ لالہ دولت رام، نرائن حلوائی کا شاگرد تھا اور نرائن نے یہ فن کُندن حلوائی سے سیکھا تھا۔ لالہ دولت رام دعوے کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ ایک سیر سوجی کا آٹھ سیر حلوہ بناتا ہے، کوئی اس کے دعوے کو چیلنج کرے تو وہ دیکھے گا۔ شہر کے تمام باشندے بلاتمیز مذہب و ملّت دولت رام سے مٹھائی خریدا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ تراویح میں ختمِ قرآن کی محافل میں بھی اسی کی بنائی ہوئی مٹھائی تقسیم کی جاتی تھی۔ اسی طرح ایک ہندو بھڑبھونجا تکوں میں پڑھنے کے لئے چنے بھون کر دیا کرتا تھا۔

ہندو صرّافوں میں لالہ بھاگ مل سرِفہرست تھا۔ مسلمانوں کا زیادہ تر کام وہی کیا

کرتا تھا۔ مُسلمان عموماً میرے جدِ امجد حاجی عمر الدین مرحوم کی معرفت بھاگ مل سے زیورات بنوایا کرتے تھے۔ میرے دادا دن میں ایک بار اس کے پاس جا کر گھنٹہ بھر بیٹھا کرتے تھے۔

لالہ بھاگ مل کو جس دن گوشت کھانے کی خواہش ہوتی وہ میرے دادا مرحوم کو ایک کپڑا اور پیسے دے دیتا۔ میرے دادا بلو قصائی کے ہاں سے گوشت خریدتے اور اسے کپڑے میں لپیٹ کر لاتے۔ راستے میں بھاگ مل کسی جگہ ان کے انتظار میں کھڑا ہوتا۔ میرے دادا مرحوم اس کے پاس سے گذرتے اور چپکے سے وہ کپڑا اسے تھما دیتے۔ اگر وہ خود قصائی کے ہاں سے گوشت خریدتا تو اس کی ذات برادری کے لوگوں کو پتہ چل جاتا کہ وہ "ماس" کھاتا ہے۔ اس کا بیٹا پریم چند، میرے والدِ مرحوم کا بڑا اچھا دوست تھا۔ افسوس کہ چند سال قبل پھلور سے چنڈی گڑھ جاتے ہوئے وہ کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا۔

ہندو ڈاکٹروں میں ڈاکٹر بھولا رام، اس کا بیٹا برہم دت، ڈاکٹر شوچرنداس، ڈاکٹر بلونت رائے، ڈاکٹر پھلوری رام، ڈاکٹر گھنڈا رام اور ڈاکٹر دیوی داس مشہور تھے۔ ڈاکٹر شوچرنداس ان سب میں زیادہ سمجھدار تھا اور وہ آپریشن بھی کر لیتا تھا۔ ڈاکٹر پھلوری رام ہمارا فیملی ڈاکٹر تھا۔ میری دادی مرحومہ کو اس پر بڑا اعتماد تھا۔ مُسلمان ڈاکٹروں میں ڈاکٹر عبدالحق نے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ لاہور چلے آئے اور یہاں انہوں نے نیا بازار ڈوگراں میں جج گھر الاٹ کروا لیا اور وہاں پریکٹس شروع کر دی۔ مُسلمانوں میں قدیم ترین ڈاکٹر، ڈاکٹر نبی بخش تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں انہیں دیکھا ہے۔ میں ابھی پرائمری جماعتوں میں پڑھتا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے ایک بیٹے فضل محمد (م ۱۹۶۳ء) نے حاذق الحکماء کی سند حاصل کر لی تھی۔ لیکن وہ دیسی ادویات کی بجائے ایلوپیتھی طریقِ علاج کے مطابق مریضوں کو دواء دیتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد فضل محمد جڑانوالہ چلے آئے اور یہاں انہوں نے کلینک کھول لیا۔ ان کے بڑے بھائی گُل محمد (م ۱۹۶۳ء) نے طب بھی نہیں پڑھی تھی لیکن والد اور بھائی کے ساتھ رہ کر انہیں اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ وہ بھی مریضوں کو دواء دے دیتے تھے۔ اب دونوں بھائی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور گُل محمد کا بیٹا حکیم ممتاز احمد ان کا کلینک سنبھالے ہوئے ہے۔

قیام پاکستان سے چند سال قبل لالہ جانکی داس پاسی کے بیٹے امیر چند نے وید کا کورس مکمل کرکے پھلور میں مطب کھول لیا تھا۔ وہ بڑا متعصب ہندو تھا اور مسلمانوں کی مخالفت میں ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر عبدالحق کے کلینک سے اگر قصائیوں کے بازار کی طرف چلیں تو دائیں ہاتھ گونگے نائی کی دکان تھی۔ وہ اپنے فن کا بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ میری حجامت وہی بنایا کرتا تھا۔ اس کی دکان سے قریب ہی غلام رسول نائی کی دکان تھی۔ یہ ۱۹۳۸ء / ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے بیشتر ممالک قبضۂ اغیار میں تھے۔ اس لئے برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں میں پان اسلام ازم کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ غلام رسول کی دکان پر نادر شاہ والئ افغانستان، اس کے فرزند محمد ظاہر شاہ، اتاترک کمال پاشا، عصمت انونو اور انور پاشا کی تصویریں فریموں میں لگی ہوئی تھیں۔ یہ سب فوجی وردیوں میں ملبوس سفید رنگ کے گھوڑوں پر سوار دکھائے گئے تھے۔ پس منظر میں کلمۂ طیبہ والا جھنڈا بھی تھا۔ بعد میں کسی مصور نے قائداعظم کی بھی ایسی ہی تصویر تیار کی۔ وہ بھی ان مشاہیر جیسی فوجی وردی میں ملبوس، لمبے سیاہ بوٹ پہنے ہوئے گھوڑے پر سوار دکھائے گئے تھے۔ برعظیم پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں نے انگریز حکمرانوں کا جاہ و جلال دیکھا تھا اس لئے ان کے دلوں میں آزاد ملکوں کے مسلمان سربراہوں کی بڑی قدر تھی۔ وہ ایسی تصویریں دیکھ کر خوش ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں نائیوں کی دکانوں پر یا تو ایسی ہی تصویریں ہوتیں یا وہ اس زمانے کی مقبول فلمی اداکاروں کی تصویریں آویزاں کرتے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جس روز اتاترک فوت ہوا میں پھلور میں تھا۔ اس روز غلام رسول اور اس کے ساتھی اس کی دکان سے کلمے والے جھنڈے لے کر نکلے۔ انہوں نے بازاروں میں ماتمی جلوس نکالا۔ اسی طرح یہ شخص میلادالنبی کے موقع پر جلوس نکالنے کا بڑا اہتمام کیا کرتا تھا۔ اس کا مقصد غیر مسلموں کو "عظمت اسلام" دکھا کر مرعوب کرنا تھا۔

شہر کے اندر ایک منڈی تھی جسے پرانی منڈی کہتے تھے۔ وہ بے آباد پڑی تھی۔ اس کی دکانوں میں دکانداروں نے گودام بنائے تھے یا صبح کے وقت سبزی کے آڑھتی وہاں اپنا کاروبار کر لیتے تھے۔ سیاسی جلسے عموماً اسی جگہ ہوا کرتے تھے۔ قیام پاکستان سے

سال سوا سال پہلے احراریوں نے یہاں جلسہ کیا اور دعوے کے ساتھ کہا کہ پاکستان قائم نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کو اس پر بڑا غصہ آیا۔ انہوں نے لاہور سے نوابزادہ رشید علی خان اور مولوی محمد بخش مسلم کو بلایا۔ پہلے ان کا شہر کے بازاروں میں جلوس نکالا پھر پرانی منڈی میں جلسہ کرکے پاکستان کے حق میں رائے عامہ ہموار کی۔

پرانی منڈی کے پاس ایک غیر آباد سرائے تھی جو کھنڈروں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ لالہ کیہر چند اور ان کے بھائیوں نے اسے خرید کر وہاں آریہ سماجی مندر تعمیر کیا۔ لالہ کیہر چند اور ان کے بھائیوں کا کلکتہ میں "دھیمان آئرن ورکس" کے نام سے کروڑوں روپے کا کاروبار تھا۔ وہ پھلور میں آریہ سماجیوں کے راہنما تھے۔ وہ پانچ بھائی تھے اور میرے دادا مرحوم کے بھی پانچ بیٹے تھے۔ اتفاق سے یہ پانچوں ایک دوسرے کے ہم عمر تھے اور ہم جماعت بھی۔ اس لئے ان کے ساتھ ہمارے بڑے خوشگوار مراسم تھے۔ راقم قیام پاکستان کے بعد دو بار پھلور گیا تو دونوں بار لالہ کیہر چند کے ہاں قیام کیا۔ کلکتے میں بھی مجھے ان کے بھائیوں کے پاس ہوڑہ میں بنارس روڈ پر قیام کرنے کا موقع ملا ہے۔

آریہ سماجی مندر کے بالمقابل ایک پرانا مسقف کنواں تھا۔ جس زمانے میں پرانی منڈی آباد تھی ان دنوں وہ کنواں مستعمل ہوگا۔ میرے بچپن میں کنوئیں میں پانی کی سطح پر کوڑا کرکٹ تیرتا ہوا نظر آتا تھا۔ قیام پاکستان سے چند ہفتے پہلے جب فرقہ وارانہ فضا خراب ہوئی تو ایک مسلمان نوجوان نے ہندوؤں اور سکھوں کا متوقع حملہ روکنے کے لئے چند بم تیار کئے۔ کسی "مسلمان" نے اس کی اطلاع پھلور کانگرس کے صدر لالہ ایشرداس کو کر دی۔ اس نے چند ذمہ دار مسلمانوں کو بلا کر کہا کہ یہ کام بڑا غلط ہوا ہے اس لئے وہ بم ضائع کر دیئے جائیں۔ اب یہ مسلمان بھی گھبرائے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ بم ضائع کرنے کے لئے لے جا رہا ہو اور لالہ جی پولیس کو اطلاع دے کر اسے پکڑوا دیں۔ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ لالہ جی کا ایک بیٹا اس بم باز کے ساتھ جائے اور ایک غیر جانب دار شخص فتح احراری کے سامنے ان بموں کا فیوز نکال کر انہیں اسی کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔ اس تجویز پر عمل ہوا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۷ء میں میری موجودگی میں خود فتح احراری نے منگل پورہ ریلوے اسٹیشن پر میرے چچا محمد شفیع کو سنایا تھا۔

آریہ سماجیوں کے مندر سے ایک گھاٹی شروع ہو جاتی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا

ہے کہ پھلور دریا کی سطح سے قدرے بلندی پر آباد تھا۔ اس گھاٹی کو "مرزیاں دی گھاٹی" کہتے تھے۔ وہاں مغلوں کے چند گھر تھے۔ وہ مرزا کہلاتے تھے۔ پھلور میں محرم کے موقع پر مرزے تعزیہ نکالا کرتے تھے۔ اسی طرح جہلم کے موقع پر بھی وہ تعزیہ نکالتے تھے۔ جہلم کے لئے چالیس دن کی شرط نہ تھی۔ جب بھی موقع ملتا، وہ تعزیہ نکال لیتے۔ کبھی کبھی محرم کو گزرے ہوئے دو یا اڑھائی ماہ بھی ہو جاتے تو جہلم منایا جاتا۔ محرم کے موقع پر ایک تعزیہ، جو سفید رنگ کا ہوتا تھا، مرزے نکالتے تھے۔ نائیوں کا تعزیہ سرخ رنگ کا ہوتا تھا اور ملاحوں کا تعزیہ سنہری رنگ کا۔ پھلور سے متصل تنگل اور رام گڑھ مسلمانوں کے دو گاؤں تھے۔ وہاں سے بھی دوپہر کے وقت دو تعزیئے پھلور آتے اور شہر سے باہر رکھ دیئے جاتے۔ شہر کے تینوں تعزیئے ملاحوں کے محلّے میں جمع ہوتے۔ دوسری جانب سے شام کے وقت تنگل اور رام گڑھ کے تعزیئے بھی وہاں پہنچ جاتے۔ غروب آفتاب سے چند منٹ قبل ان کی "ملنی" ہوتی۔ تعزیوں کے آگے چاندی کے پنجوں والے علم لگے ہوئے ہوتے تھے۔ "ملنی" کے وقت تعزیہ بردار آگے کو جھک جاتے اور پنجے کے ساتھ پنجہ لگ جاتا۔ اس وقت اتنا زور دار ماتم ہوتا کہ کئی عزادار بےہوش ہو جاتے اور لوگ انہیں اٹھا کر قریبی ریتلے میدان میں لٹا دیتے۔

محرم گزرنے کے بعد تعزیئے کے حصے علیحدہ کر دیئے جاتے۔ ان کی نیچے کی دو منزلیں کربلا میں رکھ دی جاتیں اور ان کی گمٹیاں مین بازار میں فتو جلد ساز کی دکان میں رکھوا دی جاتیں۔ جب محرم کے دن قریب آتے تو فتو جلد ساز ان کی مرمت کر لیتا۔ وہ جلد سازی کے علاوہ تعزیہ سازی کا بھی ماہر تھا۔ ملاحوں نے آئے دن کی مرمت سے تنگ آکر لکڑی کا تعزیہ بنوا لیا تھا۔ محمد حسین ملاح نے، جو لاہور میں درزی کا کام کرتا تھا، مجھے بتایا کہ اس زمانے میں اس پر سات سو روپے خرچ ہوئے تھے۔

جہاں "مرزیاں دی گھاٹی" ختم ہوتی تھی وہاں گلی کی سطح سے آٹھ نو فٹ بلند کرسی پر حکیم فقیر محمد کا گھر تھا۔ اینٹوں کی چنائی صرف گارے سے کی ہوئی تھی اور اس پر سیمنٹ کی لیپ بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنے بچپن میں ان کے بارے میں سنا تھا کہ وہ بڑے ماہر طبیب ہیں لیکن مطب نہیں کرتے۔ وہ کسی ریاست کے حکمران کے ذاتی معالج تھے۔ انہیں وہاں سے کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ان کا خاندان

ساہی وال چلا آیا جہاں ان کے ایک بیٹے مظفر حسین اپنے والد مرحوم کے نسخے استعمال کرکے عوام میں بڑے مقبول ہو گئے۔

پھلور کے ملاح مسلکاً شیعہ تھے۔ ان کا محلہ الگ تھلگ تھا اور ان کی مسجد بھی تھی لیکن اس مسجد میں اذان اور نماز سنیوں کے طریقے پر ہوتی تھیں۔ قیامِ پاکستان کے بہت بعد ہمیں یہ پتہ چلا کہ اثنا عشریوں کی اذان اور نماز ہم سے مختلف ہے۔ وہاں ایسی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ پھلور میں ملاحوں کے کافی گھر تھے۔ جب دریائے ستلج پر پُل تعمیر نہیں ہوا تھا تو وہ مسافروں کو کشتیوں میں بٹھا کر دریا پار کروا دیتے تھے۔ میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ ریل کا پُل ۱۹۰۱ء میں تعمیر ہوا تھا۔ اس سے قبل ریل کے مسافر پھلور میں اُتر جاتے اور کشتی کے ذریعے دریا عبور کرکے دوبارہ ریل میں بیٹھ جاتے۔ ۱۹۰۱ء سے قبل ریلوے کے حساب سے پھلور ایک اہم مقام تھا۔ ان دنوں وہاں انجن شیڈ بھی تھی جہاں انجن تیار کھڑے رہتے تھے۔ جب پُل تعمیر ہو گیا تو انجن شیڈ لدھیانہ منتقل ہو گئی۔ راقم کے پردادا پھلور کی انجن شیڈ میں ملازم تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۰۱ء میں طاعون کے مرض سے ہوا تو ان کی جگہ میرے دادا کو سولہ سال کی عمر میں ریلوے میں ملازمت مل گئی۔ میرے دادا نے اپنے والد سے انگریزی زبان سیکھی تھی اور سکول نہ جانے کے باوجود ان کی انگریزی اتنی اچھی تھی کہ لوگ ان سے انگریزی میں درخواستیں لکھوایا کرتے تھے۔ اسی انگریزی دانی کی وجہ سے انہیں ریلوے میں یورپین گریڈ میں ملازمت ملی۔ راقم نے اپنے بچپن میں دیکھا کہ ریلوے ہیڈ کوارٹر کے تمام بڑے بڑے انگریز افسران ان کا لحاظ کیا کرتے تھے اور یہ بلا تکلف انہیں ملنے چلے جاتے اور انگریز افسران ان کی سفارش رد نہیں کیا کرتے تھے۔ جب ۱۹۳۸ء میں وہ ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو انہیں حسنِ خدمت کا تمغہ ملا جس پر جارج ششم کی شبیہ بنی ہوئی تھی۔

پورے شہر میں میرے دادا اور چوہدری غلام بسم اللہ، دو افراد ایسے تھے جو انکم ٹیکس ادا کرتے تھے۔ یہی دونوں بزرگ مرکزی اسمبلی کے ووٹرز تھے۔ ہمارے حلقۂ انتخاب سے انبالہ کے غلام بھیک نیرنگ مرکزی اسمبلی کا الیکشن لڑا کرتے تھے۔ وہ الیکشن سے قبل پھلور آکر ان دونوں بزرگوں سے ملتے اور ووٹ دینے استدعا کرتے۔

چوہدری غلام بسم اللہ کا تعلق چوہدری خاندان سے تھا۔ جس وقت سکھ،

انگریزوں سے شکست کھا کر بھاگے تو پھلّور کے قلعے پر چوہدری غلام بسم اللہ کے مورثِ اعلیٰ قطب الدین نے قبضہ کر لیا ۔ جب انگریز پھلّور پہنچے تو قطب الدین نے قلعے کی چابیاں اُن کے سپرد کر دیں ۔ اس پر خوش ہو کر انگریزوں نے اسے ایک گاؤں عطا کیا جو اس کے نام پر قطبے وال مشہور ہوا ۔ اس گاؤں سے چوہدریوں کو کافی آمدنی ہو جاتی تھی، اس لئے مسلمانوں میں ان کا خاندان کھاتا پیتا گھرانہ مانا جاتا تھا ۔ ان کی اپنی مسجد تھی جو چوہدریوں کی مسجد کے نام سے موسوم تھی ۔ حکیم مولوی عبدالغنی مرحوم مدت تک وہاں خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ بعد ازاں کسی مسئلے پر ان کا چوہدریوں سے اختلاف ہو گیا تو مولوی صاحب نے اپنی الگ مسجد تعمیر کرلی ۔ موصوف بڑے کامیاب معالج تھے ۔ راقم ان کے زیر علاج رہ چکا ہے ۔ مولوی صاحب کا مطب چوہدریوں کی مسجد سے قریب تھا ۔ ان کی وفات کے بعد ان کا مطب ان کے فرزند ارجمند حکیم سعید احمد پھلّوری نے سنبھالا ۔ وہ طبیہ کالج دلی کے فارغ التحصیل تھے اور پھلّور میں مسلم لیگ کے رُوحِ رواں ۔ آزادی سے قبل جب ہندو ۔ مسلم تعلقات کشیدہ ہوئے تو حکیم صاحب رات کے وقت لٹھ بردار مسلمان نوجوانوں کے ساتھ گلیوں محلّوں میں پھر کر مسلمانوں کی حفاظت کیا کرتے تھے ۔ آزادی کے بعد موصوف لاہور چلے آئے اور یہاں انہوں نے لاہوری دروازے سے باہر تندہ بس اسٹاپ سے بالمقابل ، پان گلی کی نکڑ پر مطب کھول لیا ۔ شاید یہاں پہلے کویراج ہر نام داس کا مطب ہوا کرتا تھا ۔ حکیم سعید احمد صاحب ۱۵ مارچ ۱۹۸۵ء کو فوت ہوئے تو ان کی مسند پر ان کے فرزندِ ارجمند حکیم اظہر سعید بیٹھے ۔

پھلّور کا قلعہ بڑی اہمیت کا حامل تھا ۔ دریائے ستلج رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے درمیان سرحد کا کام دیتا تھا ۔ دریا کے پار لُدھیانہ میں انگریزوں کی بہت بڑی فوجی چھاؤنی تھی ۔ اس لئے دفاعی نقطۂ نظر سے رنجیت سنگھ نے ایک اطالوی فوجی ماہر کی نگرانی میں دریا سے اِس پار ، لُدھیانہ میں انگریزوں کی چھاؤنی کے بالمقابل ، قلعہ تعمیر کروایا ۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے دس سال بعد پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو اس وقت یہ بالکل نیا قلعہ تھا ۔ انگریزوں نے اسے پُولیس ٹریننگ سنٹر میں تبدیل کر دیا ۔ ہم بچپن میں سُنا کرتے تھے کہ یہاں ۲۹ ضلعوں سے پُولیس کے افسران تربیت حاصل کرنے آتے

ہیں ۔ اس زمانے میں تھانیدار کے لئے " پھلّور پاس " کرنا ضروری تھا ۔ اس قلعے کے اندر انگوٹھے کے نشان کی تصدیق کرنے والا ادارہ بھی موجود تھا ۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہی ادارہ لوئر مال رُوڈ لاہور پر منتقل ہو گیا ۔ اس ادارے میں عموماً راقم کی برادری کے لوگ ہی کام کیا کرتے تھے ۔ چوہدری خوشی محمد ، چوہدری محمد عبداللہ اور چوہدری محمد یعقوب، لاہور میں اس ادارے کو چلاتے رہے ۔ یہ تینوں پھلّور کے رہنے والے تھے ۔

قلعۂ پھلّور کے پُولیس ٹریننگ سنٹر کا سربراہ انگریز ہوا کرتا تھا ۔ شہر کے لوگ عام بول چال میں اُسے " قلعے والا صاحب " کہا کرتے تھے ۔ قلعے کے باہر وسیع میدان تھے جہاں تھانیداروں کو گھڑ سواری کی تربیت دی جاتی تھی اور صبح کے وقت انہیں بڑی سخت قسم کی ڈرل کرائی جاتی تھی ۔ ڈرل کرانے والا انسٹرکٹر عُرفِ عام میں " ڈرلیا " کہلاتا تھا اور وہ اپنی بد زبانی اور اکھڑپن کے لئے ضرب المثل ہوتا تھا ۔ غالباً وہی تھانیداروں کو گالیاں دینی سکھایا کرتا تھا ۔ یُوں تو قدرت خود بھی لالے کی حنا بندی کرتی ہے لیکن اس حنا بندی میں ڈرلیئے کا بھی بڑا اہم کردار ہوتا تھا ۔

راقم نے اس قلعے کے گرداگرد بڑی گہری خندق دیکھی ہے ۔ اس میں بڑی لمبی گھاس اُگتی تھی جو پُولیس کے گھوڑوں کو بطورِ چارہ کھلائی جاتی تھی ۔ قلعے کے جنوب مشرقی گوشے سے باہر ہندوؤں کا شمشان تھا ۔ شہر سے مُردے لے جا کر وہاں سپردِ آتش کئے جاتے تھے ۔ شمشان کے راستے میں کیکر کا ایک قد آور درخت تھا جو قیامِ پاکستان سے سال سوا سال پہلے آسمانی بجلی گرنے سے جل گیا تھا ۔ ہندو اپنے مُردے کی ارتھی اس کیکر کے نیچے رکھتے اور ایک کورے گھڑے میں پانی بھر کر اس کے سرہانے رکھ دیتے ۔ پھر اس کا کوئی قریبی رشتے دار وہ گھڑا توڑ دیتا ۔ اس عمل کو وہ بھنڈار پھوڑنا کہتے تھے ۔ ان کے عقیدے کے مطابق وہ یہ سمجھتے تھے مُردے کو اپنے مرنے کا احساس بھنڈار پھوڑنے سے ہوتا ہے ۔ ہماری کچھ زرعی اراضی اس طرف بھی تھی ۔ وہاں پہنچنے کے لئے اس کیکر کے قریب سے گزرنا پڑتا تھا ۔ بچپن میں وہاں ٹوٹے ہوئے گھڑوں کی نئی نئی ٹھیکریاں دیکھ کر مجھے بڑا خوف آتا اور میں دوڑ کر وہ مسافت طے کر لیتا تھا ۔

قلعے کے اندر عبداللہ بیاوانی کا مزار ہے ۔ عوام الناس میں یہ روایت مشہور تھی کہ جب قلعہ تعمیر ہو رہا تھا تو معمار دن کے وقت جتنا حصہ تعمیر کرتے اگلی صبح اسے گرا

ہوا پاتے ۔ اس پر کسی نے کہا کہ یہاں کسی سید کو دفن کرکے اس کا مزار بنا دیں تو پھر قلعہ سلامت رہے گا ۔ اتنے میں عبداللہ بیاوانی دولہا بنے ہوئے اپنی دلہن کی ڈولی لئے ہوئے اُدھر آنکلے جب انہوں نے معماروں سے یہ بات سُنی تو انہوں نے دلہن کی ڈولی وہیں سے واپس کر دی اور خود رضاکارانہ طور پر قبر میں لیٹ گئے ۔ معماروں نے ان کی قبر بند کرکے ان کے ماتھے کا سہرا قبر پر لٹکا دیا ۔ اس کے بعد قلعہ تعمیر ہو گیا ۔

راقم کو ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرحوم نے بتایا کہ عبداللہ بیاوانی تغلق عہد (۱۳۹۸ء ۔ ۱۳۲۵ء) کے بزرگ تھے ۔ یہاں ان کا مزار تھا ۔ قلعہ بعد میں بنا ۔ جب قلعہ تعمیر ہوا تو ان کا مزار رہنے دیا گیا ۔ مزار کے ساتھ چھوٹی سی مسجد بنا دی گئی ۔ مُسلمان تھانیدار تربیت کے دوران میں وہاں کثرت کے ساتھ قرآن خوانی اور عبادت کیا کرتے تھے ۔ اس لئے عبداللہ بیاوانی کا مزار آباد رہتا تھا ۔ جمعرات کے دن عوام کو ان کے مزار پر جانے کی اجازت تھی ۔ زائرین قلعے کے دروازے سے قریب جمع ہو جاتے تو ایک پولیس مین انہیں گروپ کی شکل میں مزار پر لے جاتا اور جو زائرین اندر سے باہر جانا چاہتے انہیں باہر لے جاتا ۔ اس طرح گروہوں کی شکل میں زائرین مزار پر جاتے ۔ پھلور کے گرد و نواح میں مُسلمان گوجروں کے گاؤں تھے ۔ وہ " قلعے والے پیر " کے بڑے معتقد تھے ۔ جمعرات کے روز وہ دودھ اور کھیر لے کر آتے اور اسے مزار پر چڑھاتے ۔

۱۹۸۰ء میں مشرقی پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دو صد سالہ جشن دن بڑی دُھوم دھام کے ساتھ منایا گیا ۔ اس موقع پر قلعہ پھلور کا نام " مہاراجہ رنجیت سنگھ فورٹ " رکھا گیا ۔ قلعے کی فصیل کے ساتھ اس نام کا بورڈ آویزاں کر دیا گیا ہے جو ٹرین اور بس میں سفر کرنے والوں نظر آجاتا ہے ۔

قلعے اور دریا کے درمیان کسی بزرگ کا مزار تھا ۔ ان کی قبر کے اوپر برگد کا درخت اُگا ہوا تھا ۔ عوام کا یہ خیال تھا کہ یہ درخت ان کی آنکھ میں اُگا ہے ۔ اس مزار کے ارد گرد جھاڑیاں بہت تھیں اس لئے شاذ و نادر ہی لوگ اُدھر جاتے تھے ۔ اس بزرگ کے مزار کے بارے میں یہ " کرامت " مشہور تھی کہ اگر کوئی بھینس ڈوکے رکھتی ہو تو مزار کے گولر میں پانچ پیسے ڈال کر اس برگد کے پانچ پتے توڑ لیں اور اس بھینس کو کھلا دیں ۔ پتے کھانے کے جلد بعد بھینس نئے دودھ ہو جاتی تھی ۔ اسی طرح اگر کسی شخص

کی گائے یا بھینس گم ہو جاتی تو وہ " پیر ڈانگیے " کے نام کی منت مانتا ۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس منت کے لالچ میں " پیر ڈانگیا " گمشدہ جانور کو " ڈانگیں " مار کر گھر کی طرف بھیج دیتا ہے ۔ جانور مل جانے پر گندم اُبال کر اس میں شکر ڈال کر بچوں اور غریبوں میں تقسیم کر دیتے تھے ۔ جب راقم نے وادیٔ سندھ کی مُہروں پر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس زمانے میں ایک دیوتا تھا جو پشو پتی کہلاتا تھا ۔ ایک مُہر پر وہ دیوتا بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے اور اس کے آگے مختلف جانور سر جھکائے کھڑے ہیں ۔ ہندوؤں کے ہاں شو جی کو پشو پتی مانا جاتا ہے ۔ یہ پیر ڈانگیا در اصل شو جی تھا جس کے نام کی نذر دی جاتی تھی ۔

قلعے کے شمال مغرب میں ایک ریتلا ٹیلہ تھا جس پر قبریں بنی ہوئی تھیں ۔ اس ٹیلے پر شاہ شرف کا مزار تھا ۔ مزار کے قریب پرانے کھنڈرات تھے جنہیں دیکھ کر مزار کی قدامت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا ۔ یہ مزار یقیناً مغل عہد کا ہو گا ۔ ہائی سکول سے قریب بابا بُوڈھے شاہ کا مزار تھا ۔ بعض بڑی بُوڑھیوں نے اسے دیکھا ہوا تھا ۔ وہ اس صدی کے آغاز میں زندہ ہو گا ۔ وہاں سالانہ عرس بھی ہوا کرتا تھا ۔ قیام پاکستان کے بعد پھلور کی تمام مُسلم آبادی پاکستان چلی آئی ۔ جب ذرا امن ہوئی تو کسی قریبی گاؤں سے ایک مُسلمان بڑھئی وہاں آکر بیٹھ گیا اور وہ مزار کی دیکھ بھال کرنے لگا ۔ ریلوے اسٹیشن کے عقب میں نوگزا پیر کی قبر تھی ۔ مجھے بچپن میں اسے دیکھ کر بڑا ڈر لگا کرتا تھا ۔ یہ قبر بارہ تیرہ فٹ طویل تھی ۔ ہمارا ایک محلے دار بابا مہر دین ریلوے اسٹیشن پر بطور پورٹر ملازم تھا ۔ اس کا کام ریلوے ٹرین کی بریک سے پارسل اُتار کر پارسل آفس میں جمع کرانا تھا ۔ اس نے ایک بار خواب میں نوگزا پیر کو دیکھا ۔ پیر صاحب کی زیارت کے بعد وہ اس کا معتقد ہو گیا ۔ اس نے اس قبر پر سبز رنگ کا غلاف چڑھایا اور پیر صاحب کا سالانہ ختم کرانے لگا ۔ عوام الناس کو ان پیروں کے ساتھ بڑی عقیدت تھی ۔ وہ جمعرات کو ان کے مزاروں پر تیل چڑھاتے جو چراغ جلانے کے کام آتا ۔

سال میں ایک بار بھرائی سلطان کی سرور کے " سنگ " لے کر پھلور آتے ۔ وہ دھونکل (نزد وزیر آباد) جاتے ہوئے ایک رات ہمارے ہاں قیام کرتے ۔ ان کے پاس بہت بڑا جھنڈا ہوتا تھا جو " سنگ " کہلاتا تھا ۔ شیخ محمد اکرام نے " آب کوثر " میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ سنگ آنے پر شہر میں منادی کر دی جاتی ۔ عورتیں نماز مغرب کے بعد بچوں

کو لے کر وہاں جاتیں۔ وہ سیر ڈیڑھ سیر اناج بطورِ نذر "سنگ" پر چڑھاتیں۔ بھرائی کے ہاتھ میں مُور چھل ہوتا جس کے ساتھ وہ عورتوں اور بچوں کو BLESSINGS دیتا۔ اگلے روز وہ اناج بیچ کر اس کی قیمت جیب میں ڈالتا اور اگلے پڑاؤ کی جانب روانہ ہو جاتا۔ پنجاب بھر سے بھرائی اپنے اپنے سنگ لے کر مقررہ تاریخ پر لاہور پہنچتے۔ یہاں سے وہ راوی عبور کر کے شاہدرہ میں قیام کرتے۔ وہاں ان کی آمد پر ایک میلہ لگتا جو "بار کا میلہ" کہلاتا تھا۔ شاہدرہ سے وہ ڈھونکل روانہ ہو جاتے جہاں سلطان سخی سرور کی چلّہ گاہ تھی۔ ڈھونکل سے واپسی پر وہ خشک بیر لے کر اسی راستے سے واپس آتے۔ وہ اپنے سابقہ ٹھکانوں پر ٹھہرتے اور اس بار وہ نذرانہ وصول کرنے کے بعد عقیدت مندوں کو خشک بیر بطور تبرک دیتے۔

اس علاقے کے مسلمانوں اور غیر مسلم سلطانیوں کو سلطان سخی سرور (م ۱۱۸۱ء) کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ ہر شہر اور گاؤں سے باہر ان کی زیارت بنی ہوئی تھی جہاں جمعرات کو بھرائی ڈھول بجاتے اور معتقدین اس زیارت میں نذرانے چڑھاتے۔ ان کی منت ایک "روٹ" ہوتا تھا۔ سوا من کچا یا بیس سیر پختہ آٹا پانی کی بجائے دودھ میں گوندھا جاتا اور اس میں چینی، کشمش اور ناریل ملائے جاتے۔ روٹ پکانے کے لئے زمین خوب گرم کی جاتی اور پھر جھاڑو کے ساتھ راکھ اور کوئلے ہٹا کر وہاں گوندھا ہوا آٹا ڈال دیا جاتا۔ بھرائی اپنے ہاتھوں سے اسے روٹی کی شکل دیتا۔ روٹ تیار ہونے کے بعد وہ اس پر ختم پڑھ کر سلطان سخی سرور کی روح کو ایصالِ ثواب کرتا اور روٹ کے ٹکڑے کر کے منت ماننے والے اور عوام میں تقسیم کر دیتا۔ ہمارا ہمسایہ جیونا بھرائی جب کبھی روٹ پکاتا تو واپسی پر اپنے محلے داروں کا حصہ بھی ساتھ لے آتا۔

سلطانیوں کی وضع قطع سکھوں جیسی ہوا کرتی تھی لیکن وہ تختہ چپتے تھے۔ شیخ محمد اکرام نے آبِ کوثر میں لکھا ہے کہ ان میں باقاعدہ سکھ بن جانے کا رُجحان بڑھ رہا تھا۔ اب یقیناً وہ سکھ بن گئے ہوں گے۔

پھلور میں بیساکھی کے تہوار کے علاوہ دسہرے کا تہوار بھی بڑی دُھوم دَھام کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ ہندوؤں نے ایک پختہ دسہرہ بنایا ہوا تھا۔ دسہرے کے دن اسے بھی سجا لیتے اور جلانے کے لئے الگ سے دس سروں والا دسہرہ تیار کر لیتے۔ یہ دراصل راون

کا بت تھا۔ ہندوؤں کا یہ اعتقاد تھا کہ اس کے دس سر تھے۔ اب ہندوؤں نے پڑھ لکھ کر یہ کہنا شروع کیا ہے کہ دس سروں سے مراد دس انسانوں جتنی عقل ہے۔ دسہرے کے میلے میں ہندو مسلم بلا تمیزِ مذہب و ملت شامل ہوا کرتے تھے۔

پھلور کا ریلوے اسٹیشن بڑا شاندار تھا۔ قلعے میں پولیس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کے موقع پر لاہور سے گورنر وہاں جاتا تھا۔ اسی طرح پولیس کے افسران بھی وہاں آتے رہتے تھے۔ اس لئے مسقف ریلوے اسٹیشن بنایا گیا تھا۔ یہ واٹرنگ اسٹیشن بھی تھا۔ ریلوے کے سٹیم انجن وہاں سے پانی لیتے تھے۔ ڈرائیوروں کو یہ ہدایت دی جاتی تھی کہ وہ انجن کی ٹنکی پھلور سے بھر لیں کیونکہ لدھیانہ کا پانی بھاپ بنانے کے لئے اچھا نہ تھا۔ اس لئے گاڑی چند منٹ وہاں کھڑی رہتی جس سے پھیری والوں کا بھلا ہو جاتا۔ اسٹیشن سے باہر نکودر، نگر اور اپرہ جانے والے یکے تیار کھڑے رہتے تھے۔ اسٹیشن سے باہر نکودر کا ایک قدیم پیڑ تھا جس کی اوپر جا کر دو شاخیں ہو گئی تھیں۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ جہانگیر نے ایک بار دورانِ سفر نکودر کا دو شاخہ پیڑ دیکھا تو اس نے ایک چابکدست مصور سے اس کی تصویر بنوائی اور اپنی تزک میں اس کا ذکر کیا۔ قیامِ پاکستان سے دو اڑھائی سال قبل برسات کے موسم میں اس درخت پر آسمانی بجلی گری جس کے صدمے سے وہ درخت گر گیا۔

ریلوے اسٹیشن کے باہر جی ٹی روڈ تھی جس پر ہر وقت ٹریفک رواں دواں رہتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے سامنے ڈاڈو بھٹیارے کا "ریسٹورنٹ" تھا۔ وہ ایک، دو سالن پکا لیتا اور مسافروں کو کھانا کھلا دیتا۔ اس نواح میں ہندوؤں کے کھانے کے متعدد ریسٹورنٹ تھے جہاں پیتل کے بڑے بڑے برتن راکھ کے ساتھ چمکا کر رکھے ہوتے۔ ڈاڈو بھٹیارے کی ایک جواں سال بیٹی پاگل تھی اور وہ سارا دن الومینیم کا کٹورا ہاتھ میں پکڑے گلیوں اور بازاروں میں گھومتی رہتی تھی۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں باہر کو نکلی رہتی تھیں۔ اس کا سر منڈا ہوا ہوتا تھا وہ "پی بک پاپا نانا پی بک پاپا ڈوا" کا ورد کرتی رہتی تھی۔ اسے دیکھ کر بچے ڈر جاتے تھے۔ میں اگر اسے راستے میں کھڑے دیکھ لیتا تو ڈر کر وہ راستہ چھوڑ دیتا۔ اگر وہ کبھی اپنے کپڑے پھاڑ دیتی تو اس کا باپ تنور سے روٹی اُتارنے والے پانچے سے اس کی خوب پٹائی کرتا۔ ۱۹۴۵ء میں پھلور میں زبردست بارش

ہوئی ۔ وہ بارش کے وقت کسی چھت کے نیچے پناہ لئے بیٹھی تھی کہ چھت اس کے اُوپر گر گئی جس کے صدمے سے اس کا انتقال ہو گیا ۔ اس کی وفات پر اس کے باپ نے اطمینان کا سانس لیا ۔

قیامِ پاکستان سے چار پانچ سال قبل بے پور کی طرف سے ایک پاگل ہندو عورت ، جو مائی بھینسا کے نام سے موسوم تھی ، پھلور آ گئی تھی ۔ اس کا جسم بڑا بھاری بھرکم تھا اور وہ سارا دن گلیوں اور بازاروں میں ننگ دھڑنگ پھرتی رہتی تھی ۔ اگر کوئی شخص اسے کپڑے بنوا کر پہنا دیتا تو وہ فوراً بعد ان کپڑوں کو جسم سے اُتار کر آگ لگا دیتی اور پاس کھڑی ہو کر تالیاں بجاتی ۔ اس لئے لوگوں نے تنگ آ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ۔ وہ پاگل ہونے کے باوجود کسی کو تنگ نہیں کرتی تھی ۔ جس وقت پاکستان قائم ہوا اس وقت وہ ہنوز زندہ تھی ۔

اسی طرح میرے بچپن میں ایک ہندو پاگل جو میلاولی کے نام سے معروف تھا گلیوں اور بازاروں میں ننگ دھڑنگ پھرتا رہتا تھا ۔ وہ بھی مائی بھینسا کی طرح بڑا بھاری بھرکم تھا ۔ وہ کبھی اپنے جسم کے گرد کپڑا لپیٹ لیتا اور کبھی اُتار لیتا ۔ عورتیں اور بچے اسے دُور سے آتے دیکھ کر راستہ چھوڑ جاتے ۔ ایک بار سردی کے موسم میں بڑی شدید بارش ہوئی اور وہ سردی سے ٹھٹھر کر مر گیا ۔

دارُو بھٹیارے کے " ریسٹورنٹ " کے قریب ہی غلام قادر کی دکان تھی وہ کھانے کے ساتھ دُودھ ، دہی اور لسی بھی فروخت کرتا تھا ۔ وہ چوہدری محمد بخش کا نواسہ تھا ۔ اسی زمانے میں اس نے حکم مقامی تحصیل نکودر کے ایک بزرگ غلام احمد چشتی صابری کے ہاتھ پر بیعت کر لی ۔ اس نے پھلور کے بہت سے لوگوں کو ان کا مُرید کروا دیا ۔ وہ وحدت الوجود میں اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اس کی باتیں سن کر لوگ اسے " رَبّ " کہنے لگے ۔ جڑانوالہ کے علی محمد عرف بھائی جان جالندھر چھاؤنی کے رہنے والے تھے ۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ سائیکلوں پر سوار ہو کر روشنی کا میلہ دیکھنے لدھیانہ گئے ۔ انہوں نے پھلور میں دُودھ نوش کیا ۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اتنا عمدہ دُودھ نہیں چکھا ۔ قیامِ پاکستان کے بعد غلام قادر باقاعدہ پیر بن گئے اور انہوں نے ضلع فیصل آباد کے ایک گاؤں جہانگیر آباد میں سکونت اختیار کر لی ۔ جہاں ان کا اور حضرت

میراں بھیک صابری کا سالانہ عُرس منایا جاتا ہے اور اخبارات میں باقاعدہ اس کے اشتہارات چھپتے ہیں ۔

غلام قادر کی دکان سے قریب ہی افیون اور پُوست کا ٹھیکہ تھا ۔ دوآبہ بست جالندھر میں بڑے بوڑھے عموماً افیون اور پُوست کے رسیا تھے ۔ وہ رات کو سونے سے پہلے پُوست پانی میں بھگو دیتے اور صبح اسے ہاتھ سے مل کر نچوڑ لیتے ۔ پُوست کا پانی پینے کے بعد وہ کوئی میٹھی چیز ضرور کھاتے ۔ بسا اوقات وہ اس غرض سے طعام کو تھوڑا سا حلوہ بنا کر رکھ لیتے ۔ افیون اور پُوست کے ٹھیکے سے قریب ڈاکخانہ تھا اور اس کے بعد دُھیرو کی بیکری تھی ۔ اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ بہت اچھا بیکر ہے ۔ اس زمانے میں بازاروں میں ایک خاص قسم کے بسکٹ فروخت ہوا کرتے تھے جسے دیہاتی بڑے شوق سے خرید کر لے جاتے ۔ اس پہلے وقت میں ایک پیسے کے سولہ بسکٹ آیا کرتے تھے ۔

دُھیرو کی بیکری سے متصل چھنیا مُوچی کی دکان تھی ۔ وہ یُوپی کا رہنے والا تھا ۔ میرے دادا مرحوم اس سے فیشن شوز بنوایا کرتے تھے ۔ ایک بار انہوں نے میرے لئے بھی دُو جوڑے بنوائے اور کل آٹھ روپے دے دیئے ۔ اب شاید آٹھ روپے لے کر کوئی پالش کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہو ۔ اسی سے اس عہد کی ارزانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

ڈاکخانے سے قلعہ کی جانب جاتے ہوئے بائیں ہاتھ ایک سرائے اور مندر تھے ۔ شاید یہ مندر سرائے کا حصہ تھا ۔ اس مندر سے تھوڑا آگے راجپوتوں کی مسجد تھی ۔ انہوں نے وہاں ایک فاضل دیو بند کو خطیب مقرر کیا تھا جو جمعیت العلماء ہند سے وابستہ اور اکھنڈ بھارت کا حامی تھا ۔ تعلیم حاصل کرنے سے قبل خطیب صاحب ہل چلایا کرتے تھے ۔ اُن کے پاس بیلوں کی بجائے بھینسے تھے جنہیں وہ ہل کے آگے جُوتتے ۔ بیلوں کے مقابلے میں بھینسے عموماً سست رَو ہوتے ہیں اس لئے خطیب صاحب انہیں خُوب مارتے تھے ۔ اسی بنا پر ان کا نام " مولوی جھوٹے کُٹ " پڑ گیا تھا ۔

راجپوتوں کی مسجد سے قریب ہی سڑک کے پار ریلوے کی حدود میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جو " ماتا رانی " کے نام سے موسوم تھا ۔ اگر کسی بچے کو چیچک نکلتی تو عورتیں

بلا تمیز مذہب و ملت پانچ پیسے کی پھلیاں اور بتاشے خرید کر بچے کو لے کر وہاں پہنچ جاتیں۔ پھلیاں بتاشے "ماتا رانی" کی بھینٹ چڑھاتیں اور بچوں کو ماتھا ٹیکنے پر مجبور کرتیں۔ یہ ایک طرح سے سیتلا دیوی کی پُوجا تھی۔ لاہور میں اس کی پُوجا کے لئے باقاعدہ ایک مندر تھا جو سیتلا مندر کے نام سے مشہور تھا۔ اسی طرح جنم اشٹمی کے موقع پر نو مسلم راجپوتوں کی عورتیں برتنوں میں دُودھ لے کر بادا کے مندر جاتیں۔ وہ دُودھ سانپوں کے بلوں میں ڈال دیتیں اور خالی برتنوں میں مندر کے کنوئیں کا پانی اور کیکر کے پتے ڈال کر گھر لے جاتیں اور برکت کے لئے وہ پانی دیواروں پر چھڑکتی تھیں۔ اب میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ یہ تو ناگ پُوجا تھی۔ قیامِ پاکستان کا اتنا فائدہ تو ضرور ہوا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کی بہت سی مشرکانہ رسمیں ادا کرنے سے بچ گئے ہیں۔

جنم اشٹمی بھادوں کے مہینے میں منائی جاتی تھی۔ یہ دراصل کرشن جی کا جنم دن تھا۔ اس کے لئے بھادوں کے مہینے کی وہ رات مختص تھی جس رات میں چاند غائب رہتا ہے۔ چند رُوز پہلے ہندوؤں کے محلوں میں "تیاں" شروع ہو جاتیں۔ نوجوان ہندو لڑکیاں اچھے کپڑے زیب تن کرتیں اور زیورات پہن کر کرشن جی کی گوپیاں بن جاتیں۔ ہندو نائن ڈھولک لے کر بیٹھ جاتی اور لڑکیاں ڈھولک کی تھاپ پر رقص کرتیں۔ مختلف دنوں میں مختلف محلوں میں "تیاں ڈالی جاتیں"۔ آخری دن تمام لڑکیاں گاتے بجاتے تیاں وداع کرنے کے لئے قریبی جوہڑ پر جاتیں۔ جوہڑ کے کنارے ناچ گا کر یہ تہوار ختم کیا جاتا۔ میں جب انگلستان گیا تو دولت رام حلوائی وہاں موجود تھا۔ وہ جب بھی ٹیلی ویژن لگاتا تو انگریز جوڑوں کو محوِ رقص دیکھتا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا کہ عجیب بات ہے ہمارے ہاں تو تیاں صرف بھادوں میں ڈالی جاتی تھیں لیکن یہاں تو سارا سال جاری رہتی ہیں۔

جنم اشٹمی کی رات کو مندر میں باقاعدہ ناٹک کھیلا جاتا۔ سب سے بڑا پُروہت جو بادا کہلاتا تھا، کرشن جی کی ماں دیوکی کا رُوپ دھار لیتا۔ وہ بستر پر لیٹ کر ایسی حرکات کرتا جیسے اسے دردِ زِہ ہو رہا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد کرشن جی جنم لیتے تو کپڑے میں ایک بڑا سا کھیرا رکھ کر حاضرین کو دکھایا جاتا کہ مہاراج کرشن جی تشریف لے آئے ہیں۔ اس رات کڑھی پکائی جاتی اور وہ کپڑوں پر ڈال کر لوگوں کو کرشن جی کے "پوتڑوں" کے

درشن کرائے جاتے۔ پھر وہ پوتڑے ایک ٹوکری میں ڈال کر بادا اپنے سر پر اٹھا لیتا اور ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد گاتے بجاتے ہوئے وہ پوتڑے دھونے دریا پر جاتی۔ ایک بار راقم دلی سے مراد آباد جا رہا تھا۔ جنم اشٹمی کا موقع تھا۔ گڑھ مکتیسر کے بازار میں ہجوم کی وجہ سے بس رُک گئی۔ میرے استفسار پر ایک مسافر نے بتایا کہ ہندوؤں کا جلوس دریائے گنگا پر کرشن جی کے پوتڑے دھونے جا رہا ہے۔ ایسی ہی فرسودہ رسموں پر ہندو دھرم کی بنیاد ہے۔

جب کوئی بڑا بوڑھا ہندو مر جاتا تو چند روز بعد جب اس کا کریا کرم کیا جاتا تو پُوری برادری میں گندوڑا تقسیم کیا جاتا۔ یہ مصری جیسا ہوتا ہے۔ ان دونوں میں نمایاں فرق یہ ہے مصری میں چینی کے دانے موجود رہتے ہیں لیکن گندوڑے میں نہیں۔ ثانیاً یہ دانت سے بڑی آسانی کے ساتھ توڑا جا سکتا ہے۔ میں اپنے والدین کے ساتھ چھوٹی عمر میں پہلے جالندھر اور پھر لاہور چلا آیا تھا۔ ہماری ہمسائی موہن دیوی میرے لئے گندوڑا جمع کرتی رہتی اور جب میں پھلور جاتا تو بڑی محبت کے ساتھ مجھے گندوڑا کھانے کے لئے دیتی۔ اس زمانے میں اتنی سمجھ نہ تھی کہ اسے کھانا شرعاً جائز ہے یا ناجائز۔ اب سوچتا ہوں کہ یہ تو بوڑھے ہندو کی آتما کو ایصالِ ثواب کے لئے بنایا اور بانٹا جاتا تھا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی اختلافات کے باوجود مکمل ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ ہندوؤں کی باراتوں میں مسلمان اور مسلمانوں کی باراتوں میں ہندو شریک ہوتے تھے۔ اسی طرح جب کوئی ہندو فوت ہو جاتا تو مسلمان مرگھٹ تک ساتھ جاتے اور مسلمان فوت ہو جاتا تو اس کے واقف کار ہندو قبرستان تک ساتھ جاتے۔ راقم کی دادی صاحبہ کا انتقال ۲۴ اور ۲۵ فروری ۱۹۴۴ء کی درمیانی شب میں ہوا۔ ان کا جنازہ اٹھنے تک بازار بند رہا اور تمام ہندو دکاندار قبرستان تک ساتھ گئے۔ ان کی تدفین کے بعد بازاروں میں کاروبار شروع ہوا۔ یہ اسی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۴۷ء میں پھلور سے مسلمانوں کے انخلاء کے وقت کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔

پھلور میں بہت بڑا ذخیرہ تھا اس لئے وہاں محکمۂ جنگلات کا دفتر موجود تھا۔ لدھیانہ کے راستے میں بھی ذخیرہ پڑتا تھا۔ سوختنی لکڑی کی ضرورت مقامی طور پر پُوری ہو جاتی تھی۔ ان ذخیروں میں رات بسر کرنے کے لئے دُور دُور سے کوّے آتے تھے۔ نمازِ عصر کے بعد

کووں کی ٹولیاں کائیں کائیں کرتی ہوئی ڈھیرے کی طرف جاتی نظر آتیں۔ عورتیں اگر کسی اور کام میں مشغول ہوتیں تو وہ سب کچھ چھوڑ کر یہ کہتے ہوئے باورچی خانے کا رُخ کرتیں کہ شام ہو گئی ہے اب تو کوّے واپس آنے لگے ہیں۔ اسی طرح جب وہ علی الصبح کوّوں کی آوازیں سُنتیں تو یہ کہتے ہوئے اُٹھ بیٹھتیں کہ اب دن نکل آیا ہے اور کوّے واپس آنے لگے ہیں۔

ڈھیرے میں درختوں کی بہتات کی وجہ سے گیدڑ، سیہہ اور سانپ بہت تھے۔ گرد و نواح کے دیہاتوں میں ہرنوں کی بہتات تھی اور ان کی ڈاریں بھاگتی دوڑتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اسی طور مور بھی بکثرت تھے۔ صبح کے وقت مور مکانوں کی چھتوں پر آکر بیٹھ جاتے تھے۔ دریائے ستلج جڑا گہرا دریا تھا اور اس میں سال بھر پانی رہتا تھا۔ اس میں اکا دُکا مگرمچھ بھی تھے جنہیں مقامی زبان میں سنسار کہتے تھے۔ پھلور کے نواح میں موروں نامی ایک جاگیر تھی۔ اس کا مالک ایک سکھ تھا جو "موروں والا سردار" کہلاتا تھا۔ اسے آنریری مجسٹریٹ کے اختیارات حاصل تھے۔ اس نے پھلور میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ پاسپورٹ فارم کی تصدیق اور ایسے ہی کاموں کے لئے اس کے پاس جانا پڑتا تھا۔ اس کے گھر کے برآمدوں میں اس کے شکار کردہ مگرمچھ بھس بھر کر دیواروں کے ساتھ لٹکائے ہوئے تھے۔

تعلیمی اعتبار سے پھلور بہت پیچھے تھا۔ شہر میں لڑکوں کے لئے ایک ہائی سکول تھا۔ پھلور میں کالج کوئی نہ تھا۔ قریبی کالج لدھیانہ میں تھے۔ اب پھگواڑہ میں بھی کالج قائم ہو گیا ہے۔ چند طلبہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ پڑھنے جاتے تھے لیکن چند ماہ بعد وہ ہمت ہار کر گھر بیٹھ جاتے تھے۔ لڑکیوں کے لئے ایک مڈل سکول تھا۔ آزادی سے دو تین سال پہلے اسے ہائی سکول کا درجہ مل گیا۔ محترمہ اَمۃ الحمید صاحبہ نے اُنہی دنوں B.A : B.T کیا تھا۔ وہ اس ہائی سکول کی ہیڈ مسٹریس بن گئیں۔ وہ ہمارے شہر میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ لاہور چلی آئیں اور محکمۂ تعلیم نے ان کا تقرر ڈیرہ غازی خان میں بطورِ ہیڈ مسٹریس کر دیا۔ اس شہر کی تمام لڑکیاں ان کی شاگرد ہیں۔

ان کے میاں چوہدری محمد طفیل ہمارے شہر کے پہلے مسلمان تھے جنہوں نے

B.A : LLB کیا۔ انہوں نے پھلور میں پریکٹس شروع کر دی۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ بھی اپنی اہلیہ کی ملازمت کی وجہ سے ڈیرہ غازی خان میں مقیم ہو گئے۔ وہ کچھ عرصہ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ڈیرہ غازی خان کے صدر بھی رہے۔ ایک بار وہ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے انتخابات کے سلسلے میں اپنے ایک دوست کے لئے ووٹ حاصل کرنے کے لئے جام پور اور راجن پور گئے۔ اثنائے سفر ان کی کار ایک درخت سے ٹکرا گئی جس کے نتیجے میں دونوں دوست موقع پر ہی انتقال کر گئے۔ یہ سانحہ ۶ دسمبر ۱۹۷۳ء کو پیش آیا تھا۔

چوہدری محمد طفیل کے ابنِ عم پروفیسر چوہدری عبدالغفور (م ۱۹۸۷ء) پھلور کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے باشندے تھے۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فزکس میں M.Sc. کی ڈگری حاصل کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انگلستان چلے گئے۔ وہاں انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی سے ایجوکیشن میں اسناد لیں اور لندن سے بی اے آنرز بھی کیا۔ موصوف مسلم یونیورسٹی میں اساتذہ کو تربیت دیتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے جامعہ ملیہ دہلی میں جب ٹیچر ٹریننگ کالج کھولا تو چوہدری صاحب کے تجربے سے فائدہ اٹھایا۔ پھر جب ذاکر حسین خان نے کانگرس کے ایماء پر واردھا سکیم تیار کی تو چوہدری صاحب کے ساتھ صلاح و مشورہ کیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت چوہدری صاحب علی گڑھ میں تھے۔ بھارتی پنجاب سے گزرنا ممکن نہ تھا اس لئے موصوف حیدر آباد چلے گئے اور وہاں سے بمبئی پہنچے اور بحری جہاز کے ذریعے کراچی پہنچ گئے۔ انہوں نے سالہا سال تک ٹیچر ٹریننگ کالج لاہور میں تدریسی فرائض انجام دیئے اور پھر فیصل آباد کے ٹیچر ٹریننگ کالج کے بانی پرنسپل مقرر ہوئے۔ ان کے ارشد تلامذہ میں علامہ سید غلام شبیر بخاری کا نام سرِفہرست ہے۔ علامہ صاحب بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتے ہیں کہ ان پر دو ارائیوں کا بڑا احسان ہے۔ ان میں سے ایک چوہدری عبدالغفور ہیں۔

چوہدری صاحب کی صاحبزادی مسز زبیدہ صدیق پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فائن آرٹس سے منسلک ہیں اور آں محترمہ کے شوہرِ نامدار ڈاکٹر صدیق جاوید گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اُردو میں اُستاد ہیں۔ ڈاکٹر صدیق جاوید معروف اہلِ قلم ہیں اور اقبالیات

ان کا خاص مضمون ہے۔ ان کی ایک تصنیف " بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ " اہل علم اور اقبال شناسوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔

محترمہ اَمۃُ الحمید کے بھائی اور چوہدری عبدالغفور کے ابنِ عم عبدالمجید تمنّا زندگی بھر فوڈ ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ رہے لیکن ان کے اندر کا ادیب اناج کی بوریوں تلے دبنے کے باوجود نہ مر سکا۔ موصوف بڑے اچھے شاعر ہیں اور مطالعہ کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ چوہدری عبدالغفور کی وفات پر تمنّا صاحب نے بڑا زور دار مرثیہ لکھا تھا جس میں ان کے ٹوٹے ہوئے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ تمنّا صاحب کے چھوٹے بھائی عبدالوحید چوہدری ایک اچھے مصوّر ہیں۔ وہ ڈیرہ غازی خان کے ہائی سکول میں ڈرائنگ ماسٹر رہ چکے ہیں۔ اس لئے فنونِ لطیفہ کی طرف ان کا قدرتی میلان ہے۔

چوہدری محمد طفیل مرحوم اور چوہدری عبدالمجید تمنّا کا آبائی مکان اور میری والدہ مرحومہ کے نانا کا مکان ساتھ ساتھ تھے بلکہ ان کی دیوار مشترکہ تھی۔ اس لئے بچپن میں راقم کو ان کے ہاں جانے کا بڑا موقع ملتا رہا۔ اسی محلّے میں جو چوڑی گلی کے نام سے موسوم تھا، مسلمانوں کے کئی کٹڑے تھے، جن میں داخل ہونے کا واحد راستہ چوڑی گلی تھی۔ ان میں سے دوسرے کٹڑے کی نکڑ پر ایک مکان تھا، جو میرے دادا نے اس کی بیوہ مالکہ سے خرید لیا تھا۔ چوتھے کٹڑے میں میرے نانا عمر الدین مرحوم کا مکان تھا اور اسی کٹڑے کے آخری سرے پر میری دادی مرحومہ کی والدہ کا گھر تھا۔ راقم نے اپنی دادی کے والد فتح محمد کو نہیں دیکھا لیکن ان کی والدہ عائشہ کا حلیہ اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ان چار کٹڑوں میں مسلمانوں ہی کے گھر تھے۔

چوڑی گلی نئے بازار میں جا نکلتی تھی۔ نئے بازار سے چند قدم پہلے جانب چپ نجروں کا محلّہ تھا۔ نکڑ والا مکان غلام غوث حجام کا تھا باقی پورا محلّہ ہندوؤں کا تھا۔ آگے جا کر یہ محلّہ پاسیوں کے چوک میں جا نکلتا تھا۔ اس چوک میں ایک مندر تھا جسے مائی جی کا مندر کہتے ہیں۔ مندر کی بانیہ مائی جی اکثر اوقات ایک جھروکے میں بیٹھی نظر آتی تھی۔ یہ مندر صرف عورتوں کے لئے مختص تھا۔ جب ہندو عورتیں کسی ارتھی کے ساتھ ماتم کرتی ہوئی مرگھٹ تک جاتیں تو واپسی پر اس مندر میں آکر اشنان کرتیں تب اپنے گھروں میں داخل ہوتیں۔

ہندوؤں کے ہاں یہ بھی دستور تھا کہ مرگ والے گھر میں تیرہ دن سیاپا (ماتم) کیا جاتا تھا۔ بڑی بوڑھیاں دوپہر کو کام کاج اور کھانے سے فارغ ہو کر سیاہ گھگرے پہن کر سیاپا کرنے جاتیں۔ بسا اوقات وہ گھگرا بازو یا کندھے پر رکھ کر چل پڑتیں اور مرگ والے گھر کے قریب جا کر شلوار کے اوپر سے ہی وہ گھگرا پہن لیتیں۔ نائن ایک مونڈھے پر بیٹھ جاتی اور وہ نوحہ گر کے فرائض انجام دیتی۔ ماتم گسار خواتین اس کے گرد حلقہ بنا کر کھڑی ہو جاتیں اور اس کی آواز پر ایک ساتھ دونوں ہاتھ اپنے سینے اور رانوں پر مارتیں۔ سیاپا کرنے سے ایک Rhytham پیدا ہوتا۔ اگر کوئی خاتون اکھڑ جاتی تو اسے بٹھا دیتیں تاکہ دوسری خواتین کا Rhytham برقرار رہے۔ میں بچپن میں نائن کے کہے ہوئے الفاظ یاد کر لیتا تھا۔ اس کے منہ میں جو آتا وہ کہہ دیتی اور خواتین سیاپے میں مصروف رہتیں۔

چوڑی گلی نئے بازار میں جا ملتی تھی۔ یہ بازار عبور کرنے کے بعد یہی گلی، راجپوتوں کا محلّہ بن جاتی تھی۔ موجودہ صدی کے اوائل میں راجپوتوں کے محلّے کے آغاز میں میری والدہ مرحومہ کے نانا محمد بخش کا لکڑی کا بہت بڑا ٹال تھا۔ وہ پھلور اور لدھیانہ کے ذخیرے ٹھیکے پر لے کر سوکھے درخت کٹوا لیتے اور سال بھر اپنی ٹال پر فروخت کرتے رہتے۔ اگر کوئی کندا زیادہ سخت ہوتا اور اسے کشمیری مزدور نہ پھاڑ سکتے تو اسے الگ رکھوا دیتے۔ مجھے لالہ دولت رام نے بتایا کہ ان کے ہاں ایسے بہت سے کندے الگ سے پڑے رہتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان سے پوچھتا کہ انہیں کیا کریں گے۔ تو وہ بڑے معصومانہ انداز میں کہتے کہ فلاں ہندو بوڑھا بڑا کمزور ہو رہا ہے۔ وہ عنقریب ہی رام جی کو پیارا ہونے والا ہے۔ اس طرح کے تمام کندے اسے جلانے کے کام آئیں گے۔

چوہدری محمد بخش کے ٹال پر بہت سے مجذوب رہتے تھے۔ ان کے لئے کھانا گھر سے منگواتے تھے اور ضرورت کے وقت کپڑے بھی سلوا دیتے تھے۔ سردی کے موسم میں اگر انہیں پتہ چل جاتا کہ فلاں جگہ ایک مجذوب پڑا ہے تو مزدور کے سر پر لکڑیاں لاد کر وہاں پہنچ جاتے اور اس کے قریب آگ جلا دیتے۔ سردیوں کے موسم میں مجذوبوں کو لحاف بنوا دیتے۔

ایک بار چوہدری محمد بخش اپنے ٹال پر سو رہے تھے کہ اچانک ایک چڑیا کی آواز

[illegible]

سن کر بیدار ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک سانپ نے چڑیا کو اپنے منہ سے پکڑا ہوا ہے اور نگلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انہوں نے فوراً ایک لکڑی اٹھائی اور سانپ پر دے ماری جس کے صدمے سے سانپ مر گیا۔ نماز فجر کا وقت ہو رہا تھا۔ موصوف اسے یونہی چھوڑ کر مسجد چلے گئے۔ انہوں نے کسی سے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ جب وہ مسجد سے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک مجذوب جو کئی ماہ سے غائب تھا، چلا آرہا ہے۔ اس نے قریب آتے ہی کہا کہ چوہدری آج ایک سانپ تمہیں ڈسنے کے لئے تخت پوش پر چڑھ رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ میں چڑیا تھما دی۔ چوہدری صاحب مجذوب کو ساتھ لے کر اپنی نال پر آئے۔ اس نے کہا کہ سانپ اور چڑیا دونوں کو غسل دے کر کفن پہناؤ اور کہیں دفن کر دو۔ چوہدری صاحب نے اس مجذوب کو نئے کپڑے سلوا کر دیئے اور اس کی بڑی خاطر مدارات کی۔

چوہدری محمد بخش کا انتقال ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ برس تونیہ ہوا۔ ڈاکٹر نے ان کے لئے برانڈی تجویز کی لیکن انہوں نے کہا کہ وہ برانڈی پی کر صحتیاب ہونے کی بجائے مرنا پسند کریں گے لیکن اس ام الخبائث کو نوش نہیں کریں گے۔ محمد بخش کے دو بیٹے تھے۔ عبدالکریم اور عبداللہ۔ اول الذکر کا انتقال شیخوپورہ میں ہوا اور موخر الذکر حال ہی میں نوّے برس سے زائد عمر پا کر لاہور میں فوت ہوئے ہیں۔

اسی محلے میں ڈاکٹر نبی بخش کا کلینک تھا۔ وہ تو میرے بچپن میں فوت ہو گئے تھے لیکن ان کے فرزند فضل محمد وہ کلینک چلاتے رہے۔ ان کے کلینک کے سامنے ایک دیوار تھی اس کے ساتھ ایک بنچ اور چند مونڈھے رکھے ہوئے تھے جہاں شام کے وقت چند پڑھے لکھے افراد بیٹھ جاتے تھے۔ اگر میرے والد مرحوم رخصت لے کر پھلور گئے ہوئے ہوتے تو شام کے وقت وہ بھی وہاں بیٹھ جاتے۔ یہ ایک طرح سے فضل محمد کا نادی یا سقیذ تھا۔ کلینک سے ذرا آگے بڑھیں تو ڈاکٹر نبی بخش کا گھر آجاتا تھا۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے شیر محمد میرے والد مرحوم کے جگری دوست تھے۔ انہیں جوانی میں حیدق نے آدبوچا۔ وہ بغرض علاج لاہور میں ہمارے ہاں مقیم رہے۔ گوجی شاہو لاہور میں ڈاکٹر گنگا رام نے ۔بجلی پانی بھاپ کا بڑا اسپتال۔ کھولا ہوا تھا۔ شیر محمد ان کے زیر علاج رہے لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ اولاد سے محروم

رہے۔ فضل محمد کے کلینک پر بیٹھنے والوں میں سے چوہدری خوشی محمد قلعہ پھلور میں نشانِ انگوٹھا کی تصدیق کے ادارے سے وابستہ تھے۔ آزادی کے بعد موصوف لاہور میں اسی ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ ان کا گھر پرانی انارکلی میں ربانی روڈ کی مسجد سے قریب تھا۔ موصوف بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ جب ان کا جنازہ اٹھا تو اسی طرح کے چھ سات صد افراد جنازے کے ساتھ چل رہے تھے۔ اس دن راقم پر امام احمد ابنِ حنبل کے قول:

بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ يَوْمُ الْجَنَائِز

کی حقیقت منکشف ہوئی۔

اس مجلس کے حاضر باش افراد میں چوہدری امام الدین کا پھلور میں بھٹہ خشت تھا۔ آزادی کے بعد وہ گوجر خان میں جا بسے۔ ان کے ایک ہم نام جو چوہدری عبدالمجید قمتا کے رشتے میں تایا لگتے تھے، میونسپل کمیٹی میں ملازم تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہیں وہی ملازمت کبیروالا کی میونسپل کمیٹی میں مل گئی۔

ریلوے اسٹیشن سے اگر جی ٹی روڈ پر پھگواڑہ کی جانب چلیں تو ایک مندر کی وقف زمین میں لاری اڈہ تھا۔ ایک زمانے میں وہاں چالیس پچاس لاریاں کھڑی رہتی تھیں۔ ان کے مالک اور ڈرائیور سکھ تھے۔ میرے چچا محمد اقبال کی موٹر سپیئر پارٹس اور ڈیزل تیل کی لاری اڈے پر واحد دکان تھی۔ تمام سکھ ڈرائیور ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ (میرے چھوٹے چچا نور محمد مرحوم کی شادی تھی اور بارات لدھیانہ جانی تھی۔ انہوں نے دو ڈرائیوروں سے کہا کہ ان کی لاریوں کی دو روز کے لئے ضرورت ہے۔ جب باقی ڈرائیوروں کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت ناراض ہوئے کہ ان دو کو کیوں کہا ہے، باقیوں کو کیوں نہیں کہا۔ اس پر میرے چچا نے کہا کہ چلو سبھی تیار ہو جاؤ۔ اگلے روز ہر لاری میں چار چار پانچ پانچ افراد بیٹھ کر جلوس کی صورت میں لدھیانہ روانہ ہوئے۔ اس سکھ مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی ذمہ داری اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ پر عائد ہوتی ہے۔

میرے چچا کی دکان کے سامنے سنگِ میل نصب تھا جس پر لدھیانہ ۹ میل، پھگواڑہ ۱۲ میل، جالندھر چھاؤنی ۲۴ میل اور دہلی ۲۰۰ میل درج تھا۔ اس کے ساتھ ہی سادھو رام کی دکان تھی جہاں پان سگریٹ اور سکنجبین کے گاہکوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔

سکھ ڈرائیور سگریٹ کی ڈبیا خرید کر اپنی پگڑی میں چھپا لیتے اور اپنی لاریوں میں بیٹھ کر سگریٹ پیتے ۔ ساد هو رام کی دکان کے برابر برما شیل کا پٹرول پمپ تھا ۔ پمپ کے اُوپر شیشے کے خالی گیلن لگے ہوتے تھے ۔ ایک گیلن بھر جاتا تو اسے ربڑ کے پائپ کے ذریعے لاری کی ٹینکی میں خالی کر دیتے اور دوسرا گیلن بھرنا شروع کر دیتے ۔ ہم بچوں کے لئے یہ بڑا دلچسپ منظر ہوتا تھا ۔

ہمارے چچا کی دکان کے سامنے وشنو داس نے ریلوے کی حدود میں کریانے کی دکان کھولی تھی ۔ وہ میرے والد مرحوم سے ملنے والوں میں سے تھا ۔ اس نے باقاعدہ کسی مولوی سے قرآن حکیم پڑھا تھا ۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ میرے چچا نے وشنو داس کی دکان سے ایک روپے اور پانچ پیسے کی چار سیر چینی خرید کر مجھے گھر لے جانے کے لئے دی ۔ اُن دنوں ہمارے ہاں چینی عموماً جاوا سے آیا کرتی تھی ۔ جی ٹی روڈ پر اور آگے بڑھیں تو دائیں ہاتھ ایک قدیم سرائے تھی جو ان دنوں تانگہ اسٹینڈ کے طور پر استعمال ہو رہی تھی ۔ وہاں مختلف قصبوں کو جانے والے یکے ہر وقت تیار ملتے تھے ۔ یکے کے پہیے پر ربڑ کی بجائے لوہے کا حلقہ چڑھا ہوا ہوتا تھا ۔ وہ چلتے وقت آواز بھی دیتا اور پکی سڑک کی بجائے کچے راستے پر خوب چلتا تھا ۔ پھلور سے لدھیانہ نو میل تھا ۔ ٹرین کا کرایہ دو آنے تھا ۔ بس اور یکے والے چھ پیسے لے کر سواری بٹھا لیتے تھے ۔ نو میل کے یکے کے سفر میں سواری کا جو حال ہوتا اس کی کیفیت بیان کرنی آسان نہیں ہے ۔

یہ سرائے جرنیلی سڑک کے کنارے تھی اور لکھوری اینٹ سے تعمیر ہوئی تھی ۔ میں نے ایک جگہ پڑھا کہ نواب ذکریا خاں (م ۱۷۴۵ء) گورنر لاہور کا فرزند شہنواز خان ، پھلوری خاں کے لقب سے ملقب تھا ۔ اس نے پھلور آباد کیا اور وہاں ایک سرائے بنوائی ۔ اس روایت کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ۔ مغلوں کے عہد میں فنچ نامی ایک سیاح یہاں آیا اور اس نے اپنے سفر نامے میں پھلور کا ذکر کیا ہے ۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پھلور ، پھلوری خان سے ڈیڑھ صدی پہلے موجود تھا ۔ اس کی مزید تائید فقیر اللہ سیف خان کی تصنیف ۔ راگ درپن ۔ سے ہوتی ہے ۔ موصوف نے پھلور کے ایک موسیقار کب جوت کا ذکر کیا ہے جو شاہجہان کے دربار میں ملازم تھا ۔ وہ پھلور میں ہی فوت ہوا ۔ اس وقت اس کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز تھی ۔ اس سے پھلور کی قدامت کا

اندازہ لگایا جا سکتا ۔

پھلور میں ایک سرائے " ماہی مل کی سرائے " کے نام سے موسوم تھی ۔ اس کا دروازہ کسی قلعے کا دروازہ معلوم ہوتا تھا ۔ میں نے اپنے بچپن میں بھی اسے بند ہی پایا ۔ قیام پاکستان سے چند سال قبل وہاں چوہدری غلام غوث مرحوم نے آٹا پیسنے کی چکی لگائی تھی ۔ پھلور میں سراؤں کی بہتات کی وجہ میری سمجھ میں یہی آتی ہے کہ پھلور جرنیلی سڑک پر واقع تھا اور ۱۸۷۰ء میں پُل کی تعمیر سے قبل مسافر کشتیوں کے ذریعے دریا عبور کرتے تھے ۔ رات کے وقت کشتیاں چلنا بند ہو جاتی تھیں اس لئے مسافروں کو رات پھلور میں قیام کرنا پڑتا تھا ۔

اس سرائے سے آگے بڑھیں تو دائیں ہاتھ ایک محلہ جو آباد پورہ کے نام سے موسوم تھا ، پڑتا تھا ۔ اس محلّے کے آخر میں میرے دادا نے ایک مکان بنوایا تھا جو "عمر منزل" کہلاتا تھا ۔ اس مکان کے دو اطراف میں زمین سے پانچ فٹ اُونچا تھڑا تھا اور دُوسری منزل میں گیلری تھی ۔ اس مکان میں وہ خود کبھی نہیں رہے ۔ ان کے پانچ بیٹے تھے ۔ انہوں نے ان کے لئے مختلف محلّوں میں پانچ مکان بنوائے تھے ۔ میری والدہ مرحومہ یہ کہا کرتی تھیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ہم "عمر منزل" میں رہیں گے ۔ اس مکان کے ارد گرد مسلمانوں کے مکانات تھے جو شہر کی گھنی آبادی سے نکل کر کھلے علاقے میں آباد ہو گئے ۔ "عمر منزل" سے ذخیرہ زیادہ دور نہیں تھا ۔ اس لئے رات کے وقت گیدڑ وہاں تک آجاتے تھے ۔

"عمر منزل" سے آگے بڑھیں تو نئی غلہ منڈی آ جاتی تھی ۔ وہاں ہندوؤں ہی کی آڑھت کی دکانیں تھیں ۔ اس منڈی میں گندم ، کپاس ، مکئی ، گڑ ، شکر ، مرچ اور تمباکو کی خرید و فروخت ہوتی تھی ۔ یہی علاقے کی فصلیں تھیں ۔ یہ بیٹ کا علاقہ تھا ۔ اس زمانے میں چھوٹی کلاسوں کو ضلعی جغرافیہ پڑھایا جاتا تھا اور اس میں یہ شعر مرقوم ہوتا تھا :

چار چیزیں ہیں تحفۂ بیٹ
مرچ تمباکو گمرہ لیٹ

تحصیل نکودر کا علاقہ دونا کہلاتا تھا ۔ اس کے بارے میں طلبہ کو یہ شعر رٹایا جاتا تھا :

چار چیزیں ہیں تحفہ دونا
گندم کپاس ماش اور پونا

پھلور کے اردگرد کی زمین کے مختلف نام تھے ۔ دریا کے ایک کنارے کی زمین ، جہاں کنوؤں کی بہتات تھی اور رہٹ چلتے تھے ، بیٹ کہلاتی تھی ۔ وہاں کنوئیں کا پانی دریا کے قرب کی وجہ سے نو دس فٹ پر تھا ۔ اس لئے بیل بڑی آسانی کے ساتھ رہٹ چلا لیتے تھے ۔ دریا کا وہ کنارہ جو ریلوے لائن کے پار تھا ، منڈ کہلاتا تھا ۔ وہاں کنوئیں نہیں تھے ۔ زراعت کا انحصار محض بارش پر تھا ۔ نکودر کی طرف جانے والی ریلوے لائن جس علاقے سے گزرتی تھی اسے ڈھاہا کہتے تھے ۔ اُونچائی پر ہونے کی وجہ سے زیرِ زمین پانی بڑی گہرائی پر تھا ۔ اس لئے بیلوں کی جوڑی سے رہٹ چلانا ممکن نہ تھا ۔ یہاں بھی فصل کا انحصار بارش پر تھا ۔ یُوں بھی زمین ریتلی تھی اس لئے فصل اچھی نہیں ہوتی تھی ۔ شہر سے دو اڑھائی میل کے فاصلے پر ایک علاقہ جان چک کے نام سے موسوم تھا ۔ وہاں فصل اچھی ہوتی تھی لیکن جنگلی ہرن فصل کو بہت نقصان پہنچاتے تھے اور ہر وقت فصل کی نگرانی ممکن نہ تھی ۔ شہر کے ایک کنارے پر بہت بڑا ذخیرہ تھا جو میلوں تک پھیلا ہوا تھا ۔ وہاں رہنے والے جنگلی جانور بھی فصلوں کو نقصان پہنچاتے تھے ۔

غلّہ منڈی سے باہر بہت بڑی شہتیر مارکیٹ تھی ۔ پچھلے زمانے میں بارہ فٹ کی دیودار کی شہتیری سوا دو یا اڑھائی رُوپے میں مل جاتی تھی ۔ یہاں اتنی بڑی شہتیر مارکیٹ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پھلور دریا کے کنارے آباد تھا ۔ ستلج کے طاس میں ہمالیہ کے دامن میں دیودار کے درخت کاٹ کر ان کے شہتیر بنائے جاتے اور ان کے گھٹے دشوار گذار پہاڑوں سے بہہ کر پھلور پہنچتے تو شہتیر فروشوں کے کارندے انہیں پکڑ لیتے ۔ ہر شہتیر کے سرے پر ایک انگریزی حرف کھدا ہوتا تھا اس لئے فوراً پتہ چل جاتا تھا کہ اس کا مالک کون ہے ۔

اس شہتیر مارکیٹ میں فرنیچر اور دوسرا گھریلو سامان تیار کیا جاتا تھا ۔ اب بھی میرے پاس چند چیزیں بطورِ یادگار موجود ہیں ۔ مجھے خوب یاد ہے کہ دیودار کی تپائی سوا روپے میں مل جاتی تھی ۔ اس سے دوسری چیزوں کے بھاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ شہتیر مارکیٹ پر ہندوؤں اور سکھوں کی اجارہ داری قائم تھی ۔ سکھ بڑھئی بڑے محنتی ہوتے تھے

اور وہ بڑا اچھا فرنیچر تیار کرتے تھے ۔ لوہار اور بڑھئی سکھ رام گڑھیے کہلاتے ہیں ۔ انہوں نے ہی پھگواڑہ میں رام گڑھیہ کالج قائم کیا ہے ۔

پُورے شہر میں صرف ایک دکان جھٹکئی کی تھی جہاں سے سکھ جھٹکہ شدہ گوشت خریدتے تھے ۔ جھٹکئی بکرے کا جھٹکہ کرکے اس کا گوشت فروخت کیا کرتا تھا ۔ اس کی دکان کے باہر جالیاں لگی ہوئی تھیں اور وہ خود یا گوشت باہر سے نظر نہیں آتا تھا ۔ سؤر کا گوشت ہم نے وہاں بکتے ہوئے نہ دیکھا نہ سُنا ۔ مسلمان قصائی کھلے بندوں گوشت فروخت کرتے تھے ۔ قصائیوں کے بازار میں ہندوؤں کی کریانے کی دکانیں بھی تھیں ۔ انہوں نے کبھی کھلے بندوں گوشت کی فروخت پر اعتراض نہیں کیا ۔ قصائیوں کے بازار میں ایک نائی کی دکان پر بڑے سائز کی ایک فوٹو لگی ہوئی تھی ۔ وہ ہر رُوز وہ فوٹو باہر لٹکاتا اور شام کو اُتار کر رکھ لیتا تھا ۔ یہ فوٹو ریلوے ٹرینوں کے حادثے کی تھی جو موجودہ صدی کے آغاز میں پھلور اور لدھیانہ کے مابین پیش آیا تھا ۔ دونوں انجن آمنے سامنے سے بڑے زور دار دھماکے کے ساتھ ٹکرائے اور وہ یُوں کھڑے تھے جیسے دو پہلوان کشتی کے وقت گتھم گتھا ہوں ۔ بوگیوں کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے ۔ میرے دادا مرحوم نے یہ حادثہ دیکھا تھا ۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ دونوں انجنوں کے ڈرائیور انگریز تھے اور وہ اس حادثے میں مر گئے تھے ۔ میں دن میں جتنی بار اُدھر سے گذرتا یہ تصویر ضرور دیکھتا ۔ قیامِ پاکستان کے آٹھ سال بعد میں پھلور گیا تو مجھے اس دکان کے باہر وہ تصویر نظر نہیں آئی ۔

بڑا گوشت پھلور میں کھلے بندوں نہیں بکتا تھا ۔ ہماری "عمر منزل" سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک چار دیواری کے اندر بڑے قصائیوں کی چند دکانیں تھیں ۔ اس چار دیواری کے دروازے کے باہر ایک دیوار بنائی گئی تھی جو گھونگھٹ کا کام دیتی تھی تاکہ باہر سے گوشت نظر نہ آئے ۔ اس زمانے میں بڑے گوشت کا بھاؤ چھ پیسے یا دو آنے سیر ہوتا تھا ۔ جمعرات کے رُوز ذرا اچھے جانوروں کا گوشت فروخت کرتے تھے ۔ شائقین اس روز بُونگ خرید کر لے جاتے تھے ۔ اب اسی گوشت کا بھاؤ چالیس رُوپے فی کلو ہے ۔ اس زمانے میں ۲۵ یا ۳۰ روپے میں گائے آجاتی تھی ۔ مقامی کاشتکاروں میں ایک اصطلاح مستعمل تھی ۔ جب کسی کاشتکار کا کٹرا بڑا ہو جاتا اور بھینس اس کے بغیر بھی دُودھ دینے

لگتی تو اسے بڑے قصائیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے۔ اگر کوئی پوچھتا کہ تمہارا کٹڑا نظر نہیں آتا تو مالک کہتا "اوہنوں پڑھنے پا دِتا اے"۔ اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ تعلیم و تعلّم کے بارے میں ان کے کیا نظریات تھے۔

ان بڑے قصائیوں کا سرپنچ بُوٹی قصائی تھا۔ ان کا محلہ بھی الگ تھا۔ وہ نویں محرم کو دُلدل نکالا کرتا تھا۔ لوگ بڑی تعداد میں دُلدل دیکھنے جاتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ دیکھنے والوں کے بوجھ سے کسی مکان کی چھت نیچے آ رہی اور لوگ زخمی ہو گئے۔ ایک بار بُوٹی کا جواں سال بھائی فوت ہو گیا۔ اسے مرے ہوئے کئی ماہ گذر گئے۔ جس دن اس نے دُلدل نکالا تو اپنے مرحوم بھائی کی پگڑی لا کر دُلدل کے سر پر رکھ دی۔ اس موقع پر اتنا زبردست ماتم ہوا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

ہندوؤں کے ہاں چند عمل ایسے ہیں جن کا بہت زیادہ پُن (ثواب) ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک عمل یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان گائے یا بچھڑا قصابوں کے ہاتھ فروخت کرنے کے لئے لے جا رہا ہو تو اسے خرید کر اس کی جان بچا لے۔ ہمارے محلّے کے پاس ہی مجّھو برہمن رہتا تھا۔ اس نے متعدد بار مسلمانوں سے گائیں خرید کر گئو شالہ میں داخل کروائیں۔ وہ علی الصبح سو کر اٹھنے کا عادی تھا۔ وہ منہ اندھیرے ہمارے محلّے سے بھجن گاتے ہوئے گذرتا۔ سُنا ہے کہ گرمی ہو یا سردی وہ صبح سویرے دریا پر جا کر اشنان کیا کرتا تھا۔ مجّھو برہمن کے گذرنے کے بعد ایک سادھو "جے گوبندا جے گوپال" کا بھجن کرتے ہوئے گذرتا۔ اس وقت وہ کسی سے کچھ نہ مانگتا۔ دس گیارہ بجے وہ ہندوؤں کے گھروں سے بھیک مانگنے آتا۔ وہ مسلمانوں سے کچھ نہ لیتا۔ اگر کوئی اسے کچھ دینا بھی چاہتا تو وہ نہ لیتا۔

اسی طرح رمضان میں ایک مسلمان فقیر آیا کرتا تھا۔ وہ سحری کے وقت لوگوں کو جگانے کے لئے بلند آواز سے یہ بیت پڑھا کرتا تھا:

بُوا دے آئے پیکے بُوا لال گُلّا سیکے
بابے دا آیا کوئی بُوا سوج بھولا ہوئی

رمضان میں تو وہ کسی سے کچھ نہ لیتا لیکن عید کے دن ہر گھر پر دستک دیتا۔ حسب توفیق لوگ اسے کچھ دے دیتے۔ میری دادی مرحومہ سے وہ چاندی کا روپیہ لئے بغیر نہ ٹلتا۔ اس کے بعد وہ گیارہ مہینوں کے لئے غائب ہو جاتا۔ خدا جانے وہ کہاں سے آتا تھا اور کہاں چلا جاتا تھا۔

جمعرات کی شام کو برادری کا فقیر خیرے شاہ روٹی لینے کے لئے آتا تھا۔ وہ پنجابی زبان کے مشہور شاعر حشمت شاہ کا قریبی عزیز تھا۔ وہ کسی کے گھر میں داخل ہوتے وقت "بھلا ہو" کی صدا لگاتا۔ عورتیں متنبہ ہو جاتیں۔ خیرے شاہ روٹی لینے کے لئے ٹوکری آگے بڑھا دیتا۔ اگر کسی کے ہاں سے اسے مکئی کی روٹی ملتی یا ثابت کی بجائے آدھی روٹی ملتی تو اسے سب سے اوپر رکھ لیتا۔ اگر کوئی پوچھتا کہ یہ آدھی روٹی کہاں سے ملی ہے تو وہ کہتا کہ فلاں بڑے گھر سے۔ اس کے پاس بالٹی بھی ہوتی تھی جس میں وہ ہر قسم کا سالن ڈالتا رہتا تھا۔ خیرے شاہ کے فرائض میں تکیئے میں دھونی ڈالنے اور خستہ نوشوں کے لئے آگ تیار رکھنے کے علاوہ مُردے نہلانے بھی شامل تھے۔ وہ جمعہ کے روز مسجد میں صفیں بھی بچھا دیتا تھا۔

خیرے شاہ کی ماں "رجی" مُردہ عورتوں کو غسل دیتی اور ان کے کپڑے لے جاتی۔ چہلم کے موقع پر وہ کپڑوں کے ایک جوڑے کی حقدار سمجھی جاتی تھی۔ خیرے شاہ کا ایک رشتے دار دھیلے شاہ قبرستان میں رہتا تھا۔ وہ قبروں کی دیکھ بھال کرتا اور پودوں کو ہرا بھرا رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ وہ جمعے کی صبح آبادی کی جانب آتا اور ہر گھر سے آٹا یا دانے لے جاتا تھا۔ دھیلے شاہ سے پہلے بُوہے شاہ یہ کام کرتا تھا۔ راقم نے اسے نہیں دیکھا۔ اب سوچتا ہوں کہ ان لوگوں کی زندگی کس قدر سادہ تھی۔ ان کی دنیاوی ضرورتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ کوئی مر جاتا تو انہیں پہننے کے لئے کپڑے مل جاتے اور چہلم تک ایک وقت کا کھانا مقرر ہو جاتا۔ جمعرات یا جمعہ کو پھیری لگا کر وہ ہفتہ بھر کے لئے اناج جمع کر لیتے تھے۔

عید الاضحیٰ کے موقع پر چند گھروں میں بکرے ذبح کرنے کا رواج تھا۔ گائے ذبح ہوتے میں نے نہیں دیکھی۔ ان دنوں قصائی بکرا ذبح کرنے اور گوشت بنانے کا معاوضہ ایک روپیہ لیتا تھا۔ اب دو سو روپیہ مانگتے ہیں اور کلو بھر گوشت بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ بکرے کا گوشت پوری برادری میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ بعض ایسے لوگ بھی تھے جو صرف عید کے دن ہی گوشت کھاتے تھے باقی دنوں میں سبزی، دال یا اچار کے

ساتھ روٹی کھاتے تھے ۔ بکرے کے پائے ماشکی لے جاتا اور سری پر نائی کا حق تھا ۔ اوجھڑی چمار کے حصے میں آتی ۔ کھال مسجد کے امام کو، جو میاں جی کہلاتے تھے، ملتی ۔ وہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر کھالیں بیچ کر چند روپے اکٹھے کر لیتے ۔ جب کوئی بچہ قرآن ختم کرتا تو میاں جی کو کپڑوں کا ایک جوڑا ملتا ۔ میاں جی نکاح پڑھانے کا معاوضہ سوا روپیہ لیتے تھے ۔ اگر بارات باہر جانی ہوتی تو دولہا میاں جی کو سلام کرنے جاتا ۔ دولہا ایک روپیہ میاں جی کو دے کر ان کی دعائیں لیتا ۔ کبھی کبھار لوگ میاں جی کو اپنے گھر بلا کر اپنے کسی مرحوم عزیز کی روح کو ایصالِ ثواب کے لئے ختم دلواتے ۔ اس وقت آلو گوشت اور حلوے کی ایک تھالی بھر کر میاں جی کے سامنے رکھ دیتے ۔ وہ پہلے حلوہ کھاتے بعد ازاں روٹی تناول فرماتے ۔ فصل کے موقع پر ہر گھر سے دو سیر اناج میاں جی کو ملتا تھا ۔ ان کے علاوہ نائی اور ماشکی کو بھی اناج دیا جاتا ۔ ماشکی کے ذمے گھروں میں پانی بھرنا اور شادی کے موقع پر دلہن کو ڈولی میں بٹھا کر اس کے سسرال لے جانا تھا ۔ ایسے موقعوں پر مسلمان ماشکی ہندو سقوں کا تعاون حاصل کرتا اور ہندو سقے ضرورت کے وقت مسلمان ماشکی سے مدد لیتے تھے ۔ وہ ڈولی اپنے کندھوں پر اٹھا کر میلوں دور لے جاتے تھے ۔ نائی ہفتے میں ایک دن تکیئے میں بیٹھ کر اپنے ججمانوں کی حجامتیں بناتا، بچوں کا ختنہ کرتا، بیاہ شادی کے موقع پر کھانا پکاتا، شادی کی تاریخ مقرر ہونے پر سمدھیوں کو اطلاع دیتا اور مرگ ہونے پر متوفیٰ کے رشتے داروں کو مطلع کرتا ۔ اس کام کے لئے اسے میلوں پیدل چلنا ہوتا تھا ۔ بیاہ شادی کے موقع پر کمہار کچے برتن فراہم کرتا اور معاوضے کے طور پر اسے کھانا مل جاتا تھا ۔ کراکری استعمال کرنے کا ان دنوں رواج نہ تھا ۔ کھانے میں بھی اگر کوئی صاحبِ حیثیت ہوتا تو آلو گوشت اور چپاتیاں تیار کرواتا اور دوسرے وقت زردہ اور پلاؤ پکوا لیتا ۔ ان دنوں پلاؤ پر دہی یا سالن ڈالنے کا رواج نہ تھا ۔ اگر کوئی غریب ہوتا تو بارات کو ایک وقت صرف گڑ کے چاول کھلاتا اور دوسرے وقت آلو گوشت اور چپاتیاں کھلا دیتا ۔ ناشتے میں چھاچھ پلا دیتے ۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب دودھ دو آنے سیر اور بکرے کا گوشت چار تا پانچ آنے سیر بکتا تھا ۔ مرغ روسٹ اور آلو بخارے کی چٹنی کے نام سے بھی لوگ واقف نہ تھے ۔ سالن بھی پیالیوں میں ڈال کر دیتے ۔ ایک پیالی میں ایک بوٹی اور آلو کے دو ٹکڑے ہوا کرتے تھے ۔ بالکل سرشیڈ کا

فارمولا چلتا تھا ۔ اگر کسی کو مزید سالن کی ضرورت ہوتی تو اسے صرف شوربا مل سکتا تھا ۔ سبحان اللہ! کتنا سستا زمانہ تھا اور کتنے سادہ لوگ تھے ۔

پھلور میں سنیما کوئی نہ تھا ۔ سنیما کے شائقین لدھیانہ چلے جاتے تھے ۔ دسہرے اور دیوالی کے دنوں میں ایک سرائے میں ناٹک ہوا کرتے تھے جو ہندو تہذیب کا حصہ تھے ۔ اس موقع پر کئی ٹیمیں ناٹک سٹیج کرنے کے لئے آتیں ۔ ہندو اور مسلمان بلاتمیز مذہب و ملت ناٹک دیکھنے جاتے ۔ جو ٹیم کامیاب رہتی اسے انعام دیا جاتا تھا ۔ ایک بار ایک ٹیم نے شکنتلا نامی ڈرامہ سٹیج کیا ۔ یہ سلسلہ تین چار روز سے جاری تھا ۔ ان کا ناٹک کامیاب ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا ۔ اتنے میں کسی حریف ٹیم کے فرد نے کیلے کا چھلکا مجمع پر پھینکتے ہوئے سانپ سانپ کا شور مچایا تو پورا مجمع اپنی جگہیں چھوڑ کر بھاگ نکلا ۔ شکنتلا سٹیج کرنے والی ٹیم نے اس شرارت کا الزام کسی ہارنے والی ٹیم پر دھرا ۔ اگر بعض سمجھ دار لوگ بیچ بچاؤ نہ کراتے تو اس روز سر پھٹول ہو جاتا ۔

شہر کے لوگ عام طور پر بڑے شریف تھے ۔ وہ قانون شکنی سے ناآشنا تھے ۔ عدالتوں میں جتنے ملزم پیش ہوتے وہ سو فیصد سکھ جاٹ ہوتے جن کا تعلق قریبی دیہات سے تھا ۔ ان کے لئے قتل ایک معمولی بات تھی ۔ یہ مشہور تھا کہ جب کسی جاٹ کی فصل اچھی ہوتی تو وہ فصل کاٹتے ہوئے اپنے حریف کا نام لے لے کر کہتا: "مہندر سیاں ہُن تیری خیر نہیں"۔ اس کے پاس اگر مقدمہ لڑنے کے لئے رقم ہوتی تو وہ اپنے حریف کو قتل کر ڈالتا تھا ۔ آٹھ دس سال کی قید اس کے لئے معمولی بات تھی ۔ وہ جیل جاتے ہوئے اپنی بیوی سے کہتا کہ گھر میں دو بھینسیں ہیں ۔ بچوں کو دودھ پلاتی رہنا، میں ابھی آیا ۔ پھلور تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا ۔ وہاں عدالتیں تھیں ۔ صبح کے وقت نور محل، بلکہ اور پرتاپ پورہ سے ٹرین آتی تو سپاہی سکھ جاٹوں کو ہتھکڑیاں لگائے ہوئے ٹرین سے اترتے ۔ یہ منظر ہر روز دیکھنے میں آتا ۔ جہاں تک شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ شریف تھے اور شہر میں گنتی کے جو چند لوگ بدمعاش تھے انہیں ہر شخص جانتا تھا کہ فلاں جواری ہے، فلاں شرابی ہے اور فلاں بدکار ہے ۔ ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی ۔ وہ "بدمعاش" بھی اپنے محلے میں نظریں جھکا کر گزرتے تھے ۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے محلے سے گردن اٹھا کر گزرے ۔ وہ محلے کے سب سے بڑے محافظ ہوتے تھے ۔ وہ بدمعاشی باہر جا کر کرتے تھے ۔ ایسا اچھا معاشرہ دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتا ۔

میرٹھ

دہلی ۔ سہارنپور ریلوے لائن پر دہلی سے ۷۱ کلو میٹر کے فاصلے پر صوبہ یوپی کا مشہور شہر میرٹھ واقع ہے ۔ لاہور سے دہلی جاتے ہوئے میرا متعدد بار وہاں سے گزر ہوا لیکن کبھی وہاں رکنے کا موقع نہیں ملا ۔ ایک بار میں ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی (م ۱۹۸۵ء) ، مولانا شاہ فضل اللہ الگیلانی (م ۱۹۷۹ء) اور قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (م ۱۹۹۱ء) دارالعلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ میں شرکت کے بعد دیو بند سے دہلی جا رہے تھے جب ہماری ٹرین میرٹھ جاکر رکی تو قاضی صاحب وہاں اتر گئے ۔ انہوں نے اس پر بڑا اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ میرٹھ اتر جاؤں اور میرٹھ کی سیر کرکے علی گڑھ چلا جاؤں لیکن میں نے مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا شاہ فضل اللہ الگیلانی کی صحبت کو غنیمت جان کر قاضی صاحب سے معذرت کرلی اور پھر کبھی میرٹھ آنے کا وعدہ کیا۔

قاضی صاحب اپنا سامان اٹھا کر ٹرین سے اتر گئے ۔ میں کسی سٹال سے چائے لینے چلا گیا ۔ اتفاق سے قاضی صاحب نے مجھے چائے خریدتے ہوئے دیکھ لیا ۔ وہ فوراً پلٹے اور کہنے لگے کہ میرٹھ میں راقم کو چائے کی قیمت ادا کرنے کا کوئی حق نہیں ، یہ ان کا وطن ہے اس لئے چائے کی قیمت وہ ادا کریں گے ۔ اللہ ! اللہ !! کیا لوگ تھے اور خدا جانے وہ کن سانچوں میں ڈھلے تھے ۔

بھارت کے ایک سفر میں مجھے اور میری اہلیہ کو میرٹھ جانے کا اتفاق ہوا ۔ وہاں ہمیں کسی عزیز کے ہاں تعزیت کے لئے جانا تھا ۔ علی گڑھ سے براستہ خورجہ اور بلند شہر ریل کے ذریعے بھی میرٹھ جا سکتے ہیں اور بذریعہ بس بھی ۔ ریل کا ٹائم ہمیں Suit نہیں کرتا تھا اس لئے ہم نے بس کا سفر اختیار کیا ۔ بس کچھ دیر کے لئے خورجہ میں رکی ۔ وہاں چینی مٹی کے برتن اور آرائشی چیزیں بنتی ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں ۔ یہاں مجھے سید ظل حسنین رضوی یاد آگئے ۔ مرحوم خورجہ کی نواحی بستی جارچاہ کے رہنے والے تھے اور لاہور میں میرے پڑوس میں رہتے تھے ۔ وہ اکثر خورجہ اور اس کی نواحی بستیوں کا ذکر کیا

کرتے رہتے تھے ۔ انہی سے یہ معلوم ہوا کہ ان کے بزرگوں کو حاکم وقت نے خورجہ کے نواح میں ایک گاؤں بطور جاگیر عطا کیا تھا ۔ اس گاؤں کی قابل کاشت اراضی کو سیراب کرنے کی غرض سے چار کنوئیں کھودے گئے اور ان کی مناسبت سے اس گاؤں کا نام چہار چاہ پڑ گیا اور عام بول چال میں لوگ اسے جارچاہ کہنے لگے ۔ یہاں کے ایک شیعہ عالم دین ابن حسن قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے آئے تھے ۔ یہاں آکر انہوں نے بڑا نام پیدا کیا۔

" سید ظل حسنین رضوی ایک روز مجھے کہنے لگے کہ قیام پاکستان سے چند روز پہلے ان کے چھوٹے بھائی جارچاہ سے دہلی گئے اور وہاں سے واپسی پر ایک گراموفون خرید لائے۔ ان کی والدہ اس پر بڑا خفا ہوئیں ۔ وہ کہنے لگیں کہ لوگ تو گھر بار چھوڑ کر پاکستان جا رہے ہیں اور وہ گراموفون خرید لایا ہے ۔ اس نے کہا کہ جب وہ پاکستان جائیں گے تو اسے بھی ساتھ لیتے جائیں گے ۔ یہ سن کر ان کی والدہ کہنے لگیں کہ پاکستان میں بھلا گراموفون چلا کریں گے ، وہاں تو اللہ اللہ ہو گی ۔ یہ تھا پاکستان کا اسلامی تصور جو مسلم لیگ نے عوام کے ذہن نشین کیا تھا ۔ ہوا یوں کہ قیام پاکستان کے موقع پر ایک سپیشل ٹرین مرکزی حکومت کے مسلم افسروں کو لینے کے لئے دہلی بھیجی گئی ۔ جب وہ ٹرین وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ مسلم آفیسرز بذریعہ ہوائی جہاز کراچی روانہ ہو چکے ہیں ۔ ٹرین کے منتظمین نے کراچی کے ساتھ رابطہ قائم کیا تو وہاں سے جواب ملا کہ زیڈ ۔ اے ۔ بخاری (م ۱۹۷۵ء) ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ ٹرین خالی واپس لانے کی بجائے دہلی اور یوپی سے موسیقاروں ، میراثیوں ، طبلہ نوازوں ، طوائفوں اور ربابیوں کو پاکستان لے آئے ۔ بخاری صاحب نے یہاں ریڈیو اسٹیشن چلانے ہیں ۔ وہ ان فنکاروں کے بغیر کیسے چلیں گے ؟ ۔ چنانچہ بخاری صاحب کی خواہش پر اس ٹرین میں یہ فنکار پاکستان " تشریف لے آئے " اور پھر انہوں نے وہ اودھم مچایا کہ الامان و الحفیظ ۔ سید ظل حسنین رضوی کی والدہ پاکستان میں جو پاکیزہ آوازیں سننا چاہتی تھیں وہ طبلوں کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار میں دب کر رہ گئیں ۔ "

خورجہ سے ۲۳ کلو میٹر کے فاصلے پر بلند شہر ہے ۔ یہ ضلعی ہیڈ کوارٹر ہے ۔ بلند شہر کا پرانا نام برن ہے ۔ تغلق عہد (۱۳۹۸ ۔ ۔ ۱۳۲۵ء) کا نامور مورخ اور مفکر ضیاء الدین

برنی یہیں کا رہنے والا تھا۔ ابھی حال ہی میرے ایک فاضل کرم فرما میجر رفیع الدین باورؔ نے "برن سے بتوں تک" کے عنوان سے ان جنجوعہ راجپوتوں کی تاریخ شائع کی ہے جو صدیوں سے اس علاقے میں آباد تھے اور قیام پاکستان کے بعد ان کی اکثریت ترک وطن پر مجبور ہو گئی۔

جن دنوں راقم شملہ میں مقیم تھا وہاں ڈاکٹر منجیت سنگھ آہلووالیہ کی ذاتی لائبریری میں آل انڈیا ہسٹری کانفرنس کی مطبوعہ روئدادیں مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ بلند شہر میں ایک قدیم مسجد تھی۔ اس کا پلستر اکھڑ گیا تو ایک کتبہ ظاہر ہوا جس سے یہ معلوم ہوا کہ وہ مسجد سلطانہ رضیہ کے عہدِ حکومت (۱۲۳۶ء - ۱۲۴۰ء) میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے اس مسجد کا شمار عہدِ سلطنت میں تعمیر ہونے والی ابتدائی مساجد میں ہوتا ہے۔

بلند شہر سے ۲۸ کلو میٹر کے فاصلے پر گلاؤٹھی آتا ہے۔ یہ اس علاقے کا معروف قصبہ ہے۔ مشہور شاعر ناطق گلاؤٹھوی کا تعلق اسی قصبے سے ہے۔ گلاؤٹھی سے بیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہاپوڑ آتا ہے۔ یہاں کے پاپڑ بہت مشہور ہیں۔ ہاپوڑ کو بابائے اردو مولوی عبدالحق (م ۱۹۶۱ء) کا وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ادیب شہیر انتظار حسین بھی ہاپوڑ ہی کے رہنے والے ہیں۔ ہاپوڑ سے ایک ریلوے لائن گڑھ مکتسر اور گجرولہ ہوتے ہوئے مراد آباد چلی جاتی ہے اور دوسری ریلوے لائن میرٹھ جاتی ہے۔ ہاپوڑ سے میرٹھ کا فاصلہ صرف ۲۸ کلو میٹر ہے۔

برطانوی عہد میں میرٹھ کی فوجی چھاؤنی پورے ملک میں مشہور تھی۔ یہیں سے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو جنگِ آزادی کا آغاز ہوا تھا۔ ہمارے فاضل بزرگ اور دوست کرنل خواجہ عبدالرشید (م ۱۹۸۳ء) نے دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں میرٹھ چھاؤنی میں بڑا اچھا وقت گزارا تھا۔ موصوف نے ایک بار راقم کو بتایا کہ وہ ہر اتوار کو میرٹھ سے دہلی چلے جاتے اور پورا دن ندوۃ المصنفین میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (م ۱۹۸۴ء) اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی (م ۱۹۸۵ء) کے ساتھ گزارتے۔ وہیں سے انہیں علم و ادب کا چسکا پڑا تھا۔

آمدم بر سر مطلب! میں اور میری اہلیہ علی گڑھ سے میرٹھ پہنچے اور قاضی واڑے میں چھپر والی مسجد کے بالمقابل قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (م ۱۹۹۱ء) کے ہاں پہنچے۔ قاضی صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں علوم اسلامیہ کے استاد رہ چکے ہیں۔ ان کا شمار

علامہ انور شاہ کشمیریؒ (م ۱۹۳۳ء) کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی وفات تک دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ ان کا تعلق مجلس شوریٰ کے اس گروپ سے تھا جس نے قاری محمد طیب (م ۱۹۸۳ء) کے بعد ان کے بیٹے محمد سالم کو مہتمم بنانے کی مخالفت کی تھی اور یوں مہتمم کے منصب کو موروثی منصب بننے سے بچا لیا تھا۔

قاضی صاحب کے بزرگوں کا تعلق گڑھ مکتسر تھا۔ ان کے دادا قاضی محمد ہادی مرحوم گڑھ مکتسر سے میرٹھ آ کر آباد ہو گئے۔ ان کے والدِ بزرگوار قاضی بشیر الدین کا شمار میرٹھ کے علماء میں ہوتا تھا۔ جامع مسجد کی خطابت ان کے ذمے تھی۔ ان کی وفات کے بعد یہ منصب قاضی زین العابدین سجاد کو ملا۔ قاضی صاحب کے ہاں میں نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (م ۱۸۹۹ء) اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۹۴۳ء) کے مکتوبات کی زیارت کی جس کا ذکر اس کتاب میں کسی اور موقع پر آیا ہے۔

قاضی صاحب نے مجھے شہر کی جامع مسجد دکھائی۔ اس کا شمار بھی عہدِ سلطنت میں تعمیر ہونے والی اولین مساجد میں ہوتا ہے۔ یہ مسجد سلطان ناصر الدین محمود کے عہدِ حکومت (۱۲۴۶ء - ۱۲۶۶ء) میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کے صدر دروازے پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت منقوش ہے:

> در عہد ہمایوں خدائیگان عالم سلطان المعظم شہنشاہ الاعظم المالک رقاب الامم کہف الفقرا فی العالمین سلطان السلاطین المخصوص بعنایت رب العالمین ابوالمظفر ناصر الدنیا و الدین محمود بن سلطان شمس الدین ایلتتمش خلد اللہ ملکہ باہتمام وزیرش غیاث الدین بلبن کہ خطاب الغ خان داشت جامع مسجد ضمن میرٹھ شہور ۶۴۷ سبع و اربعین وست مائہ۔

اس کتبے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد ناصر الدین محمود کے وزیر اور جانشین غیاث الدین بلبن کے زیر اہتمام پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ یہ مسجد بڑی وسیع ہے اور اس عہد کے فنِ تعمیر کا شاہکار مانی جاتی ہے۔

قاضی صاحب نے مجھے ایک مسجد دکھائی جس کا نام لینا مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک بار اس مسجد کے حجرے کی دیوار پر لگا ہوا پلستر اکھڑ گیا تو معلوم

ہوا کہ دیوار میں بُت نصب ہیں ۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ مسجد کسی مندر کی جگہ تعمیر ہوئی تھی ۔ قاضی صاحب کو اس کا علم ہوا تو وہ فوراً موقع پر پہنچے اور انہوں نے وہ حجرہ مقفّل کروا دیا اور جن لوگوں کو وہاں بُتوں کی موجودگی کا علم تھا انہیں سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ وہ اس راز کو اپنے تک ہی رکھیں ۔ اگر ہندوؤں کو اس کا علم ہو گیا تو وہ مسجد پر قبضہ کر کے اسے مندر میں تبدیل کر دیں گے اور اگر محکمہ آثار قدیمہ تک بات پہنچ گئی تو وہ بُتوں کو دیواروں سے نکالنے کے لئے حجرہ مسمار کر دیں گے ۔ قاضی صاحب نے راقم کو بتایا کہ رات کے وقت ایک مسلمان معمار کو بلایا اور اس نے حجرے کی دیوار سے بُتوں کو نکالا ۔ پہلے ان کا یہ خیال تھا کہ وہ بُت مسجد کے کنوئیں میں پھینک دیئے جائیں لیکن ایسا کرنے سے بڑی آواز پیدا ہوتی ۔ اس لئے رات کے پچھلے پہر وہ بُت اٹھا کر ایک قریبی چورا ہے میں رکھ آئے ۔ وہاں ان دنوں ایک مندر تعمیر ہو رہا تھا ۔ ہندوؤں نے وہ بُت اٹھا کر اس مندر میں نصب کر دیے ۔ اس طرح مسجد بُتوں کی نجاست سے پاک ہو گئی اور ہندوؤں کے قبضے میں چلے جانے سے بھی بچ گئی ۔

قاضی صاحب کے مکان سے قریب ہی ملحق واڑے میں میری اہلیہ کی ایک سہیلی حمیرہ رہتی ہے ۔ قاضی صاحب کے اہل خانہ سے مل کر ہم ان سے ملنے گئے ۔ ان کے ہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ قیام پاکستان سے قبل ہندو ۔ مسلم فسادات کا آغاز گڑھ مکتسر سے ہوا تھا اور پہلے دن شرپسند ہندوؤں نے حمیرہ کے ایک عزیز فرید صاحب کو اٹھا کر دریائے گنگا میں پھینک دیا تھا ۔ اس کے جلد بعد فرقہ وارانہ فسادات پورے ملک میں پھیل گئے ۔ حمیرہ کے ہاں سے اٹھ کر ہم دوبارہ قاضی صاحب کے ہاں پہنچ گئے ۔

میری خواہش پر قاضی صاحب مجھے شاہ پیر میرٹھی کی درگاہ دکھانے لے گئے ۔ ان کا تعلق شطاری سلسلۂ تصوف کے ساتھ تھا اور انہوں نے اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کا ابتدائی زمانہ دیکھا تھا ۔ میرٹھ شہر کا ایک دروازہ ان کے نام کی مناسبت سے شاہ پیر گیٹ کہلاتا ہے ۔ ان کا مقبرہ دو منزلہ ہے لیکن اس پر گنبد نہیں ہے ۔ شاید امتداد زمانہ سے گنبد گر چکا ہے ۔ مقبرے کی اندرونی دیواروں پر منبت کاری کا کام دیکھنے سے لائق ہے ۔

شاہ پیر کی حیات میں ان کی خانقاہ میں شب و روز سماع جاری رہتی تھی ۔ ان کا انتقال ۱۰۳۰ھ / ۱۶۲۰ء میں ہوا تو محمد صادق شاہجہانی نے ان کی تاریخ اس مصرعے سے

نکالی:

وہ کہ از مُردن دے بے سَرو پا شُد نغم

اگر نغمہ کے سَرو پا یعنی ن اور ہ اُڑا دیئے جائیں تو باقی غم رہ جاتا ہے جس کے عدد ۱۰۳۰ھ بنتے ہیں ۔ یہی ان کا سال وفات ہے ۔

میرٹھ کا اسلامیہ کالج شمال مغربی یوپی کا ایک مشہور علمی ادارہ ہے ۔ قرب و جوار کے شہروں اور قصبوں سے مسلمان بچے وہاں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں ۔ بچوں کے مشہور شاعر اسمٰعیل میرٹھی اور شہرۂ آفاق مؤرخ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا تعلق بھی میرٹھ سے ہے ۔ میرٹھ میں نَوچندی کا میلہ بڑی دُھوم دَھام سے لگتا ہے ۔ ایک بار راقم کا گزر اس موقع پر میرٹھ سے ہوا ۔ میلوں تک خیمے لگے ہوئے تھے اور لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو میلہ دیکھنے جا رہا تھا ۔

میرٹھ کے بازاروں میں سبھاش روڈ اور گدڑی بازار بڑے مشہور ہیں ۔ گدڑی بازار میں چندر سہائے کی ریوڑیوں کی دکان ہے ۔ وہ گڑ کی ریوڑیاں بناتا ہے جو ہمارے ہاں کے ملتانی حلوے کی طرح دُور دُور تک بھیجی جاتی ہیں ۔ میرٹھ چھریوں اور قینچیوں کی صنعت کا بہت بڑا مرکز ہے ۔ میرے ہاں اب تک ایک قینچی زیر استعمال ہے جو قیام پاکستان سے قبل میرٹھ میں تیار ہوئی تھی ۔ میرٹھ ایک بارونق شہر ہے ۔ اس کے باوجود کسی ناشکرے شاعر نے وہاں جا کر یہ شعر کہا تھا:

ماؤ بہزہ مجھے خُلد کے باغوں سے کم نہ تھا
میرٹھ بُلا کے کیوں مری مٹی پلید کی



قبرستان مہندیاں میں خانوادہ ولی اللٰہی کے مزارات

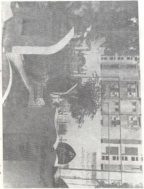
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز



سرہند شریف میں حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے
اور عالمگیر اورنگ زیب کے مرشد
خواجہ سیف الدین سرہندی کا مقبرہ



قبرستان مہندیاں سے قریب کی مسجد کے صحن میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خان کے استاد محترم مولانا مملوک العلی نانوتوی کا مزار۔ عقب میں ارون اسپتال میں واقع پانی کی ٹنکی نظر آرہی ہے



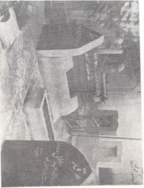
قبرستان مہندیاں دہلی میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور شیخ الحدیث مولانا عبد العلی قاسمی کی قبریں۔ان کے پائنتی جانب ارون ہسپتال کے عملے کے رہائشی فلیٹس نظر آرہے ہیں۔



مشہور شاعر مومن خان مومن کی پرانی قبر کی ایک یادگار تصویر اب اس کی جگہ نئی قبر بن گئی ہے



خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ کا صدر دروازہ



قبرستان مہندیاں میں شاہ اسمعیل شہیدؒ کے والد ماجد شاہ عبد الغنی محدث اور شاہ شہید کے فرزند ارجمند شاہ محمد عمر کی ابدی آرام گاہیں۔



شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مزار مبارک سے
جانب مشرق ان کے
فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز محدث کی آخری آرام گاہ



مزار مبارک مترجم قرآن حکیم شاہ رفیع الدین محدث۔
ان کے مزار کے پائنتی جانب
شاہ مخصوص اللہ اور شاہ محمد موسیٰ کے مزارات
نظر آرہے ہیں۔



قبرستان مہندیاں کا صدر دروازہ۔ سامنے شاہ ولی اللہ محدث کی لوح مزار نظر
آرہی ہے۔



قبرستان مہندیاں دہلی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مزار مبارک ۔ ان کے مزار کے پائنتی جانب ان کے فرزند اور قرآن حکیم کے مترجم شاہ رفیع الدین محدث محوخواب ابدی ہیں ۔



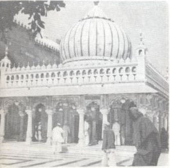
ترکمان دروازے سے باہر "شکور کی ڈنڈی" میں خواجہ میر درد اور ان کے والد بزرگوار خواجہ میر ناصر عندلیب کے مزارات



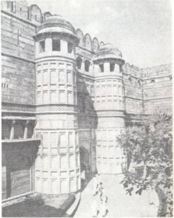
فتح پور سیکری : مزار مبارک شیخ سلیم چشتیؒ ۔ مغل حکمران اکبر کو ان کے ساتھ بڑی عقیدت تھی ۔ اسی عقیدت کی بنا پر وہ اپنا دارالحکومت آگرے سے فتح پور سیکری لے گیا تھا ۔ شہزادہ سلیم (نورالدین جہانگیر) ان ہی کی دعا سے پیدا ہوا تھا ۔



حوض خاص دہلی : دہلی میں پانی کی قلت ختم کرنے کی غرض سے سلطان علاؤ الدین خلجی نے حوض خاص بنوایا اور اس کے کنارے مدرسہ قائم کیا ۔ امیر تیمور نے ان عمارتوں کی بڑی تعریف کی تھی ۔



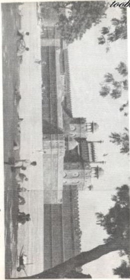
چشتیہ نظامیہ سلسلہ تصوف کے بانی حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کا مزار مبارک



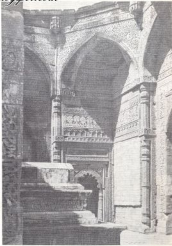
قلعہ آگرہ کا صدر دروازہ جو امر سنگھ گیٹ کے نام سے موسوم ہے۔ بابر، ہمایوں، اکبر اور جہانگیر اسی قلعے میں بیٹھ کر پاک و ہند، افغانستان اور بنگلہ دیش پر حکومت کرتے رہے۔



حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کے احاطے میں شہزادی جہاں آرا، بیگم بنت شاہجہان کا مقبرہ۔ شہزادی کی قبر کے لوح مزار پر خط ثلث میں کندہ عبارات دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔



لال قلعہ دہلی شاہجہاں نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کے صدر دروازے کے سامنے اورنگ زیب نے ایک دیوار تعمیر کروائی تھی، جو ۔ گھونگھٹ ۔ کے نام سے مشہور ہے۔ قلعے میں اسی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔



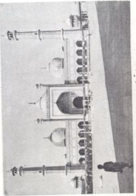
مسجد قوۃ الاسلام کے عقب میں سلطان شمس الدین التمش (۱۲۱۲ - ۱۲۳۶ء) کا خوشنما مقبرہ جس کی دیواروں پر کندہ آیات قرآنی قابل دید ہیں۔



قطب مینار کا نچلا حصہ جس پر آرائش کے لئے خط کوفی میں قرآنی آیات کندہ ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ یہ مینار دہلی کے آخری ہندو حکمران رائے پتھورا نے تعمیر کیا تھا۔ اس پر کندہ آیات ہندوؤں کے اس دعوے کی تکذیب کرتی ہیں۔



لال قلعہ کے اندر رنگ محل کی عمارت کے اندر نہر
رواں تھی۔اس نہر میں جابجا فوارے لگے ہوئے ہیں
(یہ اس وقت کا ائیر کنڈیشنگ سسٹم تھا) اس سے
یہ محل گرمیوں میں ٹھنڈا رہتا تھا۔



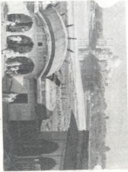
شاہجہاں کی تعمیر کردہ جامع مسجد دہلی کا عمومی منظر



گوردوارہ سیس گنج: یہ دہلی میں اس مقام پر تعمیر ہوا ہے جہاں اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد میں سکھوں کے نویں گورو تیغ بہادر کو بجرم بغاوت قتل کیا گیا تھا۔ ایک سکھ گوردوارے میں داخل ہونے سے قبل پنج اشنانہ (سکھوں کا وضو) کر رہا ہے۔



فتح پور سیکری میں مغل حکمران اکبر نے ایک پانچ منزلہ عمارت تعمیر کی تھی جو پنج محل کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اس کی بالائی منزل سے میلوں تک کا علاقہ دکھائی دیتا ہے۔



"دیکھنے والے اسے تاج محل کہتے ہیں"
قلعہ آگرہ کے مثمن برج اور مچھلی بھون سے تاج محل کا خوشنما منظر



علاؤالدین خلجی نے قطب مینار سے قریب علائی دروازہ تعمیر کروایا تھا جو سلجوقی فن تعمیر کا مظہر ہے۔ یہ دروازہ ان سلجوقی معماروں نے تعمیر کیا تھا جو منگولوں کے خوف سے وسط ایشیاء سے دہلی چلے آئے تھے۔



فتح پور سیکری میں پنچ محل اور عبادت خانہ سے متصل اکبر کے مصاحب خاص راجہ بیربل کا محل۔



اجمیری دروازہ دہلی: شاہجہاں آباد دہلی کے دروازوں میں اجمیری دروازہ بڑا مشہور ہے۔ اس دروازے کے
باہر مشہور علمی ادارہ اینگلو عربک کالج تھا جو اب ذاکر حسین کالج کہلاتا ہے۔



مقبرہ ہمایوں دہلی: یہ مقبرہ اکبر کے دور میں تعمیر ہوا تھا۔ ماہرین فن تعمیر کا یہ کہنا ہے کہ یہ مقبرہ
تاج محل کی پہلی کڑی ہے۔ اس مقبرے میں ہمایوں کے علاوہ ۱۵۰ مغل شہزادے اور شہزادیاں
دفن ہوئے۔



تاج محل کے باغ کی ڈیوڑھی جو بذات خود حسن و جمال کا مظہر ہے۔